علی گڑھ میگزین

(اڈیٹر) انیس الدین احمد رضوی ایم۔اے (علیگ)

جلد (۶) شمارہ (۵ تا ۸)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

کا

علمی اور ادبی رسالہ

علی گڑھ میگزین

مُرتّبہٗ

انیس الدین احمد رضوی ایم اے (علیگ) اڈیٹر
محمد حبیب اللہ خاں غلزئی اسسٹنٹ اڈیٹر

6.5.47.

مجلس عاملہ علی گڑھ میگزین

۰۵۱
۲۹۸۳۸۲۴
۲۷۹۲۶ء
۱۹۲۸

پریسیڈنٹ :- قاضی محمد جلال الدین صاحب ایف آر جی ایس

سنیئر انٹرمیڈیٹ کالج :- مسٹر محمد عبدالشکور صاحب ایم اے

اڈیٹر :- انیس الدین احمد رضوی ایم اے (علیگ)

معاون :- محمد حبیب اللہ خاں غلزئی (انٹرمیڈیٹ کالج)

فہرست مضامین

6.5.40

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علی گڑھ میگزین

تعطیلات نمبر

مرتبہ

انیس الدین احمد رضوی ایم اے (علیگ)

جلد (۶)	من ابتدائے جولائی لغایتہ اکتوبر سنہ ۱۹۲۸ء	نمبر (۵ تا ۸)

شذرات

کوائف دار العلوم آج تین مہینہ کی تعطیل کے بعد یونیورسٹی میں پھر وہی ہما ہمی نظر آتی ہے۔ نئے اور پُرانے طلبا اکناف و اطرافِ ملک سے جوق جوق اس مادرِ علمی کی آغوشِ شفقت سے استفادہ حاصل کرنے کے لیئے اور اس سرچشمۂ علوم سے سیراب ہونے کے لیئے آرہے ہیں۔ یونیورسٹی کے دفاتر میں داخلہ اور قیام کے مختلف مراحل پر آج پھر وہی ہجوم نظر آتا ہے، اور "بابِ براہیم" سے "باب العظمت" تک تمام دروازے مشتاقانِ زیارت سے بھرے ہوئے ہیں۔

ہم اُن تمام طلباء کا دلی تپاک سے خیر مقدم کرتے ہیں، جو امسال اپنے اپنے وطن مالوف سے جدا ہو کر "اطلبوا العلم" پر عمل پیرا ہونے کے لیئے پہلی مرتبہ علی گڑہ آئے ہیں۔ اُن کو سمجھ لینا چاہیئے کہ آج وہ بھی اسی عالم گیر "علیگ" برادری کے ایک

رکن ہیں، جس کی رُکنیت پر ہر ممبر فخر و ناز کرتا ہے۔

علی گڑھ اپنے طرزِ تعلیم کی وجہ سے مشہور رہا ہے۔ یہاں کا فاضل عرصہ گاہ حیات میں کسی سے کم نہیں رہا۔ اس کے گریجویٹ اگر ایک طرف حکومت ہند کے دست و بازو ہیں، تو دوسری طرف تحریک قومیت کی جان ہیں؛ یہاں کے مایۂ ناز فرزند ادبیات سیاسیات، اور ان کے علاوہ ہر شعبہ میں "ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما" کا اعلان کر رہے ہیں۔ علی گڑھ کا یہ اعزاز کتابوں کا کیڑا بن جانے کی وجہ سے نہیں، الف سے یے تک نصابِ تعلیم کو ازبر کر لینے کی وجہ سے نہیں، بلکہ یہاں کی قابلِ تحسین طرزِ تعلیم و معاشرت کی وجہ سے ہے۔ نئے طلباء سے ہم اُمید کرتے ہیں کہ وہ علی گڑھ کی اسی روح کو اپنے اندر حلول کر لیں گے جس نے ہر علیگ کو ملک، قوم اور حکومت کی نظر میں لائقِ اعتبار اور قابلِ اعتماد بنا دیا ہے۔

اس طرزِ تعلیم کی ایک سچی تصویر عالی جناب نواب محمد احمد سعید خاں صاحب آف چھتاری کے پیکر اقبال میں نظر آتی ہے۔ ہم انتہائی مسرت کے ساتھ اس امر کا اظہار کرتے ہیں کہ سر الگزانڈر مڈمین گورنر صوبہ جات متحدہ کی اچانک موت پر عالیجناب نواب صاحب نے گورنری کے اہم فرائض بہ حسن و خوبی انجام دیئے، اور سر مالکم ہیلی کے چارج لینے تک نواب صاحب موصوف اس صوبہ کے گورنر رہے۔ ہم موصوف کی خدمت میں اس سعادت پر تہِ دل سے ہدیۂ تہنیت پیش کرتے ہیں۔

ہمیں معلوم ہوا ہے کہ مسٹر اسد اللہ کاظمی، ایم اے (علیگ)، کو، جو مسلم یونیورسٹی انٹرمیڈیٹ کالج میں لکچرر تھے، حکومت صوبہ جات متحدہ نے "تعلیم" کے لیئے وظیفہ عطا کیا ہے، اور کاظمی صاحب لیڈس یونیورسٹی تشریف لے جا رہے ہیں۔ ان کے علاوہ مسٹر مختار احمد، ایم اے (پنجاب و علیگ) جو یونیورسٹی میں اقتصادیات کے اُستاد تھے، اور مسٹر محمد ناظم صدیقی، منشی فاضل، ایم اے، بی ٹی، جو انٹرمیڈیٹ کالج میں لکچرر تھے، اور ہسٹری میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کی غرض سے دو سال سے انگلستان گئے ہوئے تھے، یہ امتیاز لے کر واپس آ رہے ہیں۔ ہم ان سب صاحبان کی خدمت میں ہدیۂ مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

انٹرمیڈیٹ کالج بھی مستحق مبارک باد ہے، جس نے دو ایسی ہستیاں ملک کے سامنے پیش کی ہیں۔ ہم اُمید کرتے ہیں کہ اگر اس سلسلہ کو قایم رکھا جائے اور یونیورسٹی یا انٹرمیڈیٹ کالج سے ایک لکچرر ہر سال اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیئے انگلستان بھیجا جایا کرے، تو یہ سلسلہ یونیورسٹی اور کالج دونوں کے واسطے بہترین مستقبل کا حامل ثابت ہوگا۔ کیا حکومت صوبہ جات متحدہ اور مسلم یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد اس مسئلہ پر غور کر سکتے ہیں؟

گزشتہ اشاعت میں ہم نے فسانہ "بہرام" کے متعلق اس امر پر اظہار افسوس کیا تھا کہ جناب شمیم بہوری نے ایک ہی فسانہ بہ یک وقت دو رسائل کو ارسال کر دیا، جو اصول صحافت کے خلاف ہے۔ لیکن شمیم صاحب نے ہماری اس غلط فہمی کا ازالہ کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اُنھوں نے ہمارے پیشرو جناب محمود صاحب کی درخواست پر یہ فسانہ علی گڑھ میگزین میں اشاعت کی غرض سے روانہ فرمایا تھا۔ اور اس کا مثنیٰ اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ ان کے ایک دوست نے یہ دوسرا مسودہ دیکھا اور بہت پسند فرمایا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُنھوں نے جناب شمیم صاحب سے بہ اصرار اس کو لیکر لاہور کے ایک اور رسالہ کو روانہ کر دیا، اور شمیم صاحب کے اس اعتذار کی مطلق سماعت نہ کی کہ یہی فسانہ علی گڑھ میگزین کو روانہ کیا جا چکا ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ فسانہ مکمل ہو گیا، لیکن صاحب مضمون کے خط سے معلوم ہوا کہ ابھی تقریباً نصف اور باقی ہے۔ ہماری درخواست پر شمیم صاحب نے اس کے بقیہ حصہ کو نہایت عجلت میں تیار کیا، اور اشاعت کی غرض سے بھیجدیا جو اس نمبر میں زینتِ میگزین ہے۔ ہم جناب شمیم صاحب کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتے ہیں، اور اُمید کرتے ہیں کہ اسی طرح آیندہ بھی اپنے دلچسپ فسانوں سے میگزین نوازی فرماتے رہینگے۔ موصوف کا ایک اور فسانہ "آٹھ آوازیں" جس کے شائع کرنے کا ہم نے گزشتہ اشاعت میں وعدہ کیا تھا۔ ہمارے پاس بحفاظت موجود ہے، اور "بہرام" کی تیسری قسط کی وجہ سے شائع نہ ہو سکا۔ انشاء اللہ تعالیٰ آیندہ اشاعت میں ہدیۂ ناظرین کیا جائیگا۔

ایک شرمناک فلم

ہمارے ایک محترم دوست نے سینما کمپنی کی ایک نئے فلم کی طرف ہمیں توجہ دلائی ہے۔ اس فلم کا نام "شیراز" ہے، اور حال ہی میں پردہ پر آیا ہے۔ یہ خاص ہندوستان کا تیار کردہ ہے، اور ہمارے برادرانِ وطن نے نہایت محنت اور عرق ریزی سے اس کو مرتب کیا ہے۔ فلم کا پلاٹ اس قدر شرمناک اور بدنام کن ہے کہ کوئی شریف انسان دل میں غم و غصہ کا ایک عظیم ہیجان محسوس کیئے بغیر اس کو نہ پڑھ سکتا ہے نہ دیکھ سکتا ہے۔ ہندوستان کے نامور تاجدار شہاب الدین محمد شاہجہاں صاحبقران اعظم اور اُن کی محبوبہ ملکہ آسودۂ تاج کو جس گندے اور ناپاک طریقے سے بدنام کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اُس کو کوئی برداشت نہیں کرسکتا۔ ذرا اس فلم کا پلاٹ ملاحظہ فرمایئے:

"ایک چھوٹے سے ہندوستانی گاؤں میں ایک یتیمہ سلیمہ نام ایک کمہار کے گھر میں پرورش پاتی ہے۔ کمہار کا لڑکا، شیراز، اُس پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ بردہ فروش اس لڑکی کو اُٹھا کرلے جاتے ہیں،

اور شیراز اس کی تلاش میں تمام مصائب برداشت کرتا ہوا سرگرداں پھرتا ہے۔ سلیمہ شاہزادہ خرم کے ہاتھ فروخت ہوتی ہے، اور تمام شاہانہ آداب و مراسم کو نظر انداز کرتے ہوئے شاہزادہ بھی اس کے عشق میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اس محبت کی وجہ سے صوفیہ ایک حسین درباری باندی کی آتش رقابت بھڑک اٹھتی ہے، کیونکہ وہ خود خرم کے ساتھ مناکحت کی خواہاں ہے۔ اس غرض سے وہ نہایت کامیاب سازش کرتی ہے کہ شیراز اور سلیمہ ملوث ہو جائیں۔ شاہزادہ کے دربار سے دونوں کو پھانسی کا حکم ہوتا ہے، لیکن سلیمہ آخری وقت میں شہزادہ سے اظہار محبت کرتی ہے، اور دونوں کی جاں بخشی ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد سلیمہ ممتاز محل بنتی ہے، شیراز دل شکستہ ہو کر چلا جاتا ہے، اور اٹھارہ سال ایک عمارت کا نمونہ بنانے میں صرف کرتا ہے۔ اس عرصہ میں ممتاز محل کا انتقال ہو جاتا ہے۔ شاہجہاں مقبرہ کے لیئے بہترین نمونے طلب کرتا ہے، شیراز بھی حاضر ہوتا ہے اور اس کا نمونہ پسند کیا جاتا ہے۔ مقبرہ تاج محل اسی نمونہ پر تیار ہوتا ہے، اور کھیل اس سین پر ختم ہو جاتا ہے کہ زبردست ماہر فن شیراز اور شاہجہاں دونوں دوستانہ طور پر اس عورت کی یادگار کی تعمیر میں مصروف ہیں، جس پر دونوں عاشق تھے۔"

معاذ اللہ! افتراء و بہتان کا طوفانِ عظیم! کذب اور دروغ بیانی کا انسانیت سوز دفتر! دماغی بہیمیت اور وحشت کا شرمناک مظاہرہ! ہندوستان کے اس جلیل المرتبت شاہنشاہ کی ذاتِ ستودہ صفات پر اتنا بدنما داغ لگانا، جس نے دشمنان ملک و ملت سے بھی "عظیم" (magnificent) کا خراج وصول کر لیا ہو، ہم نہیں سمجھ سکتے کہ رواداری اور شرافت کے کون سے مسلک میں روا ہو سکتا ہے۔ کیا وہ نام نہاد محبانِ وطن، وہ نفوس قدسی، جو ہر مناقشہ اور قضیہ کے وقوعہ پر جارحانہ اقدام کا الزام صاحبقرانِ اعظم کے ہم مسلک افراد پر بلا تکلف رکھ دیتے ہیں، آج اس فلم کے ظہور پذیر ہونے پر بھی اپنے صد چاک گریبانوں میں منہ ڈال کر نہ دیکھینگے؟ ہم اس حیا سوز فلم کے خلاف زبردست صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں، اور امید کرتے ہیں کہ شریف اور غیور لوگ اس فلم کا ہی نہیں بلکہ اس کمپنی کا بائی کاٹ کر کے اپنے ایمان اور ضمیر کی سلامتی کا ثبوت دینگے۔

حوادثِ ارتحال | تعطیلات کا زمانہ بعض حیثیات سے انتہائی صبر آزما ثابت ہوا اس عرصہ میں ہندوستان کی چند

ایسی نادرۂ روزگار ہستیاں ہمیشہ کے لیئے داغ مفارقت دے گئیں کہ جن کی مثال زمانہ شاید نہ پیش کرسکیگا۔ مسلمانانِ ہند میں قحط الرجال کا جو افسوسناک عالم ہے، وہ ظاہر ہے۔ ایسی صورت میں معدودے چند ہستیوں کا وجود بھی غنیمت تھا، لیکن افسوس کہ یہ عظیم افراد ایک ایک کرکے ہمارے درمیان سے اُٹھتے جاتے ہیں، اور جو جگہ خالی ہوجاتی ہے، اُس کے پُر کرنے کے لیئے کوئی اور نظر نہیں آتا۔

یونیورسٹی بند ہونے کے کچھ ہی عرصہ بعد یہ روح فرسا خبر ملی کہ عالی جناب نواب سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے فرزند ارجمند نے عالمِ باقی کی طرف کوچ کیا۔ مرحوم نے اپنی عمر کی شکل سے ڈھائی منزلیں طے کی ہونگی کہ پیامِ اجل آگیا، اور ہمارے لیئے حسرت و اندوہ کا ایک دفتر بے پایاں چھوڑ کر سفرِ آخرت اختیار کیا۔ ہماری دلی دعا ہے کہ خدا وندِ کریم پسماندگاں کو صبرِ جمیل اور نواب صاحب موصوف کو نعم البدل عطا فرمائے۔

دوسری جاں گداز خبر جناب عزیز صفی پوری کے انتقال کی تھی۔ عزیز ادبیاتِ اُردو کے ان چند ماہرین میں سے تھے جنھوں نے نام ونمود کی کبھی خواہش نہ کی، لیکن پھر بھی ان کی شہرت کا آفتاب نصف النہار تک پہنچ گیا۔ اُنھوں نے ہمیشہ گمنام زندگی بسر کرنا چاہی، لیکن اُنکے جواہرِ صد آب کو ملک نے پہچان ہی لیا۔ ہماری درخواست پر جناب 'ض' نے عزیز مرحوم کے کلام پر ایک مبسوط تبصرہ حوالۂ قلم کیا ہے، جو اس نمبر میں شائع کیا جاتا ہے۔

۲۹ رجولائی کو مولانا وحید الدین صاحب سلیم پانی پتی نے ملیح آباد میں انتقال فرمایا۔ آپکے نامِ نامی سے ملک کا گوشہ گوشہ بخوبی واقف ہوچکا ہے۔ آپ ایک بہترین نثر نگار تھے، اور شاعری میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ آپ نے علی گڑھ میں اپنی لیاقت علمی کا ثبوت دیا اور پھر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن جاکر اُردو کی خدمت میں مصروف ہوگئے۔ اس کے بعد آپکے تبحر علمی نے آپ کو دار الترجمہ حیدرآباد دکن کے ممتاز اراکین کی صف میں جگہ دی، اور فرہنگ کی تدوین و ترتیب میں آپنے نمایاں حصّہ لیا۔ آپکے مشہور عام علمی کارنامے منظرِ عام پر آچکے ہیں، اور ثابت کررہے ہیں کہ اُردو پر آپ کا کس قدر عظیم احسان ہے۔ دنیائے اُردو اپنے اس محسن کی رحلت پر جس قدر بھی غم کرے تھوڑا ہے۔

اس جاں گداز حادثہ کا غم ابھی فراموش نہوا تھا کہ انگلستان سے رائٹ آنریبل سر سید امیر علی رضوی، پی سی، کی وفات حسرت آیات کی خبر آئی، جو ۳ راگست کو رہگرائے عالمِ باقی ہوئے۔ سید مرحوم کی ذات صرف مسلمانانِ ہندوستان کے لیئے ہی نہیں، بلکہ تمام ہندوستان کے لیئے مایۂ صد نازش و افتخار تھی کیونکہ آپ ہی سب سے پہلے ہندوستانی ہیں جو ملک معظم کی پریوی کونسل کے ممبر مقرر ہوئے۔ سید امیر علی اَوَدھ کے مشہور قصبہ موہان کے رہنے والے تھے، آپکے والد محترم کا اسم گرامی

سید سعادت علی تھا۔ آپ ۱۶ر اپریل ۱۸۴۹ء کو پیدا ہوئے۔ ہگلی کالج میں تعلیم پائی اور ۱۸۷۳ء میں بیرسٹر ہوئے۔ ۱۸۷۳ء سے ۱۸۷۸ء تک پریسیڈنسی کالج کلکتہ میں محمدن لا کے اُستاد رہے۔ ۱۸۷۹ء میں شاہانِ اَودھ کے متعلق تحقیقات کی جو کمیٹی بنی تھی اُس کے رُکن مقرر ہوئے۔ ۱۸۷۸ء سے ۱۸۸۳ء تک بنگال کی مجلسِ مُقنّنہ کے اور ۱۸۸۳ء سے ۱۸۸۵ء تک امپیریل کونسل کے ممبر رہے۔ ۱۸۹۰ء سے ۱۹۰۴ء تک کلکتہ ہائی کورٹ کی ججی پر فائز رہے۔ اِس کے بعد پریوی کونسل کے رُکن بنائے گئے۔ آپ کو کیمبرج یونیورسٹی سے ایل ایل ڈی کی، کلکتہ یونیورسٹی سے ڈی ایل کی اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ڈی لٹ کی آنریری ڈگریاں ملی تھیں۔

مرحوم کے انتقال نے ہندوستان کو اس کے ایک لائق فرزند سے محروم کر دیا۔ سید صاحب موصوف نے ہندوستان اور مسلمانوں کی جو خدمات انجام دی ہیں، وہ تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ جلی قلم سے ثبت رہیں گی۔ مسلمانوں کے مصائب و آلام کی سرگزشتیں سُن کر جو روحانی صدمہ مرحوم کے دل کو پہنچتا تھا، اُس کا ثبوت وہ مساعی ہیں، جو مرحوم نے جنگ طرابلس، جنگ بلقان اور جنگ یونان کے مواقع پر مظلوم ترکوں کی مدد و حمایت کے لیے کیں۔ ملت فروشی اور خوشامد کے بدنما داغوں سے محفوظ رہ کر اس عظیم المرتبت عہدہ پر پہنچنا صرف سید مرحوم کا کام تھا، اور اپنی علمی لیاقت کی بنا پر اُنھوں نے اس قدر اعزاز حاصل کیا تھا۔

مرحوم کے احسانات مسلمانوں پر اس قدر ہیں کہ ان کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ آج یورپ میں اسلام کے ساتھ جس رواداری اور حُسنِ سلوک کا برتاؤ کیا جا رہا ہے، وہ محض آپ کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ مجاہدین ریف کی حمایت میں آپ نے کئی زبردست مقالے سپردِ قلم فرمائے، جنھوں نے انگلستان کے متعصب دماغوں کے نظریوں کو قطعاً تبدیل کر دیا۔ سرزمینِ اناطولیہ میں یونانی درندوں کی بربریت اور بہیمیت کے خلاف مرحوم نے اپنا پورا زورِ قلم دکھا دیا۔ اور ثابت کر دیا کہ ترک محض بے گناہ ہیں۔ اِن مضامین نے ایک تہلکہ برپا کر دیا، اور ایم وینیزیلاس نے خود حاضر ہو کر پچاس ہزار پونڈ کی گراں قدر رقم پیش کی کہ یونان کے خلاف مضامین لکھنے سے باز رہیں، لیکن ضمیر اور ایمان فروشی اس مجاہد ملت کے مسلک میں کس طرح جائز ہو سکتا تھا۔

مرحوم نے کئی بلند پایہ اور بیش قیمت تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں، جن میں "اسپرٹ آف اسلام" اور "شارٹ ہسٹری آف دی سارا سنز" خاص طور پر مشہور ہیں۔ خداوند کریم مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عنایت فرمائے۔

مولوی انشاء اللہ خاں اڈیٹر وطن ان ہستیوں میں سے تھے، جنھوں نے مُسلمانانِ ہندوستان کو اُن کے بیرونی

بھائیوں کی حالت اور کیفیت کی طرف سے ہوشیار کر دیا۔ ان کی تحریک سے پیشتر ہندی مسلمان عام طور پر اس سے قطعی ناواقف تھے کہ ہندوستان سے باہر ترکوں اور ایرانیوں کی مسلمان قومیں بھی آباد ہیں۔ مرحوم نے اسی غرض کی تکمیل کے لیئے "وطن" جاری کیا، جو اُردو کے اولین صحائف میں شمار ہوتا ہے۔ اُنھوں نے خود اعلیٰ معلومات بہم پہونچائیں، اور ملک کو بھی اس کی غفلت اور نیند سے بیدار کر دیا، مسلمانانِ ہند کے دلوں میں عالمگیر اخوتِ اسلامی کے صحیح جذبات پیدا کرنا صرف مرحوم کا کام تھا۔ اُنھوں نے سلطنت علیہ عثمانیہ کی کئی مستند تاریخوں کا ترجمہ کیا، خود مسلمانانِ عالم کی عام حالت کے متعلق کئی کتابیں تصنیف کیں، جنھوں نے ملتِ اسلامیہ کے شیدائیوں کے دلوں میں حریت و قوم پرستی کے پاکیزہ جذبات کی ایک لہر دوڑا دی۔ افسوس کہ ستمبر کے آخر ہفتہ میں اس زبردست ہستی نے بھی ہمیں داغِ مفارقت دے دیا۔ ہماری دلی دعا ہے کہ خدائے توانا ان کی قایم کردہ تحریک کو قوی سے قوی تر بنائے، اور مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ عنایت فرمائے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

انیس الدین احمد رضوی ایم اے (علیگ)
اڈیٹر

گزارشِ احوالِ واقعی

آج سے پیشتر بھی اس حقیقت کا کئی مرتبہ اظہار کیا جا چکا ہے کہ میگزین طلبا، اور صرف طلبا، کا ہے، اس کے صفحات طلبا، کے رشحاتِ قلم کے لیئے محفوظ ہیں، اور اس کا مقصدِ اجرا، کلیتہً یہی ہے کہ طلبا، اس کے وسیلے سے دنیائے ادبیات میں روشناس ہوں۔ میگزین کے ہر مدیر نے یہی اعلان کیا ہے، اور آج پھر اسی کو دہرایا جا رہا ہے۔ لیکن ہمیں انتہائی افسوس ہے کہ باوجود اس قدر یاددہانیوں کے، اس قدر اصرار کے، میگزین کی طرف کوئی توجہ نہیں کی جاتی، اور اُس کو "تنگیٔ دامن" کے بجائے ہمیشہ "بے نیازی" کا شکوہ رہتا ہے۔

ایسی حالت میں غریب مدیر کو "اپنوں" کی طرف سے مایوس ہو کر دوسری طرف دستِ سوال دراز کرنا پڑتا ہے برضا و رغبت نہیں، بلکہ طوعاً و کرہاً، جبراً و قہراً۔ کاش کہ کسی صورت سے آپ کا واحد مجلّہ آپ کی توجہات کو اپنی طرف منعطف کرا سکتا۔ خود ہی فرمائیے، کیا کوئی ایسی صورت ممکن ہے؟

بعض کرم نما یہ خیال بھی ظاہر فرماتے ہیں کہ طلبا، کا اکثر و بیشتر حصّہ میگزین کی خدمت (یا میگزین نوازی) کے لیئے تیار ہے، لیکن خلقت و فطرت اس کو سرِ میدان لانے سے روکتی ہے۔ ایسی حالت میں ہماری صرف اتنی گزارش ہے کہ اگر بوجوہات خود زحمت فرمانا گوارا نہیں، تو گورنمنٹ برطانیہ نے ڈاک کا سلسلہ بھی قایم کر دیا ہے۔

"تعطیلات نمبر" آپ کے سامنے ہے، خود ہی ملاحظہ فرمایئے کہ آپ کا اس کی ترتیب و تدوین میں کس قدر حصّہ ہے۔ لیکن کیا کیا جائے، مجبوری کی بنا پر مرتب غریب کو باہر والوں کے مضامین سے ہی تمام میگزین کو بھرنا پڑتا ہے۔ پھر انصاف فرمایئے، یہ الزام کہاں تک درست ہے کہ میگزین طلبا، کے مضامین سے بالکل معرّا رکھا جاتا ہے؟

چساں آدابِ محفل را نگہ دارند می سوزند
مپرس از ما شہیدانِ نگاہ بر سرِ راہے

انیس الدین احمد رضوی
اڈیٹر

نمبر ۸ ایس۔ ایس۔ ایسٹ
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مسئلۂ شرقیہ

(از انیس الدین احمد رضوی، ایم۔اے (علیگ)

مشرق قریبہ کا لاینحل مسئلہ ایک نامعلوم مدت سے دول یورپ کے سامنے درپیش ہے حقیقت اور ماہیت کے لحاظ سے اِس مسئلہ میں بہت کم تغیّر و تبدّل ہوا ہے۔ صدہا برس پیشتر اس خطۂ زمین کی بابت جو سوال درپیش تھا، آج بھی اسی شکل میں مدبّرین یورپ کو پریشان کر رہا ہے۔ یورپ کے جنوب و مشرقی گوشہ میں مشرق اور مغرب کے عادات و اطوار، خیالات و معتقدات کے تصادم سے یہ مسئلہ معرضِ وجود میں آیا۔ اس کی نوعیت میں تو کوئی فرق پیدا نہ ہونے پایا، لیکن زمانہ کے ساتھ ساتھ مختلف قوموں کے عروج و زوال کی وجہ سے یہ مسئلہ بھی مختلف شکلیں اختیار کرتا رہا۔ زمانۂ تاریخ کی ابتدا میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایران اور قدیم یونان کی آویزش کی صورت میں رونما ہوا، اور میراتھن، تھرماپلی، اور سلامس کے بہادرانہ کارنامے آج تک اپنی یادگاریں چھوڑ رہے۔ قیاصرۂ روما کے زمانہ میں "مسئلۂ شرقیہ" قدیم یونانی سلطنتوں کی حدود جدِ آزادی میں مرکوز تھا۔ ازمنۂ وسطیٰ کے اوائل میں یہ مسئلہ اسلام اور مسیحیت کی کش مکش میں ظاہر ہوا، اور ارتقائی مدارج طے کرنے کے بعد طورز (Tours) کی جنگِ عظیم (۷۳۲ء) میں اپنی حدِ کمال کو پہونچ گیا۔ چند صدی بعد یورپ کے مذہبی جوش نے اس کش مکش کو جنگ ہائے صلیبی کی صورت میں ازسرِ نو تازہ کر دیا۔ اس تحریک مذہبی کے اغراض و مقاصد خواہ کسی قدر مختلف الانواع تھے، لیکن فی الحقیقت اس میں بھی ہلال و صلیب کی وہی دیرینہ رقابت مضمر تھی فلسطین کی سرزمین، جس پر توحید کے پرستار قابض و متصرّف تھے، تثلیث پرستوں کے نزدیک حضرت مسیح کی دنیاوی زندگی کے اعتبار سے انتہائی مقدس اور متبرک تھی، اور اس سرزمین پر، جسے مسیحیت کا گہوارہ ہونے کا فخر حاصل تھا، "کفّار" کا قبضہ کسی طرح گوارا نہیں کیا جا سکتا تھا۔

"مسئلۂ شرقیہ" کی کسی صحیح اور قابل تسلیم تعریف تک پہونچنا بہت مشکل ہے۔ سیاسیاتِ انگلستان کی لغت میں جنگِ لیپانٹو (۱۵۷۱ء) کے وقت سے اس جملہ کا کچھ خفیف سا پتہ ملتا ہے، لیکن حقیقتاً صحیح معنی میں یہ جملہ صرف بغاوتِ یونان

کے زمانہ (۱۸۲۱ء ۱۸۲۹ء) سے داخل ہوا۔ یورپ کے مدبرین اور ماہرین سیاست نے "مسئلۂ شرقیہ" کی مختلف تصریحات کی ہیں۔ لارڈ مارلے کا قول ہے کہ:۔

"متضاد مفادات، متخاصم اقوام، اور مختلف مذاہب کی وہ تغیر پذیر لاینحل اور پیچیدہ بھول بھلیاں ہے، جو مسئلۂ مشرق کے بظاہر معمولی نام میں پوشیدہ ہے۔"

ایک مشہور فرانسیسی مصنف، موسیو ڈریالٹ کے نزدیک مسئلۂ مشرق صرف

"اسلام کی سیاسی طاقت کی تباہی کا مسئلہ"

ہے، لیکن یہ تعریف غیر ضروری طور پر وسیع معلوم ہوتی ہے۔ شاید سب سے زیادہ صحیح توضیح ڈاکٹر ملر نے کی ہے۔ اِس کا قول یہ ہے کہ:۔

"یورپ سے سلطنت عثمانیہ کے رفتہ رفتہ غائب ہوجانے کی وجہ سے جو خلا پیدا ہو رہا ہے، اُس کو پُر کرنے کے مسئلہ کا نام مسئلۂ مشرق ہے۔"

زیادہ تصریح کے لیئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسئلۂ مشرق میں حسب ذیل اُمور شامل ہیں:۔

(۱) ترکوں نے جب سے چودھویں صدی عیسوی کے وسط میں دردانیال کو عبور کیا، یورپ کی تاریخ میں کیسا حصّہ لیا۔

(۲) ریاست ہائے بلقان کی حیثیت۔ (الف) جو عثمانی تلاطم کے فرو ہونے کے بعد رفتہ رفتہ دوبارہ نکلتی رہیں، مثلاً یونان، سرویہ، بلغاریہ، اور رومانیہ۔ (ب) یا جو پورے طور سے کبھی مُطیع و منقاد نہ ہونے پائی تھیں، مثلاً مانٹی نگرو۔ (ج) یا جن کا آسٹریا نے الحاق کرلیا، بوسینیہ، ہرزیگوینیہ، ٹرانسلوینیہ، اور بکووینہ۔

(۳) بحیرۂ اسود کا مسئلہ، وہاں سے باہر جانے اور اندر آنے کا راستہ، باسفورس اور دردانیال پر تصرف، اور ان سب سے بالاتر قسطنطنیہ پر قبضہ کا اہم سوال۔

(۴) یورپ میں روس کی حیثیت، بحیرۂ روم کی طرف اس کا قدرتی رُجحان، آبنائے جات میں سے مستقل راستہ حاصل کرنے کے لیئے اس کی مساعی، اِس کے تعلقات اپنے ان ہم مذہبوں سے، جو سلطان المعظم کے زیر حکومت ہیں، اور بالخصوص سلافی قومیت میں شامل ہیں۔

(۵) سلطنتِ آسٹریا ہنگری کی حیثیت، اور بالخصوص بحیرۂ ایجین تک پہونچنے کے لیئے اس کی جد و جہد، اس کے تعلقات ایک طرف صوبہ جات دلماشیہ، بوسینیہ، ہرزیگوینیہ، اور ان کے علاوہ سرویا اور مانٹی نگرو کی سلافی اقوام سے اور دوسری طرف ٹرانسلوینیہ اور بکووینہ کے رومنوں سے۔

(۶) ان متذکرۂ بالا اُمور و مسائل کی طرف دول یورپ اور بالخصوص انگلستان کا طرزِ عمل۔

اِس تصریح سے معلوم ہوا کہ اس مسئلہ میں سب سے مقدم اور اہم عنصر یورپ کے جسم میں ایک اجنبی مادّہ کی موجودگی ہے اور وہ اجنبی مادّہ ترکانِ آلِ عثمان ہیں۔ اقوامِ یورپ سے مذہب، قومیت، زبان، عادات و اطوار اور سیاسی معتقدات میں خلاف رہ کر ترکوں سے پانچ صدی سے زائد تک دول یورپ کے سامنے ایک ایسا مسئلہ پیش کیا، جو کبھی اندوہگین، کبھی خوش آیند، کبھی مضحکہ خیز، لیکن ہمیشہ لاینحل اور پریشان کُن رہا۔ ایک خانہ بدوش قوم کا اناطولیہ میں آباد ہونا، دردانیال کو عبور کرکے یورپ کی سرزمین کو اپنی فتوحات کا آماجگاہ بنانا، جزیرہ نمائے بلقان اور حکومت سردیہ کو رفتہ رفتہ فتح کرنا، اور آخر میں قسطنطنیہ پر کامیاب حملہ کرکے مشرقی روما کی سلطنت کو تہ و بالا کرڈالنا، تاریخ آلِ عثمان کے اوّلین صفحات ہیں۔

قسطنطنیہ کی فتح کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ عثمانیوں نے بحیرۂ روم کے تمام مشرقی علاقہ، یعنی مجمع الجزائر یونان، شام مصر، اور شمالی افریقہ، کی فتح کے لیئے بڑھنا شروع کیا، اُنھوں نے اپنی طاقت کا انتہائی عروج حیرت انگیز تیزی اور سرعت کے ساتھ حاصل کرلیا، یہاں تک کہ سولھویں صدی ختم ہونے سے قبل وہ اس حد تک پہونچ چکے تھے۔ اس کے بعد زمانۂ زوال شروع ہوتا ہے۔ سلطان سلیمان اعظم کا دورِ حکومت (۱۵۲۰ء تا ۱۵۶۶ء) عام طور پر عثمانی عظمت و شان کا نصف النہار مانا جاتا ہے، لیکن انحطاط کے آثار و قرائن اس زمانہ میں ہی شروع ہوگئے تھے، اگرچہ صاف طور پر نمایاں نہ ہونے پائے تھے۔ سلطانِ اعظم کی وفات سے پانچ برس کے اندر ہی خلیج لیپانٹو کی بحری شکست (۱۵۷۱ء) نے دنیا کی متحیر نظروں پر صاف ظاہر کردیا کہ ترکوں کی سرگرمی اور بحری قوت تنزل پذیر ہوچکی ہے۔

خشکی پر ترکوں کا اقبال آیندہ صدی تک اور قایم رہا۔ لیکن جو فتوحات ترکوں کو اس زمانہ کے بعد حاصل ہوئیں، ان میں سلاطین کا کوئی حصہ نہ تھا۔ سترھویں اور اٹھارھویں صدی کے سلاطین میں سے کسی نے تاریخ کے صفحات پر کوئی نام نہ چھوڑا۔ وہ صرف حرم کے دلدادہ تھے، اور حرم کے سوا دنیا و مافیہا سے غرض نہ رکھتے تھے۔ سترھویں صدی میں

البانوی خاندان کوپریلی کی بدولت ترکی عروج و اقبال کا عارضی احیار ہوا، لیکن یہ احیار کسی قوی بنیاد پر قایم نہ تھا۔ اور صدی ختم ہونے سے پیشتر ہی اس کی بے ثباتی ظاہر ہونے لگی۔ جنگ تیس سالہ (۱۶۱۸ء تا ۱۶۴۸ء) کے دوران میں عیسائیوں کی خانہ جنگی اور باہمی آویزش سے مسلمانوں کا کوئی فائدہ نہ اُٹھانا ہی اس بات کا بیّن ثبوت تھا کہ ان میں پہلا سا جوش اور ولولہ باقی نہیں رہا۔ لیکن ان سب سے زیادہ معنی خیز وہ شکستیں تھیں، جو ترکوں کو اُٹھانا پڑیں۔ سینٹ گاتھرڈ کی مشہور لڑائی (۱۶۶۴ء) میں مانٹی کوکولی نے یہ ثابت کردکھایا کہ خشکی پر بھی ترکی قوت ناقابلِ تسخیر نہیں رہی، جس طرح کہ ڈان جان نے ایک صدی قبل لیپانٹو پر بحری طاقت کی عظمت و شان کا پول کھول دیا تھا۔

بیس برس بعد وزیر اعظم قرہ مصطفےٰ پاشا فتح مند ترکی افواج کو لے کر اُٹھا، اور وائنا کی دیواروں سے جا ٹکرایا، لیکن جان سوبیسکی، شاہِ پولینڈ نے یہ شکار اس کے ہاتھ سے چھین لیا، آسٹروی دار الحکومت کو ترکوں کے پنجہ سے بچالیا، اور اس عفریت کو دور کردیا جو عرصہ سے یورپ کے سر پر مسلط تھا۔

اس سال (۱۶۸۳ء) کے بعد ترکوں کی طرف سے دُنیائے مسیحیت کے لیئے کوئی خطرہ نہ رہا۔ شمال میں آسٹریا نے اُن کو پے درپے کئی ہزیمتیں دیں، اور جنوب میں اہلِ وینس (بندقیہ) نے جزیرہ نمائے موریہ پر قبضہ کرلیا۔

درآں حالیکہ ترکوں کا قدیم حلیف فرانس مغربی یورپ کی سیاسیات میں اس قدر اُلجھا ہوا تھا کہ انکی کچھ مدد نہ کرسکا۔ معاہدۂ کارلووٹز (۱۶۹۹ء) جو آسٹریا اور ٹرکی کے مابین طے پایا، اور معاہدۂ ازدف (۱۷۰۲ء) جو روس کے ایما سے تحریر ہوا، اس بات کا بیّن ثبوت تھے کہ پانسہ اب قطعی طور پر پلٹ چکا ہے۔ ڈھائی سو سال تک عثمانیوں نے عالمِ عیسائیت کے لیئے تازیانہ کا کام دیا، اور یورپ کی سلطنتوں کے قیام و بقا کو سخت خطرہ میں ڈال دیا تھا۔ لیکن یہ خطرہ اب ہمیشہ کے لیئے دُور ہو چکا تھا، جان سوبیسکی کی شاندار مہم فیصلہ کُن تھی۔ مُسلمانوں کی فاتحانہ پیش قدمی رُک چکی تھی، اور اس طرح مسئلۂ مشرق کا پہلا دور ختم ہوا۔

دوسرا دَور پہلے سے کم خطرناک، لیکن زیادہ تشویش انگیز ثابت ہوا۔ اٹھارھویں صدی کے اوائل سے ہی دولِ یورپ کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ ”مردِ بیمار“ کی رحلت پر کیا کیا خوفناک نتائج برآمد ہونگے، اور اس کی وراثت کی تقسیم کس طرح ہوگی۔ تقریبًا دو سو برس تک لوگوں کا یہ خیال رہا کہ دولِ عظمیٰ میں سے کوئی ایک یا کئی اس وراثت کے حقدار ہونگے۔ لیکن اس کا کبھی وہم و گمان بھی نہ تھا کہ وہ قومیں، جو اس سرزمین میں بود و باش رکھتی ہیں، کبھی آیندہ چل کر اس ملک کی قسمت کے فیصلہ پر اپنا اثر ڈال سکیں گی۔ اسپین کے وزیر اعظم البیرونی کے زمانہ سے ہی ترین

یورپ نے سلطنتِ عثمانیہ کی تقسیم کے متعلق متعدد نقشے تیار کر لیئے تھے، لیکن ان نقشوں میں بھی ان اقوام کے حقوق کو قطعی نظر انداز کر دیا گیا تھا، جو وہاں آباد تھیں۔ ان اقوام کا کوئی ذکر نہ ہونا تعجب کی بات بھی نہیں۔ پندرھویں صدی کے شروع سے انیسویں صدی تک یورپ میں بہت کم لوگ یہ جانتے تھے کہ بلغاری، سلافی، رومن، اور یونانی کون ہیں، اور کہاں رہتے ہیں۔ لہٰذا مشرقِ قریبہ کا مسئلہ باشندگانِ بلقان سے نہیں، بلکہ دولِ یورپ اور بالخصوص روس سے تعلق رکھتا تھا۔

مسئلہ مشرق کا دوسرا دور (۱۷۰۲ء تا ۱۸۴۰ء) تقریباً بالکل روس اور ٹرکی کے تعلقات پر مشتمل رہا۔ آسٹریا بھی کبھی کبھی اس اسٹیج پر نمودار ہوا، لیکن ہمیشہ روس کے حلیف کی حیثیت سے اور اٹھارھویں صدی کے ساتھ ساتھ اس کی پیش قدمی بھی کم ہوتی گئی۔ پیٹر اعظم سے الکزانڈر اوّل کے زمانہ تک فرانس کے علاوہ تمام دولِ یورپ اس کو تسلیم کرتی رہیں کہ مشرقِ قریبہ کی تقسیم میں روس کا معتدبہ حصہ ہونا چاہیئے، حالانکہ روس یورپ کے متمدن ممالک کی صف میں سب سے آخر میں داخل ہوا تھا، روس نے دولِ مغرب کو اپنی طاقت منوانے سے قبل ہی بحیرۂ اسود کی طرف پیش قدمی شروع کر دی تھی۔ ۱۷۷۴ء تک اس نے اپنا قبضہ اس اندرونی سمندر پر بخوبی جما لیا تھا، اور بحیرۂ روم تک پہونچنے کی تدابیر پر غور کر رہا تھا۔ کوچک کینارجی (۱۷۷۴ء) کے صلح نامہ کی رو سے اسے نہ صرف یہ حق حاصل ہو گیا کہ آیندہ بھی بلقان کے معاملات میں دخل اندازی کر سکے، بلکہ قسطنطنیہ میں اس نے اپنا مستقل سفارت خانہ بھی قایم کر لیا، جَسّی (۱۷۹۲ء) اور بخارسٹ (۱۸۱۲ء) کے صلح ناموں نے اسے دو قدم اور آگے بڑھا دیا، لیکن اس وقت تک اس مسئلہ کے حل میں اور قومیں بھی دلچسپی لینے لگی تھیں۔

فرانس نے بحیرۂ روم میں اپنے مفاد کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ ۱۵۳۵ء کی "مراعات" کے ذریعہ سے فرانسس اوّل شاہ فرانس نے سلیمانِ اعظم سے مصر میں تجارت کرنے کے لیئے کافی مراعات حاصل کر لی تھیں۔ ۱۷۳۸ء میں ڈی آرگنسان نے خاکنائے سویز میں ایک نہر نکالنے کی تجویز شائع کی، اور اسی کے ساتھ فرانسیسی تجار اور مدبرین کے ذریعہ سے مصر میں سیاسی انتظام اور تجارتی کاروبار قایم کرنے کی اسکیم پیش کی۔ ان واقعات کی وجہ سے کیتھرائن دوم (روس) اور شہنشاہ جوزف (آسٹریا و جرمنی) نے دولت علیہ عثمانیہ کے حصے بخرے کرنے کے جو نقشے مرتب کیئے، ان میں فرانس کے مفاد کا خیال رکھا، اور مصر اور شام کے صوبے فرانس کے حصّہ میں تجویز ہوئے۔

لیکن جس شخص نے اہلِ فرانس کی توجہ مسئلہ مشرق کی زبردست اہمیت کی طرف خاص طور پر منعطف کی وہ نپولین تھا۔ جزائر آئی اونین کا الحاق، مصر اور شام کی مہم، برطانی ہند پر حملہ کی عظیم الشان اسکیم، اور سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کے لیئے زار الکزانڈر سے نامۂ و پیام ——— ان تمام واقعات نے مل کر فرانسیسی مدبرین اور تجار کے دماغوں میں ایک ہیجان بپا کر دیا۔

اور صرف فرانس میں ہی نہیں۔ نپولین اگر فرانسیسی مدبرین کے لیئے زبردست معلّم کی حیثیت رکھتا تھا، تو اس سے زیادہ وہ انگریزوں کے لیئے ثابت ہوا، انگریزی تاجرین دو صدی قبل سے ہی بحیرۂ ابیض کی تجارتی اہمیت کو تسلیم کیئے ہوئے تھے، لیکن مدبرین اور ماہرین سیاست حیرت انگیز طریقہ پر اس بات کو سمجھنے سے قاصر تھے کہ سلطنت عثمانیہ کے وقائع و حوادث انگلستان کے لیئے بھی کوئی سیاسی اہمیت رکھتے ہیں۔ اٹھارھویں صدی کے انگریزی سیاست داں ترکوں کے انحطاط اور روس کی پیش قدمی کو یکساں طور پر بے توجہی سے دیکھتے تھے۔ البتہ ولیم پٹ ثانی ان میں سب سے پہلا اور واحد شخص تھا، جس نے اس مسئلہ مشرق سے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا۔ اس کی دوربین نظروں نے صاف اندازہ لگا لیا کہ اس مسئلہ کا حل انگلستان کے لیئے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس کا سب سے پہلا سیاسی کارنامہ، یعنی ۱۷۸۸ء کا اتحاد ثلاثہ، دراصل مشرقِ قریبہ میں روس کی پیش قدمی روکنے کی غرض سے تھا۔ لیکن اس کے ہم عصر مدبرین اس کی رائے کے موافق نہ تھے۔ انگلستان کے بہت کم وزراء نے دار العلوم میں ولیم پٹ کا سا اقتدار اور اعتبار حاصل کیا ہوگا، لیکن جب اس نے ۱۷۹۱ء میں روس کے خلاف بحری مظاہرہ کی تجویز پیش کی ہے، تو اسے ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا۔ اس کے برخلاف انگلستان کے حریف ان باتوں کو خوب سمجھے ہوئے تھے۔ نپولین کا قول تھا کہ:۔

"ہمیں انگلستان فتح کرنے کے لیئے سب سے پہلے مصر پر قبضہ کرنا چاہیئے۔"

یہی وجہ ہے کہ سیاسی زندگی میں قدم رکھتے ہی جنرل بوناپارٹ نے جزائر آئی اونین کے حصول پر زور دینا شروع کیا۔ اِس نے ۱۷۹۷ء میں ہی کہہ دیا تھا کہ:۔

"کارفو، زنطہ، اور سفالونیہ، فرانس کے لیئے تمام اٹلی کی سلطنت سے زیادہ قیمتی ہیں، کیوں کہ یہ جزائر مصر تک پہونچنے کی پہلی سیڑھی ہیں، اور مصر، ہندوستان کی شاہراہ پر ایک منزل ہے۔"

ان واقعات کی بنا پر فرانسیسیوں کا میلان قدرتی طور پر مصر کی طرف زیادہ ہوگیا، صرف اسی وجہ سے نہیں کہ مشرقِ قریب میں

فرانس کی تجارتی مفاد کی نگرانی کی جائے، بلکہ زیادہ تر اس غرض سے کہ مشرقِ بعید میں انگلستان کے اقتدار کو خطرہ میں ڈال دیا جائے۔ فرانسیسی حالانکہ اس سے پیشتر بھی اس نظریہ پر قایم تھے، مگر نپولین نے آکر ان میں عملی جدو جہد کی روح پھونک دی اور ان کے تخیلات میں ازسرِ نو جان ڈال دی۔ ان واقعات کے باوجود بھی بحیرۂ ابیض کی اہمیت پر غور کرنے کے لیئے انگریزوں کی آنکھیں پوری طرح نہ کھلیں، وہ ٹرکی کے انحطاط، روس کی پیش قدمی، اور فرانس کی حریصانہ خواہشات کو مقامی سیاسیات سے ہی متعلق سمجھتے رہے البتہ ۱۸۲۱ء میں بغاوتِ یونان کے بعد انگریزی وزارتِ خارجہ نے مشرقی مسائل سے کچھ دلچسپی لینا شروع کی، حالانکہ انگریزی قوم پھر بھی بے خبر تھی۔

بغاوتِ یونان نے اپنی حیرت انگیزی کی وجہ سے تغافل پسند دماغوں کو بھی ہشیار کر دیا۔ بلغاریوں اور سرویوں کی طرح یونانی بھی چار سو برس سے زائد سے ترکوں کے زیر حکومت تھے۔ اس عرصہ میں ان کی کسی تحریک سے بیرونی دنیا کو یہ پتا نہ چل سکا کہ وہ ابھی تک قومی جذبات و احساسات رکھتے ہیں، کجا یہ کہ اپنی قومی آزادی حاصل کرنے کا خیال بھی ان کے دلوں میں جما ہوا ہے۔ ۱۸۰۴ء میں سرویہ میں ایک بغاوت ضرور ہوئی تھی، اور معاہدۂ بخارسٹ کی رو سے سرویوں کو حکومت خود اختیاری کی کچھ مراعات بھی حاصل ہو گئی تھیں، لیکن تمام بڑے بڑے شہروں میں ترکی افواج کی چھاؤنیاں قایم تھیں، اور سرویوں کا آزادی کی طرف کوئی قدم بڑھانا معلوم بھی نہ ہوتا تھا، اس کے علاوہ یورپ اس وقت نپولین سے دست و گریبان تھا، اور بلقانی معاملات اس کے مقابلہ میں مقامی حیثیت رکھتے تھے۔

لیکن یونان کی بغاوت بالکل دوسری قسم کی تھی۔ جس وقت الکزانڈر ہیپلانٹی نے صوبہ مالدیویہ میں آزادیِ یونان کا جھنڈا بلند کیا ہے، اور جس وقت یہ آگ صوبۂ موریہ تک پھیل گئی ہے، تو کند اور ماؤف دماغوں کو بھی اس کا یقین ہو گیا تھا کہ یورپ کی سیاسیات میں کسی نئی طاقت کا اضافہ ہو رہا ہے، اور ایک قدیم مسئلہ نئے دور میں داخل ہو رہا ہے۔ بغاوتِ یونان در اصل جذباتِ قومیت سے ایک اپیل کے مترادف تھی۔ پان ہیلنزم —— —— یا اہلِ یونان کا اتحاد و آزادی —— کا طغرا ان کے جھنڈوں پر تحریر تھا، گویا کہ کئی صدی بعد جزیرہ نمائے بلقان میں "قومیت" کا احیاء ہو رہا تھا۔ اس کے علاوہ اس زمانہ تک مسئلۂ مشرق کے معنی سلطنتِ عثمانیہ کے عروج یا زوال کے لیئے جاتے تھے، اس کو ٹرکی اور آسٹریا یا وینس کی لڑائی کے مرادف سمجھا جاتا تھا، آخر میں آ کر یہ معانی صرف سلطان اور زار کی آویزش میں مرکوز ہو گئے تھے۔ لیکن اس زمانہ کے بعد سے یہ مسئلہ روس

اور انگلستان کی کوششوں کی وجہ سے بین الاقوامی سمجھا جانے لگا۔

بغاوتِ یونان نے جب زیادہ طاقت حاصل کرلی، اور ترکی افواج اس کو فرو کرنے سے عاجز رہیں، تو سلطان محمود خان ثانی نے مصر کے گورنر محمد علی پاشا کو اپنی مدد کے لیئے طلب کیا۔ محمد علی پاشا نے اپنے بیٹے ابراہیم کی سرکردگی میں مصری فوج اور بیڑہ ارسال کردیا، جس نے موریہ پہونچتے ہی بغاوت کے فتنہ سامان شراروں کو دبادیا اور ملک میں کسی حد تک امن و امان ہوگیا۔ لیکن انگلستان اور فرانس اپنے ہم مذہب بھائیوں کی اس ذلت و ناکامی کو کس طرح گوارا کرسکتے تھے۔ ان کے متحدہ بیڑے نے، جو پہلے ہی سے اس انتظار میں تھا، ۲۰ راکتوبر ۱۸۲۷ء کو جب مصری اور ترکی افواج موریہ کے انتظام و انصرام میں مشغول اور بیڑہ کی حالت سے بے خبر تھیں، خلیج نوارینو میں مصری بیڑہ پر یکایک حملہ کرکے تباہ و برباد کرڈالا۔ اب روس نے، جو ہمیشہ ایسے مواقع کی تاک میں رہتا تھا، یہ دیکھ کر کہ ۱۸۲۶ء میں افواج ینگچری کے قتلِ عام کے بعد سے ترکی میں افواج کی قلت ہے، اور اُدھر نوارینو کے وحشتناک واقعہ سے ترکوں اور مصریوں کو کافی نقصان پہونچ چکا ہے، فوراً بابِ عالی کے سامنے اپنے مطالبات پیش کردیئے اور ۱۸۲۸ء میں اعلانِ جنگ بھی کردیا۔

ترکی افواج نے باوجود قلت اور ناتجربہ کاری کے اس قدر حیرت انگیز جرأت اور بہادری کا ثبوت دیا کہ تمام یورپ انگشت بدنداں رہ گیا، لیکن پھر بھی شیر اور بکری کا مقابلہ تھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورے دو سال کی سخت مہموں کے بعد روسی افواج کوہ بلقان کو عبور کرکے اڈریا نوپل میں داخل ہوگئیں۔ معاہدۂ اڈریا نوپل (سنہ ۱۸۲۹ء) روس کی زبردست سیاسی فتح تھی، جس نے تمام دول یورپ کو چونکا دیا۔ بقول ڈیوک آف ولنگٹن وزیر خارجہ انگلستان :۔

"اس معاہدہ نے یورپ میں ترکوں کو موت کا پروانہ دے دیا"

روس نے اس قدر اختیارات حاصل کرلیئے تھے کہ آیندہ کے لیئے ہمیشہ دولتِ عثمانیہ کے اندرونی معاملات میں بھی دخل اندازی کا حقدار ہوگیا تھا اور سلطان المعظم کی عیسائی رعایا کی نگرانی بھی اسی کے ہاتھ میں تھی۔ لیکن صلح نامہ نے انگلستان اور فرانس کو ہشیار کردیا، اور روس کی ان ریشہ دوانیوں کا توازن قایم رکھنے کے لیئے اُنھوں نے معاملاتِ یونان میں دخل اندازی شروع کردی، اور دولتِ علیہ سے نامہ و پیام کا سلسلہ جاری کردیا۔ بالآخر ۱۸۳۲ء

میں لندن کانفرنس کے ذریعہ سے یہ قضیہ نامرضیہ طے ہوا، اور انگلستان، فرانس، اور روس کی سرپرستی میں یونان کو ایک خود اختیار حکومت مان لیا گیا۔

اس طرح مسئلہ شرقیہ کا تیسرا دَور شروع ہوا، لیکن اس کا دوسرا باب دولت ترکیہ کے لیئے اس سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہوا۔ محمد علی پاشا، والیٔ مصر، یونان کی بغاوت کو فرو کرنے میں یقینی کامیاب ہوجاتا، اگر دولِ یورپ اس مستبدانہ طریقہ پر دخل در معقولات نہ دیتیں۔ ان تمام خدمات کے بعد جزیرہ کریٹ جو موعودہ انعام کا ایک حصہ تھا، اس کو نہایت ہی حقیر معلوم ہوا، اور اسی دوران میں اس کو سلطنتِ عثمانیہ کی اندرونی کمزوریوں کا احساس بھی بخوبی ہوچکا تھا، ان واقعات کو دیکھتے ہوئے اس نے یہ ارادہ کرلیا کہ ولایت شام حاصل کرکے مصر اور شام کی خود مختار حکومت قایم کرلے، اور اگر ممکن ہوسکے تو قسطنطنیہ سے قدیم خاندانِ عثمانی کے کمزور افراد کو برطرف کرکے دولت علیہ کا خود مالک بن بیٹھے۔ اپنی ان خواہشات کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے کے لیئے محمد علی نے دس برس (۱۸۳۱ء تا ۱۸۴۱ء) تک جوجد وجہد کی، اُس نے دولِ یورپ کو متواتر خطرہ میں مبتلا رکھا، اور سیاسیاتِ شرقیہ کی تاریخ میں ایک اور باب کا اضافہ کردیا۔

اپنی سلطنت کو محمد علی سے بچانے کے لیئے سلطان المعظم نے دولِ یورپ سے مدد واعانت کی درخواست کی، لیکن صرف روس نے اس صدا پر لبیک کہی، اور اپنی خدمات کے صلہ میں دولتِ عثمانیہ سے صلح نامۂ ہنکار اسکلہ سی (۱۸۳۳ء) پر دستخط کرا لیئے۔ اِس صلح نامہ کی شرائط نے روس کو باسفورس اور درِ دانیال کا تقریباً مختارِ کل بنا دیا۔ زار نے ہر موقع پر غیر محدود بری اور بحری مدد دینے کا وعدہ کیا، جس کے عوض میں سلطان نے آبنائے جات کو تمام اقوام کے جنگی جہازوں کے لیئے بند کردیا، درآں حالے کہ روس کے جہاز ہر وقت گزر سکتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ترکی سلطنت روس کی دست نگر بن کر رہ گئی ہے۔

اس وقت تک انگلستان نے روس کی جنوبی پیش قدمی کی طرف کسی حسد و رقابت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ کیننگ نے روس کا دوست ہوتے ہوئے بھی ٹرکی میں اس کے اثر و اقتدار کی افزایش کو روکنے کی کوشش کی، اور اپنی موت (۱۸۲۷ء) تک وہ کامیاب رہا۔ لیکن ہنکار اسکلہ سی کے معاہدہ نے اس کی کامیابیوں پر پانی پھیر دیا۔ روس نے سلطان المعظم کے یورپین مقبوضات پر گویا کہ ایک قسم کی فوجی نگرانی قایم کرلی تھی۔

ہنکار اسکلہ سی کے معاہدہ سے مسئلہ شرقیہ کے ارتقا میں ایک نئے دَور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس زمانہ سے لے کر

معاہدہ برلن (۱۸۷۸ء) تک روس اور انگلستان کی بڑھتی ہوئی بے اعتمادی اور مخالفت اس مسئلہ کا مقدم عنصر رہی۔ لارڈ پالمرسٹن نے، جو سیاسی نظریات میں ولیم پٹ اور کیننگ کا سچا جانشین تھا، سلطنتِ عثمانیہ پر روسی نگرانی کے خلاف اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا، اور تہیہ کر لیا کہ اس معاہدہ کو، جس میں یہ شرائط تحریر ہیں، موقع ملتے ہی پھاڑ کر پھینکیگا معاہداتِ لندن (۱۸۴۰ء و ۱۸۴۱ء) کے ذریعہ سے واقعی ہنکار اسکلہ سی کے معاہدہ کو منسوخ کر دیا گیا۔ ان معاہدات کی رُو سے دولتِ عثمانیہ پر تنہا روس کے بجائے تمام دولِ مغرب کی نگرانی منظور کی گئی، اور ۱۸۴۱ء کے بعد روس اپنے حقوق کو کامیابی کے ساتھ پھر کبھی پیش نہ کر سکا۔

آخر کار جنوب و مشرقی یورپ میں برطانیہ کے مفادات و مصالح کو روس نے بلا پس و پیش تسلیم کر لیا، اور زار نکولس اوّل نے باہمی سمجھوتہ کرنے کے لیئے دو مرتبہ بیکار کوشش کی۔ اُس نے اس نظریہ پر نامہ و پیام شروع کیا تھا کہ سلطنتِ عثمانیہ کا خاتمہ قریب ہے، اور ایسی حالت میں ان دولِ عظمیٰ کا، جو ان مسائل سے کچھ دلچسپی رکھتی ہیں، یہ فرضِ منصبی ہے کہ پیش تر سے ہی مملکت کی تقسیم کے لیئے مفاہمت کریں۔ لیکن برطانی مدبرین نے زار کی تشخیص کو ماننے سے انکار کر دیا۔ ان کی رائے میں "مردِ بیمار" کو دوبارہ صحت حاصل کر لینے کا ابھی موقع تھا، اور اس کی موت سے قبل ہی اس کی وراثت کو تقسیم کر لینا ان کے نزدیک سیاسی تہذیب اور اخلاق کے منافی تھا۔ بالخصوص لارڈ پالمرسٹن روس کے ارادوں پر قطعی اعتماد نہ رکھتا تھا، اور یقین کرتا تھا کہ سلطنتِ عثمانیہ عنقریب قوت و استحکام حاصل کر لیگی۔ ان وجوہات کی بنا پر روس کی پیش کردہ تجاویز کو ملامت کے ساتھ ٹھکرا دیا گیا، اور اس کی کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔

حالانکہ زار کی تجاویز انگریزی مدبرین کے اخلاقی اور سیاسی نظریات کے نزدیک لغو اور بیہودہ تھیں، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی اندرونی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ اگر بفرضِ محال ان کو عام طور پر قبول کر لیا جاتا، تو جنگِ کریمیا کبھی نہ ہوئی ہوتی، روس جزیرہ نمائے بلقان اور آبنائے جات پر قابض و متصرف نظر آتا، اور مصر اور کریٹ پر انگلستان کا پھریرا اڑ رہا ہوتا۔ اس وجہ سے برطانی پارلیمنٹ کا زار کی تجاویز پر غور کرنے سے انکار کر دینا بھی جنگِ کریمیا کی ایک وجہ مانی جاتی ہے۔

جنگِ کریمیا (۱۸۵۳ء تا ۱۸۵۶ء) نے مشرقِ قریبہ میں روس کی حریصانہ پالیسی کے خلاف ایک زبردست سدّ قایم کر دی۔ آج کل عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ کم از کم برطانی نقطۂ نظر سے یہ جنگ اگر جرم نہیں تو ایک خطرناک غلطی

ضرور تھی۔ اس خیال کا جواب دینے کے لیئے طولانی بحث کی ضرورت ہے، فی الحال اسی قدر کہہ دینا کافی ہے کہ جنگِ کریمیا نے ترکوں کو اس بات کا کافی موقع بہم پہونچا دیا کہ اپنی سلطنت میں نظام قایم کریں۔ روس کی طرف سے ان کو بیس برس تک کسی خطرہ کا اندیشہ نہ ہوا۔ لیکن واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ مملکت میں مختلف اصلاحات نافذ کرنے کا جوش زیادہ تر اپنی سلامتی اور حفاظت کی خاطر تھا۔ جب تک خطرہ رہا، اصلاحات کے نفاذ کا ولولہ بھی رہا۔ جب خطرہ دُور ہو گیا، تو پھر وہی بیخبری کا عالم تھا۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی یقینی امر ہے کہ خود دولِ یورپ اس کو کسی طرح گوارا نہیں کر سکتی تھیں کہ ترک اپنی اندرونی اصلاح کر کے ان کے ہم پلّہ اور مساوی ہو جائیں، اور اس غرض سے مختلف اندرونی سیاسی پیچیدگیاں پیدا کر کے ہمیشہ اصلاحات کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرتی رہتی تھیں۔

ٹرکی میں عیسائی رعایا کی حالت درست کرنے کے لیئے کوئی مفید کام انجام نہیں دیا گیا، اور اگر کچھ ہوا بھی تو بہت کم، اس وجہ سے اُنیسویں صدی کے آخر میں رعایا نے معاملات کو خود اپنے ہاتھ میں لینا شروع کر دیا۔ جزیرۂ کریٹ ۱۸۴۰ء سے متواتر بغاوت کی حالت میں تھا۔ ۱۸۷۵ء میں یہ بے چینی جزیرہ نما تک پھیل گئی۔ سب سے پہلے ہرزیگوینا میں نمودار ہوئی، اور وہاں سے نکل کر بوسینیہ، سرویہ، اور مانٹی نگرو کو آتش زار بنا دیا۔ اس سلافی بغاوت کی صدائے بازگشت مشرق میں بلغاریوں کی طرف سے بلند ہوئی، اور تمام جزیرہ نمائے بلقان اس آگ سے بھڑک اٹھا۔ ترکوں نے اس خطرناک بغاوت کو فرو کرنے کے لیئے اپنی فوجیں روانہ کیں، اور چند دولِ یورپ کی خفیہ امداد و اعانت کے باوجود باغیوں کو ہر جگہ شکست اُٹھانی پڑی، اور قلیل مدت کے اندر ہی بغاوت کا خاتمہ ہو گیا۔ لیکن حسب معمول یورپ کے ایوانات ترکوں کے نام نہاد ظلم و ستم کے خلاف فریاد و شیون کی فلک شگاف صداؤں سے گونج اُٹھے، اس کے علاوہ کچھ اپنے ہم مسلک بھائیوں کی ذلت و ناکامی نے دولتِ عُلیا کی طرف سے اہلِ یورپ کے غم و غصہ کا پارہ کئی ڈگری اوپر چڑھا دیا۔ پھر خاموش رہنے کی کون سی صورت تھی؟۔ لیکن باہمی رقابتوں نے دولِ یورپ کو مل کر کام نہ کرنے دیا اور ۱۸۷۷ء میں صرف روس کو اس کا انتقام لینے کے لیئے مجبور ہونا پڑا۔

ایک سخت اور فیصلہ کن مہم کے بعد جس میں شیرِ پلیونا غازی عثمان پاشا کا کارنامہ یادگار رہیگا، وہ قسطنطنیہ کے دروازوں پر آ پہونچا، اور ترکوں سے صلح نامۂ سان اسٹیفانو پر دستخط کرا لیئے۔ اس مشہور و معروف صلح نامہ کی شرائط نہ صرف آسٹریا اور برطانیہ، بلکہ یونانیوں اور سرویوں کے نزدیک بھی انتہائی غیر پسندیدہ تھیں کیوں کہ

مقدونیہ کا تمام علاقہ سلطنت بلغاریہ میں شامل کرکے ان دونوں قوموں کے حقوق کو پامال کردیا گیا تھا۔ اس وجہ سے برطانیہ نے مطالبہ کیا کہ یہ صلح نامہ دولِ یورپ کی کانگریس کے سامنے پیش کیا جائے، اور روس کو کافی حیل وحجت کے بعد سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔ اس کے بعد ۱۸۷۸ء میں پرنس بسمارک کی زیرِ صدارت برلن میں دوسرے معاہدہ کی شرائط طے پائیں، اور مسئلۂ مشرق کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

اس وقت تک یہ بات بخوبی واضح ہوچکی تھی کہ بلقانی اقوام کے حقوق کو نظر انداز کرکے مسئلۂ شرقیہ کا حل کسی طرح نہیں ہوسکتا۔ جزیرہ نمائے بلقان کی تمام اقوام کئی صدی تک عثمانی تلاطم کے اندر غرقِ آب رہیں، لیکن جب تلاطم فرو ہوا، تو رفتہ رفتہ ایک ایک کرکے اُبھرنے لگیں۔ یونان، رومانیہ، سرویہ، اور بلغاریہ کا دوبارہ ظہور پذیر ہونا اُنیسویں صدی عیسوی کی سیاسی تاریخ کے سب سے زیادہ حیرت انگیز اور سب سے زیادہ عجیب وغریب واقعات میں سے ہے۔ اس واقعہ نے مشرقِ قریب کے پیچیدہ مسئلہ میں "قومیت" کے نئے عنصر کا اضافہ کردیا، جو زبردست اہمیت کا حامل تھا۔ دولِ یورپ نے بھی اس عنصر سے اپنی ہمدردی کا ثبوت دینا شروع کیا۔ ۱۸۷۵ء سے ۱۸۷۸ء تک برطانی سرکاری طرزِ عمل سے ظاہراً یہ معلوم ہوتا تھا کہ اہلِ برطانیہ ترکی بدنظمی اور قدامت پسندی کے طرف دار تھے، حالاں کہ فی الحقیقت ایسا نہ تھا۔ لارڈ بیکنس فیلڈ کی پالیسی کے اغراض ومقاصد خواہ کچھ ہوں، لیکن ان کا اثر بلقانی اقوام کی رفتارِ ترقی پر بالکل نہ پڑسکا۔ کم از کم یونان اور سرویہ کو اس مدبّر کا منت گزار ہونا چاہیئے، جس نے صلح نامۂ سان استیفانو کو پھاڑ کر رکھدیا۔ اگر مقدونیہ سلطنتِ بلغاریہ کے ساتھ ملحق تسلیم کرلیا جاتا، تو ان دونوں کو اپنے حقوق سے بجبر واکراہ دست بردار ہونا پڑتا، اور ممکن ہے کہ یہ علاقہ خود بلغاریہ کے لیئے بجائے نفع بخش ہونے کے مضرت رساں ثابت ہوتا۔

۱۸۷۸ء کے بعد سے بلقانی اقوام نے میدانِ ترقی کی طرف تیزی سے قدم بڑھانا شروع کیا۔ لیکن اس عرصہ میں ایک نئی قوت نے جنوب ومشرقی یورپ کو اپنی توجہات کا آماج گاہ بنانا چاہا۔ سلطنت آسٹریا کے لیئے مشرقِ قریب کے واقعات کچھ اس درجہ اہمیت رکھتے تھے، کہ وہ کسی وقت بھی ان کی طرف سے غافل نہ رہ سکتی تھی۔ لیکن ۱۸۴۸ء اور ۱۸۶۶ء کے درمیان اسے اپنی کامل توجہ دوسری طرف منعطف کرنی پڑی۔ جنگِ کریمیا کے زمانہ میں اس نے انتہائی چالاکی اور ہشیاری سے کام لے کر غیر جانب دارانہ رویہ اختیار کیا، لیکن اس طرزِ عمل نے برطانیہ میں غم وغصہ کی لہر دوڑا دی۔ یہی وجہ ہے کہ آسٹریا کی آیندہ مصیبت سے انگریزوں نے کسی ہمدردی کا اظہار نہیں کیا۔ پرشا (جرمنی)

کی سلطنت بھی دوسری طرف مشغول رہی، اور جب تک پرنس بسمارک برسرِ اقتدار رہا، پرشیا نے مسئلہ مشرق سے کوئی دلچسپی ظاہر نہ کی۔

پرنس بسمارک اور قیصر ولیم ثانی کی پالیسیوں میں سب سے نمایاں فرق یہی تھا کہ قیصر نے تخت نشین ہوتے ہی مسئلہ مشرق میں پورے انہماک سے حصہ لینا شروع کیا۔ برلن اور وائنا، اور اُس سے زائد برلن اور بوداپسٹ، کے دوستانہ تعلقات کی استواری نے آخرکار قیصر کے دماغ کو اس طرف رجوع کیا۔ ۱۸۷۰ء میں جنگِ فرانس کے موقع پر آسٹریا نے اپنی غیر جانب داری قائم رکھی تھی، اور بسمارک نے ۱۸۷۸ء میں بوسینیا اور ہرزگوینیا آسٹریا کے حوالے کرکے اس احسان کا بدلہ اُتار دیا تھا، اِن واقعات نے دونوں سلطنتوں کے تعلقات کو خوش گوار بنا دیا، مگر اس جرنلے احسان نے پہلی مرتبہ برلن اور پیٹروگراڈ کے درمیان منافرت کی خلیج پیدا کردی۔ جب تک پرنس بسمارک جرمنی کے دفترِ خارجہ کا نگراں رہا، اِن دونوں دارالحکومتوں کے درمیان سلسلۂ اتحاد ٹوٹنے نہ پایا، لیکن اس کے جانشین قیصر ولیم کو آسٹریا اور روس میں سے کسی ایک کو انتخاب کرنا پڑا، اور اس نے عمداً اوّل الذکر کو ترجیح دی۔

اِس انتخاب نے مشرقِ قریبہ میں جرمنی کے طرزِ عمل کی تبدیلی لازم کردی۔ یہ صاف ظاہر تھا کہ آسٹریا بحیرۂ ایجین تک راستہ حاصل کرنے کے لیئے کوشاں ہے۔ جرمنی نے نہ صرف اس کے ان ارادوں کی تائید کی، بلکہ خود اپنے لیئے ایسی ہی تجاویز پر غور کرنے لگا۔ اگر آسٹریا کا مطمحِ نظر سالونیکا تھا، تو اُس کے حلیف کو قدرتی طور پر قسطنطنیہ، اور وہاں سے بغداد اور بصرہ، کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔ بسمارک ان عظیم الشان تجاویز پر غور کرنے سے بچتا تھا، لیکن قیصر ولیم کے دماغ کے لیئے ان کی اپیل ناقابلِ تردید تھی۔ اس بناء پر جرمنی نے ۱۸۹۰ء سے مشرقِ قریب کی سیاسیات میں پورے انہماک سے متواتر حصہ لینا شروع کردیا۔ ہر ممکن طریقہ سے ترکوں کی پشت پناہی کی جانے لگی، یہاں تک کہ ارمنی عیسائیوں کا قتلِ عام (۱۸۹۵ء) بھی برلن اور قسطنطنیہ کے خوش گوار تعلقات پر اثر انداز نہ ہوسکا۔ اُس وقت جب کہ تمام یورپ میں اس قتلِ عام کی خبروں سے اضطراب و بے چینی پھیلی ہوئی تھی، قیصر جرمنی قصر دولمہ باغچہ میں باطمینان و فراغت بیٹھا ہوا ترکوں کے ساتھ اپنے ادعائے دوستی کا ثبوت دے رہا تھا۔ ۱۹۰۲ء سے اتحادِ ثلاثہ (جرمنی، آسٹریا، اٹلی) میں ترکی کو بھی شامل کرلیا گیا، حالانکہ ایک رکن کو اس سے ناگواری پیدا ہوگئی۔ برلن برابر روما اور وائنا کے مناقشات رفع کرنے کا نازک کام انجام دے رہا تھا، جو مشرقِ قریب کے معاملات کی وجہ سے دونوں میں اُٹھ کھڑے ہوتے تھے، اور اوّل اوّل اُس کو کامیابی

حاصل ہوتی رہی، لیکن ۱۹۱۱ء میں جنگِ طرابلس نے "اتحاد" میں تفریق پیدا کر دی، تاہم وہ تین سال بعد تک برائے نام برقرار رہا، اور ۱۹۱۴ء میں جنگِ عظیم کے وقت بالکل شکست ہو گیا۔

اس دوران میں مشرق قریبہ میں جرمن پالیسی کو کئی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا۔ چونکہ زیادہ تر اس کا انحصار شخصی اعتماد پر تھا، اس لیئے سلطان عبد الحمید خاں ثانی کی معزولی اور "نوجوان ترکوں" کی فتح سے اس کے لیئے سخت خطرہ پیدا ہو گیا۔ لیکن یہ خطرہ گزر گیا، "نوجوان ترک" بھی برلن کے اثرات سے سلطان عبد الحمید خاں کی طرح موم بن کر رہ گئے، اور قسطنطنیہ میں پھر جرمن اقتدار کی حکومت نظر آنے لگی۔ پھر ۱۹۱۲ء میں بلقان لیگ کا قیام اور میدانِ جنگ میں اس کی حیرت انگیز فتوحات اُس سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہوئیں۔ جرمن ڈپلومیسی کی تمام شاطرانہ چالیں ترکوں کو کامل تباہی سے بچانے کے لیئے صرف ہو گئیں! اور کامیاب رہیں۔ سرویہ کو انتہائی ہوشیاری سے بحیرۂ اڈریاٹک کی طرف سے ڈھکیل دیا گیا، اور اُسے مجبوراً جنوب کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ مقدونیہ کے متعلق یونان کے تمام مطالبات کو تسلیم کر لیا گیا۔ بلغاریہ کو اس کے حلیفوں کی طرف سے سخت برانگیختہ کر دیا۔ یورپ میں دولتِ عثمانیہ کا ایک حصہ بچا لیا گیا! اور قسطنطنیہ میں پھر قیصر کے حلیف کی حکومت باقی رہ گئی۔

تاہم ایک خطرہ اب بھی موجود تھا۔ وسطی یورپ اور اُس کے مطمحِ نظر کے درمیان سرویہ سدِّ راہ تھا۔ ۱۸۷۸ء کا سرویہ نہیں، آسٹریا ہنگری کے ہاتھ کا کھلونا نہیں، بلکہ وہ سرویہ جس میں یوگوسلافی قوم کی قدیم روح از سرِ نو مبعوث ہو چکی تھی، وہ سرویہ جو ایک عظیم الشان سرو کروشی سلطنت کا مرکز ہونے کی خواب دیکھ رہا تھا، جس میں کروشیہ، سلاونیہ، بوسینیہ ہرزیگوینیہ، سرویہ، مانٹی نگرو، اور دلماشیہ کے علاوہ کارنیولہ، کارنتھیہ، اسٹریہ، اور اسٹیریہ کے کچھ حصے بھی شامل تھے۔ ایسی سلطنت کا قیام نہ صرف سلطنتِ آسٹریا ہنگری کی تباہی کے مترادف تھا، بلکہ مشرقِ قریب میں وسطی یورپ کی تمام تجاویز پر پانی پھیر دیتا۔ جرمنی اور آسٹریا تمام خطرات کا، حتیٰ کہ عالم گیر جنگ کا سامنا کرنے کو تیار تھے، اگر کسی طرح یہ خطرہ دُور ہو سکتا۔ X

۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم اسی یقین کا نتیجہ تھی۔ مشرق نے ایک مرتبہ پھر صرف مغرب کو ہی نہیں بلکہ تمام دنیا کو ردِّ عمل کا نقشہ دکھا دیا۔ اس غرض سے کہ آسٹریا ہنگری بحیرۂ ایجین تک اپنا راستہ قائم رکھ سکے، اور اس غرض سے کہ برلن اور بصرہ کی سڑک کو تبدیل کرنا نہ پڑے، تمام دُنیا کو جنگ کی ہولناک بھٹی میں جھونک دینا چاہیئے، معصوم اور امن پسند

بلجیم کو تباہ و برباد کر دینا چاہیئے، پولینڈ کو ایک مرتبہ پھر عقوبت میں گرفتار ہونا چاہیئے، فرانس کے سرسبز اور زرخیز ترین علاقوں کو ویران ہو جانا چاہیئے، برطانی افواج کو جزیرہ نمائے گیلی پولی میں اپنے خون کی قربانی کرنی چاہیئے انگریزوں کو دجلہ اور فرات کی دلدلوں میں پھنسنا چاہیئے، عورتوں اور بچوں کو بھوک پیاس سے تڑپ تڑپ کر جان دینا چاہیئے، لندن سے ملبورن تک قاہرے سے کیپ ٹاؤن تک، یوریول سے وانکوور تک، تمام سلطنتِ برطانیہ کو بقائے حیات کے لیئے لڑنا چاہیئے، اور تمام دنیا کو ہجومِ کرب و مصیبت سے کراہنا چاہیئے۔

اگر یہ سچ ہو کہ سنینِ ماضیہ میں مغرب نے مشرقِ قریب کے معاملات میں ظالمانہ اور ہوس پرستانہ خود غرضی سے کام لیا تھا، تو مشرقِ قریب نے اپنا پورا انتقام لے لیا۔

جنگِ عظیم کا آغاز جرمنی اور آسٹریا کے لیئے اُمید افزا تھا۔ ان کا سب سے زبردست رقیب روس انقلاب کے پنجہ میں گرفتار ہو چکا تھا۔ رومانیہ اور سرویہ کی تباہی نے بحیرۂ ایجین کا راستہ بالکل صاف کر دیا تھا، گیلی پولی اور دردانیال سے انگریزی فوجیں منہزم ہو کر واپس جا چکی تھیں، اور جرمنی کے عساکر عروس البلاد پیرس کے اوپر منڈلا رہے تھے۔ لیکن اس کا اختتام اسی قدر یاس آمیز نکلا۔ ترکی اور بلغاریہ کی فوجی قوت کا خستہ ہو جانا، جرمنی کا دیوالہ نکل جانا، اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا دشمنوں کی صف میں شامل ہو جانا، وسطی یورپ کی آرزوؤں کے لیئے موت کا پیغام ثابت ہوئے، اور بالآخر ۱۹۱۸ء میں اس مصیبت کا خاتمہ ہو گیا۔

دولِ مغرب کی اس شاندار کامیابی نے تقریباً تمام اقوام کی اُمیدوں کو زندہ کر دیا۔ اس جنگ کے بعد حدود کے تصفیہ میں "قومیت" کا بہت زیادہ خیال رکھا گیا۔ سرویہ کے خواب کی تعبیر پوری ہو گئی، رومانیہ نے بقیہ رومنوں کو ہم آغوش کر لیا، پولینڈ کا دوبارہ احیاء ہو گیا، آسٹریا ہنگری کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے، اور یورپ کے نقشہ پر پہلی مرتبہ "قومیت" کی حدود کا خاکہ نظر آنے لگا۔ لیکن اس ادّعائے آزادی میں یورپ اور بالخصوص برطانیہ کے مدبرین حدِ اعتدال سے متجاوز ہو گئے، یورپ میں تھریس، اور ایشیا میں سمرنا اور آدین کی ولایات اس اُصول کے خلاف ترکوں سے نکال کر یونانی درندوں کے حوالہ کر دی گئیں، جنھوں نے معصوم اور بے خطا مسلم آبادی پر اپنی تمام وحشت اور بربریت کو ختم کر دیا۔ ترک لڑائیوں سے تھک کر چور چور ہو چکے تھے، مسلسل بارہ برس تک موت و حیات کی کشمکش نے ان کی فوجی قوت کو سخت نقصان پہنچا دیا تھا۔ لیکن قومیت کی روح ان میں بیدار ہو چکی تھی، حریت کے جذبہ نے ان کو سرشار بنا دیا

تھا، اور وہ اپنے وطن مالوف کو اغیار کے دستِ تظلم میں دیکھ کر مضطرب ہوگئے۔ بطلِ اعظم غازی مصطفےٰ کمال پاشا (ایدّہٗ اللہ بنصرہٖ العزیز) اناطولیہ کے چند ناتجربہ کار دہقانوں کو لے کر میدان میں آترا، اور مغرور یونانیوں کا صفایا بول دیا۔ اناطولیہ کی مقدس سرزمین، جو چار سال سے مصائب و آلام کا شکار بنی ہوئی تھی، بالآخر پھر آزادی کی گود میں جھولا جھولنے لگی۔

۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۳ء تک کے واقعات انتہائی پیچیدہ ہیں۔ سیاسیاتِ عالم میں قسطنطنیہ کی حیرت انگیز اہمیت اور آبنائے جات کے تحفظ و نگرانی کے متعلق دولِ یورپ کی باہمی رقابتیں، ان واقعات کا محور بنی رہیں۔ اگر روس نے ۱۹۱۷ء میں خودکشی نہ کرلی ہوتی، تو اب وہ اپنے مغربی حلیفوں سے اس وعدہ کو ایفا کرنے کے لئے زور دیتا، جو جنگ کے دوران میں انھوں نے کیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ایاصوفیہ میں ہلال کے بجائے صلیب کا پھریرا اُڑ رہا ہوتا، زارانِ روس کی دیرینہ آرزوئیں پوری ہوگئی ہوتیں، اور ترکوں کی جگہ پر روسی آبنائے جات کی حفاظت کررہے ہوتے۔

لیکن انقلابِ روس نے اس تاریخی مسئلہ کے حل کو پھر روک دیا۔ روس کے بجائے کسی اور قوم کو قسطنطنیہ کی کنجی سپرد کردینا آسان کام نہ تھا۔ یونانیوں نے قدیم سلطنتِ یونان کے دارالحکومت، بائزنطیم (قسطنطنیہ) سے اپنے حقوق کی دست برداری نہیں دی تھی۔ لیکن مشرقی بحیرۂ روم میں یونانی قوت کے غلبہ کو نہ تو فرانس گوارا کرسکتا تھا، جو ترکوں کا قدیمی دوست تھا، اور نہ اٹلی، جو سلطنتِ روما اور ریاستہائے وینس و جینوا کی قدیم روایات کا حامل ہونے کے علاوہ یونان کا زبردست رقیب تھا۔ اس کے برخلاف برطانیہ برابر یونان کے حریصانہ ارادوں کی تائید کررہا تھا، اور چاہتا تھا کہ ایاصوفیہ ہلال سے نکل کر صلیب کی آغوش میں آجائے، لیکن اپنی مسلم رعایا کے جذبات کی وجہ سے مجبور تھا۔ اگر یونان تنہا ترکوں کو یورپ سے باہر نکال سکتا، اور ایشیائے کوچک میں اپنی طاقت کو مضبوط کرلیتا، تو اس کی ہمت افزائی کرنے اور سیاسی اعانت دینے کو تیار تھا، لیکن اس کے علاوہ کچھ نہیں۔

واقعات پر ایک نظر ڈالنے سے اس صورت کے امکان یا غیر امکان کا پتہ چل سکتا ہے۔ ترکوں نے ۳۰ / اکتوبر ۱۹۱۸ء کو ہتھیار ڈال دیئے۔ فروری ۱۹۱۹ء کے شروع میں وینیزیلاس نے یونان کی طرف سے ولایت سمرنا پر اپنا حق پیش کیا۔ لیکن سینٹ جین ڈی مارین کے معاہدہ کی رو سے برطانیہ اور فرانس نے سمرنا کا علاقہ عارضی طور پر اٹلی کو تفویض کیا تھا، اس دوران میں اٹلی اور اتحادیوں کے درمیان فیوم کے تضیہ پر ناچاقی پیدا ہوگئی، اور اٹلی پیرس کانفرنس

سے علیحدہ ہو گیا (اپریل ۱۹۱۹ء)۔ وینیزیلاس نے یہ موقع پاتے ہی سمرنا پر یونانی قبضہ جمانے کے لیئے مئی ۱۹۱۹ء میں اتحادیوں کی اجازت حاصل کر لی۔

قبضہ کے وقت برطانیہ، فرانس اور امریکہ کے جنگی جہاز یونان کی حمایت کے لیئے موجود تھے، لیکن اس نے ترکوں میں اور بالخصوص "قوم پرستوں" میں غم و غصہ کی ایک لہر دوڑا دی۔ قوم پرست فرقہ مصطفےٰ کمال پاشا کی قیادت میں بسرعت تمام اناطولیہ پر اپنا اثر قایم کر چکا تھا۔ جولائی ۱۹۱۹ء میں یہ اولوالعزم سپاہی قسطنطنیہ سے نکل آیا، اناطولیہ کے کوہساروں میں ترکوں کو خواب غفلت سے بیدار کر دیا، اور انگورہ میں قسطنطنیہ کے مقابلہ میں ایک نئی حکومت قایم کر لی۔ جنوری ۱۹۲۰ء میں قسطنطنیہ کے چند ترکی نائبین نے "میثاق ملّی" ترتیب دے کر منظور کر لیا، جو جدید ترکی جمہوریت کے قوانین عامّہ کا سنگ بنیاد ہے۔

مئی ۱۹۲۰ء میں صلح نامہ کی شرائط، جو ترکی پر عائد کی گئی تھیں، وزیراعظم توفیق پاشا کے حوالہ کر دی گئیں۔ یہ مسلّمہ امر ہے کہ یہ شرائط بہت سخت تھیں، اور ترکوں نے اِن کے خلاف زبردست صدائے احتجاج بلند کی، بالخصوص اُن شرائط کے خلاف، جن میں سمرنا اور اس کے مضافات یونان کو دیئے گئے تھے، اور آبنائے جات کے کمیشن میں باب عالی کو شامل نہیں کیا گیا تھا۔ موخرالذکر اعتراض کو اتحادیوں نے مان لیا، لیکن بقیہ اعتراضات کی متعلق ترکوں کو سختی کے ساتھ جتایا گیا کہ وہ جنگ میں بغیر کسی سبب کے شامل ہوئے تھے، اور اس طرح ان حکومتوں سے دغابازی کرنے کے مجرم تھے، جو عرصہ سے ان کی دوست تھیں، نیز یہ کہ ان حکومتوں نے اگست ۱۹۱۴ء میں وعدہ کر لیا تھا کہ اگر دوران جنگ میں ٹرکی نے اپنی غیر جانب داری قایم رکھی، تو اتحادی ٹرکی کے تمام علاقوں کی ضمانت کرتے ہیں، نیز یہ کہ ترکوں کے ظلموں نے انسانیت کو سخت نقصان اور مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے، اور نیز یہ کہ اس وحشت کے صلہ میں، جو ترکوں نے اپنی سرپرست اور محافظ اقوام کے ساتھ برتی ہے، اتحادیوں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ تمام رقبہ جات ترکوں کے قبضہ سے نکال لیئے جائیں، جن میں غیر ترکی اکثریت ہے۔

اِن الفاظ سے تو ہمت مردانہ کا اظہار ہوتا ہے، لیکن کیا اتحادی ان کو عملی جامہ پہنانے کے لیئے تیار تھے؟ سیورَیز کے صلح نامہ کو خود قسطنطنیہ کی حکومت نے بھی قبول نہیں کیا، کجا مصطفےٰ کمال پاشا اور انگورہ کا قوم پرست طبقہ، جس نے فوراً اعلان کر دیا کہ وہ کسی صورت میں اِن شرائط کو تسلیم کرنے کے لیئے تیار نہیں۔ ۱۹۲۰ء کے

موسم گرما میں یونانی افواج کی فتوحات سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ شاید ان کو یہ شرائط ماننی پڑینگی۔ اتحادیوں اور خصوصًا برطانیہ کی شہ پاکر یونانیوں نے قوم پرست ترکوں پر حملہ کرکے انھیں شکست دیدی، اور ۸رجولائی کو عثمانیوں کے قدیم دارالحکومت بروصہ پر قبضہ کرلیا۔ اِسی دوران میں تھریس میں بھی اُنھوں نے اپنی طاقت کو مضبوط کرلیا اور ۲۵رجولائی کو ایڈریانوپل میں داخل ہوگئے۔ ۱۰راگست کو توفیق پاشا نے صلح نامۂ سیوریز پر دستخط کردئیے۔

لیکن توفیق پاشا صرف قسطنطنیہ کی حکومت کا ذمہ دار تھا، انگورہ کے ترک سلطان اور اتحادیوں کی بالکل طور پر خلاف تھے، اور تقدیر اُن پر کھڑی مسکرا رہی تھی۔ ۲۵راکتوبر کو الکزانڈر شاہِ یونان ایک بندر کے کاٹنے کی وجہ سے مرگیا۔ اس زمانہ میں الیکشن زوروں پر تھا، اور وینیزیلاس نے فورًا امیرالبحر کونڈریوٹس کو جدید حکمراں کے آنے تک حکومت سپرد کردی۔ لیکن پال نے یہ اعلان کردیا کہ:-

"میں حکومت سنبھالنے کو تیار ہوں، بشرطیکہ یونانی قوم یہ فیصلہ کرے کہ وہ
میرے والد ماجد کو سلطنت میں واپس نہ بلائیگی، اور ولی عہد شہزادۂ جارج کو تخت
و تاج کے حقوق سے محروم کردیگی۔"

لیکن اس کا فیصلہ الیکشن کے نتیجہ پر منحصر تھا۔ سیوریز کا فاتح وینیزیلاس خود اپنے گھر میں ذلیل ہوگیا، اور الیکشن میں اُس کی پارٹی کو بڑی زبردست شکست اُٹھانی پڑی۔ اُس نے فورًا نومبر ۱۹۲۰ء میں ملک کو خیرباد کہا، اور دسمبر میں رائے عامہ کے ذریعہ قسطنطین سابق شاہِ یونان کو پھر واپس بلالیا گیا، اور ایتھنز میں اس کا پُرجوش خیرمقدم کیا گیا۔ لیکن اس نے صورتِ واقعات کو اور نازک بنادیا۔ اتحادیوں نے قسطنطین کو بادشاہ تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ دریں حالے کہ انگورہ کے قوم پرست ترکوں نے "میثاقِ ملی" کو منظور کرکے یہ مطالبہ کیا کہ قسطنطنیہ کی حفاظت کی ضمانت دی جائے، وہ حصّہ جہاں عثمانی مُسلم اکثریت ہے ترکی حکومت کے تحت متحد کردئیے جائیں، اور رائے عامہ کے ذریعہ مغربی تھریس کا فیصلہ کیا جائے (جنوری ۱۹۲۱ء)

کسی نتیجہ پر پہونچنے کی غرض سے مجلسِ عالیہ نے لندن میں ایک کانفرنس منعقد کی (فروری تا مارچ ۱۹۲۱ء) جس میں یونان اور دونوں ترکی حکومتوں کے سفراء شریک ہوئے۔ اتحادیوں نے معاہدۂ سیوریز کی شرائط میں کافی ترمیمات پیش کیں، لیکن یونان اور ترکی دونوں نے ماننے سے انکار کردیا۔ لندن کانفرنس کے دوران میں

فرانس اور اٹلی نے حکومتِ انگورہ سے جُداگانہ معاہدات کر لیئے، اور ۲۰ راکتوبر ۱۹۲۱ء کو فرانسیسی ترکی معاہدہ شائع ہو گیا۔ اِس کے یہ معنی تھے کہ فرانس نے حکومتِ انگورہ کو تسلیم کر لیا، اور ان اتحادیوں کو جن کے ساتھ مِل کر وہ ۱۹۱۴ء سے کام کر رہا تھا، چھوڑ دیا، اور ۴ ستمبر ۱۹۱۴ء کے فرانسیسی برطانی معاہدہ اور نومبر ۱۹۱۵ء کے میثاق لندن کے برخلاف ترکی سے علیحدہ معاہدہ کر لیا۔ گویا کہ فرانس نے اقلیتوں کی حفاظت کی ذمہ داریوں سے دست برداری دے دی، اور میسو پوٹامیہ میں برطانیہ کے حقوق کو تلف کر دیا۔

اِن معاہدات نے ترکوں کی ہمتوں میں اضافہ کر دیا۔ اوائل ۱۹۲۱ء میں یونانیوں کی پیش قدمی روک دی گئی، کچھ عرصہ بعد وہ پھر بڑھے، لیکن سال کے آخر میں اُنھیں شکستِ فاش نصیب ہوئی۔ فروری ۱۹۲۲ء میں اتحادیوں نے ایک اور کانفرنس پیرس میں منعقد کی، اور دونوں متخاصمین کے سامنے صلح نامہ سیورے کی شرائط کو از سرِ نو ترتیب دینے کی تجویز پیش کی۔ یونان اور حکومتِ قسطنطنیہ نے ان تجاویز کو مان لیا، لیکن کمالیوں نے اُس وقت تک جنگ ملتوی کرنے سے انکار کر دیا، جب تک کہ اناطولیہ کا غیر مشروط اور فوری انخلاء نہ ہو جائے۔ اِس بنا پر نامہ و پیام کا خاتمہ ہو گیا، لیکن اگست میں اتحادیوں نے پھر کوشش کی کہ متخاصمین کو راہ پر لے آئیں۔ قبل اِس کے کہ یہ مجوزہ کانفرنس منعقد ہو، ترکوں نے اپنی فاتحانہ پیش قدمی شروع کر دی تھی۔ یونانیوں کو اپنے سامنے سمندر میں ڈھکیل دیا تھا، اور ۹ ستمبر ۱۹۲۲ء کو مظفر و منصور سمرنا میں داخل ہو چکے تھے۔ ایشیائے کوچک کے تمام علاقوں سے یونانی پناہ گزیں ترکوں کے خوف و دہشت سے بھاگتے چلے آتے تھے، جن میں سے دس لاکھ کے قریب اتحادی اور یونانی جہازوں پر سوار ہو کر نکل بھاگے۔

یونانیوں کی یہ شکست فیصلہ کن اور فاش تھی، اور سلطنت آئی اونیہ کے متعلق ان کے خوابات خاک میں مل گئے۔ اسی کے ساتھ فوج نے سالونیکا، کریٹ، خیوس اور متی لین میں بغاوت کر دی، اور قسطنطین کو تخت سے اُتارنے کا مطالبہ کیا۔ بادشاہ نے سرِ تسلیم خم کر دیا، ۳۰ ستمبر کو بیوی بچوں کے ساتھ ایتھنز چھوڑ دیا، اور جنوری ۱۹۲۳ء میں پلرمو میں مر گیا۔ اِسی دوران میں ایک بین الاقوامی خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ فتحمند ترکی افواج نے دردانیال کی طرف پیش قدمی شروع کر دی تھی، اور چناق کے قریب پہنچ چکی تھیں۔ فرانس نے فوراً اپنی فوجوں کو واپس بُلا لیا، اور اٹلی نے بھی اپنے طرزِ عمل سے ثابت کر دیا کہ لڑائی چھڑ جانے کی حالت میں اس سے کسی مدد کی توقع فضول ہے۔

صرف برطانیہ مقابلہ پر جما رہا، جنگی جہاز اور فوجیں فوراً کمک کے لیئے دردانیال کی طرف روانہ کردی گئیں نوآبادیات اور بلقانی ریاستوں سے "بین الاقوامی حلقہ" کو بچانے کی درخواست کی گئی، اور لڑائی کی تیاریاں مکمل ہوگئیں۔

تاہم لڑائی بال بال بچ گئی، برطانی گورنمنٹ کے استقلال اور قسطنطنیہ کے اتحادی کمانڈر ان چیف، سر چارلس ہیرنگٹن کے تدبر اور دوربینی نے دُنیا کو ایک اور مصیبت سے بچادیا۔ ترکوں یونانیوں، اور اتحادیوں کے درمیان صلح کی سلسلہ جنبانی اوائل اکتوبر میں ہی شروع ہوگئی تھی، اور ۱۱ راکتوبر کو مدانیہ میں التوائے جنگ پر دستخط ہوگئے۔ ترکوں نے "آزادئ آبنائے جات" کا وعدہ کیا، اور اتحادیوں نے یہ عہد کیا کہ یونانی مشرقی تھریس کو فوراً خالی کرینگے، جس پر اتحادی عارضی قبضہ کرلینگے۔

نومبر میں سیوریز کے اتحادی نمائندے اور نئی ترکی سلطنت کے سفرا، لوزان میں جمع ہوئے۔ اس عرصہ میں یکم نومبر کو انگورہ کی مجلس ملی نے یہ اعلان کردیا کہ سلطان کا عہدہ اُڑادیا گیا، اور آئندہ سے خلیفہ کے عہدہ پر خاندان آل عثمان کے کسی فرد کا انتخاب ہوا کریگا۔ ۴ر نومبر کو رفعت پاشا نے حکومت انگورہ کے نام سے قسطنطنیہ کا انتظام لے لیا۔ اسی دن توفیق پاشا نے سلطان کے سامنے وزارت کا استعفا پیش کردیا۔ ۱۷ر نومبر کو آل عثمان کے آخری تاجدار نے ایک انگریزی جنگی جہاز کے ذریعہ قسطنطنیہ کو الوداع کہا، اور تاریخ جدید کا ایک عظیم اور پُرہیبت باب اس اچانک اور ذلت آمیز طریقہ پر ختم ہوگیا۔

۱۸ر نومبر کو پرنس عبدالمجید خلیفہ منتخب ہوئے، لیکن مارچ ۱۹۲۴ء سے خلافت کا عہدہ بھی اُڑادیا گیا، اور خلیفہ کو معہ اہل وعیال کے جلا وطن کردیا گیا۔ ۱۳ر اکتوبر ۱۹۲۳ء سے انگورہ ترکی حکومت کا صدر مقام مقرر کیا گیا، اور ۲۹ر اکتوبر کو جمہوریت کا اعلان کردیا گیا، جس کا پہلا صدر مصطفےٰ کمال پاشا منتخب ہوا۔ یونان بھی بالآخر اسی راستہ پر آپڑا۔ اور شاہی استبداد کو بالائے طاق رکھ کر جمہوریت قایم کرلی۔ اس عرصہ میں اُس کی اندرونی حالت بہت نازک ہوگئی تھی، اور اٹلی کے تصفیہ نے اس پر مزید اضافہ کردیا۔ یونانیوں نے عاجز آکر وینیزیلاس کو پھر واپس بلالیا، اور اس سے ملک کو تباہی سے بچانے کی درخواست کی۔ شاہ جارج ثانی تخت وتاج چھوڑکر رومانیہ چلا گیا، اور وینیزیلاس جمہوریۂ یونان کا صدر مقرر ہوا۔

۲۰ر نومبر ۱۹۲۲ء کو لوزان کانفرنس کا افتتاح ہوا۔ یورپ کے مدبرین برطانی وزیر خارجہ لارڈ کرزن کے زیر صدارت دو مہینہ تک دماغ لڑاتے رہے، تاکہ صلح کی شرائط کا تصفیہ کریں، اور مسئلہ مشرق کا ایسا حل پیش کریں جو اگر مستقل نہ ہو تو کم از کم دیرپا ضرور ہو۔ لیکن حالات اُن کے موافق نہ تھے۔ دو صدی سے ترکوں نے اپنی مسلسل شکستوں کے نتائج بد سے بچنے کی حیرت انگیز کوشش کی، کیا اب ان سے یہ اُمید کی جاسکتی تھی کہ وہ اپنی کامل اور معجزانہ فتح سے مستفیض نہ ہوں؟۔ اس کے علاوہ اِن کی فتح صرف میدانِ جنگ تک ہی محدود نہ تھی اُنھوں نے اٹلی اور یونان کی دیرینہ عداوت اور برطانیہ اور فرانس کی نوزائیدہ رقابت سے کام لے کر لوزان کانفرنس میں بالکل فاتحانہ انداز اختیار کرلیا۔ بہرحال جنوری ۱۹۲۳ء تک تمام شرائط کا تصفیہ ہوگیا، لیکن ترکی سردارِ وفد عصمت پاشا نے کچھ اور مہلت مانگی، اور عین وقت پر دستخط کرنے سے انکار کردیا، جس کی وجہ سے کانفرنس کا خاتمہ ہوگیا۔

لیکن اس خلاف اُمید ناکامی سے مدبرین کی ہمتیں پست نہیں ہوئیں، اور ۲۳ر اپریل کو سر ہوریس رمبالڈ کی صدارت میں وہ پھر مجتمع ہوئے۔ تین ماہ کی سخت کوشش کے بعد آخرکار ۲۴ر جولائی ۱۹۲۳ء کو صلح نامہ پر سفراء کے دستخط ہوگئے۔ ایک مہینہ بعد ۲۳ر اگست کو انگورہ کی مجلسِ ملّیہ نے اس کو منظور کرلیا، اور اسی تاریخ سے انگریزی فوجوں نے، جو التوائے جنگ کے وقت سے قسطنطنیہ پر قابض تھیں، شہر کو خالی کرنا شروع کردیا۔

صلح نامۂ لوزان کی شرائط پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے اس کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ ترکوں کے مقابلہ میں یونان کی شکستیں کس قدر زبردست تھیں۔ مشرقی تھریس معہ اڈریانوپل، جزائر امبروس اور ٹینیڈوس اور ولایات سمرنا اور آئدین یونان سے چھین کر ترکوں کے حوالے کئے گئے۔ جزیرۂ رہوڈس اٹلی کے قبضہ میں رہا۔ ترکی، مصر، سوڈان، قبرص، شام، فلسطین، میسوپوٹامیہ اور عرب سے دست بردار ہوگئے۔ قسطنطنیہ کے یونانیوں اور مغربی تھریس کے ترکوں کے سوا، یونان اور ٹرکی میں یونانی اور ترکی آبادی کا تبادلہ کیا گیا۔ سولھویں صدی عیسوی سے ٹرکی میں غیر ملکوں کے باشندے "مراعات" (Capitulations) کے تحت اپنی اپنی حکومتوں کے قوانین اور نظامِ عمل کی پیروی کرتے تھے۔ اس معاہدہ کی رو سے "مراعات" کا خاتمہ کردیا گیا، اور غیر ملکی باشندوں کے لیے بھی ترکی قانون لازمی قرار پایا۔ آبنائے جات کو "غیر جانب دار" قرار دیا گیا۔

اور وہ تمام اقوام کے جنگی اور تجارتی جہازوں کے لیئے کھول دی گئیں۔ لیکن ترکوں کو یہ حق حاصل رہا کہ وہ قسطنطنیہ میں فوجی چھاونی اور قلعہ جات قایم رکھیں، اس کے علاوہ بقیہ ساحل پر فوجی استحکامات بنانے کی ممانعت کی گئی۔

اِس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ صلح نامہ جمہوریت ٹرکی کی شاندار فتح اور دیگر دول کی ذلت آمیز شکست کے مترادف ہے۔ لیکن یہ بھی مسلّمہ ہے کہ اس صلح نامہ نے مشرق قریب کی پیچیدہ گتھیوں کو ایک مدت کے لیئے سلجھادیا اور بہت ممکن ہے کہ یہ معاہداتِ وارسیلز، سینٹ جرمین، ٹرائنن، اور نیوئیلی سے زیادہ دیرپا ثابت ہو۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ دورانِ جنگ میں اتحادی مدبّرین نے جو اعلانات کیئے تھے، یہ صلح نامہ ان سے کس حد تک مطابقت رکھتا ہے۔ ۱۰ رنومبر ۱۹۱۴ء کو لائڈ جارج نے ترکوں کی بابت یہ رائے ظاہر کی تھی:-

"ترک انسانوں کی شکل میں ایک سرطان ہیں، اور جس جس ملک میں ترکوں کی بدنظمی قایم ہے، اس کے گوشت میں یہ ایک متحرک درد کی حیثیت رکھتے ہیں، جو زندگی کی شرائین کو تباہ و ناکارہ کرڈالتا ہے۔ مجھ انتہائی مسرت ہے کہ اب ان کے خلافِ انسانیت مظالم کی طویل داستانوں کا اُن سے آخری حساب طلب کیا جائیگا"

کون کہہ سکتا ہے کہ معاہدۂ لوزان میں یہ "آخری حساب" طلب کیا گیا ہے؟۔ اِسی طرح اس معاہدہ نے دول اتحادی کے ان ارادوں پر بھی پانی پھیر دیا، جن کا اعلان ۱۰ ردسمبر ۱۹۱۶ء کو مراسلۂ بالفور کے ذریعہ سے کیا گیا تھا۔ اس مراسلہ میں اتحادیوں کے ایک مقصد جنگ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:-

"اِن آبادیات کو آزاد کرانا، جو ترکوں کے خونیں مظالم میں پھنسی ہوئی ہیں، اور سلطنتِ عثمانیہ کو مغربی تہذیب و تمدن سے قطعی بیگانہ ہونے کی وجہ سے یورپ سے بالکل خارج کردینا"

لیکن بالشویک انقلاب نے اتحادیوں کے تمام اعلانات کو خاک میں ملا دیا، اور قسطنطنیہ اور آبنائے جات کے متعلق جو مواعید زار کی حکومت سے کیئے گئے تھے، وہ سب بیکار ہوگئے۔ ۵ رجنوری ۱۹۱۸ء کو لائڈ جارج نے پھر اعلان کیا کہ:-

"ہم اس وجہ سے جنگ نہیں کررہے ہیں کہ ٹرکی کو اس کے دارالخلافہ یا ایشیائے کوچک اور تھریس کے زرخیز علاقوں سے محروم کردیں جن میں ترکی اکثریت کا غلبہ ہے۔ - - - - - - - - - درآں حالیکہ ہم سلطنتِ عثمانیہ سے اس کے ترکی علاقوں کو الگ نہیں کرسکتے، جس کا دارالحکومت قسطنطنیہ ہی رہیگا ــــــــ البتہ بحیرۂ روم اور بحیرۂ اسود کا راستہ ضرور بین الاقوامی اور غیر جانبدار بنا دیا جائیگا ــــــــ لیکن عرب

آرمینیہ، میسو پوٹامیہ، شام، اور فلسطین ہمارے نزدیک جُداگانہ حکومتیں مان لیئے جانے کی مستحق ہیں، اور سابقہ حکومت میں کسی طرح شامل نہیں کیئے جاسکتے "

اِس کے بعد ۸ر جنوری ۱۹۱۸ء کو وِلسن صدر جمہوریہ امریکہ نے اپنی چودہ شرائط پیش کیں، جن میں سے بارھویں شرط حسبِ ذیل تھی:-

"موجودہ سلطنتِ عثمانیہ کے ترکی علاقوں کو یقیناً ایک محفوظ ترکی حکومت کے تحت باقی رہنا چاہیئے۔ لیکن جو غیر قومیں کہ ترکوں کے زیرِ حکومت ہیں، اُن کی زندگی اور حفاظت کی ضمانت ہونی چاہیئے۔ اور حکومت خود اختیاری میں ترقی کرنے کے لیئے ان کو بالکل بے خطر مواقع بہم پہونچانے چاہئیں، اور دردانیال کو بین الاقوامی ضمانت میں تمام اقوام کی تجارت اور جہازوں کے لیئے مستقل طور پر کھول دینا چاہیئے"

انقلابِ روس نے مغربی اتحادیوں کو مجبور کردیا کہ وہ مشرق قریب کی صورتِ حالات پر نظرثانی کریں، اور اپنی اغراضِ جنگ کو ازسرِنو ترتیب دیں۔ اِسی وجہ سے اوائلِ جنگ کے دعاوی، بعد کے اعلانات سے اس قدر مختلف نظر آتے ہیں۔ اِس کا لازمی نتیجہ تھا کہ سیوریز میں بھی سابق اعلانات کے موجب ترکوں کو "یورپ سے بدھنے کے ساتھ یورپ سے نکالدینے" کی طے شدہ اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش نہ کی گئی۔ پھر وزان میں تو کس طرح ہوسکتی تھی؟ ۱۹۲۲ء میں یونان کی یادگار شکست نے اس کے تمام خوابوں کو باطل کردیا، جو وہ قدیم بازنطینی سلطنت کے احیا کے متعلق دیکھ رہا تھا، جس کا دارالحکومت پھر ایک مرتبہ باسفورس کی لہروں سے اٹھکھیلیاں کررہا ہوتا۔ روس اور یونان کے حقوق کو نظرانداز کرنے کے بعد، ایک ایسے شہر کو جس کی روایات اور مواقع قسطنطنیہ کی طرح ہوں، بین الاقوامی بنا دینا بھی آسان نہ تھا۔ طوعاً و کرہاً ترکوں کو یورپ میں قایم رکھنا پڑا، اور اس حیثیت سے مسئلۂ مشرق لاینحل ہی رہا۔

مسئلۂ مشرق کا دورِ جدید یورپ میں ترکوں کے داخلہ سے شروع ہوا، اُنھوں نے ممالک بلقان کو رفتہ رفتہ زیر کیا، اور تمام جزیرہ نما پر محیط ہوگئے۔ ان کی پانصد سالہ حکومت نے اس مسئلہ کو پیچیدہ بنا دیا، اور اس کے تصفیہ میں کافی مدت صرف ہوگئی۔ پانچ صدی تک اُنھوں نے بلقان میں حکومت کی، مگر وہاں کی مختلف اقوام کو اپنے اندر جذب نہ کرسکے۔ ان کے زوال کے بعد ان قوموں نے رفتہ رفتہ سر اُٹھانا شروع کیا، حتیٰ کہ ۱۹۱۴ء تک یورپ میں ترکی حدود قریب الختم ہوچکی تھیں۔ جنگِ عظیم کے بعد یہ یقین یورپ میں عام ہوگیا تھا، کہ اب ترکوں کا بالکل خاتمہ ہوجائیگا۔ لیکن قدرت کو

کچھ اور ہی منظور تھا۔ ایسا نہ ہونا تھا نہ ہوا۔ جنگ اور صلح دونوں یکساں طور پر اس تاریخی مسئلہ کو مغربی لوگوں کی امید کے مطابق حل کرنے سے قاصر رہیں۔ کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی اگر اس سوال کا جواب مغرب کے عقل و دماغ سے نہیں، بلکہ خود ترکوں کی فنا نہ ہوسکنے والی قوت سے ملے، لندن اور پیرس سے نہیں، قسطنطنیہ سے بھی نہیں، بلکہ انگورہ سے، ایک ایسی ٹرکی سے، جو آلِ عثمان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ قومی سلطنت ہونے کا دعویٰ رکھتی ہے، اور جس کے تخیلات و احساسات صرف فوجی نہیں بلکہ سیاسی بھی ہیں، ایک ایسی ٹرکی سے جس نے قسطنطنیہ کی خمار آور آب ہوا اور عیش پرستیوں سے الگ ہوکر، ساحل مارمورہ کے تباہ کن اثرات سے دُور رہکر، اناطولیہ کے بے برگ و گیاہ اور مرطوب کوہساروں سے اپنے دل و دماغ میں نئی روح پھونک لی ہے، اور آلِ عثمان کے قدیم وطن سے ملحق ہوکر نشائۃ ثانیہ حاصل کرلی ہے۔

انجام کی کسی کو خبر نہیں، تاہم ایک امر یقینی ہے کہ مشرق قریب کا مستقبل نہ تو ماضی کی طرح ہوگا، اور نہ حال سے مطابقت کریگا۔ لیکن پانچ صدی کی متواتر حکومت نے تاریخ کے صفحات پر ایک سبق جلی حرفوں میں لکھا ہوا چھوڑ دیا ہے۔

"ترک صرف غیر مستقل مزاجی میں مستقل رہے ہیں، لیکن اپنی سادہ لوحی کا اظہار کرکے اُنھوں نے دُنیا کے عقلمندوں کو پریشان کردیا ہے، اور ہمیشہ اپنی کمزوری سے قوت حاصل کرلی ہے۔"

انیس الدین احمد رضوی
ایم اے (علیگ)

(امروہہ: ۳۱ راگست ۱۹۲۰ء)

شاعر کا نصب العین

از جناب بدر الحسن صاحب بدرؔ جلالی، بی اے

نومبر ۱۹۲۶ء میں انجمن صدیقۃ الشعراء انٹرمیڈیٹ کالج علی گڑھ کی طرف سے جو عظیم الشان مشاعرہ منعقد ہوا تھا، اِس میں جناب بدرؔ جلالی کی اس معرکۃ الآرا نظم نے بجا طور پر خراجِ تحسین حاصل کیا تھا۔ ہم اِس کو میگزین میں شائع کرنے کا فخر حاصل کرتے ہیں۔

اڈیٹر

رندِ قدیم آج ہوا بے نیازِ ہوش
محرومِ التفات ہے سامانِ ناؤ نوش

اب نغمہ سازیاں نہیں موجِ شراب کی
ٹوٹا پڑا ہے میکدہ میں سازِ مے فروش

مینا فسردہ خاطر و ساغر شکستہ دل
تصویر ایک یاس کی ہے ہر لبِ خموش

یارانِ رفتہ کی نہیں صد حیف کچھ خبر
کیا جانئے کہاں ہیں حریفانِ بادہ نوش

سب لٹ گئی متاعِ خمستانِ عزم کی
سونی پڑی ہے انجمنِ پیرِ مے فروش

امیدِ بادہ خوار پہ خوں رو دیئے کہ ہے
رشکِ سکونِ یاس شرابِ کہن کا جوش

عبرت گہِ ہراس ہے ہنگامہ زارِ عشق
مطرب نہ نے بلب ہے نہ ساقی سبو بدوش

شوقِ عمل پہ حیرتِ ناکام کا ہجوم
گویا ہے خودکشی کا سبب داستانِ دوش

باقی ہے اتنی گرمیٔ محفل کی یادگار
یا کچھ رویّ دود ہے یا شعلۂ خموش

اے نکتہ سنجِ علتِ تکوینِ آب و گِل
اے شاعرِ سخن گر و حق کوش و حق نیوش

اے وہ کہ تھا مصورِ فطرت ترا لقب
اے وہ کہ ہر مرقعِ عالم کا نقش کوش

اے وہ کہ جس سے محفلِ ہستی کو تھا فروغ
اے وہ کہ ہر ادائے عمل میں تھا دلفروش

اے وہ کہ جس کے خون میں روحِ جہاد تھی
ثابت ہوا جو راہِ محبت میں سرفروش

اے وہ کہ جس کی سعیِ مسلسل پیامِ فتح
اے وہ کہ تھا عزائمِ پیہم میں عزم کوش

اے وہ کہ جس کی شان ہے تقلیدِ داوری
اے وہ کہ جس کی بات بیانِ لبِ سروش

اللہ رے بے نیازیٔ منزل کہ سو رہا
آغوشِ راہزن میں ترا کاروانِ ہوش

سُن بے خبر کہ چرخ سے آتی ہے کیا صدا
مسلم ہے سہل کار تو مشرک ہے سخت کوش

اے ماتمیٔ محفلِ پارینہ رحم کر
اب لوٹ کر کبھی نہیں آئیگی بزمِ دوش

تھا دَور جو بھی تجھ پہ گزرنا گزر گیا
آ اُٹھ کہ ہم سنائیں پیامِ لبِ سروش

ہر بستۂ حیات میں صورِ عمل کا شور
ہر ریشۂ نبات میں نشو و نما کا جوش

ہر موجۂ سراب ہے تغیرِ صد طپش
ہر قطرۂ سحاب ہے اک برقِ شعلہ پوش

ہر ذرہ مرتعش ہے بیابانِ عشق کا
ہر روح ہے کشاکشِ ہستی میں عزم کوش

ہر تارِ سازِ گیتیٔ ناپائدار میں
اب چھڑ رہے ہیں شوق کے صد نغمہ ہائے ہوش

خُم خانۂ حیات ہے تو بھی ہو جرعہ نوش
اب بھی بنا لے بزمِ محبت کو پُر خروش

خوابیدہ روزگار میں حق کی پکار کر
خونِ عمل سے محفلِ کُن لالہ زار کر

سیواجی اور افضل خاں

از جناب سید معین الحق صاحب ایم اے

سیواجی کے سوانح حیات کے متعلق ملک میں غیر معمولی غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے اور بعض حلقوں میں کوشش کی جا رہی ہے کہ یہ غلط فہمی ترقی پاتی رہے۔ نہ صرف یہ بلکہ ان غلط فہمیوں پر ایک عالی شان عمارت تعمیر کردی جائے تاکہ ملک کے گوشہ گوشہ میں اُس کی پرستش ہونے لگے اور ضعیف الایمان افراد اُس پر عقیدت کے پھول نچھاور کرنے لگیں۔ یہ اہم ذمہ داری ایک مجلس کے زیرِ نگرانی پرورش پا رہی ہے جس کی کمیٹی انتظامیہ کے صدر مہاراجہ صاحب کولہاپور ہیں۔ گزشتہ دس بارہ برس میں اس کمیٹی نے دس لاکھ روپیہ کی گراں قدر رقم جمع کی اور ستر ہزار روپیہ صرف کرکے سیواجی کا مجسمہ تیار کیا گیا۔ ۱۶ جون ۱۹۲۸ء کو گورنر بمبئی نے بڑی آن بان کے ساتھ اس مجسمہ کو بے نقاب کرنے کی رسم ادا کی جس عمارت میں یہ مجسمہ نصب کیا گیا ہے دو لاکھ روپیہ میں تیار ہوئی ہے۔ اور اس عمارت کی بنیاد پرنس آف ویلس کے مبارک ہاتھوں سے رکھی گئی تھی کمیٹی کے پاس اب بھی پانچ لاکھ روپیہ موجود ہے اور اس رقم سے کوشش کی جا رہی ہے کہ سیواجی کے متعلق ایک تاریخی یادگار قائم کردی جائے۔ اور اُس کے دامنِ کردار پر جو بدنما دھبے ہیں دور کردیے جائیں۔

دل آزاری اور بے جا نکتہ چینی ہمارا شیوہ نہیں، ہم تاریخی واقعات کو جن کا تعلق سیواجی سے ہے علمی روشنی میں پیش کرنا چاہتے ہیں اور ملک کے سامنے اس قومی لیڈر کے وہی خد و خال پیش کریں گے جو تاریخی کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ سیواجی کے زمانے کا تاریخی حال کثرت سے موجود ہے۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ بے تعصب اور غیر جانب دار ہوکر واقعات پر غور کیا جائے اور صحیح نتائج اخذ کیے جائیں۔

۱۶۵۷ء میں شاہ جہاں صاحبقراں کی اچانک علالت ہندوستان کی تاریخ کا ایک اہم ترین واقعہ ہے جس کے اثرات

صدیوں تک ملک میں اپنے کرشمے دکھاتے رہے، اس واقعہ نے سلطنت مغلیہ کے گوشہ گوشہ میں ایک تہلکہ مچا دیا۔ نہ صرف یہ بلکہ دکن کی سیاست میں انقلابات کا ایک نیا باب کھول دیا، بھائیوں کی وہ خونخوار جنگ بھی کس قدر اہم تھی کہ جس نے ایک کو تو تخت طاؤسی کا مالک بنایا، اور دوسروں کو قبل از وقت فنا کا جام پلایا، حریف بھائی خاموشی سے جنگی تیاریوں میں پہلے ہی سے مصروف تھے، اپنے پدر نامدار کی علالت کی خبر سُن کر فوراً دہلی کی جانب کوچ کرنے لگے۔ شاہزادہ اورنگ زیب اس وقت بیجاپور کی سلطنت کو قریب قریب زیر کر چکا تھا، بیجاپور کی جانب اُس کی پیش قدمی نہایت کامیاب ہوئی تھی، راستے کے قلعے اس کی شمشیر خارا شگاف کے سامنے سر تسلیم خم کرتے جاتے تھے۔ شہر ایک دوسرے سے انتہائے عبودیت میں گوئے سبقت لے جانے کے لئے آمادہ تھے۔ دکن کا سب سے زیادہ مضبوط قلعہ بیدر ایک دن میں فتح ہو چکا تھا۔ جوش وخروش میں بھرے ہوئے مغل سپاہ دار الخلافت میں پہونچ چکے تھے، اور فاتح صرف فتح وظفر کا طالب تھا، لیکن دہلی کی وحشت ناک خبروں نے کل اسکیم ملیامیٹ کر دی اور معاملات کو جلد جلد سلجھا کر اورنگ زیب شمال کی جانب سرگرم سفر ہوگیا۔ شہزادے کا غائب ہوجانا بیجاپور کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ تھی، نہ صرف یہ کہ یہ سلطنت سیلاب فنا سے محفوظ رہی، بلکہ آزاد ہو کر خود اپنی مقامی پیچیدگیوں کا فیصلہ کرنے لگی۔ شاہ بیجاپور کے لئے تمام وقتوں سے زیادہ اہم سیواجی کی بغاوت کا مسئلہ تھا جس کی جانب متوجہ ہونے کی فوراً ضرورت تھی، لیکن بجائے اس کے کہ مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی قوت کو پامال کیا جاتا دربار بیجاپور میں پھر از سر نو خود غرضی اور ذاتی مناقشات کی ریشہ دوانیاں شروع ہوگئیں۔ ۱۶۵۸ء کا پورا قیمتی سال بیٹھے بٹھائے ضائع کیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیواجی نے اپنے ذرائع وسیع تر کر کے اپنی قوت خوب مستحکم کر لی۔ ۱۶۵۹ء میں باری صاحبہ (ڈواگر کی ملکہ) نے سیواجی کے حملوں کو ختم کرنے کا عزم بالجزم کیا۔ اُس زمانہ میں بھی ملکہ سلطنت کی حقیقی حکمراں تھی، اور اُس کے حزم و تدبر کی دور دور دھاک بیٹھی ہوئی تھی، شاہ علی عادل شاہ نوعمر لڑکا تھا اور ملک کے معاملات کا انتظام وانصرام اسی ملکہ کے ہاتھوں سے ہوتا تھا۔ سیواجی کے باپ شاہ جی کو ہدایت کی گئی کہ وہ اپنے بیٹے کی نافرمانیوں کا سدباب کرے۔ شاہ جی مدت العمر بیجاپور کا نمک خوار اور اطاعت شعار تابع فرمان رہا۔ لیکن اس غریب نے علانیہ عرض کر دیا کہ میرا بیٹا میرے قبضہ سے باہر ہے، حکومت جس طریقہ سے چاہے بغیر اُس کے جذبات کا خیال کئے ہوئے اُسے سزا دے اور اس کی سرزنش کرے۔

افضل خاں نے کہ ایک ہوشیار اور آزمودہ کار سپہ سالار تھا سیواجی کی گوشمالی کی، اہم ذمہ داری اپنے سر

سے لی اور دس ہزار مسلح فوج لے کر بیجاپور سے پونہ کی جانب چل کھڑا ہوا، یہ سن کر کہ دشمن نے پرتاب گڑھ کے نوتعمیر شدہ قلعہ پر قبضہ کر لیا ہے افضل کو اپنا راستہ بدل دینا پڑا، اور چند ہی دن میں وہ وائی پر پہونچ گیا جو ستارا سے بیس میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ بعض ہندو مورخین کا بیان ہے کہ اس کوچ کے دوران میں افضل خاں نے مندروں کے دیتاؤں اور مانیکیشور بندھار پور اور مہادیو کے برہمنوں پر ہزارہا ظلم و ستم کئے، اور تلجاپور کی مشہور دیوی بھوانی کے مجسمہ کو ناپاک کیا، لیکن یہ شدت سے خلاف قیاس ہے کہ اس طرز عمل کا یہ لازمی نتیجہ ہوتا کہ اس نواح کی کل ہندو آبادی کی ہمدردی زائل ہو جاتی، اور کوئی

۱ے - گرانٹ ڈف (جلد اول صفحہ ۱۳۱) پانچ ہزار سوار، اور سات ہزار پیادے

مرہٹہ مورخین مبالغہ سے کام لے کر سپاہ کی اس تعداد کو بڑھانا چاہتے ہیں تاکہ سیواجی کی فتح نمایاں تر شمار کی جا سکے، لیکن اس مبالغہ کی تصدیق اس زمانہ کے کسی مورخ سے نہیں ہوتی۔ سرکار کا یہ خیال کہ عالمگیر نامہ میں "دو ہزار" کی بجائے "دہ ہزار" پڑھنا چاہئے صحیح معلوم ہوتا ہے۔

۲ے - اس زمانہ کے کسی مورخ نے افضل خاں پر یہ اتہامات نہیں لگائے، گو سترھویں صدی کے مرہٹہ مورخین اکثر یہ راگ گاتے ہیں۔ سیواجی کے زمانہ سے قبل مرہٹے بالعموم نہایت وحشی اور غیر مہذب تھے۔ سیواجی نے ان کو سیاست میں متحد کر دیا لیکن چونکہ خود جاہل تھا اس لئے تہذیب و تمدن کے اعلیٰ معیار کو ان کے سامنے پیش نہ کر سکا، اسی وجہ سے مرہٹے اس وقت تک لٹریچر سے عاری تھے، سیواجی کا کوئی ہمعصر مرہٹہ مورخ ملنا ناممکنات میں سے ہے۔ سیواجی پر سب سے پہلی مرہٹی کتاب کرشن جی اننت سبھا ساد کی لکھی ہوئی "شیوا چترا پرچن چرترا" ہے جو ۱۶۹۴ء میں تصنیف کی گئی تھی، مگر اس کی ترتیب تاریخی کاغذات وغیرہ کی مدد سے نہیں کی گئی بلکہ ایک سن رسیدہ شخص کی یاد پر اسے ترتیب دیا گیا ہے، سنسکر نے اسے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔

اس کے بعد لکھی ہوئی مرہٹہ تاریخوں میں "سبھا ساد" کو بعض مزید روایات کے اضافہ کے ساتھ دہرایا گیا ہے۔

"ایسی حالت میں جے، این سرکار لکھتے ہیں۔ "حب الوطنی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم مرہٹی تواریخ کو ترجیح دیں (جو بالعموم واقعات سے بہت بعید ہوتی ہیں، اور جن میں شدت سے افسانے و روایات بھرے ہوتے ہیں)، اور انگریزی و فارسی تواریخ کو نظر انداز کر دیں، لیکن یہ قابل اعتبار تاریخ نہ ہوگی۔"

وہ پھر لکھتے ہیں "سبھا ساد بکھار گو سیواجی کے ایک ہمعصر نے لکھی ہے، لیکن وہ حکومت کے کاغذات کی مدد سے نہیں لکھی گئی۔ یہ اس زمانہ میں لکھی گئی ہے جب جنجی کے قلعہ میں راجہ رام محصور تھا اور مہاراشٹر اسے جان بچا کر بیک بینی و دو گوش (بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۳۰)

سردار افضل خاں کو کمک نہ پہونچاتا، حالاں کہ یہ طے شدہ امر ہے کہ وتھاجی ہیت راؤ، کھانڈاجی کھوپڑے وغیرہ نے ہر طریقہ سے افضل کو مدد پہونچائی۔

افضل خاں کی آمد کی خبر نے سیواجی کو بہت خائف کر دیا، یقیناً یہ اس کی زندگی کا ایک خطرناک لمحہ تھا، کھلے میدان میں غنیم سے دوچار ہونا اس کے قبضۂ قدرت سے باہر تھا، اطاعت کرنا گویا ماضی کے کارناموں اور مستقبل کی امیدوں پر پانی پھیر دینے کے مترادف تھا، اُس نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا، لیکن اُن کی رائے اُسے مفید معلوم نہ ہوئی اُس نے خود غور کیا اور اس فیصلہ پر پہونچا[۱]۔ اور افضل خاں کے پاس ایک نہایت عاجزانہ پیام بھیجا۔ خافی خاں کہتا ہے "مکار بدمعاش نے مقامی تحائف بھیج کر اپنے عجز و انکسار سے افضل خاں کو رام کر لیا[۲]۔ اس نے سوچا کہ صلح و امن کے ساتھ معاملہ کے طے ہو جانے میں میرا وقار زیادہ بڑھے گا بہ نسبت اس کے کہ میں ایک طویل جنگ چھیڑ دوں، دوستی کا حیلہ کرنا جنگ کرنے سے بہتر تھا اس لئے اُس نے پیام بر جماعت کا خوش اخلاقی سے خیر مقدم کیا، اور اپنی پوری اطاعت گزاری کا یقین دلایا[۳] میں حکومت سے آپ کے لئے اور زیادہ اعزاز و فوجی سامان کا بند و بست کر دوں گا، اگر آپ دربار میں حاضر ہونا چاہیں گے آپ کا خیر مقدم کیا جائے گا۔ اگر آپ حاضری پسند کریں گے تو آپ کو حاضری سے مستثنےٰ کر دیا جائے گا" ان الفاظ میں سردار نے سیواجی کی دل جوئی کی۔

سیواجی نے پرتاب گڑھ میں نیتاجی پالکر اور رمورو ترمیک پنگل کو معہ فوج کے طلب کیا تھا، اس پیام لانے والے کا اُس نے فراخ دلی اور خوش اخلاقی سے استقبال کیا، اُس نے کچھ ایسا انتظام کیا تھا کہ رئیس وفد کرشن جی بھکر کے

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ اس قلعہ میں پناہ گزیں ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس حالت میں وہ کسی قسم کے کاغذات اپنے ساتھ نہ لا سکتا تھا"
پیا سنے بکھار میں غیر معتبر روایات کا انبار ہے جو اکثر غلط ہیں، جن میں افسانے، معجزے اور بازاری گپ کثرت سے موجود ہیں۔ مگر واقعات اور صحیح تاریخ کا پتہ بہت کم چلتا ہے۔" (سیواجی سرکار صفحہ ۴۴، ۸۴)

[۱]۔ سبھاسات کہتا ہے کہ بھوانی دیوی خواب میں بشارت دے گئی تھی اور دشمن کے خلاف پوری مدد کا وعدہ کر گئی تھی۔

[۲]۔ رلیٹ جلد ساتویں صفحہ ۲۵۹

[۳]۔ بعضے مرہٹہ مورخ کہتے ہیں کہ کرشن جی بھکر افضل خاں کا ایلچی تھا۔ سرکار کہتا ہے کہ یہ زمیندار تھا۔ گرانڈ ڈف کا خیال ہے کہ کرشن جی کا آدمی تھا اور افضل خاں کے ایلچی کا نام انتوجی گوپی ناتھ تھا۔ سبھاساد کی جلد اول صفحہ ۱۲۳ پر یہ عبارت درج ہے: (باقی بر صفحہ آئندہ)

جائے قیام وفد کے اور افراد کی جائے اقامت سے قدرے فصل پر ہو، یہ انتظام اس لئے کیا گیا تھا کہ سردارِ وفد سے اطمینان کے ساتھ خفیہ گفتگو ہو سکے۔

رات کے وقت سیواجی رئیس وفد سے تنہائی میں ملا اور اُسے اپنی جانب ملتفت کرنے کی ترغیب دی اور جہاں تک ممکن ہو سکا برہمن کے مذہبی جذبات کو مشتعل کیا۔ یہ کہا کہ میں اپنے ذاتی نفع کی غرض سے جنگ نہیں[۱] کر رہا ہوں بلکہ میری زندگی کا مقصد یہ ہے کہ میں گئو ماتا اور برہمن داتا کی حفاظت کروں۔ یہ احکام خداوندی کی پیروی ہے[۲]۔ اس اپیل کے ساتھ ساتھ اُس نے اُس کو اور اُس کی نسل کو موضع ہیورا بطور انعام کے بخش دینے کا وعدہ کیا۔ غریب برہمن لالچ کے پھندے میں پھنس گیا۔ اور اُس نے اپنی خدمات سیواجی کی خدمت میں پیش کیں۔ اسی غدار برہمن کی مدد سے سیواجی افضل خاں پر قاتلانہ حملہ کر سکا۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اس برہمن نے بیجاپور کیمپ میں سیواجی کے خلاف سازش کی اطلاع کی تھی۔ لیکن یہ بات اب تک پایۂ ثبوت کو نہیں پہونچی ہے[۳]

بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ ——— "اس اثنا میں پنتوجی پنتھ افضل خاں کا ایلچی وارد ہوا۔ پنتوجی پنتھ رات کو بھی طلب کیا گیا۔ کیوں کہ ایک خفیہ مجلس منعقد ہوئی جس میں صرف بادشاہ اور پنتوجی موجود تھے"

مختلف بھکار میں یہ نام مختلف صورتوں میں لکھا گیا ہے۔ چتر اگپتا۔ اسے دتاجی گوپی ناتھ لکھتا ہے حالاں کہ سبھاساد اور رشیدھ گوکر میں یہ پنتوجی پنتھ مرقوم ہے۔

۱۔ لائف آف سیواجی (Takakhav) میموریل ایڈیشن صفحہ ۱۵۸

۲۔ Ibid

۳۔ سیواجی کے مداحین نے بھکار کے وثوق پر یہ نظریہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ افضل خاں نے سیواجی کے خلاف ایک سازش کی تھی۔ پروفیسر سرکار ایک خط پیش کرتے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیجاپور کی رانی نے عبداللہ خاں کو دس ہزار سوار و پیادوں کے ساتھ روانہ کیا تھا۔ یہ جانتے ہوئے کہ وہ اتنی قوت سے سیواجی کا مقابلہ نہیں کر سکتا اُس نے خان موصوف کو مجبور کیا کہ وہ پہلے دست داری کا بہانہ کرے جیسا کہ کیا گیا۔ (۱۰ر اکتوبر ۱۶۵۹ء اف۔ آر راجہ پور)

ظاہر ہے کہ راجہ پور کے عائدین ان ہدایات سے واقف نہیں ہو سکتے تھے کہ جو ملکہ نے خان موصوف کو دی تھیں۔ اغلباً افضل خاں کی صلح پسندی اور سیواجی کی بڑھتی ہوئی طاقت کی وجہ سے انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ——— دوستی کا حیلہ کرنا اغلباً اس وجہ سے عمل میں آیا کہ سیواجی اور مغلوں کے اتحاد کا خطرہ تھا۔ بیجاپور کی حکومت کو یہ علم تھا کہ دہلی سے فارغ ہونے کے بعد ہی اورنگ زیب کی فوج اُن کے ملک پر آدھمکے گی۔ بقیہ نوٹ صفحہ آئندہ

علاوہ اس کے کہ اُن کی شہادت ضعیف ہے اس معاملہ کے حالات سب اس کے خلاف شاہد ہیں۔ بیجاپوری نہ اورنگ زیب کے حملہ کو بھولے تھے اور نہ مغل فوج میں سیواجی کے داخل ہونے کی آرزو انھوں نے فراموش کی تھی۔ وہ مرہٹوں کو اس قدر تنگ نہیں کرنا چاہتے تھے کہ وہ مجبور ہو کر مغلوں سے سازگاری کرلیں۔ دراصل ان کا مقصد یہ تھا کہ جس طریقہ سے ہو مفاہمت ہو جائے افضل خاں کے یہ الفاظ کہ وہ سیواجی کو زندہ گرفتار کر کے شاہ بیجاپور کے قدموں پر ڈال دے گا حقیقت میں سیواجی کو مطیع کرنے کے خیال کا ایک مبالغہ آمیز پیرایہ بیان ہے۔ سیواجی کی دوستی کا دم بھرتا ہوا برہمن اپنے آقا کے کیمپ میں واپس ہوا اور اُن شرائط کو بتایا جن پر ملاقات کا انتظام کیا گیا تھا۔ افضل خاں نے اپنی جانب سے پوری احتیاط و حفاظت کا وعدہ کیا اور ملاقات کے لئے ایک چھوٹی سی پہاڑی پرتاب گڑھ کے قلعہ کے قریب تجویز ہوئی۔ سیواجی کے حکم سے بیجاپور کی فوج کے لئے جنگل کاٹ کر راستہ بنا دیا گیا تھا اور رسد رسانی کا انتظام بھی سیواجی نے اپنے ذمہ لے لیا تھا۔

سیواجی نے جو ملاقات کی تیاریاں کیں اُن سے اُس کے مکارانہ ارادوں کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ معمولی لباس کے نیچے اس کے جسم پر ایک مکمل زرہ اُس کے سر پر پگڑی کے نیچے ایک خود سید سے ہاتھ کی آستین میں ایک چھوٹا سا پیش قبض اور بائیں ہاتھ میں ایک پنجۂ فولادی۔ جیومحل، اور شنبھوجی کاب جی دو شہرۂ آفاق قاتل جو اپنی بہادری اور غیر معمولی چالاکی میں یکتائے روزگار تھے سیواجی کے ساتھ گئے اور اُس کے رخصت ہونے کے وقت تمام وہ مذہبی مراسم ادا کئے گئے جو موت کے موقع پر ادا کئے جاتے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اُس نے قیمتی تحائف دے کر برہمنوں کو شمالی ہند کے متبرک مقامات کی جانب روانہ کیا اور اپنی بوڑھی ماں کی دعائیں لے کر افضل سے ملنے چلا۔

اُسے علم تھا کہ اس دغابازی کا خاتمہ جنگ پر ہوگا اس لئے اُس نے پرتاب گڈھ کے قلعہ کو محاصرے کے لئے تیار کر دیا تھا۔ قلعہ بندی مستحکم طور سے کی جا چکی تھی، اور فوج کو ضروریات کا کل سامان فراہم کر دیا گیا تھا۔ قلعہ کے باہر بہادروں کے چھوٹے چھوٹے گروہ جھاڑیوں میں چھپے ہوئے تھے اور آزمودہ کار سپاہیوں کی ایک مضبوط جماعت جائے ملاقات کے قریب تک سیواجی کے ساتھ جانے والی تھی۔

یہ راز صرف تین مرہٹہ عمائدین کو معلوم تھا۔ نیتاجی پلکار۔ موروپنتھ اور تاناجی مالوسرے۔ اس کا انتظام کیا گیا تھا کہ کام کے

بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ۔ اس لئے اپنے باغی سردار سے اپنے ہی ملک میں باقاعدہ جنگ کرنا خلاف مصلحت تھا۔ دوست داری کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی۔

ختم ہوتے ہی بگل کی آواز ہوگی۔ یہ آواز نیتاجی کی پیش قدمی کا اشارہ تھا اور موروپنت قلعہ سے پانچ توپوں کی آواز سن کر حرکت کرے گا۔

اس کے برخلاف افضل خاں ایک ہزار سپاہیوں کے ساتھ روانہ ہوا اور نیک نہاد برہمن اسی بات پر زور دیتا رہا کہ سپاہیوں کی اس قدر کثیر تعداد سے شاید سیواجی شبہ میں پڑ کر صلح نہ کرے۔ سادہ مزاج خان، چالاک مرہٹہ کے اطاعت سے لبریز پیامات سے متاثر تھا۔ اور دغا باز ایلچی کی ریشہ دوانیوں سے بے خبر۔ اس لئے اس بات پر آمادہ ہوا کہ یہ کل فوج کا دستہ دور از مقام ٹھہر جائے۔ چنانچہ وہ خان موصوف ایک پالکی میں سوار ہوا اور دو باڈی گارڈ کے سپاہی لے کر ملاقات کے لئے چل دیا ان میں سے ایک مشہور سپاہی سید بندہ تھا۔

اس کے تھوڑے ہی دیر بعد سیواجی قلعہ سے اترتا ہوا نظر آیا۔ اس نے بے انتہا خوف زدہ ہونے کا بہانہ کیا گویا وہ تھر تھر کانپ رہا ہے اور چلنے سے قاصر ہے وہ اپنے گزشتہ گناہوں پر گویا رو رہا تھا اور التجا کر رہا تھا کہ خان موصوف کے باڈی گارڈ کے سپاہی بھی دور ہٹا دیئے جائیں۔

سیواجی کے آتے ہی افضل خاں اس کی پیش قدمی کے لئے چند قدم آگے بڑھا۔ سیواجی بہت جھک کر تسلیمات بجا لایا خان موصوف مسلمانی طریقہ پر دوستانہ انداز میں بغلگیر ہوا۔ سیواجی پست قد تھا، افضل خاں کے شانوں تک پہنچتا تھا، اسی حالت میں سیواجی نے افضل خاں کے پیٹ میں پیش قبض پیوست کر دیا[1]۔ یکلخت آنتیں باہر نکل پڑیں۔ مجروح سپہ سالار نے کوشش کر کے اپنی تلوار چلائی جو حریف کے خود سے جا کر ٹکرائی۔ خان موصوف کے سست پڑنے والے ہاتھوں سے اپنے آپ کو

---

[1] اس مقام پر بھی پروفیسر سرکار اور دوسرے مورخ جو مرہٹہ لٹریچر پر اعتماد کرتے ہوئے یہ بیان کرتے ہیں پہلے افضل خاں نے ہی بغل تنگ کر کے حملہ کا ارادہ کیا تھا اور اس کے بعد سیواجی پیش قبض کو کام میں لایا۔ مگر یہ خیال بعید از قیاس ہے۔ سیواجی نے پہلے ہی سے قتل کا ارادہ کر لیا تھا اور اس لئے یہ خلاف عقل معلوم ہوتا ہے کہ وہ دشمن کو حملہ آور ہونے کا موقع دیتا۔ یقیناً ان مورخین کے خیال سے سیواجی کی دانشمندی کہیں بڑھ چڑھ کر تھی۔ اسی طور سے اگر خان موصوف سیواجی کو زندہ پکڑنے کا آرزومند ہوتا تو وہ اپنے ساتھیوں کو ہٹانے کی غلطی نہ کرتا اور نہ سیواجی کو اجازت دیتا کہ وہ اپنے ساتھی اس قدر قریب لا سکے۔ علاوہ ازیں اگر وہ سیواجی کو قتل کرنا چاہتا تو اس سے بغلگیر ہو کر وہ اپنے ہاتھ بے کار نہ کر لیتا۔ اس لئے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ خان موصوف نے دشمن کو مشتعل ہونے کا کوئی موقع نہ دیا۔ اس خیال کی تصدیق کسی مستند کتاب سے نہیں ہوتی سوائے ایک خط کے جو سیواجی نے رام داس کو تحریر کیا تھا۔ مگر اس خط کی صداقت بہت مشتبہ ہے۔

چھڑا کر سیواجی بھاگ نکلا اور افضل خاں چلاتا رہا۔

"دغا بازی! قتل!! مدد، مدد!!!"

یہ دیکھتے ہی بھاگتے ہوئے مرہٹے پر سید بندہ حملہ آور ہوا اور غنیم کے سر پر تلوار کی ایک ضرب ماری۔ لیکن پیچھے سے جیو محل نے سید کا سیدھا بازو کاٹ ڈالا۔ پالکی کے کہار مرتے ہوئے آقا کو لے کر بھاگے لیکن کاوجی نے ان کی ٹانگیں کاٹ ڈالیں اور پالکی زمین پر گر گئی۔ خاں موصوف کا سر کاٹ کر کاوجی سیواجی کے پاس بطور سوغات لے گیا۔ یہ سر ایک برج (عبداللہ برج) کے نیچے دفن کر دیا گیا جو جنوب میں مشرقی جانب کو قلعہ کے نیچے واقع ہے۔[۵۱]

سیواجی کے قلعہ کی جانب واپس ہوتے ہی حملہ کا اعلان کر دیا گیا۔ اور وہ مرہٹہ سپاہ جو جھاڑیوں میں چھپے بیٹھے ہوئے تھے نکل کھڑے ہوئے اور بیجاپور کی فوج پر ٹوٹ پڑے۔ سپہ سالار کی عدم موجودگی میں بغیر تیاری کے اس فوج کا دیر تک مقابلہ کرنا ناممکن تھا۔ چنانچہ کچھ گھنٹہ بعد اس فوج نے ہتھیار ڈال دیئے اور مرہٹوں نے ایک کثیر تعداد میں اُن کو تہ تیغ کیا۔[۵۲] ہاتھی اور اونٹ بھی دشمن کی زد سے نہ بچ سکے۔ پروفیسر سرکار کہتے ہیں کہ مال غنیمت بہت کثیر تھا۔ تمام توپ خانہ، گاڑیاں، گولہ بارود خزانہ، خیمہ و خرگاہ، باربرداری کے جانور گویا ایک مکمل فوج کا کل ساز و سامان دشمن کے ہاتھ لگا۔ ان میں ۶۵ ہاتھی چار ہزار گھوڑے۔ بارہ سو اونٹ، دو ہزار کپڑوں کے بنڈل اور دس لاکھ روپیہ نقد تھا۔[۵۳]

سیواجی نے اپنے ساتھیوں کو انعام و اکرام سے مالا مال کیا اور بیجاپور کے وہ سردار جو قید کر دیئے گئے تھے رہا کر دیئے گئے۔

۵۱۔ سرکار کی تصنیف کردہ Shivaji and His Times ــــــ افضل خاں کا دوسرا نام عبداللہ خاں

۵۲۔ سرکار ایک بیان پیش کرتے ہیں کہ تمام اُن افراد نے کہ جو پناہ کے متلاشی ہوئے اور اپنے دانتوں کے درمیان گھاس لیکر کھڑے ہو گئے چھوڑ دیئے گئے۔ اور باقی سب تہ تیغ کر ڈالے گئے۔ بالعموم سیواجی اپنے قیدیوں کے ساتھ بے رحمی کا برتاؤ نہ کرتا تھا سوائے اُن لوگوں کے ساتھ کہ جن کے دولت مند ہونے کا اُسے یقین ہو جاتا تھا اور جن کے ساتھ وہ ہر قسم کی دراز دستی کرنے پر تیار ہو جاتا تھا (ملاحظہ ہو گرانٹ ڈف جلد اول صفحہ ۱۰۶)

روپیہ کا وہ اس قدر طالب تھا کہ وہ اپنے قیدیوں پر ہر قسم کا ظلم کرتا تھا۔ کم از کم کبھی ایک ہاتھ کاٹ ڈالتا کبھی دونوں۔

Shivaji and The Partal Tragedy ۔ ۱۹۲۶ء اپریل ، (Times of India)

۵۳۔ خافی خاں (جلد دوم صفحہ ۱۱۷) صحیح اعداد بیان نہیں کرتا بلکہ معمولی الفاظ میں اس سامان کا ذکر کرتا ہے جو دشمن کے ہاتھ لگا۔

افضل خاں کا خاندان مع اس کے لڑکے فضل خاں کے مرہٹہ سپہ سالار کی چشم پوشی کی وجہ سے بھاگ کھڑا ہوا اور یہ سوار مسمی کھانڈوجی کھوپڑے سیواجی کے حکم سے اس جرم میں قتل کیا گیا۔[ا]

سیواجی کی کامیابی ہر حیثیت سے مکمل تھی۔ علاوہ اس مال غنیمت کے جس کی تفصیل ہم ابھی دے چکے ہیں۔ افضل خاں کے قتل سے اس کے قاتل کی قوت اور عظمت مستحکم کر دی، اور لوگ اس درخشاں کامیابی سے خیرہ ہو کر اس امر کی جانب ملتفت نہ ہوئے کہ یہ کامیابی کیسے ناجائز وسائل سے حاصل کی گئی ہے۔ یہ ظاہر تھا کہ سیواجی نے بیجاپور کی ایک مضبوط اور مرتب فوج کا مقابلہ کیا اور اسے پامال کر دیا۔ یہ نقطہ اس کی زندگی میں ایک نیا باب کھولتا ہے۔ اب تک وہ مال دار زمینداروں اور چھوٹے چھوٹے راجاؤں پر دستِ تعدی دراز کرتا تھا اور اسی وجہ سے اس کی حیثیت ایک قزاق اور لٹیرے کی سی تھی۔ ایسی لوٹ مار اس زمانے کے حالات دیکھتے ہوئے کوئی غیر معمولی بات بھی نہ تھی لیکن اس واقعہ نے لوگوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا کر دیا کہ وہ جنوبی ہند کے سب سے زیادہ ذی اقتدار حکمراں کی کامیابی کے ساتھ سرزنش کر سکتا تھا، نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ اعزاز اور وسائل کے بڑھتے ہی اس کا دائرۂ عمل وسیع تر ہو گیا۔ وہ بالطبع جری تھا۔ افضل خاں کے واقعہ نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ کبھی وہ بیجاپور کی فصیل تک جا دھمکتا اور کبھی شاہ دہلی کی رعایا پر ظلم و ستم کرتا۔

سیواجی کی حیات میں افضل خاں کی شکست ایک انقلاب پیدا کرنے والا واقعہ ہے۔ مگر جن وسائل سے یہ فتح حاصل کی گئی وہ ہر زمانہ میں ناجائز اور ناقابل معافی تصور کی جائے گی۔ قرونِ وسطےٰ میں انسانی زندگی کی قدر و قیمت نسبتاً کم تھی مگر اس زمانہ کا جنگی اخلاق بھی اس طرز عمل کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ سیواجی کے مداحین اس اخلاقی دھبہ کو اپنے ہیرو کے دامن سے دھونے کی کوشش کرتے ہیں اور بیان کرتے ہیں کہ یہ طرز عمل محض مدافعت کی بنا پر کیا گیا تھا۔ انھوں نے ان واقعات کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ خود افضل خاں عہد شکنی پر کمربستہ تھا، اور سیواجی محض اپنی جان بچانے کے لئے یہ کر گزرا۔ مگر جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں یہ خیال بعید از قیاس بھی ہے اور خلاف عقل بھی۔ ہمارے پاس جس قدر مستند تاریخی مواد موجود ہے اور جس کا حوالہ ہم اوپر دے آئے ہیں وہ سب اس کے منافی ہے۔

[ا] یہ افسانہ کہ روانگی سے قبل افضل خاں نے اپنی بیویوں کو پانی میں ڈبو دیا تھا غلط ہے اس کا خاندان اس کی شکست کے بعد افضل خاں کے ساتھ ملا ہوا تھا۔

ہم شروع ہی میں یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ اس واقعہ سے تھوڑے ہی زمانہ پہلے سیواجی نے کئی موقعوں پر دغابازی کی تھی اور اُس کے طرزِ عمل سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اُسے حمیت سے کوئی سروکار نہ تھا۔ شنبھوجی موہیت اُس کا ماموں سیواجی کی جاگیر کا محافظ تھا۔ سیواجی نے بغیر کسی معقول وجہ کے اُسے قید میں ڈال دیا۔[1] پروندھار کے قلعہ پر بھی دغابازی کے ذریعہ سے قبضہ ہوا تھا۔ ملکت نایک بیجاپور کی سرکار کی طرف سے اس قلعہ کا محافظ تھا۔ اُس نے تین بیٹے چھوڑے جو اُس کے بعد ہی خانہ جنگی پر کمربستہ ہو گئے۔ سیواجی کو معاملات کے طے کرنے کے لئے بلایا گیا۔ اس نے قلعہ کا معائنہ کرنے کے بہانہ سے اُس پر قبضہ حاصل کر لیا۔[2] سنہ ۱۶۹۲ء میں چندر راؤ مور کا قتل ہوا جو اس کی غداری کا ایک روشن ترین ثبوت ہے۔ یہ جاؤلی کا سردار تھا۔ اس کی لڑکی سے شادی کرنے کے بہانہ سے آپس میں گفت و شنید شروع ہو گئی اور یہی گفتگو کے وقت سیواجی کے اشارہ پر رگھناتھ نے چندر راؤ مور کو قتل کر ڈالا۔ اس کے قتل کے بعد سیواجی نے جاؤلی پر حملہ کیا اور کاؤجی نے ہنومنت راؤ کو تہ تیغ کیا۔

مسٹر کنکیڈ سیواجی کی تائید میں کہتے ہیں: "یہ ممکن ہے کہ ایلچی کو چندر راؤ کی دیانت پر شبہ ہوا اور آخرالذکر نے سیواجی کے حملہ کی شکایت کی۔ آپس میں گفتگو تیز ہونے لگی۔ میان سے تلواریں نکل آئیں اور سنہ ۱۶۵۰ء میں مور اور اس کے بھائی کا قتل عمل میں آیا۔ اس کے بعد جنگل میں فرار ہو کر سیواجی کے سایۂ عاطفت میں پناہ گزیں ہوئے۔ آخرالذکر نے اپنے ایلچی کو اس قسم کی کوئی ہدایت نہیں کی تھی۔[3]

---

[1] Kincaid اور Parasnis جلد اوّل صفحہ ۱۳۰ کہتے ہیں کہ شاہ جی نے اپنے کل خاندانی جائداد کا انتظام سیواجی کے سپرد کر دیا تھا اور اُس کا ارادہ تھا کہ سنبھو سیواجی کو اپنا آقا تسلیم کرے مگر اس کی کوئی مستند شہادت نہیں اور یہ روایت ضعیف معلوم ہوتی ہے۔ شاہ جی اپنی دوسری بیوی تکا بائی مہتہ سے بہت زیادہ مانوس تھا اور اُس کے خاندان میں سوائے سیواجی کی ماں کے اور کوئی باقی نہ رہا تھا۔

[2] Parasnis جلد اول صفحہ ۱۳۹۔

[3] Kincaid اور Parasnis جلد اول صفحہ ۱۵۰ و ۱۵۱۔ قتل کے بعد ہی سیواجی جاؤلی کے سپاہیوں پر ٹوٹ پڑا۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ سازش پہلے سے کی گئی تھی۔ اور رگھناتھ کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اس جرم کا ارتکاب کرے۔

اس کے بیان کی رو سے مور کے قتل میں سیواجی سراسر بے گناہ ہے۔[1]

ان مثالوں سے یہ خوب واضح ہوتا ہے کہ اس قسم کے جرائم کے ارتکاب میں کوئی اخلاقی خیال سیواجی کے سدِ راہ نہ ہو سکتا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ اس کے برعکس ان غدارانہ سازشوں میں جو سیواجی کو کامیابی حاصل ہوئی اس سے یقین ہے کہ اُس کے ذہن میں اس طرزِ عمل کی کامیابی ذہن نشین ہو گئی ہوگی۔ اور یہ اس کی صریحی غلطی ہوتی کہ وہ بیجاپور کے باقاعدہ اور مرتب فوج سے کھلے میدان میں جنگ کرتا۔ وشواس راؤ نانا پربھو جو غنیم کی قوت دیکھنے کی غرض سے ایک فقیر کے بھیس میں بھیجا گیا تھا یوں بیان کرتا ہے ـــــ تاکاخاں کہتا ہے۔

"اس مشن کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیواجی کو افضل خاں کی شان وار تیاریوں کا پتہ چل گیا اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اگر فتح حاصل ہوگی تو کس قدر قیمتی ہوگی۔"

"پس سیواجی نے اپنی فوج کی قلت کو چالاکی اور مکاری سے پورا کرنے کا ارادہ کر لیا، اور اس قسم کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا، ارادے کو مستحکم کر کے اُس نے اطاعت شعاری کا بہانہ کیا۔ اور افضل خاں کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ میں ایسا نادان نہیں ہوں کہ ایسے آزمودہ کار سپہ سالار سے جنگ کرنے کی ہمت کروں اور اب میں سوائے اس کے اور کوئی آرزو نہیں رکھتا کہ حکومت بیجاپور کے سامنے سرِ تسلیم خم کروں، اور امن و آشتی میں اپنی بقیہ عمر گزاردوں"[2] سیواجی کی تدبیر یہ تھی کہ اطاعت شعاری کے بہانہ سے افضل خاں کو رام کر لے، اور ملاقات کے وقت بے خبری کے عالم میں اس کو قتل کر ڈالے۔ اس مقصد کے حاصل کرنے میں اُسے اُس بدنہاد برہمن سے مدد ملی جو جاگیر کے صلہ میں ایمان فروشی پر تیار ہو گیا۔

---

[1] ۔ سرکار نے یہ ثابت کر کے کہ سیواجی مور کے غدارانہ قتل کا ذمہ دار ہے۔ یہ تقریر درج کی ہے اور مسٹر کنکیڈ کے خیالات کے متعلق یہ رائے ظاہر کی ہے۔ "ستارا کے ذی علم جج نے جس طریقہ سے شہادت کو جانچا ہے اور نتائج اخذ کئے ہیں وہ میرے لئے بے حد حیرت انگیز ہیں۔ اور بیرونی طالب علم یہ باور کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ Indian civil service کے ایک نوآموز جج ہندوستان میں اس طریقہ سے انصاف کرتے ہیں۔ وہ مورخ جو شہرت کا آرزومند ہو صداقت کو ہردلعزیزی پر ترجیح دے گا۔" (Sarcar's Sivaji PP. 53 و 54)

[2] ۔ حیات سیواجی از Takakhar میموریل اڈیشن صفحہ ۱۰۶

خان موصوف اس خونخوار سازش کا شکار اس لئے ہوگیا کہ اُس نے ایک طویل جنگ پر امن پسندی کو ترجیح دی ایسے طاقتور لٹیرے کو ایک اطاعت شعار سردار بنا نا سراسر دانشمندی تھا بالخصوص ایسے بد امنی اور سیاسی انتشار کے زمانہ میں اگر سیواجی کو غداری سے ہلاک یا گرفتار کرلیا جاتا تو کینہ پرور مرہٹوں کی ایک بڑی جماعت مقابلہ کے لئے آمادہ ہوجاتی کیوں کہ سیواجی نے ایک بڑے گروہ کی سرداری حاصل کر کے ان میں قتل و غارت گری اور آزادمنشی کا جذبہ پیدا کردیا تھا جس کو محض قوت سے پامال کرنا ناممکن تھا اور اسی لئے افضل خاں غداری کے لئے آمادہ نہ ہوا کہ اس سے خطرے کے بڑھنے کا خیال تھا۔

علاوہ ازیں معاملہ کے حالات خان موصوف کے ارادوں کی صداقت ظاہر کرتے ہیں۔

وائی کے کیمپ میں اس کے پاس ایک ہزار سپاہیوں کا دستہ موجود تھا مگر برہمن کے اصرار پر اُس نے اس دستہ کو واپس کردیا اور میدان میں محض چار ہمراہیوں کو لے کر آموجود ہوا۔ اُس وقت اُس کے پاس سوائے ایک تلوار کے اور کوئی ہتھیار نہ تھا اور یہ تلوار بھی سیواجی کے خلاف استعمال کرنے کی غرض سے نہیں لائی گئی تھی۔ حریف کی درخواست پر اُس نے اپنے مختصر سے ساتھیوں کو بھی دور ہٹا دیا۔ بغیر سیواجی سے اسی قسم کا اصرار کئے ہوئے۔ کیا ایک دغا دینے والا قاتل بھی احتیاط کرے گا؟ خان موصوف خود بھی مخلص تھا اور سیواجی کے اخلاص پر اعتماد کرتا تھا۔ اسی لئے اسے کسی احتیاط کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔

پروفیسر رحمٰن کا یہ سوال "اگر افضل خاں غداری پر آمادہ تھا تو اُس نے اپنی فوج کو حملہ کرنے کے لئے یا کم از کم اپنی مدافعت کے لئے کیوں نہ تیار رکھا؟" بہت پُر معنی ہے۔ سرکار اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ سیواجی کی موت اُس کی نوساختہ قوت کو فوراً تباہ کردیتی اور اس کی فوج پر کسی حملہ کی ضرورت نہ ہوتی۔ علاوہ ازیں افضل خاں کو دشمن کی افواج کا اندازہ نہیں تھا۔ کیوں کہ مرہٹوں کی دو بڑی بڑی فوجیں منزلیں تیزی سے طے کرتی ہوئی گرد و نواح میں آ چکی تھیں؎۱ ظاہر ہے کہ یہ دلیل محض ایک اعتراض پر حاوی ہوسکتی ہے مگر اُس اعتراض کا بھی کوئی کافی و شافی جواب نہیں ہوسکتا یہ ممکن ہے کہ افضل خاں کو اپنی نادانی کی وجہ سے یہ یقین ہوگا کہ سیواجی کی نوساختہ قوت آن واحد میں تباہ ہوجائے گی۔ اور اس لئے اُسے حملہ کرنے کی کوئی ضرورت نہ ہوگی۔ مگر اُس نے اپنی ذات کو ایسے غیر محفوظ طریقہ سے کیوں معرض خطر

؎۱ ۔ سیواجی مصنفہ سرکار صفحہ ۷۱

میں ڈالا۔ کیا اُسے یہ یقین نہ تھا کہ سیواجی کے پیرو اس قابل بھی نہیں ہیں کہ اُن کے سردار کے تنہا حملہ آور دشمن سے جنگ کر سکیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اپنے حریف اور اُس کے چار آزمودہ کار ساتھیوں کے جتھے میں افضل خاں تن تنہا جا پہونچتا ہے۔

یہ بیان کہ افضل خاں مرہٹوں کی قوت سے واقف نہ تھا، سراسر مہمل اور لغو معلوم ہوتا ہے۔ خود پروفیسر سرکار لکھتے ہیں "سیواجی کی فوجی طاقت ایسی نہ تھی کہ اس کی طرف توجہ نہ کی جاتی اور بیجاپوری سردار مغربی پہاڑوں اور جنگلوں میں لڑنے کے لئے آسانی سے تیار نہ ہوتے۔ بیجاپوری دربار میں اس مہم کی سرداری سوائے افضل خاں کے اور کسی نے قبول نہ کی[1]۔ مزید برآں افضل خاں کے ساتھ فوج کا ایک مضبوط رسالہ روانہ کیا گیا۔ ان سب باتوں سے یہ ظاہر ہے کہ سیواجی کی قوت کا اندازہ بیجاپور کے دربار میں ہر شخص کو بخوبی تھا۔ خود افضل خاں وائی کا گورنر رہ چکا تھا اور اُسے جاؤلی کے اطراف وجوانب کے کل حالات معلوم تھے[2]۔ یہ ممکن ہے کہ افضل خاں کو مرہٹہ افواج کے آنے اور مرہٹہ سپاہیوں کے جھاڑیوں میں پوشیدہ ہونے کا علم نہ ہو مگر اُسے یہ بخوبی معلوم تھا کہ پرتاب گڑھ کا قلعہ سیواجی نے بخوبی مستحکم کرلیا ہے اور اسی مرکز سے وہ شاہی افواج کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہے۔ ظاہر ہے کہ افضل خاں نے اپنی لاعلمی کی وجہ سے نہیں بلکہ سیواجی کے الفاظ پر اعتماد کرنے کی وجہ سے کوئی احتیاط نہ کی اور یہ خیال کیا کہ دشمن مطیع ہوگیا ہے۔

اس کے برخلاف سیواجی کی غدارانہ تیاریاں صاف طور سے ظاہر ہیں۔ روانہ ہونے سے قبل اُس نے غسل کیا اور تمام وہ مراسم ادا کئے جو موت کے وقت ادا کئے جاتے ہیں۔ اس کے بعد اُس نے اپنی خاندانی دیوی بھوانی کی بارگاہ میں دعائیں مانگیں[3]۔ پھر اپنی ماں کی وداعی دعائیں حاصل کیں۔ سپاہیوں کو ہدایتیں کیں اور ان تیاریوں کے بعد افضل خاں سے ملنے روانہ ہوا۔

ایسی زبردست شہادت کی روشنی میں یہ باور کرلینا کہ سیواجی نے جو کچھ کیا وہ محض مدافعت کی غرض سے کیا،

---

[1] - سرکار صفحہ ۲۳۶ اس بیان کی تائید کرتے ہیں۔
Takakhav کہتا ہے "بیجاپوری جنرل اس کا مقابلہ کرنے سے خائف تھے" صفحہ ۱۵۱

[2] .. Kincaid جلد اول، ۱۵۷

[3] Takakhav صفحہ ۱۷۰

سراسر ظلم ہے۔ بدقسمتی سے مرہٹی تواریخ جو نہ معاصرانہ ہیں اور نہ صحیح اور مستند تاریخ پر مبنی ہیں۔ واقعات کو مسخ کرکے اپنے قومی ہیرو کا کیرکٹر بے لوث ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ ایسی تواریخ کے مطالعہ میں احتیاط شرط ہے۔ حالاں کہ بعض اصحاب اُن پر پورے طور سے بھروسہ کرتے ہیں۔ بغیر مستند کتابوں دیکھے اور واقعات کے حالات پر غور کئے نتیجہ اخذ کرنا دانشمندی نہیں۔ اُس زمانہ کی کوئی تاریخ افضل خاں کو غدارانہ ارادوں کا تذکرہ نہیں کرتیں اور اس کے خلاف کثرت سے شہادت موجود ہے [1]

علاوہ معاصرانہ کتابوں کے واقعہ کے حالات ایسے واضح اور روشن ہیں کہ سیواجی کی غدارانہ تیاریوں کا پتہ چلتا ہے۔ اُس کی زندگی میں ایسے واقعات بکثرت ہیں کہ اس نے اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لئے ناجائز اور ظالمانہ وسائل اختیار کئے اور ملاقات کے بہانہ سے لوگوں کو تہ تیغ کر ڈالا۔ اس لئے ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ سیواجی کا یہ فعل مدافعت کی رو سے جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک نہایت مکروہ اور بزدلانہ فعل اُس دشمن کے پامال کرنے کے لئے کیا گیا جس کی شجاعت کی تاب وہ کھلے میدان میں نہ لا سکتا تھا۔

---

[1] گرانٹ ڈف جو سیواجی سات مرہٹی سوانح عمریوں سے بخوبی واقف تھا اور جسے کم از کم سو فارسی و مرہٹی مسودات کا علم تھا جن کا مطالعہ اُس نے اس کتاب کی تیاری کی غرض سے کیا تھا اسی نتیجہ پر پہونچا ہے۔

اُس کے اڈیٹر ایک فٹ نوٹ میں Forrest's کے انتخابات (Maratha Series) جلد اول (۱۸۸۵)، صفحہ ۱ لغایتہ ۲۲ سیواجی کے سوانح عمری کا ایک انتخاب ہے جو وضاحت سے بیان کرتا ہے کہ سیواجی نے افضل خاں پر ایک غدارانہ حملہ کیا تھا۔ Times Literary Supplement ۳ اپریل ۱۹۱۹ء

گرانٹ ڈف آکسفورڈ اڈیشن ۱۹۲۱ء جلد پہلی صفحہ ۱۳۵

ملاحظہ ہو Friarsnum account صفحہ ۱۷۲

رموزِ نہاں

بنائے زندگی یک قطرہ خون ست　　طلسمِ ہستیت کیفِ فسون ست
چنیں شورش کہ داری در حیات　　دلا! بہتر نہ از جوشِ جنون ست

۲

نشاط آگیں خمارِ زندگی نیست　　چمن پیرا بہارِ زندگی نیست
اسیرِ گردشِ فردا و دوش ست　　سکوں پرور قرارِ زندگی نیست

۳

نشاطِ زندگی ناپائدار ست　　طلسمِ دوش و دی بے اعتبار ست
حیاتِ کامراں کس را میسر؟　　کرا پندارِ ہستی سازگار ست

۴

دلا! افسانۂ پروانہ تا چند؟　　تپش چوں آں دلِ دیوانہ تا چند؟
بسوز از خامشی چوں شمعِ سوزاں　　ز اسرارِ وفا بیگانہ تا چند؟

(۵)

تحیر زا طلسم ہست و بود ست　　کرشمہ آفریں بزمِ وجود ست

بہ بیں خونیں قبائے لالہ و گل　　کہ ایں ہنگامہ از جوشِ نمود ست

(۶)

نشانِ زندگی ہست و عدم نیست　　فراز ہستیت در کیف و کم نیست

بہ ہر ذرہ کہ بینی سجدہ ریز　　کمالِ بندگی طوفِ حرم نیست

(۷)

بروں از بندشِ شام و سحر شو　　بلند از پستیِ خاک و شرر شو

حباب آسا مغلط اندریمِ دہر　　فلک پرواز چوں تارِ نظر شو

(۸)

دلا از رمزِ ہستی باخبر زی　　ز سودائے سکوں بیگانہ تر زی

بگیر ایں نکتہ از اقبالِ خوش گو　　"اگر خواہی حیات اندر خطر زی"

(رابعہ خاتون پنہاں بریلوی)

بقائے دوام

از جناب میاں محمد اسلم صاحب لاہور

ہماری مودبانہ التجا پر جناب اسلم صاحب نے اپنی نئی تصنیف " بقائے دوام" کا ایک حصہ اشاعت کی غرض سے مرحمت فرمایا ہے۔ اس میں موصوف نے نہایت محنت و کاوش سے روح کے متعلق مختلف اقوال جمع کئے ہیں۔ کتاب عنقریب شائع ہونے والی ہے۔

اڈیٹر

موت اک زندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

"حیات بعد الممات" ایک ایسا مسئلہ ہے جو ہماری زندگی کے اہم ترین مسئلوں میں شمار ہونے کے قابل ہے۔ ہر فرد بشر کے دل میں یہ خیال قدرتی طور پر پیدا ہوتا ہے کہ "موت" کے وقت ہماری حالت کیا ہو گی۔ کیا ہم کمل طور پر "فنا" ہوں گے۔ اور ان صورتوں کو جن سے ہم جدا ہوں گے۔ پھر بھی کبھی دیکھیں گے یا نہیں۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ مرنے کے بعد "فنا" ہے۔ تو پھر یہ خوف و ہراس کیا ہے۔ لیکن چوں کہ ہم " موت کے خیال سے گھبرانے لگتے ہیں۔ اور گور کی وحشت اور تنہائی کے تصور سے پریشان ہوتے ہیں تو اس سے ظاہر ہے کہ ہمارے دل میں یہ خوف و ہراس موجود ہے کہ مرنے کے بعد ہم پر ایک اور ہی حالت وارد ہونے والی ہے۔

ایک مدت سے لوگ یہ سوچتے چلے آرہے ہیں کہ کیا ہماری حالت ان ستاروں کی مانند ہے جو فضائے عالم میں ایک بار چمک کر ہمیشہ کے لئے ڈوب جاتے ہیں۔ یا ان ستاروں کی مانند ہے جو ایک مدت تک کرۂ ارض کو اپنی چمک دکھا کر آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں، اور ان کی نسبت ہیئت داں یہ کہہ دیتے ہیں کہ اب یہ ستارے اتنی مدت کے بعد فلاں سمت پر پھر نمودار ہوں گے۔

دل یہ تسلیم کرنے کے لئے کبھی آمادہ نہیں ہو سکتا۔ کہ قدرت کا انسان کو دنیا میں بھیجنے سے صرف اتنا ہی مقصد ہے کہ وہ ایک خاص وقت تک زندگی کے مختلف مرحلے طے کر لینے کے بعد قبر کی تاریکی میں روپوش ہو جائے۔ اگر ہم غور و فکر سے کام لیں تو ہم کو خود بخود یہ یقین سا ہونے لگے گا کہ قدرت کا یہ ہرگز منشا نہیں کہ ہم مختلف اوقات میں مختلف طور پر سرگرم عمل رہ کر ہمیشہ کے لئے مٹ جائیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو ہماری یہی سرگرمی ایک اور اہم کام کی تیاری ہے۔ جس کے لئے قدرت خود ہمیں تیار کر رہی ہے۔ لیکن اس سے ہم بالکل بے بہرہ ہیں کہ وہ اہم کام کب اور کہاں شروع ہوگا۔

دانایان فرنگ اسی معمے کو حل کرنے کے لئے مدت سے غور کر رہے ہیں۔

یہود کی کتابوں میں مذکور ہے۔

"جس طرح زمین اور آسمان کی بلندی کے درمیان ایک غیر محدود فاصلہ ہے اسی طرح میرے خیال کی وسعت بھی انسان کے فہم و ادراک کی وسعت سے بے انتہا پرے واقع ہوئی ہے۔"

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہم غور و فکر سے جتنا کام لیتے ہیں۔ اسرار قدرت ہم پر اتنے ہی واضح ہوتے جاتے ہیں۔ اور ناظم عالم کی اعجاز نمائیاں صاف صاف دکھلائی دیتی ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہماری حد نگاہ اور وسعتِ خیال جہاں تک پہنچتی ہے اس کی وسعت پرواز سے اور بھی پرے ایسے ایسے اسرار موجود ہیں جن تک ہمارے فہم و ادراک کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ انسان کی بالکل وہی حالت ہے جو ایک شخص کی کسی ریگستان میں جا کر ہو جاتی ہے۔ جہاں اسے "سراب" پر "چشمہ" کا دھوکا ہوتا ہے۔ وہ اس فریب سے بچنے کے لئے بار بار اپنی آنکھیں کھولتا اور بند کرتا ہے حالاں کہ "سراب" اور "چشمہ" دونوں اس ریگستان میں موجود ہیں اور ان دونوں میں امتیاز کرنا ہمارا اپنا کام ہے۔ اگر ہم اپنی نگاہ کو حقیقت بینی کا خوگر کریں گے تو "سراب" پر "چشمہ" کا دھوکا نہ کھائیں گے۔

ٹیلیفون جو زمانۂ حال کی ایجاد ہے اس سے لوگوں نے سمندر پار ایک دوسرے سے گفتگو کی ہے اور ایک انسان کی آواز دوسرے انسان تک ہزاروں میل کے فاصلہ پر سنائی دینے لگی ہے۔ صرف اسی ایک تجربہ کی صداقت

کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر ہماری آوازیں سمندروں کو عبور کر ہزاروں میل کے فاصلہ پر سنی جا سکتی ہیں تو اس بات کے تسلیم کرنے میں ہمیں کوئی عذر نہیں ہو سکتا۔ کہ ہماری دعائیں اور التجائیں آسمانوں تک پہنچ سکتی ہیں اور وہاں کی مخلوق ان کو سن سکتی ہے۔ ابھی تو ہم اپنے "خیال" اور "دماغ" کی طاقتوں سے ہی آگاہ نہیں ہوئے۔ جب ہم ان سے پورے طور پر واقف ہو جائیں گے تو کون کہہ سکتا ہے کہ ہم قدرت کے اسراروں سے کہاں تک آگاہ ہو سکیں گے۔

اس ترقی کے زمانہ میں بھی اس خیال کے لوگوں کی تعداد کچھ کم نہیں جو "روحانیات" کا مطالعہ کرنے والوں کو پاگل اور دیوانہ سمجھتے ہیں۔ دنیا کو معلوم ہے کہ جب ماہرین نے "برقی رَو" کے ذریعہ "بے تارکی" خبر رسانی کا سلسلہ جاری کرنے کا دعوےٰ کیا تو عوام الناس ان لوگوں کو بھی فاتر العقل اور دیوانہ سمجھتے تھے۔

اور جب امریکہ سے "ایڈیسن" کے دعووں کی اطلاع بلاد مذہب میں پہنچی تو اکثر لوگ اس امریکن سائنس داں کا مضحکہ اُڑاتے تھے لیکن آج تمام دنیا اس کے دعووں کی صداقت کو تسلیم کرتی ہے۔

یورپ میں جب "روح" کے متعلق عام چرچا ہونے لگا۔ تو ۱۸۸۲ء میں انگلستان میں "دارالعلوم کیمبرج" کے چند ایک نامور علماء نے اس مسئلہ کی سائنس کی رو سے تحقیق کرنے کے لئے ایک مجلس قائم کی اس مجلس کا نام

"سوسائٹی فار فزیکل ریسرچ"

رکھا گیا۔ ۱۸۸۲ء سے اس وقت تک اس سوسائٹی کے اراکین نے اس مسئلہ پر جس قدر غور کیا ہے اور یورپ کی دیگر علمی مجالس کے ساتھ مل کر تحقیقات کی ہے۔ اس کا لبِ لباب یہ ہے کہ "جسم" کو تو فنا ہے۔ لیکن "روح" جو جسم کے اندر مستور ہے غیر فانی ہے۔

ایک انگلستان میں ہی اس وقت کم و بیش ۲۰۰ ایسی انجمنیں ہیں جو "روح" کی تحقیق میں سرگرم عمل ہیں۔ ان باضابطہ مجالس کے علاوہ ایسے بہت افراد بھی ہیں جو اپنے اپنے طور پر اس مسئلہ کی گرہ کشائی کے درپے ہیں انگلستان کے علاوہ یورپ کے تمام بڑے بڑے شہروں میں ماہرین "علم الارواح" کی مجلسیں موجود ہیں۔ اور اسی طرح آسٹریلیا، کینیڈا، نیوزیلینڈ اور جنوبی افریقہ میں بھی ایسی کئی انجمنیں قائم ہو چکی ہیں۔

ان تمام انجمنوں کے ارکین متفقہ طور پر یہ تسلیم کرتے ہیں کہ انسان مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہوتا ہے۔ اور خاص طور سے عام "روحوں" کو بقا حاصل ہو جاتی ہے۔ ان لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ مادی کائنات ایک مشین کی مانند ہے جو اپنے مقررہ اصولوں پر چلتی ہے۔ اس میں انسان کے فہم و ادراک کا دخل نہیں۔

غالباً اس مسئلہ کی صداقت میں بہت کم لوگ شک کرتے ہوں گے کہ قدرت کی طرف سے آنے والے واقعات یا حادثات کی انسان کو کسی نہ کسی طور پر آگاہی ہو جاتی ہے۔ اس "ندائے غیب" یا "پیش خبری" کا ظہور مختلف طور پر ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کو خواب کی حالت میں کچھ اشارہ سا ہو جاتا ہے۔ اور بعض کو اپنے روزمرہ کے کاموں کے دوران میں کسی غیر معمولی واقعہ کے پیش آنے کا احساس ہونے لگتا ہے۔ بعض لوگ شگون لینے کے عادی ہوتے ہیں۔ لیکن عام طور پر اس قسم کی باتوں کو "وہم" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مانا کہ یہ "وہم" ہی سہی مگر اس سے ثابت ہوتا ہے کہ "وہم" بھی آخر کوئی نہ کوئی قوت ضرور ہے جو دل پر وارد ہو کر انسان کی طبیعت میں ایک اثر پیدا کر دیتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہی "ندائے غیب" "پیش خبری" یا "وہم" کچھ حقیقت بھی رکھتے ہیں یا نہیں۔

یہ ایک بہت دلچسپ مسئلہ ہے اور حکمائے یورپ کا ایک گروہ بڑی کاوش کے ساتھ اس نظریہ کی تحقیق میں منہمک ہے اگر ہم اس مسئلہ کے ہر ممکن پہلو پر محققانہ نگاہ ڈالیں تو ہمارے تجربہ یا مشاہدے میں اکثر ایسی مثالیں موجود ہوں گی جو ہر نقطۂ نگاہ سے غور کے قابل ہیں۔

یورپ میں آج کل دو گروہ پیدا ہو گئے ہیں۔ ایک گروہ تو "موت" کے بعد "بقائے روح" یعنی انسان کے مرجانے کے بعد "حیات دوام" حاصل کر لینے کے نظریہ کو صحیح مانتا ہے۔ دوسرا گروہ زندگی کی تگ و دو کو صرف جسم تک محدود رکھنا چاہتا ہے۔ اس گروہ کے نقطۂ خیال سے مرجانے کے بعد انسان کا کام ختم ہو جاتا ہے۔ اور وہ کامل طور پر "فنا" ہو جاتا ہے۔ لیکن یہی گروہ اس نظریہ کو بھی تسلیم کرتا ہے کہ اس دور حیات میں انسان کو پیش آنے والے واقعات کا علم ایک پر اسرار طریق سے ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ علم کیسے اور کیوں کر ہوتا ہے اس کا جواب خاموشی ہے۔

انجمن علمائے روحانیات کے ایک مشہور رکن "ڈبلیو۔ ایچ میرز" نے اپنی کتاب "ہیومن پرسونیلیٹی" میں اس موضوع کے

متعلق چند مثالیں پیش کی ہیں ان مثالوں سے اس دعوے کی پوری پوری تصدیق ہوتی ہے۔

اسی طرح سر" آلیور لاج "نے حال ہی میں سوسائٹی فار فزیکل ریسرچ کے جلسہ کی صدارت کرتے ہوئے اپنے خطبہ میں چند ایک مثالیں بیان کی تھیں ان کا مطالعہ ہر ایک کے لئے مفید ہو سکتا ہے۔

سر آلیور لاج کہتا ہے۔

" ۱۹۱۲ء میں ایک شخص مسٹر جان جو شمالی ویلز میں سکونت رکھتا ہے اور معدنیات کی اکثر کانوں کا سب سے بڑا حصہ دار ہے۔ایک روز اپنے بھائی کے ساتھ ایک کان کا معائنہ کرنے کے بعد واپس آرہا تھا۔ راستہ میں اس کے دل میں کچھ خوف سا پیدا ہونے لگا اور مزدوروں کی سلامتی کے متعلق وہ کچھ بے قرار اور مضطرب سا ہو گیا۔ اُس نے اپنے بھائی سے راستہ ہی میں یہ کیفیت بیان کی اور ساتھ ہی "کان "کے مہتمم کو ایک تار دے دیا کہ فوراً کام بند کر دو اگر مزدوروں کو چھٹی دے دی جائے کان کے مہتمم نے اسی وقت کام بند کر دیا مزدوروں کو چھٹی دے دی اور مزدور اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔کام بند ہونے کے کوئی ایک گھنٹہ بعد "کان " جو تقریباً ایک سو گز اونچی تھی اچانک بیٹھ گئی۔مہتمم اور انجینیر خود حیران تھے کہ کان کے گرنے کا شائبہ تک نہ تھا۔کچھ بھی سہی۔لوگ مسٹر جان کے "خیال " "وہم " یا " قیاس کی جو چاہیں تعبیر کریں۔لیکن ایک سچا واقعہ ہے اور کوئی شخص اس کی صداقت سے انکار نہیں کر سکتا۔"

بعض اوقات ہم مشاہدات پر ایک نظریہ قائم کر لیتے ہیں۔لیکن کسی مشاہدہ یا واقعہ کو محض اس لئے غلط قرار دینا کہ ہم اسے دلیل و برہان سے ثابت نہیں کر سکتے شیوۂ دانشمندی سے بعید ہے۔ اگر انسان عقل اور فہم سے کام لے تو نظام عالم میں بہتیری ایسی چیزیں موجود ہیں جن کو درست تسلیم کرنے کے لئے دلائل کے لئے سرگرداں ہونا نہیں پڑتا۔

سر آلیور لاج اپنی کتاب ریمانڈ میں لکھتا ہے۔

ہر ایک شخص کا کام نہیں کہ وہ "حیات روح" کے متعلق تحقیقات کرے۔لیکن ہر ایک کو یہ پورا یقین

دیکھنا چاہئے کہ وہ عزیز جو ان سے جدا ہو چکے ہیں انہیں بھولے نہیں بلکہ وہ جدا ہو جانے کے بعد بھی ان کی طرف متوجہ رہتے ہیں۔ اور ایسے نظام کے ماتحت زندہ ہیں جو ہماری زندگی سے زیادہ دلچسپ ہے۔

یہ بتلانا محال ہے کہ "حیات انسان" کا راز کیا ہے۔ ہم یہ تو جانتے ہیں کہ انڈے سے پرندہ پیدا ہوتا ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ بیج سے درخت بنتا ہے "علم حیات" کے مطالعہ سے ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ہمارے جسم میں خون کیسے گردش کرتا ہے۔ سانس پھیپھڑوں میں کیسے گزرتا ہے۔ دل کس طرح حرکت کرتا ہے۔ لیکن یہی "علم حیات" ہم کو یہ بتلانے سے قاصر ہے کہ ہماری زندگی ایک گزرنے والی چھاؤں کی مانند ہے۔ یا حقیقت میں ایک ایسی چیز ہے جسے "فنا" نہیں۔

سر آلیور لاج روح کے متعلق بحث کرتے ہوئے کہتا ہے :-

"انسان کی روح اس کے مرنے کے بعد فنا نہیں ہوتی، بلکہ ایک نئی زندگی حاصل کر لینے کے بعد اپنی تگ و دو برابر جاری رکھتی ہے۔ روح خاص خاص حالتوں کے ماتحت اپنے عزیزوں سے جن سے وہ بچھڑ چکی ہے آکر ملتی بھی ہے لیکن اس قسم کی ملاقات یا "روح" کی موجودگی کا احساس صرف اس صورت میں ہو سکتا ہے جس صورت میں مرنے والے کو اپنے کسی عزیز سے ایک خاص لگاؤ اور محبت ہو اور وہ بھی مرنے والے کی جدائی اور غم کو خصوصیت سے محسوس کر رہا ہو۔ یہ حالت اُس وقت تک قائم رہتی ہے جب کہ وہ دوسرا بھی اپنے جسد خاکی سے الگ ہو کر "آسمان کی ملکت" میں داخل ہو جاتا ہے۔"

اگر نظام عالم کا یہی دستور ہوتا کہ ایک شخص کے اس مادی دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد اس کی "روح" بھی فنا ہو جاتی تو پس ماندگان بھی مرنے والے کے لئے یوں گریہ کناں نظر نہ آتے۔ مرنے والے کے ساتھ ہی اس کی یاد بھی دلوں سے مٹ جاتی۔ نہ کوئی کسی کا ماتم کرتا نہ کوئی سوگوار ہوتا۔

اگر غور کیا جائے تو "حیات روح" کا سب سے بڑا ثبوت یہی ہے کہ اس کے پس ماندگان اس کی جدائی کو محسوس کرتے ہیں اور ان میں سے کوئی ایک اس کی مفارقت کو دوسروں کی نسبت زیادہ شدت سے محسوس کرتا ہے۔ اور

اکثر اس کی یاد میں آنسو بہاتا اور آہیں بھرتا نظر آتا ہے۔

ایک "روح" جو جسم کی قیود سے آزاد ہو چکی ہے۔ اور "وجود اثری" اختیار کر چکی ہے اس کے گھر میں موجود ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اس کی "روح" آمد یا موجودگی کے وقت وہ شخص جس سے اسے قلبی محبت تھی خود بخود بے قرار نظر آنے لگتا ہے۔ یا با لفاظ دیگر وہ بچھڑے ہوئے کی موجودگی کو محسوس کرتا ہے۔ گو آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا۔ "روح" کے خود بخود اپنے پس ماندگان کی طرف متوجہ ہونے کا راز محبت اور الفت کے انداز پر موقوف ہے۔

مشرق کا ممتاز ترین شاعر اور فلاسفر علامہ سر اقبال کہتا ہے ؎

ہے ابد کے نسخۂ دیرینہ کی تمہید عشق
عقل انسانی ہے فانی زندۂ جاوید عشق

رخصتِ محبوب کا مقصد فنا ہوتا اگر
جوشِ الفت بھی دل عاشق سے کر جاتا سفر

عشق کچھ محبوب کے مرنے سے مرجاتا نہیں
روح میں غم بن کے رہتا ہے مگر جاتا نہیں

ہے بقائے عشق سے پیدا بقا محبوب کی
زندگانی ہے عدم ناآشنا محبوب کی

غزل

ہم تو اصلِ نازو نیاز ہو جائے
میں سازِ سوز ہوں، وہ سوز ساز ہو جائے

سرشک خوں سے وضو ہو اگر، تو ممکن ہے
حریم دل میں کسی کی نماز ہو جائے

ہے اولینِ قدم راہ عشق میں محمود!
جبیں رہینِ حریمِ ایاز ہو جائے

ادھر ہو دردِ جگر اور ادھر ہو لذتِ درد
یہ دل ستیزہ گہِ سوز و ساز ہو جائے

جنابِ شیخ! کہو کیا کروگے پھر جاکر
عدم میں گر یہ طلسمِ مجاز ہو جائے

اڈیٹر

ایک مزدور دوشیزہ کو دیکھ کر

از جناب محمد عزیز حسین خان صاحب عزیز بریلوی - بی اے - ایل ایل بی

آئی اک مزدور لڑکی آج میرے باغ میں
زخم ڈالے اور بھی جس نے دلِ پُر داغ میں

حُسن کی تقسیم کا بھی کچھ عجب معیار ہے
دیکھئے قدرت بھی کیسی غیر جانب دار ہے
ایک کا ہے حُسن گر آرائشِ قصرِ شہی
دوسرے کے دم سے زینت جھونپڑے کی ہو گئی
الغرض تخصیص اس کی قوم و ملت پر نہیں
آپ ہر طبقہ میں پائیں گے حسین و مہ جبیں

ہاں! تو اُس مزدور دوشیزہ کی صورت دیکھ کر
کہہ نہیں سکتا ہوا دل پر مرے کتنا اثر
اُس کی طفلی ہو چکی تھی اب ہم آغوشِ شباب
یعنی وہ سن تھا کہا جاتا ہے جس کو لاجواب
اُس کے اعضا کا تناسب اُس کا حُسنِ دلفریب
رہزنِ ایمان و دیں غارت گرِ صبر و شکیب
چھپ سکا ملبوسِ کہنہ میں نہ حُسنِ بے مثال
آج دیکھا میں نے پہلی مرتبہ گدڑی میں لال
ہاتھ میں رنگِ حنا تھا اور نہ رُخ پر غازہ تھا
انتہائے سادگی میں حُسن بے اندازہ تھا
تھیں غلط انداز نظریں ہر طرف پڑتی ہوئی
اور دل میں دیکھنے والوں کے گھر کرتی ہوئی
بس کہ مشکل تھا سنبھلنا اپنے بارِ حُسن سے
ہو رہے تھے پاؤں بے قابو خمارِ حُسن سے
ٹوکری مٹی کی سر پر لائی اٹھلاتی ہوئی
ہر قدم سے حشر کا انداز دکھلاتی ہوئی
دفعتاً دروازہ پر آ کر اُسے ٹھوکر لگی
ٹوکری کے ساتھ ہی خود بھی زمیں پر گر پڑی
اس طرح گرنے سے اُس کے ہو گیا میں بدحواس
اس کے چہرہ پر مگر قطعاً نہ تھا کچھ بھی ہراس

جھاڑ کر کپڑوں کو اپنے ہو گئی فوراً کھڑی
اور گر جانے پر اپنے کھلکھلا کر ہنس پڑی

دیکھنے والی نگاہوں سے جو تھی وہ بےخبر
ایک لمحہ تک رہی استادہ بےخوف و خطر

دفعتاً مڑ کر جو دیکھا پڑ گئی مجھ پر نظر
دل رُبا اک کیفیت طاری ہوئی اُس شوخ پر

دیکھتے مجکو جو دیکھا، بے طرح گھبرا گئی
مسکراہٹ اُن لبوں پر آئی اور شرما گئی

ٹوکری سر پر اُٹھا کر باغ سے چلتی ہوئی
اپنے قدموں سے دلِ بیتاب کو ملتی ہوئی

جب کبھی آتا ہے مجکو اس پریوش کا خیال
اک حقیقت کی طرف ہوتا ہے ذہنی انتقال

یعنی یہ لڑکی پریشاں خواب کی تعبیر ہے
نکبت و افلاس کی اس ملک کے تصویر ہے

آہ یہ ہندوستاں پہلے کبھی زرخیز تھا
چپہ چپہ پُرمسرت تھا طرب انگیز تھا

سنتے ہیں اس میں کبھی تھی فارغ البالی بہت
اس کے باشندوں کو بھی حاصل تھی خوشحالی بہت

یہ حسینہ آج سارے دن تو مٹی ڈھوئے گی
رات کو جا کر کہیں فرشِ زمیں پر سوئے گی

اُس کے فرقِ ناز کو بالش کی حاجت ہی نہیں
نرم بستر کی اُسے گویا ضرورت ہی نہیں؛

چند پیسے شام کو لے کر جو یہ گھر جائے گی
تب کہیں نانِ جویں اُس کو میسر آئے گی

دوسرے دن کے لئے اس کو مصیبت ہو رہی
ٹوکری سر پہ لئے پھرنے کی محنت ہو رہی

آہ جس کے حُسن پر خود حُسن کو بھی ناز ہو
سحر ہو رفتار میں گفتار میں اعجاز ہو

عرش سے اُتریں فرشتے جس کے دینے کو خراج
جس کے قدموں پر تصدق ہوں شہنشاہوں کے تاج

جس پہ کر دیں اہلِ دولت اپنا سیم و زر نثار
نکبت و افلاس سے ہو زندگانی اس پہ بار

چشمِ نظارہ کو جس کے حُسن سے ہو ارتعاش
پیٹ کی خاطر اُسے کرنا پڑے کسبِ معاش

مشغلے ہرگز یہ شایانِ بتِ کم سن نہیں
ٹوکری سر پر لئے پھرنے کے اُس کے دن نہیں

عورت

عقلمند صرف وہی ہے، جو مکھی کے زہر آلود ڈنک سے محفوظ رہ کر اس کا شہد حاصل کر سکتا ہو۔ دوشیزہ عورت ہمہ تن شہد ہوتی ہے۔ لیکن شادی شدہ عورت ایک خطرناک ڈنک سے مماثلت رکھتی ہے۔ علاوہ بریں عورت اپنی چند خصوصیات میں پہاڑ، سانپ، آگ، اور سراب سے مشابہ ہوتی ہے، جو دور سے انتہائی نظر فریب معلوم ہوتا ہے اور بُعد کے ساتھ ساتھ اس کی دیدہ زیبی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ وہ اپنے اندر پہاڑ کی ناہمواری، سانپ کا زہر اور آگ کی سوزش رکھتی ہے، اور سراب کی طرح ہر اس شخص کو فنا کے گھاٹ اُتار دیتی ہے جو اس سے زیادہ قرب حاصل کر لینے کا مجرم ہو۔ لیکن سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ ہر عورت ایک مطلق العنان بادشاہ کی طرح تن تنہا حکومت کرنا چاہتی ہے، اور شریک کے نام کو خواب میں بھی گوارا نہیں کر سکتی۔

ماحصل یہ ہے کہ ہر خاوند کو اپنی بیوی کی ذات میں یا تو ایک مستبد اور جابر بادشاہ سے سابقہ پڑتا ہے۔ یا ایک کینہ ور دشمن سے، جس کو غیر مشروط اور کامل اطاعت کے سوا کوئی شے رضامند نہیں کر سکتی۔ اس طرح اس غریب کی ہستی گھل گھل کر اس کی بیوی کی ذات میں بالکل فنا ہو جاتی ہے۔ گویا کہ وہ اس شاندار درخت کی مانند ہوتا ہے جس کو عشق پیچاں کی دل آویز بیل نے ہم آغوش ہو کر ریاکارانہ بوس و کنار سے قبل از وقت ہی مرجھا دیا ہو۔"

(ماخوذ) مسعود حسن نقوی بی اے (علیگ)

غزل

چلاتے ہیں وہ خنجر کشتۂ اُلفت کی گردن پر — قیامت ہے عنایت ہو رہی ہے اُن کی دشمن پر
نصیبِ عاشقاں یہ موت ہوتی بخت جاگ اُٹھتا — وہ اظہارِ تاسف کر رہے ہیں مرگِ دشمن پر
ضیائے عشق سے چمکا رہا ہوں اپنی تربت کو — چراغوں کی نہیں مطلق ضرورت میرے مدفن پر
برس اے ابرِ رحمت نام لیوا ہوں محمد کا — نہ رہ جائے ذرا بھی داغِ عصیاں میرے دامن پر

شریف ایسا ہوا ہے سوزِ نارِ عشق سے پیدا
ہمارے شعلہائے دل ہنسا کرتے ہیں گلخن پر

حکیم محمد شریف الزماں شریف

کلام عزیز صفی پوری

عرفی نے زمانہ کی ناقدری سے تنگ آکر کہا تھا ؎

از من بگیر عبرت و کسبِ ہنر مکن ٭ با بختِ خود عداوت ہفت آسماں مخواہ

گویا دوسرے الفاظ میں کسبِ ہنر کرنا ساتوں آسمانوں کی دشمنی مول لینا ہے۔ یہ بد فالیاں ایسی بری گھڑی کی زبان سے نکلیں کہ حرف بحرف پوری ہو کر رہیں۔ ہمارے مشرقی اہل کمال میں (باستثناے چند) سب کے سب ہمیشہ دنیا کے ہاتھوں نالاں رہے اور ناقدریٔ زمانہ کے شاکی

انھیں اہل کمال میں جناب عزیز صفی پوری کا بھی شمار ہے۔ اُدھر تو ابناے روزگار کی بے اعتنائی اور فن شعر کی متاعِ کس مخرؔ کی کساد بازاری نے عزیز کو شہرت کے اسٹیج سے دور رکھا ادھر اُن کی گمنامی پسند طبیعت اور صوفیانہ افتادِ مزاج نے نام و نمود کو اپنے لئے باعث ننگ سمجھا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک ایک ادیب باکمال کے چشمۂ فیض سے بہ وجہِ احسن سیراب نہ ہوسکا۔

خاندان | عزیز کا نام منشی ولایت علی خاں ہے مگر تصوف کے حلقوں میں وہ شاہ عزیز اللہ چشتی کے عرف سے مشہور تھے اُن کا سلسلۂ خاندان خواجہ محمد عثمان تک منتہی ہوتا ہے جو حضرت معین الدین اجمیریؒ کے پیر تھے۔ باپ دادے سب شاہانِ اودھ کی سرکار میں مراتب رفیعہ اور مناصب جلیلہ پر سرفراز رہے

ولادت و تعلیم | عزیز ۱۸۴۱ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور اپنے عہد کے مشہور اساتذہ سے فارسی و عربی کی تکمیل کی۔ آخر ۱۸۵۶ء میں جب انتزاع سلطنت ہوا اور اس کے دوسرے سال غدر کا ہنگامہ برپا ہوا تو عزیز کو بھی لکھنؤ چھوڑنا پڑا۔ اور انھوں نے صفی پور (اناؤ) میں جہاں اُن کی ننھیال تھی سکونت اختیار کرلی یہیں انھوں نے نہایت مستغنی المزاجی اور نامرادی کے ساتھ اپنی عمر کے آخری لمحے خانہ نشینی میں بسر کئے۔

مشاغل تصوف | عزیز ایک متوکل درویش اور صاحب اوقات صوفی تھے اور حضرت خادم صفی محمدی سے بیعت رکھتے تھے۔ انھوں نے عمر عزیز کا بیشتر حصہ یاد الٰہی اور خدمت تصوف میں صرف کردیا اور اودھ میں اُن کا سلسلۂ ارشاد و ہدایت عرصہ تک جاری رہا۔

شاعری اور تصانیف | وہ عربی کی اچھی استعداد رکھتے تھے اور فارسی و اُردو کے زبردست ادیب تھے انھوں نے سترہ اٹھارہ برس کی عمر سے فارسی میں شعر کہنا شروع کیا اور ستر برس تک مشق سخن میں مصروف رہے اُس کے ساتھ ساتھ اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں رہ کر اکثر اُردو شاعری میں بھی طبع آزمائی کرتے اور تصوف، نعت، منقبت، عشق کے مضامین لکھتے رہے۔

اُنھوں نے فارسی و اردو نظم و نثر میں تقریباً چالیس کتابیں تصنیف کیں جن میں سے نظم دل فریب (دیوانِ اردو) نور ولایت (ایضاً) ختم فکر (آخر عمر کی غزلیات) کلام نظم فارسی، ارمغان، نور بان، پیش کش شاہجہانی (فارسی نثر) پنج رقعہ، فسانۂ عجائب کا ترجمہ فارسی (نظم) جو بقدر بارہ ہزار اشعار کے ہے۔ مثنوی فتح مبین (فارسی) بجواب شاہنامہ فردوسی۔ زیادہ قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے اکثر کتابیں بوجہ ناداری زیور طبع سے مزین نہ ہوسکیں اور وضع زمانے کو دیکھتے ہوئے خوف ہوتا ہے کہ کہیں بالکل معدوم نہ ہو جائیں

تلمذ | عزیز فارسی نظم و نثر میں مرزا غالب کے شاگرد ہیں۔ اُنھوں نے مختلف غزلوں پر مرزا سے اصلاح لی۔ ایک کتاب نثر فارسی (پنج رقعہ) بھی بغرض استفادہ و مشورہ بھیجی تھی۔ غالب نے بغیر حک و اصلاح تعریف و توصیف کے ساتھ واپس کردی۔ اُسی زمانے میں اُنھوں نے فسانۂ عجائب سرور کو فارسی میں نظم کیا مگر اُستاد نے ضعیف العمری کا عذر کیا اور اصلاح سے مجبوری ظاہر کی۔ یہاں مرزا کا خط جو اُنھوں نے اپنے عزیز شاگرد کو پنج رقعہ کی بابت تحریر کیا تھا، درج کیا جاتا ہے۔

مرزا غالب کا خط | "خاں صاحب عنایت مظہر سلامت۔ آپ کا مہربانی نامہ آیا۔ اوراق پنج رقعہ نظر فروز ہوئے۔ خوشامد فقیر کا شیوہ نہیں۔ پنج رقعہ سابق کی تحریر سے لفظاً و معناً بڑھ کر ہے اُس میں یہ معانی نازک اور الفاظ آب دار کہاں۔ مگر ایک امر سے میں تمھیں آگاہ کرتا ہوں کہ یہ نثر ظہوری کی نہیں ارادت خاں متخلص بہ واضح عالمگیری سرداروں میں سے ایک

شخص تھا مینا بازار اور پنج رقعہ اس کی فکر کا نتیجہ ہے تو ایسی کسرت کی طرز ایجاد کی ہوئی اس کی ہے
موجد سے مقلد بہتر نکلا یعنی تم نے خوب لکھا ع

"نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول"

جہاں آپ نے فقیر کا مطلع لکھا ہے وہاں آپ بعرف میرے معرف ہوئے ہیں بہت تعجب ہوں کہ یا میرا
شعر نکال ڈالو یا عرف کی جگہ تخلص لکھدو۔

نجات کا طالب غالب"

خود عزیز نے ایک قصیدہ عالیہ میں اپنے تلمذ کا حال نہایت خوبی سے بیان کیا ہے فرماتے ہیں ؎

ممنون میں نہیں ہوں کسی کے کمال کا
شاگرد اس زباں میں ہوں اس ذوالجلال کا

ہاں نظم پارسی میں ہوں غالب سے مستفید
منت گزار لطف ہوں دو تین سال کا

لکھی تھی ایک نثر مطول بھی چار جز
ہوں معتقد میں دونوں میں اُن کے کمال کا

بے شبہ پارسی میں وہ یکتا ہے عصر تھے
شاید ہو کوئی ہند میں اُن کی مثال کا

لکھا کہ اس میں حک و تصرف کی جا نہیں
ہرگز محل نہیں ہے کسی احتمال کا

بس نثر میں بھی مجکو تلمذ جو ہے تو یہ
اس میں بھی معترف ہوں خدا کے نوال کا

اس کے علاوہ مولانا حالی۔ علامہ شبلی اور منشی امیر مینائی بھی اُن کی قدرت کلام اور رفعت کمال کے معترف و مداح تھے۔ جیسا کہ ان حضرات کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے غرض اسی طرح جناب عزیز ایک مدت مدید تک فارسی اور اُردو ادب کی خدمت اور طالبان ارشاد کی ہدایت میں مصروف رہے۔

وفات آخر گزشتہ ماہ (جولائی ۱۹۲۵ء) کی دوسری تاریخ کو ۷۰ برس کی عمر میں انھوں نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور یہ چشمۂ فیض ہمیشہ کے لئے بند ہوگیا۔ یہاں پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم لکھنؤ کے ممتاز اسلامی رسالہ "سچ" کی عبارت کا کچھ حصہ جو مرحوم کے حادثۂ رحلت سے متعلق تھا نقل کریں اور اُس کے بعد اُن کے کلام سے اہل ذوق کو روشناس کریں

"مرحوم کا نام تصوف کی دنیا میں شاہ عزیز اللہ چشتی تھا اور اُن کی بعض فارسی اور اُردو غزلیں قوالوں کی نوک زبان ہیں ... یہ کہنا کہ انھوں نے اپنی ساری عمر فارسی زبان میں کمال

حاصل کرنے میں صرف کر دی تھی اُن کی مدح نہیں ہو کرتا ہے۔ وہ اہل اللہ تھے اور یقیناً اُنھوں نے

عمر عزیز کا بیشتر حصہ یاد الٰہی اور طاعت و عبادت میں بسر کیا ہوگا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ "اہل زبان"

بے شبہ تھے لیکن اس سے بھی بڑھکر "اہل دل" تھے اور دنیا کی نظر میں جس قدر "قابل" تھے

شاید اُس سے بڑھکر دین کی راہ میں "مقبول" تھے۔"

مرحوم کے تصوف کی بابت (نفس تصوف کی حیثیت سے) ہمیں کچھ کہنا نہیں۔ اس لئے کہ نہ ہم "اہل دل" اور نہ تصوف کی غوامض احاطۂ بیان میں آسکتے ہیں۔ البتہ اُن کی "زبان" اور کلام (خصوصاً اُردو کلام) پر زبان کے خادم ہونے کی حیثیت سے کچھ عرض کرنا غالباً عام دلچسپی اور آگاہی کا موجب ہو۔

کلام پر تبصرہ | عزیز کا اُردو دیوان جو اسم تاریخی (نظم دل فریب ۱۳۱۶ء) سے موسوم ہے کچھ زیادہ ضخیم نہیں۔ اس دیوان میں تصوف، نعت، عشقیہ ہر قسم کے مضامین ہیں اور غزلیات کے علاوہ ۱۲ رباعیاں، ۳ قصیدے، ایک سہرا، ۳ مسدس اور ایک ترکیب بند ہے۔

تصوف | کلام میں تصوف کا عنصر ہر ہر قدم پر نمایاں ہے اور اگرچہ خیالات میں کوئی خاص ندرت و تازگی نہیں تاہم ذوق اور جوش بیان کی کمی نہیں۔ ملاحظہ ہو

مظاہر کونیہ ذات بحت کا نشان ہیں ؎

تری شان کا میں نشان ہوں مجھے عشق نے یہ بتا دیا ؛ کھلی آنکھ سے تجھے دیکھنا مرے دل نے مجکو بتا دیا

عشق و عقل باہم دشمن ہیں ؎

مرے دل میں ہے غم عاشقی نہیں آرزو کسی بات کی ؛ یہ ہے خاصیت ترے عشق کی کہ چراغِ عقل بجھا دیا

نیرنگ مجاز و حقیقت کی کارفرمائی ؎

سر سجدہ کر کے بت کے سامنے ؛ لا کو اِلّا کر کے لا کرتا ہے عشق

صوفی غم دنیا و عقبیٰ دونوں سے آزاد ہے ؎

اتنے سوراخ ہوں دل میں کہ جگر خوں ہو جائے ؛ فکر دنیا نہ ہو اندیشۂ عقبیٰ نہ رہے

اور چند شعر سنئے ؎

فرما گئے آپ نحن اقرب — دل کش ہے دہک رگِ گلو کی

ہوئے سُن سُن کے سب کافر خدائی دیکھئے اُس کی — قیامت ہو اگر پردے کے باہر وہ صنم نکلے

آخری دیوان ختم فکر میں یہ رنگ اور تیز ہو گیا ہے اور انداز بجائے شاعرانہ ہونے کے خالص صوفیانہ معلوم ہوتا ہے

میں ابتدا میں رہا اکیلا — ظہور کا ہے یہ سب جھمیلا

چمن میں پھیلی ہے میری خوشبو — کہیں چنبیلی کہیں ہے بیلا

گرچہ شاہد ہوں مگر پردۂ مشہود میں ہوں — نفی کرتا ہوں جو اس کو اُسے پا جاتا ہوں

انا الحق اور ہو الحق ایک ہی ہے — یہ قلت ملتِ پیر مغاں ہے

اس قسم کے خیالات اگرچہ ارباب ظاہر کے نزدیک شریعت کے خلاف ہیں۔ مگر سرمستانِ مے خانۂ عشق غالبؔ معذور رکھے جائیں ۔

نعت ومنقبت دوسری خصوصیت عزیز کا جوش اعتقاد حسن ادب ہے جو نعتیہ اشعار میں ہر جگہ جلوہ گر ہے دربار رسالت میں اُنھوں نے جس محبت وعقیدت سے نذر پیش کی ہے یقیناً قابل رشک ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

وہی معجزہ وہی مہ معاً آشکار ہوتا — جو ترا اشارہ ہوتا تو ہزار بار ہوتا

کہیں دیکھتا جو زاہد تری مرحمت کو مجھ پر — تو اس آرزو میں مرتا کہ سیاہ کار ہوتا

سجدہ کیا اُن کے در پہ رو کر — ہے شرط نماز میں وضو کی

اب لعمرک گر کہے کوئی تو کس منہ سے کہے — یہ قسم وہ ہے جو ہے اللہ کی کھائی ہوئی

ہے مسلسل جس طرح سطر پہ کلام اللہ میں — زلف مشکیں عارض انور پہ بل کھائی ہوئی

اسی طرح اپنے پیر ومرشد کی مدح میں بھی اشعار اُن کی زبانِ قلم سے خاص لذت لے کر نکلتے ہیں۔ سنئے ؎

کس طرح قید تعین سے رہائی ہو اُسے — شاہ خادم جو نہ ہوں اپنے گرفتار کے پاس

اُن کا جمال کیا ہی محرک ہے شوق کا — جب آئے دل میں آتے ہی دل کو ہلا دیا

کرتی ہے دل کو کھینچ کے اللہ کی طرف — واللہ کیا اثر ہے تمھاری نگاہ میں

وہ جمالِ جمیل دکھلا کر — کھول دی شانِ کبریا تم نے

صفحۂ دل پہ تھا خدا کا نام　　لکھ دیا اُس پہ حاشیہ تم نے

حضرت عزیزؔ کی عشقیہ غزلیات میں اگرچہ کوئی ایسی دل کش اور نمایاں خصوصیت نہیں جس کی بنا پر اُن کو کسی خاص رنگ (اسٹائل) کا مالک کہا جا سکے۔ تاہم بالکل نظرانداز کرنے کے قابل بھی نہیں۔ نمونہ یہ ہے ؎

کیوں نہ ہو کم سخن وہ تنگ دہن　　مونھ سے کچھ بات کی نہیں جاتی

باندھتے میرے قتل پر لیکن　　کمر اُن سے کسی نہیں جاتی

البتہ کہیں کہیں انداز کی شوخی اور زبان کی صفائی دل کو تڑپا دیتی ہے۔ ذیل کی غزل ملاحظہ ہو۔ تمام اشعار منتخب ہیں: ؎

بلا کے بات بھی کی اور مسکرا بھی دیا　　کیا شہید بھی قاتل نے مسکرا بھی دیا

گیا جو نامہ بر آیا بہت سراسیمہ　　کہا کہ چاک کیا خط کو اور جلا بھی دیا

سنبھلتے حضرت موسیٰ مگر ستم یہ ہوا　　دکھا کے جلوۂ دیدار کچھ سنا بھی دیا

میں وہ چراغ ہوں جس کو فروغ ہستی نے　　قریب صبح کیا روشن اور بجھا بھی دیا

عزیزؔ اس کے کرم پر فدا نہ ہوں کیونکر　　کہ عشق دے کے مجھے عشق کا مزا بھی دیا

اور ملاحظہ کیجیے ؎

کچھ ہاتھ نہ آیا تو بہانے سے حنا کے　　ہاتھ اُن کو غم قتل سے ملتے ہوئے دیکھا

دل میں ہر وقت کچھ کھٹک سی ہے　　آہ چھیڑ آپ کی نہیں جاتی

کوئی جائے وہاں تو کیونکر جائے　　خبر مرگ بھی نہیں جاتی

چھوٹی بحر کی غزلیں عموماً صاف اور بے تکلف ہیں اور سنیے: ؎

اپنے عاشق کا تڑپنا دیکھیے　　رقص بسمل کا تماشا دیکھیے

ہے وہ بت شان خدا سر تا بہ پا　　آہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھیے

لائی ہے نسیم اُن کی خوشبو　　حاجت نہیں ایاغ و سبو کی

راحت ہے تو اُن کی آرزو میں　　کیا بات شہید آرزو کی

اشعار ذیل سے سلاست بیان اور شیرینیِ ادا کا لطف اٹھائیے :ـــہ

کافر نہیں کرتے ہیں مسلماں نہیں رکھتے — دم بھر مجھے اک راہ پہ چلنے نہیں دیتے
داغوں سے بنایا ہے مجھے سروِ چراغاں — کیا غم ہے اگر پھولنے پھلنے نہیں دیتے
دیتے ہیں ہر مزار پہ سب ایک ہی پتا — یعنی شہیدِ ناز ترے پائمال کے
دیں گالیاں جو صدقے میں سلکِ گہر ہوئیں — جھولی بھری ہوئی ترے در کے گدا کی ہے
ساقی ترے جمال نے کیا حال کر دیا — مٹی خراب مجھ سے پارسا کی ہے

اُن کی زبان کیا غزلیات میں اور کیا قصائد میں اُن کے علمیت کا ثبوت دیتی ہے مثلاً :

میرے رونے تک فروغِ جلوۂ بیباک تھا — آبروئے حسن اشکِ دیدۂ نمناک تھا
جوہرِ ہر شے محبت سے غرض ہے کائنات — بن گیا مغزِ استخوانِ خانہ گو کاواک تھا
کافر کو کوئی شک ہو تو اُس بت کو دیکھ لے — قرآں میں جو نشاں ہے لشئی عجاب کا
تیرے لبوں سے آبِ بقا کو بقا ملے — کیا ذکر اُن کے سامنے لعلِ مذاب کا
ہیں مجھ میں سب صفاتِ بہیمی معاف کر — کب منضبط ہے کوئی طریقہ دواب کا

کہیں کہیں اُن کی بندشوں پر غالب کی تراکیب کا دھوکا ہوتا ہے جیسے :

اُس کی صحبت میں نہ تھی ہم کو تمیزِ روز و شب — غمزہ ہر رنگِ طلسمِ گردشِ افلاک تھا
لال ڈورے بن کے میرا خون پہلے قتل سے — جوہرِ تیغِ نگاہِ قاتلِ سفاک تھا

مگر اُن کے تخیل کا رنگ رنگِ غالب سے بہت متفاوت ہے۔

زبان کا یہ انداز ہر جگہ نہیں اور بیشتر زبان میں سلاست اور بندشوں میں صفائی پائی جاتی ہے۔ جیسا کہ سابق مثالوں سے واضح ہوا ہوگا۔

اُن کے قصیدوں میں قصیدۂ حالیہ جس کے چند اشعار اوپر نقل ہوئے اور مسدسات میں شہر آشوب نسبتاً دلچسپ ہیں۔ مسدس مذکور کا ایک بند بطور نمونہ درج کیا جاتا ہے ـــہ

شاہِ اودھ کہاں ہے کہاں ہے وہ تاج و تخت | وہ لکھنؤ کہاں ہے کہاں ہیں وہ اہلِ تخت
یکا ہوئی خرابی تو غارت ہوئے وہ رخت | نازل ہوئی فلک سے اودھ پر بلائے سخت

ہم کیا ہیں کیسے کیسے تباہی میں پڑ گئے
شاہ اور شاہ کے سب اعزہ بگڑ گئے

غرض یہ مختصر تبصرہ تھا جناب عزیز کے کلامِ اُردو پر۔ جس کی پڑھنے سے اُن کے زورِ طبع کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ مگر اصل یہ ہے کہ اُن کے علو کمال کا صحیح اندازہ اور اُن کے قدرت کلام کا خاص رنگ فارسی میں نظر آتا ہے اور پارسی کے "نقشہائے رنگ رنگ" کے مقابلہ میں یہ "مجموعۂ اُردو" ایک حد تک "بیرنگ" معلوم ہوتا ہے۔ اگر وقت نے مساعدت کی تو کلام فارسی سے اہلِ نظر کو روشناس کرانے کی سعی کی جائے گی۔ ہاں افسوس ہے تو اس کا کہ اُن کے ساتھ فارسی کا "بہترین خزانہ" کل نہیں تو بیشتر دفن ہو گیا۔ شاید کچھ علم دوست اصحاب ادھر متوجہ ہوں اور اُن کا رہا سہا کلام فارسی جواب تک زیادہ تر غیر مطبوعہ ہے مٹنے سے محفوظ ہو جاتے۔

"ص"

غزل

نہ دیدے سے ہیں پھر بھی آپ کو گو عمر بھر دیکھا | یہ دیوانوں کا اپنے آپ نے ذوقِ نظر دیکھا
فغان و نالہ و فریاد و شیون بے اثر دیکھا | کمالِ اضطرابِ عشق میں ہر کام کر دیکھا
سوا ان کے نہ دیکھا کچھ جو آنکھیں کھول کر دیکھا | طلسمِ ہستیٔ موہوم کو مدِّ نظر دیکھا
سراسر خواب پایا ہم نے وقتِ نزع دنیا کو | شکستِ رنگ کو آخر سپیدیٔ سحر دیکھا
شعاعِ حسن آخر پھوٹ نکلی تہ سے پردوں کے | جھلک کو تیری عالم نے پسِ دیوار و در دیکھا

غلط ہے یہ کہ مر کر چھوٹ جاتے ہیں مصیبت سے
تمھارے ہجر میں ارشادؔ نے سو بار مر دیکھا

ارشاد میرٹھی

غزل

از جناب باسط بھوپالی

ابھی یارب بہت کچھ وسعتیں ہیں میرے داماں میں
چمن کا کانٹا کانٹا کھنچ کے آجائے بیاباں میں

مرے مذہب پہ رشک افرد زیاں ہیں کفر و ایماں میں
الٰہی کیا کشش رکھدی جبینِ عجز ساماں میں

تجلّی ہو گئی تقسیم اجزائے پریشاں میں
بلا کا جذب تھا خاکسترِ بربادِ انساں میں

خدا رکھے محبت کی یہ رونق کنجِ زنداں میں
ہزاروں نزہتیں ہیں شورشِ زنجیر ساماں میں

ذرا اُس کی حقیقت پر بھی بحث آرائیاں واعظ
جسے اک جام نے پہنچا دیا ہے بزمِ عرفاں میں

کہاں تک عام ہوگا آخرش وحشت کا ہنگامہ
یہ کیسی وسعتیں ہیں کوچۂ چاکِ گریباں میں

ارے او ڈھونڈھنے والے تجلیاتِ مقصد کے
کبھی اپنا تجسس بھی کیا ہے دارِ امکاں میں

تہی ساغر نظر آیا نہ کوئی اس خرابہ میں
خیالِ رشک لفظِ بے صدا ہے بزمِ حرماں میں

کسی دن عشق کی سب منزلیں آباد کر دیگا
جنوں کا یہ خرامِ ناز اور وہ بھی گریباں میں

چمن تم کو مبارک اور چمن کی بزم آرائی
ہمیں بھی مل ہی جائے گا کوئی گوشہ بیاباں میں

ذرا اے حیرتِ جلوہ مرے دل کو لئے رہنا
نقاب اُلٹے ہوئے ہیں وہ تجلی گاہِ عرفاں میں

محبت نے ادھر دل کو گدازِ آرزو بخشا
اُدھر کچھ بجلیاں بھر دیں نگاہِ طور ساماں میں

گلستاں رقص کیوں کرتا مری رنگیں نوائی پر
نہ ہوتی معرفت باسط جو طبعِ شعر ساماں میں

تاثراتِ فکری

(از جناب ابوالنظر رضوی امروہوی)

ہمارے دوست جناب ابوالنظر نے اپنے مختلف مضامین میں جو خاص خاص مقولات زبانِ قلم سے نکالے ہیں ان کو یکجا کرکے ہماری درخواست پر بغرض اشاعت روانہ فرمایا ہے۔ بقول خود یہ تاثرات کسی دوسرے دماغ کے مرہونِ منت نہیں۔ (اڈیٹر)

---

(۱) دنیا کی کوئی لذت ہزار تلخیوں سے کم قیمت میں نہیں خریدی جاسکتی۔

(۲) انسان کا جذبات کی رنگینی میں ڈوب کر حقائق سے آنکھیں بند کرلینا انسانیت کی بدترین تعبیر اور اس کے ساتھ شرمناک ستم ظریفی ہے۔

(۳) قدرت نے خود انسان کے دل میں جو سکون و طمانیت کے جواہر پارے ودیعت کئے ہیں وہ چونکہ کائنات کی مجموعی مسرتوں سے بھی کہیں زائد قیمتی، دیرپا اور شیریں ہیں۔ اس لئے انسان دنیا کی ساری مسرتوں کو سمیٹ لینے پر بھی پوری پوری مسرت سے آشنا نہیں ہوسکتا۔

(۴) خود ناشناسی ہی نے دنیا کو دوزخ بنادیا ورنہ انسان خود اپنے آپ سے دلچسپی لیتے ہوئے اس ہی ناپاک دوزخ کو فردوس بریں کے سانچے میں ڈھال سکتا ہے۔ اس لئے انسان کو بجائے "دنیائے بیگانہ" کی پرستش کے اپنی پرستش ہی میں مخمور ہوجانا چاہیئے ورنہ اضافات حیاتیہ کے سلاسل یقیناً زندگی کو تلخ بناکر رہیں گے جس سے دنیا کی کوئی طاقت رہائی نہیں دلاسکتی۔

(۵) سلبی اخلاق ہی ایجابی اخلاق کی لطافت اور قوت کے بہترین ضامن ہوسکتے ہیں۔

(۶) اشعۂ حیاتیہ کو جب تک قلب کے اندر نہ سمیٹ لیا جائے گا کوئی اعلیٰ ترقی نہیں کی جاسکتی۔

(۷) تصوف کی روحانی ترقیات ہی کائنات انسانی کو ہمدوشِ ثریا، قوائے فطرت کو مسخر اور دنیا کو بہترین "پیغامِ امن" کے ذریعے فردوس بریں کی شیرینیوں سے لذت اندوز کرسکتی ہیں۔

(۸) انسان: حسن، قوت اور علم تینوں میں کائنات کے مجموعی حقائق سے فوقیت رکھتا ہے۔

(۹) غم اگر ایک حصہ شر ہے تو تین حصہ خیر۔

(۱۰) پرجوش اور پاکیزہ محبت کے نازک ترین احساسات کی تلاش، باوجود اقتضائے فطرت ہونے کے "احمقانہ حسن ظن" کے مترادف ہے۔

(۱۱) انسان کی تمام پائدار مسرتیں خود اس کے ذاتی احساسات سے وابستہ ہیں۔

(۱۲) روزِ ازل میں ارواح کا باہمی تعارف پُرشباب صورِ مثالیہ کے ذریعے سے ہوا تھا۔

(۱۳) ایمان، تقویٰ، عبادت اور محبت اختلاف مظاہر کے ساتھ معانی میں بالکل متحد ہیں۔

(۱۴) جنت : تعلیماتِ اسلامی، عقل اور وجدان تمام کے اعتبار سے روحانی یا لطیف جسمانی ہی ہونی چاہیئے۔

(۱۵) جذبۂ محبت تمام دیگر جذبات انسانی حتیٰ کہ انقیاد و بندگی سے بھی اپنی "جامعیت" کی بنا پر کہیں اعلیٰ ہے۔

(۱۶) خواب : ہمارے ارتقائے ذہنی و نفسی کی بہترین تصویر ہے۔ اس ہی لئے خواب کا وہ حصہ جو خیالات اور جذبات سے متعلق ہو۔ کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔

(۱۷) تجربہ کہنہ سالی نہیں بلکہ کائنات کی ہر انقلابی کروٹ، ہر معمولی جنبش اور ہر ناقابلِ اعتنا مسرت و غم حتیٰ کہ ہر ذرۂ حیاتیہ کے شئون سے سبق اخذ کرنے ہی کے ذریعے سے حاصل ہو سکتا ہے۔

(۱۸) شہرت پرستی یا نام زندہ رکھنے کا جذبہ حیات ذاتیہ کے خلاف مسلسل جہاد کا نتیجہ ہے نہ کہ فطرت کا اقتضا ۔

(۱۹) میرے نزدیک حقوقِ وراثت کا راز بجائے "رشتہ" کے محبت کی گہرائیوں میں مضمر ہے۔

(۲۰) قرآن کی دعوتِ صبر و صلوٰۃ کا فلسفہ نظامِ ذہنی اور نظامِ عملی درست کر سکنے میں مضمر ہے۔

(۲۱) انسان کا فطری جذبۂ پرستش۔ کائنات کی لطیف یا پُرعظمت قوتوں سے متاثر ہونے پر علویتِ انسانیہ کو ہر ذرّہ کی ٹھوکروں میں ڈال کر ابتذال کے انتہائی مراحل تک پہنچا دیتا ہے۔

(۲۲) عبادت، محبت کے اُس مظاہرہ ہی کا دوسرا نام ہے جس سے دنیا پاکیزگی کی لطیف ترین قوتیں اخذ کر سکے ۔

(۲۳) کائنات کی رنگینیوں سے شیفتگی ترقیات کے لئے زہر آلود نشتر سے زیادہ خوف ناک ہے۔

(۲۴) شباب ! اعتلائے تقویم کی زائیدہ کہربائیت یا بالفاظ دیگر موزوں ترین ترکیب عنصری کے رنگین فروغ کا نام ہے۔

(۲۵) رعنائی کہتے ہیں حسن کی اُن نوخیز رنگین تازگیوں کو جو اُس کی سنہری گود میں مسکراتی ہوئی مچل رہی ہوں۔

(۲۶) اثر ! نام ہے موثر کے صفات طبعی اور کیفیات مخصوصہ کا متاثر میں عکس ریز ہو کر اُس کو اپنی صفات و کیفیات سے ایک گونہ مشاکل بنا دینا۔

(۲۷) انتظار کیا ہے؟ جذب مسرت کے لئے کہربائیت ذہنی کا کش مکش بیم کی نذر ہو جانا۔

مخمورِ حسن

اے حسینہ! مستِ حسنِ دلنشین و دلنواز
پرتوِ برقِ جمالِ طورِ حسنِ شعلہ ساز

اے سراپائے لطافت، اے بہارِ شوخ و شنگ
اے ستم پرداز فطرت اے نگارِ صبح رنگ

اے جمیلہ! نازشِ افسانۂ کیفِ بہار
اے حسینہ، غیرتِ ماہِ تجلی آشکار

اے سمن بر، عفتِ صد غنچہائے نازنیں
اے ستمگر نکہتِ گلہائے مغرور و حسیں

اے حسیں ناظورۂ خورشید پیکر برق خیز
اے گلِ نوخیز گلزارِ شبابِ غنچہ ریز

اے حبابِ نازنینِ بحرِ جذباتِ شباب
اے شعاعِ مہرِ عصمت، بر لبِ موجِ حجاب

ساحرہ، محوِ سحر کاریِ چشمِ مست ناز
جادوئے صد شعلہ در بر خندۂ مینا گداز

مست زہرہ، محوِ رقصِ ناز بر چرخِ حیا
اے شبابِ موج افزا اے ادائے دلربا

سبز ساری پردہ دارِ پیکرِ رنگیں جمال
سرخ پیشانی کا ٹیکا تازگیٔ صد خیال

گیسوئے آوارہ میں افسانۂ شامِ جناں
زلفِ عنبر آفریں میں اک گھٹا جادو چکاں

اک دھواں تھا آہ کا جو زلف کا فر ہو گیا
میری الفت کا شرارہ حسن پرور ہو گیا

ہے جبینِ ماہ گوں شمعِ درخشانِ شباب
تابشیں ہیں جس کی یعنی پردۂ برقِ حجاب

یہ جبیں ہے یا نویدِ رمزِ ایمن ساز ہے
یا ہلالِ نازنیں کی خوابگاہِ ناز ہے

چند شکنیں، آہ وہ برہم زنِ نظمِ حیات
جن کی ہر جنبش میں پنہاں انقلابِ کائنات

قرص پر بلور کی شاید خراشیں پڑ گئیں
چند تلواریں تھیں یا باہم جو آکر لڑ گئیں

چشمِ کافر کے اشارے برق افگن ہو گئے
چند شعلے مسکرائے حسنِ ایمن ہو گئے

بجلیاں ٹوٹیں فضائیں برق پرور ہو گئیں
یہ تری نیچی نگاہیں نوکِ نشتر ہو گئیں

سرخ ڈورے آنکھ میں کھنچتے ہوئے تلوار سے — قلب بسمل ہوگیا ہے اس انوکھے وار سے
بھر دیا آنکھوں میں تیری کس نے کندن کوٹ کر — گر رہی ہیں بجلیاں حسن فضا میں ٹوٹ کر
وہ نگاہ نازمیں پتلی کا چنچل ارتعاش — وہ بلا کی شوخ نظریں وہ نگاہِ سحر پاش
پتلیاں یعنی حبابِ نازشِ بحر شراب — بجلیاں یعنی دلِ مضطر کا عکس اضطراب
جنبشِ مژگاں ہزاروں تیر برساتی ہوئی — دل کے زخمی آبلوں کو یعنی برماتی ہوئی
خنجرِ ابرو کی حرکت اذن قتل عام ہے — ہر ستم فرسا اشارہ موت کا پیغام ہے
اُف وہ تلواریں کہ باہم یعنی ٹکراتی ہوئیں — گہہ ادھر آتی ہوئیں گہہ اُدھر جاتی ہوئیں
ہر تحرک جن کا وقفِ خونِ حسرت ہوگیا — ہر اشارہ جن کا محوِ صد جراحت ہوگیا
رخ وہ آئینہ کہ جس میں موج زن رنگِ شباب — شیشۂ رخسار میں کچھ بجلیاں حسنِ شہاب
وہ سپیدی صبح کی سرخی تہِ دامن لئے — وہ گلابی موج یعنی پرتوِ گلشن لئے
سرخیاں رخسار کا فر میں تموج خیز ہیں — بجلیاں رنگ شفق میں صاعقہ انگیز ہیں
خالِ نازک نقطۂ پرکارِ حسنِ دل ستاں — وہ ذرا سا شوخ دھبہ سرخیِ رُخ پر عیاں
یہ تماشائے عجوبہ کیا تحیر خیز ہے — اک سیہ نکتہ مگر کس درجہ جادو ریز ہے
رنگِ گلشن صبح رخ میں چھا گیا بن کر خمار — خالِ نازک کی ادا ہے یعنی لالہ آشکار
رنگِ منظر پر نمایاں کچھ چمن ہونے لگے — تیرے لب ہائے درخشاں خندہ زن ہونے لگے
سلکِ مروارید ہونٹوں میں ہے شعلہ داستاں — جھلملاتے چند تاروں کی لڑی لب میں نہاں
کہکشاں نے آکے ہونٹوں میں پناہ نازلی — سطر پروین خندۂ لب میں چمک دکھلا گئی
غنچۂ لب پہ سحر کی اوس سے چھینٹیں پڑیں — قطرۂ شبنم پرو کر کس نے لڑیاں گوندھ دیں
وہ زنخداں بقعۂ نورِ شرارِ برقِ طور — قمقمہ وہ یعنی عکسِ جلوۂ خورشید نور
محو ذرے ہوگئے منظر تماشا ہوگیا — تیرے حسن نازنیں کا ایک اشارہ ہوگیا
ہر نگاہِ ناز تیری مستِ آہو ہوگئی — یہ جمال مضطرب مخمور جادو ہوگئی

قیس جمال بریلوی

سیّدنا خضر علیہ السلام

(از جناب حکیم شبیہ احمد صاحب صدیقی امروہوی)

(گزشتہ سے پیوستہ)

قبل بعثت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پانچسو برس کے بعد دندان مبارک اُن کے نکلتے تھے۔ مگر بعد بعثت ایک سو بیس برس بعد نکلنے لگے۔ آپ نیک خلق، جواں مرد مشفق بر خلق ہیں۔ جود وعطا میں بے نظیر، ایثار آپ کی عادت ہے، علم الکیمیا سے بخوبی آگاہ خود قرض لیتے دیتے ہیں اور بازار میں دلالی کرتے ہیں اور اُجرت پر بھی کام کرتے ہیں۔ حضرت امام نووی شرح صحیح مسلم شریف باب الفضائل خضر علیہ السلام میں لکھتے ہیں کہ جمہور اس طرف ہیں کہ حضرت خضرؑ زندہ ہیں اور ہم لوگوں میں موجود ہیں۔ یہی متفق علیہ ہے۔

بعض وہ حالات و واقعات ہیں جو قبل بعثت حضور نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم ہیں۔ اُن کا اس مقام پر درج کرنا اس لئے غیر ضروری ہے کہ نبوت خضر علیہ السلام اور وجود خضرؑ قرآن مجید اور ارشادات حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو چکا ہے۔ خلاصۃ المفاخر میں حضرت شیخ ابو طالب عبدالرحمن ہاشمی الواسطی مقریؒ سے روایت ہے کہ میں نے ایک مرتبہ حضرت شیخ جمال العارفین ابو محمد عبداللہ بصریؒ سے دریافت کیا کہ حضرت خضرؑ زندہ ہیں آپ نے فرمایا کہ زندہ ہیں اور ملاقات و سوال و جواب مجھ سے کئے ہیں جس کی تفصیل کتاب مذکور میں موجود ہے۔

حضرت شیخ ابو مدین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے مسلسل تین سال حضرت ابو العباس خضر علیہ السلام سے ملاقات رہی اور اُنھوں نے مجھے حضرت شیخ ابو محمد عبداللہ محی الدین عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ کے مراتب اور مقامات کی خبر دی۔ شیخ ابی محمد قاسم بن عبید بصریؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت سیدنا ابو العباس خضر علیہ السلام سے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ کا حال دریافت کیا تو فرمایا کہ اس وقت شیخ فرد احباب اور قطب اولیاء ہیں خدا نے کسی ولی کو اس وقت تک نہیں پہنچایا جس پر اس وقت حضرت شیخ عبدالقادر رضی اللہ عنہ ہیں۔ یہ وہ حضرات ہیں جن کا وجود چوتھی یا پانچویں صدی میں قبل از زمانہ حضرت غوث الثقلین رضی اللہ عنہ تھا یا وہی زمانہ رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ ہزاروں بزرگان و علماء سے

کیثر روایت ملاقات خضر علیہ السلام کی کتابوں میں موجود ہیں۔

اب میں اُن روایات کو درج کرتا ہوں جو حیات خضر علیہ السلام کے مخالف ہیں۔

بخاری شریف باب العشاء والعتمۃ من رآہ واسعاً میں یہ روایت ہے۔ قال صلی لنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیلۃ صلوٰۃ العشاء وھی التی یدعون الناس العتمۃ ثم انصرف فاقبل علینا وقال ارایتکم لیلتکم ھذہ فان راس مائۃ سنۃ منھا لا یبقی ممن ھو الیوم علی ظھر الارض احد

مولانا شروانی نے ابوبکر نقاش کے حوالہ سے لکھا ہے کہ تفسیر ابوبکر نقاش میں ہے کہ میں نے حضرت علی بن موسیٰ رضا سے دریافت کیا کہ خضر زندہ ہیں یا مر گئے۔ فرمایا کہ خضر مر گئے۔ حضرت امام بخاری سے حیات خضرؑ کی بابت سوال کیا گیا تو اُنھوں نے اس حدیث کی بنیاد پر اُن کے زندہ ہونے سے انکار کیا۔ ابوحیانؒ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ مذہب جمہور یہ ہے کہ خضرؑ نے وفات پائی۔ ابن ابی الفضل سے منقول ہے کہ خضرؑ صاحب موسیٰؑ نے رحلت کی۔

ابوالحسن بن المبارک نے جو کتاب احوال خضرؑ میں لکھی ہے اُس میں وہ ابراہیم حربی کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ خضرؑ نے رحلت کی۔ اسی کا یقین ابن النساوی نے کیا ہے۔ اور حدیث مذکورۂ بالا کو نقل فرماتے ہوئے حیات خضرؑ سے انکار کیا ہے۔

ابن جوزیؒ نے جو کتاب اس موضوع پر لکھی ہے اُس میں لکھا ہے کہ ابویعلی حنبلی فرماتے ہیں کہ ہمارے بعض اصحاب سے حیات خضرؑ کے متعلق سوال کیا گیا کہ کیا اُنھوں نے رحلت فرمائی جواب دیا کہ " ہاں " ابوطاہر عبادیؒ قاضی ابوبکر بن العربی بھی ابویعلیٰ حنبلی کے ہم خیال ہیں۔ ابن مناویؒ نے جیسا کہ مولانا شروانی نے لکھا ہے۔ راویان حدیث پر خوب تبرا کیا ہے اور قرآن مجید کی یہ آیت وما جعلنا لبشر من قبلک الخلد[لہ] لکھکر فرماتے ہیں کہ یہ موت خضر پر کافی دلیل ہے۔ نیز تفسیر معالم التنزیل نے اس آیۂ شریفہ کو دلیل نفی حیات خضر لکھا ہے۔ لیکن اس آیۃ میں بھی احتمال تاویل پایا جاتا ہے۔ لفظ بشر اُن لوگوں کے لئے بولا جاتا ہے جو بلا تامل نظر آتے ہیں۔ اور ہر ایک سے ملاقات کرتے ہیں اور ہر ایک اُن سے ملاقات کرتا ہے اور وہ زمین پر رہتے ہیں۔ حالات خضرؑ اس کے خلاف ہیں۔ کیوں کہ وہ خواص سے ملاقی ہوتے ہیں۔ پانی یا زمین یا ہوا پر قیام ہے۔ عام لوگوں کی نظر سے پوشیدہ ہیں۔ ایک حدیث مشہور ہے جس سے نفی حیات خضرؑ پر استدلال کیا جاتا ہے لوکان الخضر حیا لزارنی۔ اگر خضر زندہ ہوتے تو مجھ سے ملاقات کرتے۔

[لہ] سورہ انبیاء پارہ ۱۷

مجمع البحار میں مقاصد الحسنہ سے منقول ہے کہ یہ قول مرفوعاً ثابت نہیں۔ بلکہ یہ اُسی شخص کا قول ہے جو حضرت خضرؑ کی حیات کا منکر ہے۔

اگر اس کو ارشاد حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تسلیم کر لیا جائے۔ تب بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ارشاد حضور روحی فداہ قبل از ملاقات خضرؑ ہے۔ مگر اس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ ترکیب توجیہات کی نفی کرتی ہے پس اُس کے بعد وقوع کس طرح ہو سکتا ہے کہ بنائے ملاقات عرف وعادات اور ظن غالب پر ہوتا ہے۔ جیسا کہ بعض کا قول ہے کہ کوئی جان دار جو روئے زمین پر ہے اُس کی بقا سو برس سے زاید نہ ہوگی۔ امام نوویؒ نے شرح مسلم میں اس ارشاد کے متعلق خاص باب لکھا ہے۔ فرماتے ہیں کہ باب بیان معنی قولہ صلی اللہ علیہ وسلم علی راس مائۃ سنۃ لا یبقی نفس منفوسۃ ممن ھو موجود الآن انتہیٰ یعنی آپ فرماتے ہیں کہ کیا تم نے دیکھا اُس رات کو بیشک ابتدای صدی سال پر کوئی باقی نہ رہے گا اُن لوگوں میں سے جو آج روئے زمین پر ہیں۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس ارشاد سے یہ مطلب ہے کہ یہ قرن گزر جائے گا۔ ایک دوسری روایت حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی وفات سے ایک ماہ قبل فرماتے سنا کہ جو آج موجود ہے وہ سو سال تک زندہ نہ رہے گا۔ حضرت ابی سعید رضی اللہ عنہ نے بھی اس کے ہم معنی روایت کی ہے۔ مگر اُس میں اس قدر زاید ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ روایت غزوۂ تبوک سے واپسی کے وقت ارشاد فرمائی۔ جن کی بعض اور احادیث سے تفسیر کردی اور ان میں ایک خاص علم ہے علوم نبوت سے جس کا مطلب یہ ہے کہ جو نفس اس شب میں زمین پر موجود ہے وہ اس کے بعد سو سال تک زندہ نہ رہے گا۔ خواہ اُس کی عمر اس سے قبل کم ہو یا زیادہ۔ اس سے اس امر کی نفی نہیں ہے کہ جو کوئی اس رات کے بعد ہوگا وہ سو سال سے زیادہ نہ رہے گا نفس منفوسہ سے مراد یہاں نفس پیدا کردہ شدہ ہے۔ اس سے ملائکہ نکل گئے اور ان ہی احادیث سے بعض محدثین استدلال کرتے ہیں کہ حضرت خضر علیہ السلام مردہ ہیں۔ مگر جمہور اس کے خلاف ہیں اور ان احادیث کی تاویلات اس طرح کرتے ہیں کہ وہ اُس وقت دریا پر تھے زمین پر موجود نہ تھے۔

۲ - یہ کہ یہ حدیث عام مخصوص البعض ہے۔ چنانچہ شیخ ابراہیم کردیؒ مسالک الابرار میں لکھتے ہیں کہ یہ

حدیث عام مخصوص البعض ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام و معمر کو شامل نہیں ہے۔ ملا یعقوبؒ خیر جاری شرح صحیح بخاری میں فرماتے ہیں کہ علی ظہر الارض کی قید سے وہ لوگ جو آسمان پر ہیں خارج ہو گئے جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ملائکہ اور حضرت خضرؑ کہ وہ دریا کے کنارے تھے زمین پر نہ تھے۔ اور جمہور کے نزدیک زندہ ہیں اور اُن کی ملاقات کے قصص اولیاء اللہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے منقول و مشہور، نیز شیطان بھی اس سے خارج ہے وہ بھی پانی یا ہوا پر تھا۔ یا یہ کہ اس سے مراد وہ لوگ لئے جائیں جو ظاہر میں موجود تھے اور یہ بھی وجہ عمدہ ہے تو اُن کے علاوہ دوسرے لوگوں کے خارج ہونے کی ضرورت نہیں۔ پھر دوسرے مقام پر اسی شرح میں ارشاد فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے امام بخاریؒ وغیرہ حضرت خضرؑ کی موت پر استدلال کرتے ہیں جس کا جمہور نے یہ جواب دیا ہے کہ یہ عام مخصوص البعض ہے۔ یا یہ کہ زمین سے مراد خاص زمین ہے۔ جیسے مکہ معظمہ یا مدینہ منورہ۔ اسی طرح قسطلانی میں بھی ہے اور اُس کی عبارت میں جو تکلف ہے وہ ظاہر ہے۔ اس واسطے کہ معلوم لفظ کے عام ہونے سے مخصوص غیر معلوم الوجود متروک نہیں ہوتا۔ پس ایسی صورت میں اولیٰ یہ ہے کہ عموم اُس نفس کے اعتبار سے سمجھا جائے جو اُس شب کو اُس زمین پر موجود ہو اور حضرت خضرؑ شاید اس شب میں یا اُس وقت زمین پر موجود نہ ہوں۔ بلکہ دریا میں ہوں۔ پس ایسی صورت میں یہ حدیث اُن تمام زمین والوں کی فنا پر دلالت نہیں کرتی جو بعد زمانۂ صدور اس ارشاد شریف کے پیدا ہوں اور اس سے قیامت کا وقوع لازم آجائے گا۔ کیوں کہ فنا سے مراد اُس شب کے موجودہ لوگوں کی فنا ہے۔ جیسا کہ شراح نے اس کی تصریح کی ہے۔ نیز حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اشعۃ اللمعات میں صحیح مسلم کی اس حدیث کے ترجمہ کے ذیل میں جو اُسی مضمون بخاری شریف والی روایت میں حضرت جابر سے منقول ہے۔ فرماتے ہیں کہ حضرت خضرؑ اس عموم سے مخصوص ہیں۔ حضرت شیخ نورالحق محدث دہلوی تیسیر القاری ترجمہ صحیح بخاری میں رقم فرماتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مخالفین حضرت خضر علیہ السلام کا استدلال ٹھیک نہیں ہے۔

(۱) یہ کہ الف ولام ارض میں استغراقی نہیں ہے

(۲) یہ کہ زمین سے مراد خاص زمین ہے جیسے جزیرۃ العرب

(۳) یہ کہ اگر الف لام استغراقی بھی تسلیم کر لیا جائے تو لفظ احد عام ہے۔ عام اکثر مخصص ہوتا ہے ممکن ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام اُس شب کو زمین پر نہ ہوں۔

(۴) یہ بھی ممکن ہے کہ احد سے مراد وہ لوگ ہوں جن کو عموماً سب دیکھتے ہیں اور میل جول رکھتے ہیں۔
شیخ الاسلام شرح بخاری میں فرماتے ہیں کہ شاید اس سے تحریص عبادت مقصود ہو تاکہ اُمتیان محمدی صلی اللہ علیہ وسلم خاص اہتمام اور سعی کریں۔ کیوں کہ عمریں اس اُمت کی کم ہیں۔ لہذا اُمت کے لوگوں کو عبادت میں زیادہ کوشش کرنا چاہیئے۔

جمہور کا قول ہے کہ خضر علیہ السلام اس سے مستثنیٰ ہیں اور یہ حکم اکثری ہے اور اس قسم کے عام بہت ہوتے ہیں نیز یہ بھی ممکن ہے کہ لوگوں سے مراد وہ لوگ ہوں جو آپس میں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ حضرت خضر علیہ السلام مردانِ غیب سے ہیں اُن کو عام لوگ نہیں دیکھتے سوائے اولیاء اللہ کے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اُس شب کو زمین پہ نہ ہوں یا زمین سے زمین خاص مراد ہو۔ جیسے جزیرۂ عرب۔ قسطلانی اس روایت کی شرح میں فرماتے ہیں کہ یہ عام مخصوص البعض ہے یا زمین سے مراد وہ زمین ہے جہاں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نشو ونما پایا تو حضرت خضر علیہ السلام وہاں موجود نہ تھے جو اس خبر کے مصداق ہوتے۔ جیسا باب السمر بالعلم میں یہ بات بیان کی جاچکی ہے کہ زمین سے مراد وہ زمین ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوئی یعنی عرب۔ جس میں حجاز، تہامہ، نجد وغیرہ شامل ہیں اور اُس کی تائید ارشاد خداوندی او ینفوا من الارض سے ہوتی ہے۔ کیوں کہ ارض سے مراد وہ زمین ہے جس میں گناہ ہوا اور اُس میں الف لام استغراق کا معلوم نہیں ہوتا۔ پس اس حدیث سے خضر علیہ السلام کی موت پر استدلال کرنا ساقط ہوگیا۔ مُلّا عصام اسفرائنیؒ شمائل ترمذی کی شرح میں ابو الطفیل ابن واثلہ کے اس قول میں کہ رأیت النبی صلے اللہ علیہ وسلم وما بقی علی وجہ الارض احد غیری فرماتے ہیں کہ حدیث مذکورہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اشبح، یسرا، جعفر، نسطور رومی، ابا ہدیہ بصری، مدعیان صحابیت (نعوذ باللہ) کذاب تھے۔
اسی طرح بابا رتن ہندی جنھوں نے ۶۳۲ھ ہجری میں دعویٰ صحابیت کیا۔ یا ربیع بن محمود جو اُن کے بھی بعد ظاہر ہوئے اور دعویٰ صحابیت کیا اُن کا دعویٰ بھی باطل اور لغو تھا۔ حالانکہ بعض نے ان کے دعوے کو قبول کیا جیسا کہ احادیث "معمرتینات" کے ملاحظہ سے ظاہر ہوتا ہے اور نیز اُن کی صحت کے متعلق اکثر علمائے محدثین نے مہرِ تصدیق ثبت فرمادی ہے۔ پس اُن کو صحابہ کی فہرست میں شمار کرنا حیات خضر علیہ السلام کو تسلیم کرنے کے مرادف ہے۔
امام تقی الدین ابو العباس احمد بن شیخ کمال الدین محمد بن حسن متوفی ۸۷۲ھ مزیل الخفاء عن الفاظ الشفاء میں

رقم فرماتے ہیں کہ یہ حدیث عام ہے اُن لوگوں کے لئے جو اُس وقت میں دیکھ پڑتے تھے اور لوگوں سے ملتے جلتے تھے نہ اُن لوگوں کے لئے جو ایسے نہ تھے جیسے حضرت خضر علیہ السلام۔ کیوں کہ دجال اس حدیث سے خارج ہے جیسا کہ مسلم نے (جساسہ) کی حدیث سے وجود دجال بزمانۂ حضور نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم پر دلالت کرتی ہے۔ نیز اُس کی بقا پر اس زمانہ کے بعد روایت کی ہے۔ پس امام علی رضا، امام بخاری، ابن مبارک، ابن جوزی اور دیگر علمائے محدثین کا حیات خضر سے انکار کیوں کر تسلیم کیا جا سکتا ہے، جب کہ اُن کے اقوال مؤید موت خضر میں بھی امکان تاویل حیات خضر کا موجود ہے۔

اقتباس الانوار میں ہے جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ بعد بعثت حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے دندان مبارک ایک سو بیس سال کے نکلنا شروع ہوئے۔ "تا ایں زماں از وقت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہفت نوبت برآمدہ اند و او زناں بسیار داشتہ است و فرزندان بے شمار، اما زنان و فرزندان او را نمی شناختند کہ ایں حضرت است و پیش قاضی نیز در وقت نکاح نام خود را 'مغربی' می گفت و حالا صد و بست سال و ہفت ماہ شدہ اند کہ ترک تزویج کردہ است۔"

آگے چل کر فرماتے ہیں کہ "نغمۂ خوب را دوست می دارد رقص و تواجد نیز بسیار می کند و در مجالس سماع کہ صاحب باشد آنجا بامر حق حاضر می شود۔" پھر فرماتے ہیں کہ "اکثر اوقات در مجلس سماع سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ حاضر شدے و باوے صحبت داشتے۔"

صاحب مرآۃ الاسرار فرماتے ہیں کہ "ایں فقیر کاتب الحروف چند مرتبہ حضرت خضر علیہ السلام را بمثل دیگر مردان غیب شہدا دیدہ است و استفادہ صوری و معنوی از ذات با برکات وے حاصل نمودہ۔" ایک موقع پر بحوالہ کتاب عروۃ الوثقیٰ فرماتے ہیں "کہ دریں زماں خضر و قطب و ابدال موافق مذہب امام شافعی نماز می گزارانند۔"

حضرت مولانا عبد القادر جون پوری فصول مسعودیہ فارسی کے خطبہ میں تحت ذکر حضرت عبد اللہ علمبردار فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں خطاب جماعۃ اہل عادۃ سے ہے اور اُس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص اُس وقت کے موجودین میں سو سال تک بقائے عادی و استمراری کہ جو بطریق تخلف یا تخلیل کے ہے باقی نہ رہے گا۔

حضرت خضر و الیاس علیہما السلام یا دیگر اشخاص کی بقا بقائے استمراری کے طور پر نہ تھی کاتب الحروف کے نزدیک یہ معنی بہت ٹھیک ہیں اور اسی کے قریب وہ حکایت ہے جو اصابہ فی معرفۃ الصحابہ میں منقول ہے۔ ملا علی قاری مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں فرماتے ہیں کہ حدیث مذکورہ کے معنی یہ ہیں کہ کوئی جاندار سو سال تک باقی نہ رہے گا۔ اس سے

مراد حضرات صحابہ کی موت ہے اور یہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم برنبائے غالب ہے یعنی اکثر ایسا ہوگا کہ اس صدی کے پیدا شدہ لوگ باقی نہ رہیں گے ورنہ بعض صحابہ تو سو سال سے زائد بھی زندہ رہے۔ جیسا کہ حضرت انس بن مالک اور سلمان وغیرہ رضی اللہ عنہم۔

اگرچہ ان مدعیان صحابیت کی (جن کا ذکر کیا گیا ہے) ملا طاہر گجراتی نے مجمع البحار میں اور میزان الاعتدال میں علامہ ذہبی نے اور دیگر کتب اسماء الرجال میں تکذیب کی ہے۔ مگر باوجود اس کے اکثر علماء نے احادیث روایت کردہ بابا رتن ہندی کو اخذ کیا ہے۔ چنانچہ ایک رسالہ میں شیخ احمد مکی نے جس کا نام "الفتحیات من الاحادیث الرتنیات" ہے ان احادیث کو جمع کردیا ہے (یہ رسالہ مطبوعہ ہے اور راقم الحروف نے دیکھا ہے) قطع نظر ان حالات کے جب ہم یہ دیکھتے ہیں اور مشاہدہ کرتے ہیں کہ ایک ہزار سال سے زائد تک کی عمر کے جوگی اس زمانہ میں پائے جاتے ہیں اور اکثر نے اُن سے ملاقات کی ہے تو لامحالہ ان احادیث کی اُن تاویلات کو جو علمائے متقدمین نے کی ہیں صحیح تسلیم کرنے میں کوئی عذر باقی نہیں رہتا اور ان مدعیان کو دجال وکذاب کہنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ دوسرے یہ کہ علماء ہی کی جرأت ہے کہ ان کو دجال وکذاب کہہ دیں۔ ہمارے لئے تو صرف یہی کفایت کرتا ہے کہ اُن کے لئے صرف وہی سزا کافی ہے جو انھوں نے بزعم خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا طوفان باندھا ہے اور یہ تو ان علماء کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے جس کو چاہا دجال، کذاب بنا دیا یا فتویٰ کفر صادر کردیا۔ چنانچہ صرف ابن تیمیہ جن کو شیخ الاسلام کہا جاتا ہے انھوں نے حضرت امیرالمومنین فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی نسبت یہ الفاظ کہے۔ "واغلطات واے غلطات" حضرت سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہ کی تین سو سے زائد بیوہان کرنا بیان کیا ہے۔ حضرت سیدنا عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی تکفیر کی ہے۔ (دیکھو فتاوی حدیثیہ علامہ ابن حجر مکی وصراط المستقیم والرد علی اہل الجحیم ابن تیمیہ)

ملا علی قاری جن کا پایہ فقہائے احناف میں بہت بلند ہے حیات خضر کے قائل ہیں۔ چنانچہ بعض احادیث حیات کو نقل فرماکر فرماتے ہیں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں وجود خضرؑ ضرور تھا۔ چنانچہ اکثر صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے ثابت ہے۔ اور جو لوگ ممات خضر کے قائل ہیں اُن کا قول رجم بالغیب ہے۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں۔ کذاب۔ دجال۔ اللہ اور رسول کی تکذیب کیا کرتے ہیں۔ کچھ بعید نہیں کہ حضرت خضر علیہ السلام کی بھی تکذیب کریں لیکن زہاد، عباد اکابر صوفیا کے ساتھ رہنے میں کلام نہیں۔ نیز حضرت خضر علیہ السلام کا مرسل نبی ہونا

اجماع سے بالکل باطل ہے۔ علیٰ ہذا القیاس یہ کہنا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر نہیں ہوئے یہ بھی باطل ہے۔ عدم بیعت کے متعلق صرف یہ ہے کہ اگر بیعت نہیں کی پھر بھی ہر بات میں متابعت حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پائی جاتی ہے۔ اس میں دنیا و دین کا کوئی نقصان نہیں۔ پھر فرماتے ہیں کہ ارباب اصول میں سے ایک جماعت نے حضرت خضر علیہ السلام کو جماعت صحابہ میں شمار کیا ہے۔

جو حضرات حالات و سوانح اولیاء کرام مطالعہ کرتے رہتے ہیں اور بزرگانِ دین سے اعتقاد رکھتے ہیں اور اُن کو خدا کا مقبول بندہ اور اتباع رسول کرنے والا جانتے ہیں۔ اُنھوں نے حالات حضرت سیدنا عبداللہ کی علم بردار رضؓ خواجہ عبدالعزیز کی عبداللہ علم بردار کا مطالعہ کیا ہوگا۔ یا حالات حضرت سلطان الہند میں یا مقالات خواجہ قطب الدین بختیار کاکی و حضرت بابا فریدالدین شکر گنج و حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی میں دیکھا ہوگا کہ حضرت عبداللہ بیابانی کی حیات کے متعلق حضرت سلطان الہند کا کیا ارشاد ہے اور کب تک کی مہلت دی گئی ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ اقتباس الانوار حالات حضرت معین الملت والدین خواجہ غریب نواز سیدنا و مولانا سید معین الدین حسن سنجری اجمیری رضی اللہ عنہ اور حالات سیدنا عبداللہ کی علمبردار کے لئے فصول مسعودیہ مصنفہ شاہ مسعود علی قلندرؒ مطبوعہ اصح المطابع آسی پریس لکھنؤ

اس کے بعد میں اُن اولیاء کبار رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے اسمائے گرامی پر اکتفا کرتا ہوں جنھوں نے حضرت خضر اسرائیلیؑ سے ملاقات کی ہے اور فیوض و برکات حاصل کئے ہیں۔ کتب سوانح و ملفوظات میں نہایت شرح و بسط کے ساتھ حالات درج ہیں۔ یہاں اُن کا درج کرنا طوالت سے خالی نہیں۔

(۱) حضرت سلطان ابراہیم بن ادہمؒ (۲) قطب ابدال خواجہ علو ممشاد دینوریؒ (۳) خواجہ ہبیرۃ البصریؒ (۴) خواجہ ابو اسحٰق شامیؒ خواجہ خواجگان خواجہ معین الدین حسن سنجری اجمیریؒ (۵) خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ (۶) خواجہ بابا فریدالدین شکر گنجؒ (۷) سلطان الاولیا حضرت نظام الدین بدایونیؒ (۸) مخدوم سید علی احمد صابرؒ (۹) شیخ احمد عبدالحق ردولویؒ (۱۰) شیخ عبدالقدوس قطب العالم گنگوہیؒ (۱۱) حضرت غوث الاعظم سیدنا محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ (۱۲) حضرت خواجہ عبدالخالق غجدوانی (۱۳) حضرت خواجہ محمد پارساؒ (۱۴) حضرت شیخ بہاء الدین نقشبندؒ (۱۵) حضرت سیدنا شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی (۱۶) شہسوار میدان آزادی بندگی خواجہ شاہ عبدالہادیؒ جد راقم وغیرہ وغیرہ۔ واقعہ حضرت سیدنا سلطان ابراہیم ادہمؒ و واقعہ حضرت سیدنا شیخ عبدالستار دہلوی خلیفہ اعظم حضرت

قطب العالم بندگی شیخ عبد القدوس گنگوہی کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

حضرات! ان جملہ حالات اور واقعات کے مطالعہ کے بعد یہ ثابت اور کھلا ثابت ہے کہ مخالفین حیات حضرت سیدنا ابوالعباس خضر اسرائیلی علیہ السلام جن آیات و احادیث و اخبار و اقوال صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اور محدثین رحمہم اللہ تعالیٰ کو سند لاتے ہیں۔ اُن کے ملاحظہ سے واضح ہوگیا کہ مفہوم معنی کے سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔ ورنہ جمیع اکابر اولیاء جس میں صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین و محدثین و مفسرین متفق ہیں کہ کوئی حدیث صحیح موت حضرت خضر اسرائیلی کے متعلق نہیں ہے۔ بلکہ مؤید حیات اکثر احادیث پائی جاتی ہیں اور جو ضعیف ہیں اُن کی تلافی اور جبر و نقصان کثرت طرق کے بنا پر ہوگئی ہے۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں اولیاے کرام کے مشاہدات سے بھی اُس کی تائید ہوتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ خضر علیہ السلام نبی ہیں اور زندہ ہیں اور خدمت بر و بحر پر من جانب اللہ مامور ہیں اور تبدیل ہیئت و حلیہ کی قدرت جناب باری نے اُن کو دے رکھی ہے۔ اولیاے کرام اور گم شدگان راہ سے ملاقات فرماتے ہیں اور یہ خداے قدوس قادر و توانا کے لئے کوئی مشکل امر نہیں ہے۔

آنسو

یاد رکھئے یہ ننھی ننھی بوندیں روح کا جوہر ہیں۔

اگر آہِ سرد ایک فرشتہ کی تلوار ہے، تو آنسو اس کی کاٹ ہیں

خوبصورتی کے لئے آنسو مسکراہٹ سے بھی زیادہ قیمتی معلوم ہوتے ہیں۔

ایک عورت کے آنسو مثل خاموش مقرر کے ہیں، وہ الفاظ کا بوجھ رکھتے ہیں۔ مگر جہاں آنسو بھی اثر نہ کرسکیں، وہاں اور کوئی چیز اثر نہیں کرسکتی۔

جو آنسو ہمدردی سے پونچھ لیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ہنسی آتی ہے۔ کیونکہ آنسوؤں سے کوئی چیز جلد خشک نہیں ہوجاتی۔

ایک مصورِ فطرت کا قول ہے کہ آنسو دل سے اُٹھتے ہیں اور آنکھوں میں جمع ہوتے ہیں۔ آپ آنکھوں سے آنسو پونچھ سکتے ہیں، مگر دل کو آنسوؤں سے پاک نہیں کرسکتے

یہی حقیر بوندیں بڑے بڑے بہادروں کی جرأت مردانہ کو بھی غرق کردیتی ہیں۔

مگر آنسوؤں کا جوہر مثنوی مولانا روم کے ان الفاظ میں مضمر ہے:

بلکہ مبارک دل کہ او بریان اوست ✲ اے خوشا چشمے کہ او گریان اوست ✲ گریہ کن تا بے دہاں خنداں شوی ✲ با تضرع باش تا شاداں شوی

سید محمد زیدی

غزل

(از جناب مختار بدایونی)

ترجمانِ رنج و غم پابندِ ہر مشکل ہوں میں
سانس کی آہٹ سے جو دُکھتا ہے دل وہ دل ہوں میں

مطمئن ہو کر بھی ہمشکلِ دلِ بسمل ہوں میں
مختصر یہ ہے کہ اپنا آپ ہی قاتل ہوں میں

بعد مرنے کے کسی کو ہو گی یہ عزت نصیب
جیتے جی اے قبر والو! تم میں اب شامل ہوں میں

پوچھتے ہو عشق میں کیا مجھ سے تم راہِ مُرادؔ
رہبری دل میں خود گم کردۂ منزل ہوں میں

اللہ اللہ عشق میں یہ فیضِ رنگِ بے خودی
کرنے والے کام کے انجام سے غافل ہوں میں

غور کرنے سے کھلا آخر یہ دوری کا سبب
یعنی اپنے اور تیرے بیچ میں حائل ہوں میں

ہے جہانِ آرزو میں اس قدر میری بساط
صرف اک ہلکی سی آوازِ شکستِ دل ہوں میں

کچھ عجب صورت سے ہوتا ہے مرا رنگِ ظہور
بیٹھکر بھی پردۂ محمل میں بے محمل ہوں میں

یہ کہاں قسمت کہ دیکھیں تیرے جلوہ کی بہار
ہوں تو دریا میں مگر دور از لبِ ساحل ہوں میں

کر رہا ہوں وعدۂ فردا کی گھڑیوں کا شمار
آرزو مندِ مآلِ سعیِ بے حاصل ہوں میں

کم ہے جو کچھ ہو مجھے اپنی وفاؤں پر غرور
عشق کی دنیا میں ہر الزام کے قابل ہوں میں

کون ہے مختارؔ دونوں میں خرابی کا سبب
باعثِ محفل ہے وہ برہم کنِ محفل ہوں میں

ترکی کی کہانی حمدی بے کی زبانی

(از جناب ایم اے وحید صاحب بی اے)

جب ایک غیر ملکی سیاح سرزمین ہند پر وارد ہوتا ہے تو یہاں کی مختلف مگر خلاف امید حالتیں اُس کے دلی اشتیاق کو وسعت تجربہ کے لئے دوبالا کر دیتی ہیں۔ ساحلِ بحر سے دامن ہمالیہ تک عظیم الشان بندرگاہوں کی خوب صورتی، تجارتی مرکزوں کی گوناگون مصروفیتیں، جدید شہروں کی مغربی وتعیشانہ زندگی اور قدیم مقامات کے عروج و زوال کی پر درد داستانیں اس کے سامنے عجیب و غریب دلکش مناظر پیش کرتی ہیں۔ لیکن جب یہ تفریحات اُس کے دماغ کو موجودہ قوموں اور بالخصوص مسلمانوں کی ذہنیت علمیت اور تہذیب کا سطحی خاکہ لینے پر مجبور کرتی ہیں تو وہ ایسی جگہ کا متلاشی ہوتا ہے جہاں فدائیان توحید کی جملہ کار فرمائیوں کا صحیح مرقع نظر آجائے۔ یہ اصلی واقعات ہیں جن کی بنا پر ہر سیاح علی گڑھ کی مقدس فضا میں سانس لینا لازمی سمجھتا ہے۔ محترم حمدی بے نے بھی اس نظریہ کو مقدم قرار دیا۔ آپ ترکی کے ایک اعلیٰ خاندان کے رکن اور مصر کے مشہور معروف جرنلسٹ ہیں۔ ممالک یورپ، امریکہ، جاپان، فارس اور چین میں دورہ کرنے کے بعد ملک ہند میں تشریف فرما ہوئے اور سال رواں کے اوائل میں اپنی عالمگیر سیاحت کے جزو اعظم کی تکمیل کے لئے آپ نے ہمارے دارالعلوم کو رونق بخشی صاحب موصوف کی یہ برادرانہ ہمت افزائی اگرچہ ہمارے لئے کوئی نئی بات نہیں۔

اس عظیم الشان درسگاہ کی گزشتہ پچاس سالہ فہرست میں کتنے معزز زائرین ہیں جو وقتاً فوقتاً وکٹوریہ گیٹ کے جلال سے ہماری رفعت کا پورا زائچہ لے چکے ہیں۔ ہزاروں کی تعداد ہے جو اس باب الرحمۃ سے گزرتے رہے ہیں۔ حمدی بے بھی حال ہی میں اس کے معترف ہوئے کہ جس تحریک کی بنا ایک ترک نے باب عالی کے ستارے کو اوجِ کمال پر پہنچانے کے لئے آج رکھی ہے ملک ہند میں اُس کی روح اب سے نصف صدی قبل باب الرحمۃ کے دوسری جانب سونے والی ہستی نے پھونک دی تھی۔ فی الحقیقت آپ کی سیاحت ہند ایک لحاظ سے ضرور قابل یادگار رہے گی۔ آپ نے عین ایسے وقت میں ہم لوگوں کو شرف باریابی اور اطمینان قلبی بخشا جب کہ اُن کے مخالفین نے اس ملک کی فضا میں ترکوں کی موجودہ تحریک کے خلاف جراثیم

منافرت پھیلا دیئے تھے۔ مصطفیٰ کمال کو ہزارہا لغزشوں، صدہا طعنوں اور مذہبی بیزاری کا نشانہ بنایا تھا۔ آپ نے اس ناپاک پروپیگنڈے کے خلاف جو جہاد عظیم کیا اس نے دودھ کو دودھ اور پانی کو پانی کر دکھلایا۔ ہمارا خیال ہے کہ ہندی مسلمانوں کو اس ترکی رئیس کی بلند نظری اور بصیرت افروزی سے سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ آپ نے مصطفیٰ کمال کی ذمہ دارانہ زندگی پر اجمالی نظر ڈال کر اُن اہم و سنگین حادثات کو دہرایا جو جنگ سمرنا کے درمیان میں واقع ہوئے اور ساتھ ہی ساتھ اُن اثرات پر بھی روشنی ڈالی جو جنگ عظیم کے بعد سے عالم اسلامی میں عموماً اور نوجوان ترکوں میں خصوصاً پیدا ہو رہے ہیں۔ آپ کا قول ہے کہ اسلام کے خوش گوار اور پُرامن مستقبل کے لئے یہ امر لازمی ہے کہ ترک جدید روش پر زمانہ کے موافق دیگر اقوام یورپ کے دوش بدوش ترقی کریں۔ دنیا کی شاید کوئی قوم ایسا دقیق اور عظیم الشان انقلاب تاریخ میں مشکل سے پیش کرے گی۔ مذہب سے بے التفاتی کو آپ نے قطعاً لغو اور بے بنیاد اتہام قرار دیا۔ علماء و صوفیا کے فرقوں میں ضروری اصلاحات درکار تھیں وجہ یہ تھی کہ اول الذکر فرقہ اپنی تنگ نظری سے ہمیشہ سیاسی معاملات میں زبردست رکاوٹیں پیدا کرتا رہا اور موخر الذکر نے صدہا مرتبہ سلطنت کے خلاف درگاہوں کو بغاوتوں کی سازش گاہیں ثابت کیا ہے۔ رواج پردہ کے متعلق آپ نے فرمایا کہ عام تعلیم کا ہونا ضروری تھا۔ جب آبادی کی اکثریت تعلیم کی شعاعوں سے منور ہو جاتی تب پردہ کا ہٹانا کوئی خرابی پیدا نہ کرتا کیوں کہ ایسی حالت میں مرد و زن اپنی اور غیروں کی ذمہ داریوں کو محسوس کرنے لگتے ہیں۔ علاوہ بریں یہ اسلام میں سب سے زیادہ اہم، پیچیدہ اور نازک مسئلہ ہے جس کی گتھیوں کو سلجھانے کے لئے وقت کی اور آزمودہ کار دماغوں کی ضرورت ہے۔ آپ نے موجودہ ترکی کے مختلف شعبوں پر نہایت ہی خوش اسلوبی سے روشنی ڈالی اور یقین دلایا کہ مسلمانانِ ہند اور ترکوں میں ایک لابدی رشتہ قائم ہے جس کی شکست سے ہر ایک مجبور ہے۔ واقعی یہ بات بھی مناسب ہے کہ ہم کو ترکی کے نظریہ پر غور کرنا چاہیئے فروعات میں پڑنے سے کیا فائدہ۔ ترکی نے حفاظت اسلام کے لئے جو بیش بہا قربانیاں کی ہیں ضروری ہے کہ ایک فروعی کمزوری پر ہم اُن کو فراموش نہ کر بیٹھیں۔ ترک حقیقی معنی میں اسلام کا سچا پیرو ہے۔ خدا اُس کے بلند ارادوں میں کامیابی اور استقامت عطا فرمائے۔

کیفیات

(از جناب کیف مرادآبادی)

جلال میں ہے نہ ثروت میں ہے نہ جاہ میں ہے
وہ کیفیت جو مری حالتِ تباہ میں ہے

نجوم و شمس و قمر کی ضیائیں کیا دیکھوں
کہ اُن کے حسن کی تابش مری نگاہ میں ہے

بس اے فریب تمنا کہ مٹ جائے کہیں
وہ اک عجیب سی لذت جو "آہ آہ" میں ہے

ہجوم غم میں جو مشکل سے لب تک آئی تھی
وہی دعا مری اب اُن کی بارگاہ میں ہے

مرے لئے کوئی لذت نہیں ہے ہستی میں
کہ اب گناہ کا احساس بھی گناہ میں ہے

رموزِ عشق کا اک روز رازداں ہوگا
وہی دل آپ کے تیروں کی جو پناہ میں ہے

تجلیات محبت کی اُف رے بوالعجبی
جو نالہ دل میں نہ ٹھیرا وہ داغ ماہ میں ہے

نقاب اُٹھا دو کہ میں ہٹ رہا ہوں مرکز سے
عجیب لغزشِ پیہم مری نگاہ میں ہے

خرامِ ناز کی تاثیر دیکھنا اے کیف
اک ارتعاشِ خفی سا غبارِ راہ میں ہے

غزل

از جناب عبدالواحد صاحب بی ایس سی (علیگ)

ساقیا جاتا ہوں پیاسا ترے میخانے سے
کون دم دیتا ہے ٹوٹے ہوئے پیمانہ سے

پھر چلا چھوڑ کے گھر بار وہ تیری خاطر
پھر ترے وحشی کو الفت ہوئی ویرانہ سے

ہم بھی اب خوگرِ آلام ہوئے جاتے ہیں
باز آئیں گے نہیں آپ ستم ڈھانے سے

پاؤں پھیلاتا ہے پھر دشت نوردی کے لئے
پھر اُلجھتا ہے جنوں آپ کے دیوانے سے

چشمِ حق بیں سے کوئی دیکھنے والا ہی نہیں
وہی کعبہ سے ہے ظاہر وہی بت خانے سے

جب سُنا قصۂ غم اُس نے تو ہنسکر بولا
بس! گھٹن ہوتی ہے واحد ترے افسانے سے

مسلمان اور ہندی ادب

(از جناب عبد العلیم نامی صاحب انٹرمیڈیٹ کالج علیگڑھ)

ہندوستان کے دو مشہور فرقوں ہندو اور مسلمانوں میں جو آج کل بے حد کشیدگی اور منافرت پھیلی ہوئی ہے اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ چند خود غرض لوگوں کے اثر سے اُن میں باہمی اعتماد باقی نہیں رہا۔

حکومت برطانیہ کے تسلط سے پیشتر ہندوستان میں ہندو اور مسلمان دونوں ایک دوسرے کے علوم حاصل کرتے اور ایک دوسرے کے خیالات سے آگاہی حاصل کرتے تھے جس سے کہ دونوں کی معاشرت آپس میں شیر و شکر ہو جاتی اور دونوں کے لئے ایک مشترک زمین پیدا کرتی تھی لیکن جب سے ملک پر برطانیہ کے اثرات غالب آنے شروع ہوئے فضا بالکل بدل گئی اور ملکی نقطۂ نظر میں تبدیلیاں ہونے لگیں تعلیمی پروگرام میں بھی رد و بدل ہوگیا جس سے کہ نہ صرف اخلاقی حالت میں ایک نمایاں تبدیلی واقع ہوگئی بلکہ ان مخرب اخلاق تاریخوں نے جو پروپگنڈا کی خاطر نیم انگریزوں نے لکھیں اور حکومت کے زیر اثر ان کو اسکولوں اور کالجوں کے نصاب میں داخل کرایا۔ بچپنے ہی سے اُن نونہالان چمن کے دلوں میں جو چار دن کے بعد قوم کہلانے کی مستحق تھیں حقارت و عداوت کے جذبات پیدا کر دیئے اور خاص کر مسلمان بادشاہوں کی نسبتاً خوب من گھڑت قصے کھڑے ہوگئے اور ان کو ظالم، متعصب اور غاصب کی بُری شکلوں میں رنگ کر پیش کیا گیا اور اس لٹریچر کو اس قدر کثیر تعداد میں شائع کیا گیا کہ ہندو نوجوانوں کے دماغوں نے جو اُس نئی تعلیمی سرچشموں سے مستفید ہوئے فوراً مسلمانوں کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات کو قبول کر لیا۔

اُن جذبات میں سے جو اس تعلیم سے پیدا ہوئے ہیں ایک خیال اُس نئی ہندو قوم کے دل میں یہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے ہندوستان کی اتنی مدت کے سکونت و حکومت کے باوجود ان کے علم و ادب پر کوئی توجہ نہ کی اور ہمیشہ اس سے کنارہ کش اور ان کی تہذیب و تمدن سے بے پروا رہے۔

اس لئے یہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اس فضا میں ہم کچھ اُس زمانہ کے مسلمانوں کی مثالیں پیش کریں جنھوں نے سنسکرت

اور بھاشا میں دستگاہ کامل حاصل کی۔

سلطان زین العابدین والیٔ کشمیر جس نے کہ اکبر اعظم سے کئی صدی پیشتر عنان حکومت اپنے ہاتھوں میں لی تھی۔ سنسکرت کا ایک بڑا عالم اور ایک عظیم الشان دار الادب کا بانی مبانی تھا۔ یہی سب سے پہلی شخصیت تھی جس نے کہ عربی و فارسی تصانیف کا ترجمہ ملکی زبان میں کرانے کی بنیاد ڈالی اور اس ہی کے زمانہ میں مہابھارت نے سنسکرت سے ترجمہ ہوکر فارسی کا جامہ پہنا جس کے بعد اکبر اعظم نے اس کو اور زیادہ ترقی دی۔ راج ترنگنی جو کہ حکمرانان کشمیر کی مستند تاریخ ہے سلطان ممدوح ہی کے حکم سے لکھی گئی۔

ابراہیم عادل شاہ شاہ دکن نے جو ۹۴۲ھ میں تخت نشین ہوا اور جو اپنی دینداری و مذہبی تشدد میں مشہور تھا فارسی کی بجائے ہندی کو درباری زبان قرار دیا۔

سلطان فیروز شاہ تغلق جو ۵۵۰ھ میں تخت نشین ہوا، کہا جاتا ہے کہ وہ سنسکرت ادب کا بہت شائق تھا اور کانگڑہ کی فتح کے بعد جب کہ جوالامکھی کی مشہور سنسکرت لائبریری اس کے قبضہ میں آئی تو اس نے بہت سی نادر کتابوں کا ترجمہ فارسی میں کرنے کا حکم دیا اور اس زمانہ کے سنسکرت کے سب سے بڑے مسلمان عالم مولانا عزیز اللہ صاحب کی خدمات اس کار خیر کے لئے حاصل کیں۔ مولانائے موصوف نے علم ہیئت کی ایک نایاب کتاب کا ترجمہ بھی فارسی میں کیا جس کا نام بادشاہ کے نام پر فیروز شاہی رکھا۔

امیر خسرو دہلوی جو ایک درویش سیرت بزرگ اور فارسی کے مشہور شاعر تھے سنسکرت ادب میں اعلیٰ مرتبہ رکھتے تھے آپ نے اپنی مشہور تصنیف نہ سپہر میں ایک باب صرف ہندوستان کی فضیلت بیان کرنے میں صرف کیا ہے۔ اس باب میں آپ نے ہندو علوم کی فوقیت ہی نہیں بلکہ ان کے مذہب کی بھی سوائے اسلام کے سب پر بزرگی دکھلائی ہے۔ یہ عام طور سے مانا جاتا ہے کہ امیر خسرو مسلمانوں میں بھاشا کے سب سے پہلے عالم تھے۔ لیکن تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ امیر خسرو سے دو سو برس پہلے سعد (یا مسعود) سلیمان نے جو سلطان محمود غزنوی کے دربار کا ایک ممتاز امیر تھا بھاشا میں ایک دیوان تصنیف کیا تھا۔

امیر خسرو کے بعد ملک محمود جائسی (جائس اودھ میں ایک چھوٹا قصبہ ہے) جو کہ شیر شاہ کے زمانہ میں پیدا ہوا تھا بھاشا کا ایک مشہور شاعر گزرا ہے۔ اس کی بھاشا کی تصنیف "پدماوت" اب تک اپنی زبان کی خوبی اور نفاست میں ممتاز سمجھی جاتی ہے پدماوت کے علاوہ اس نے اور بھی کئی کتابیں بھاشا میں تصنیف کی تھیں۔

فیضی، غلام احمد آزاد اور عبد الجلیل بلگرامی اکبر اعظم کے زمانہ میں سنسکرت کے عالم اور اعلیٰ پایہ کے مصنف گزرے ہیں

جہانگیر کے زمانۂ حکومت میں ملا مسیح پانی پتی نے رامائن کا ترجمہ فارسی نظم میں کیا۔ جہانگیر خود بھی سنسکرت علماء کا قدر شناس تھا اور ہندو مذہب کے بزرگوں کی دل سے عزت کرتا تھا۔ اس کے زمانہ میں جودہ روپ اپنی مذہبی ریاضت میں مشہور تھا اور ویدوں کا عالم سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ جہانگیر نے اس کی ملاقات کی خاطر طویل سفر جس میں کہ اس کو ریگستان سے ہو کر گزرنا اور کچھ پیدل بھی چلنا پڑا برداشت کیا، اس سے حسب رتبہ پیش آیا اور ملاقات کا شرف حاصل کیا۔

چنانچہ جہانگیر کی جودہ روپ سے ملاقات کا واقعہ اس کی خود نوشت سوانح عمری یعنی تزک جہانگیری میں بھی موجود ہے جہانگیر کا ایک بھائی شہزادہ دانیال بھی بھاشا کا ایک مشہور شاعر تھا۔ غواصی اور ملا نوری بھی اس کے زمانہ کے بلند پایہ شاعروں میں سے تھے لیکن سب سے مشہور بھاشا کا شاعر جس نے اکبر اور جہانگیر دونوں کا زمانہ دیکھا وہ شیخ شاہ محمد بلگرامی تھے جو حصار کے گورنر تھے۔

مغل بادشاہوں نے بھاشا شاعری کی ویسی ہی سرپرستی کی جیسی کہ انھوں نے اپنی زبان فارسی کی۔ ایک مرتبہ راجہ سورج سنگھ نے ایک نہایت ذہین ہندو شاعر کو جہانگیر کے سامنے پیش کیا جس کے دل فریب نغموں سے وہ اس قدر خوش ہوا کہ اس کو ہاتھی انعام میں بخش دیا۔

میر ہاشم محترم اس زمانہ کے ایک دوسرے عربی عالم تھے جنھوں نے کہ تمام مہابھارت کو برزبان کر لیا تھا۔

عالم گیر (اورنگ زیب) جس کو اینگلو انڈین مورخ تعصب کے رنگ میں پیش کرتے ہیں بھاشا کے سب سے بڑے سرپرستوں میں سے ایک تھا۔ ظہیر اس کے دربار کا مشہور شاعر تھا جس نے بھاشا میں امتیازی درجہ حاصل کیا تھا اس کا تخلص تیمی تھا اس نے یرجا تک کا ترجمہ فارسی میں کیا جو علم موسیقی کی ایک مشہور کتاب تھی۔ عالم گیر کے زمانہ کا دوسرا شاعر تخلص بہ داتا ہوا ہے یہ بھی بھاشا کا ایک اعلیٰ پیمانہ کا شاعر مانا جاتا ہے۔

اس زمانہ میں بھاشا مسلمانوں کو ایسی مرغوب تھی کہ بڑے بڑے عربی کے عالم اور پیشوا بھاشا میں ممتاز درجہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ شیخ غلام مصطفےٰ جو راقم سطور کے ہم وطن تھے (مرادآباد) انھیں میں سے ایک تھے جن کو کہ بھاشا اور ہندی پر اس قدر عبور حاصل تھا کہ سوائے چند برہمنوں کے اس وقت ان کا کوئی مدمقابل نہ تھا اور بڑے بڑے ممتاز پنڈت ان کا شاگرد ہونا باعثِ فخر سمجھتے تھے۔

محمد شاہ کے زمانہ میں راجہ جے سنگھ والیٔ جے پور نے اپنی راجدھانی میں ایک مشہور رصدگاہ کی بنیاد ڈالی۔ اس وقت کے

کچھ مشہور علماء نے شرح چغمنی اور دوسری کتابوں کا جو علم ہیئت پر تھیں بھاشا میں ترجمہ کیا۔ شرح چغمنی ایک بہت مشکل کتاب ہے اس کا ترجمہ اُردو میں بھی ہو سکتا ہے لیکن اس کے ترجمے کے لئے ضروری ہے کہ مترجم بھاشا پر کافی عبور رکھتا ہو۔

سید نظام الدین بلگرامی نے بنارس کا سفر اس مقصد سے اختیار کیا تھا کہ وہ سنسکرت اور بھاشا کے نصاب تعلیم کو پورا کریں۔ علم موسیقی میں انھوں نے بلند پایہ شہرت حاصل کی اور دو کتابیں بھی بھاشا میں تصنیف کیں جن کے نام مدھ چندریکا اور مدھیاناک سنگرکھ رحمت اللہ خیرالدین بھی جن کا انتقال سنہ ۱۱۵۸ء میں ہوا ایک مشہور بھاشا زبان کے عالم تھے۔

سید غلام نبی صاحبزادہ سید محمد باقر بلگرامی جو سنہ ۱۱۱۱ء میں تولد ہوئے ایک دوسرے مشہور بھاشا زبان کے شاعر تھے۔ اُنھوں نے بھاشا نظم میں ایک کتاب تصنیف کی جس میں ایک سو ستتر شعر تھے اور جس کا نام اُنھوں نے درپن رکھا۔

سید برکت اللہ جو ایک مشہور فاضل گزرے ہیں بھاشا کے شاعر اور بہت سی کتابوں کے مصنف تھے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بلگرام جو اودھ میں ایک چھوٹا قصبہ ہے ہمیشہ سے اپنے علم و ادب کے لئے مشہور رہا ہے اس کے اکثر علماء نے سنسکرت میں اعلیٰ شہرت حاصل کی۔ ہمارے زمانہ کی آخری شعاع شمس العلماء مولانا سید علی مرحوم تھے جو ایک مشہور زباں داں ہونے کے ساتھ سنسکرت میں ایم اے تھے۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں جنھوں نے سنسکرت میں مایۂ ناز مہارت پیدا کی ہے میرے روشن ضمیر دوست پروفیسر معین الدین احمد میرٹھی ہیں جنھوں نے کہ اپنی زندگی کے بیش بیش قیمت سال سنسکرت کی تعلیم میں صرف کئے ہیں۔ آپ نے خلفائے عباسیہ کے چند نہایت دل چسپ قصوں کو عربی زبان سے سنسکرت میں ترجمہ کیا ہے اور ہندو مذہب کی سنسکرت کتابوں سے انتخاب کرکے ان کا ترجمہ مع اصل کے انگریزی و اُردو میں شائع کیا ہے۔

یہ چند مثالیں ہیں جس سے کہ مسلمانوں کی محبت ہند و ادب و شائستگی سے صاف ظاہر ہوتی ہے۔ زیادہ تفصیلی مضمون یقیناً مزید طوالت کا باعث ہوگا۔

تاہم یہ چند مثالیں ملکی ادب و تمدن سے کنارہ کش رہنے کے اُن بے بنیاد الزامات کو رفع کریں گی جو مسلمانوں پر لگائے جاتے ہیں اور بڑی حد تک اُس رنجیدگی اور منافرت کو بھی دُور کریں گی جو دو فرقوں میں پیدا ہو گئی ہے۔

اگر یہ میری ناچیز کوشش دونوں فرقوں میں باہمی یکجہتی اور اتفاق کا ذرّہ برابر بھی باعث بن سکی تو میں سمجھوں گا کہ میری مساعئ جمیلہ کا مجھے کافی سے زیادہ صلہ مل گیا۔

غزل

(از جناب کپتان احمد خاں صاحب تاباں)

خزاں اور عالم وہ پژمردگی کا، بہار اور وہ شادابیٔ بوستانی بنا ہے وہ ایامِ پیری کا نقشہ، کھنچی ہے یہ تصویرِ عہدِ جوانی

اگر ڈر ہے اے خضر تو موت کا ہے کہ ہے داروئے دردِ سوزِ نہانی خدا سے حیاتِ ابد چاہتا ہوں، بالفاظِ دیگر غمِ جاودانی

یہ ہے واقعہ ہی الم ناک بے حد، نہیں اس میں کچھ میری جادو بیانی جو باور نہیں ہے تو اک روز سنئے، مرا قصۂ غم عدو کی زبانی

ندامت سے اور فرطِ حیرت سے چپ ہوں، سمجھتے ہیں وہ معنیٔ بےزبانی کسی اور صورت سے ممکن نہیں ہے، مری حالتِ زار کی ترجمانی

ہر ایک شے میں افسردگی کا ہے عالم، حسینوں کی ہیں صحبتیں وجہ ماتم مصیبت بڑھاپے کی ہے خود ہی کیا کم، قیامت ہوئی اور یادِ جوانی

ہر اک ولولہ عشق کا مٹ چکا ہے، مگر پھر بھی داغِ تمنا ہرا ہے کلیجے سے اس کو لگائے ہوئے ہوں، کہ ہے یادگارِ دلِ آنجہانی

بایں کم نگاہی مری آنکھ موسیٰ، ہر اک چیز میں دیکھتی ہے وہ جلوہ مگر آپ کہتے ہیں تو خیر ہوگا، سرِ طور وہ قصۂ لن ترانی

کہاں تک کوئی غم کا قصہ سنائے، نہیں آتا تم کو یقیں تو نہ آئے یہ کیا ضد نکالی ہے بیٹھے بٹھائے، دکھانے کی ہے چیز دردِ نہانی

تم آتے نہیں اور مرتا نہیں ہوں، دمِ نزع ہے در پہ آنکھیں لگی ہیں غرض روح کی کشمکش کا سبب ہے، تمھاری نزاکت مری ناتوانی

جو رستے میں مقتل کے ملتا ہے کوئی، تو دیتا ہوں دیدارِ جاناں کی دعوت مجھے حوصلے غیر کے دیکھنے ہیں، انھیں ندیاں ہیں لہو کی بہانی

کہے شعر میں نے کہ نالے کئے تھے، عجب چیز ہے طبعِ موزوں کے صدقے
وہ غیروں سے کہتے ہیں تاباںؔ کو سنئے، کہ یہ شخص ہے آج رشکِ فغانی

سلیم کی سرگزشت

(از جناب محمد عبدالشکور صاحب ایم اے)

میرے دوست سلیم نے بی اے کی ڈگری حاصل کرکے سرکاری ملازمت حاصل کی اور اُن کا تقرر دہلی ہوا، مگر چار سال ملازمت کرنے کے بعد بد دل ہو کر انھوں نے اس طوقِ غلامی کو اپنی گردن سے نکال ڈالا۔ اول تو تنخواہ کم تھی، دوسرے دہلی کی زندگی گراں، پھر افسروں سے ناچاقی، طبیعت میں آزادی کی بو باس تھی، غرض کہ استعفیٰ دے کر مکان پر واپس آگئے اور حقیت کے بندوبست میں منہمک ہو گئے اور یہ انہماک اس قدر بڑھا کہ شہر کی زندگی کو بھی خیرباد کہدیا، اپنے گاؤں میں جا کر آباد ہوئے اور نئے ترقی یافتہ نئے طریقے پر کھیتی کرنے لگے۔ زراعت میں اُن کو کافی یافت ہو جاتی تھی، پھر بھی میرا خیال یہی تھا کہ یہ کام اور یہ دیہاتی طرز معاشرت، سلیم کے لئے موزوں نہیں۔ میں یہ چاہتا تھا کہ وہ دہلی واپس چلے جائیں اور وہیں تعلیم یافتہ طبقے میں اپنا وقت صرف کریں۔ گاؤں میں پڑے پڑے اُن کے قوائے ذہنی و دماغی پر زنگ چڑھنے لگا تھا اور جہاں تک میرا خیال ہے، اُن کی روح بھی اس ماحول کے خلاف بغاوت پر کمربستہ تھی جب میں اُس کے تمازت آفتاب سے جھلسے ہوئے چہرے، گرد و غبار سے اَٹے ہوئے کپڑوں اور تھکے ماندے جسم کو دیکھتا تو مجھے اس غریب کی حالت پر رحم آجاتا تھا۔ خدا کے فضل سے روپیہ پیسہ کی کمی نہ تھی مگر یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک شیریں گفتار اور زرّیں مقال پرند کو ایک گھٹا ٹوپ پنجرے میں بند کر دیا ہے۔ میں اُسے غور سے دیکھتا مگر مجھے یہ کبھی باور نہ ہوتا کہ یہ شخص کبھی بھی زراعت کا ماہر ہو سکتا ہے۔ مجھے یہی محسوس ہونے لگتا کہ وہ اس پیشے کی طرف سے بے پروا ہے اور خدا کا شکرگزار ہے اس لئے کہ امن و سکون کے ساتھ دن گزرتے چلے جا رہے ہیں۔

مجھے سلیم سے بہت محبت تھی اور میں اپنے قصبہ سے چل کر کئی کئی دن اُس کے یہاں قیام کرتا اور جہاں تک بن پڑتا، اُس کی زراعتی کش مکش میں حصہ لیتا، مگر میری یہی خواہش تھی کہ وہ اس کام کو چھوڑ کر کسی اعلیٰ علمی صحبت میں اپنا وقت گزارے۔ سلیم کا مکان بہت خوش منظر اور صاف تھا۔ اُس کے وسیع پائیں باغ میں آم اور امرود کے

اچھے اچھے درخت کثرت سے لگے ہوئے تھے۔ باغ کے مشرقی کنارہ پر ایک صاف پانی کا چشمہ بہتا تھا جس نے آب و ہوا اور زراعت دونوں کو خوش گوار اور زرخیز بنانے میں کافی سے زیادہ حصہ لیا تھا۔ سلیم کے خیالات بھی کچھ عجیب و غریب تھے جن میں صفائی اور پاکیزگی تو بہت تھی مگر مردہ دلی کے بھی آثار موجود تھے۔ ہم دونوں گھنٹوں آپس میں بیٹھے بیٹھے ان ہی خیالات پر گفتگو کرتے رہتے۔ سلیم کی بیوی شکیلہ مجھ سے پردہ نہ کرتی تھی، سلیم ایک آزاد خیال شخص تھا' اُسے یہ پسند نہ تھا کہ اُس کی بیوی اُس کے دوستوں سے بھی پردہ کرے۔ شکیلہ بھی ہماری گفتگو میں اکثر شریک ہوجاتی اور اپنی ذہانت و خوش مزاجی سے ہمارے مباحثوں میں زندگی اور تازگی پیدا کردیتی، میں سلیم کا عزیز ترین دوست تھا' اس حیثیت سے وہ مجھ سے بھی محبت کرتی تھی۔ سلیم بہت ذہین اور نیک مزاج شخص تھا مگر مجھے یاد ہے کہ جب کبھی وہ اپنے گہرے اور قیمتی راز بیان کرتے کرتے ہماری اخلاص سے لبریز دوستی پر تبصرہ کرتا تو میرے اوپر ایک عجیب ناگوار کیفیت پیدا ہوجاتی اور میرے دل کی حرکت تیز ہوجاتی تھی۔ اُس کی شدید محبت مجھے کچھ تعجب خیز اور تھکا دینے والی معلوم ہوتی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ محض معمولی دوستانہ تعلقات ہی قائم رہیں۔

مدت تک میں اپنے اُن جذبات کی تحلیل نہ کرسکا' جو میرے دل میں شکیلہ کی طرف سے موجزن تھے، مگر یہ بات یقینی ہے کہ میرے خاکستر دل میں محبت کی چنگاریاں سلگ رہی تھیں۔ میں اُس کے چہرہ' اُس کی آنکھیں، اُس کی آواز اور اُس کی رفتار میں ایک خاص دل کشی اور جاذبیت پاتا تھا۔ جب کبھی زیادہ عرصہ تک میں اُسے نہ دیکھ سکتا تو میرے دل میں ایک ہوک سی اُٹھتی اور عالم خیال میں سوائے اُس خوب صورت اور نازک بدن عورت کے اور کسی کی تصویر منقش نہ ہوتی تھی اُس کے متعلق میرے دل میں اب تک کوئی خاص تدبیر نہ تھی، نہ مجھے کسی خاص مقصد کا خواب و خیال تھا، مگر جب کبھی ہم دونوں تنہا ہوتے مجھے یاد آجاتا کہ میں اُس کے شوہر کا ایک عزیز دوست ہوں' اس خیال کے آتے ہی میرے دل میں ایک لذیذ درد کی ٹیس پیدا ہونے لگتی۔ جب کبھی ہارمونیم کے ساتھ کچھ گاتی' میں دیوانہ وار اُس کی آواز کو اپنی روح میں جذب کرنے کی کوشش کرتا اور خوشی خوشی میں اُس کی ترنم ریزی کو محوِ حیرت بنا ہوا سنتا رہتا۔ اس کے ساتھ ساتھ بھی یہی خیال پیدا ہوتا کہ اُسے اپنے شوہر سے محبت ہے جو میرا ایک محترم دوست ہے' اس خیال کے آتے ہی میں پھر بدحواس اور ملول ہوجاتا' میری حالت کے تغیرات کا وہ حیرت سے مطالعہ کرتی اور کہتی:

"آپ اپنے دوست کے نہ ہونے سے کچھ اُداس معلوم ہوتے ہیں ــــ لیجئے میں اُنھیں ابھی کھیت پر سے

بلاتی ہوں"۔

سلیم کے آتے ہی وہ کہتی،

"لیجئے آپ کے دوست آ گئے ـــ اب خوش ہو جائیے"۔

اس حالت میں دو سال گزر گئے۔

جولائی کے مہینے میں شام کے وقت میں اور سلیم بے کاری سے اکتا کر قریب کے بڑے قصبہ میں ایک مقامی زمیندار سے ملنے اور چند ضروری چیزیں خریدنے گئے۔ ابھی ہم خرید و فروخت سے پوری طرح فارغ نہیں ہوئے تھے کہ شام ہو گئی اور رات نے اپنی کالی کالی چادر فضائے عالم پر طاری کر دی۔ یہ ایک ایسی رات تھی جس کو میں کوشش کرنے پر بھی کبھی فراموش نہیں کر سکتا تازی تازی موسمی ترکاریاں تو ہم خرید کر چکے تھے، مگر اب تک بزاز کی دوکان سے ہمیں فرصت نہیں ہوئی تھی۔ سلیم کا ارادہ تھا کہ اپنے ملازمین کے لئے کچھ کپڑا خریدے اور اسی غرض سے ہم اب تک تھان پر تھان دیکھ چکے تھے مگر فیصلہ نہ کر سکتے تھے کہ کیا خریدیں، اسی انتظار میں ہمارا کوچبان گھوڑے کے نعل جڑانے ایک لوہار کے یہاں گیا۔ ہم نے اُسے تاکید کر دی کہ وہاں سے فارغ ہو کر سیدھا شاہی مسجد کے دروازہ پر آئے، ہم اُسی جگہ اس کا انتظار کر رہے ہونگے۔ بزاز کی دکان سے فارغ ہو کر ہم ہنستے بولتے ہوئے شاہی مسجد کی جانب چل کھڑے ہوئے۔ اسی اثنا میں ایک شخص نے ہمارا تعاقب شروع کر دیا اور ایک جاسوس کی طرح ہمارے پیچھے پیچھے ہو لیا کل ضلع اس شخص سے بخوبی واقف تھا۔ اس کا نام عبداللہ تھا۔ اس کے حیرت انگیز ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں، کوئی ایسا نہ تھا جو اس کے کمالات سے واقف نہ ہو، قرب و جوار میں جس سے چاہو اس کے مہمل کارنامے سن لو۔ میرے پاس بھی یہ شخص خدمت گار کی حیثیت سے کئی سال تک ملازم رہا، اس کے بعد اس نے دو تین سال سلیم کی بھی نوکری کی۔ مگر یہ ناممکن تھا کہ وہ کسی جگہ دلجمعی کے ساتھ رہ سکے، اس میں سب سے بڑا عیب یہ تھا کہ ہفتہ دو ہفتہ بڑی محنت و جانفشانی سے کام کرتا اور اُس کے بعد دو چار روز کے لئے یکلخت غائب ہو جاتا۔ یہ عادت اُس کے مزاج میں اس قدر راسخ ہو گئی تھی کہ کسی طرح دُور نہ ہوتی، اس کے علاوہ اُسے شراب کا بھی چسکا پڑ گیا تھا اور اُس کے لباس و چہرے مہرے کی طرح اُس کی ساری زندگی شدت سے مہمل اور غیر مرتب تھی۔ سُنا ہے کہ اُس کے ماں باپ دونوں شریف تھے اور عزت کے ساتھ خوش گزران زندگی گزارتے تھے۔ اس کو بھی اپنے نسب کے اعلیٰ ہونے پر فخر تھا۔ میں نے بہت غور کے ساتھ اُس کے چہرے، اُس کی آنکھوں اور اس کے انداز کا مطالعہ کیا ہے مگر میں بلاخوف تردید کہہ سکتا ہوں

کہ ہم نے کہیں شرافت کا کوئی شائبہ نہ پایا۔ وہ خود کہتا تھا کہ میں نے تھوڑی بہت تعلیم بھی حاصل کی ہے اور چنگی کے اسکول میں بچپن کے دو تین سال گزارے ہیں۔ اُس کا بیان تھا کہ حقہ پینے کی سزا میں وہ اسکول سے نکال دیا گیا۔ اُس کے بعد اُس کی تعلیم جاری نہ رہ سکی اور جو کچھ پڑھا پڑھایا تھا وہ بھی طاقِ نسیاں پر رکھ دیا۔ اس کے بعد وہ ایک مسجد میں موذن ہو گیا، وہاں سے بھی تمباکو نوشی کی سزا میں برطرف کر دیا گیا۔ مگر میرا خیال ہے کہ تمباکو نوشی، شراب خواری کے ہم پلہ تھی، اس کے بعد اُس نے قرب و جوار کے اضلاع میں چکر لگانا شروع کیا۔ کبھی تلاشِ معاش میں کبھی تلاشِ ہم میں چند دفعہ اُس کا چالان ہوا۔ ایک دفعہ سزا ہوتے ہوتے رہ گئی۔ اب آ کر اس ضلع میں نوکری کی، کسی گاؤں میں زمیندار کے سپاہی بنے، کسی رئیس کے یہاں خدمت گار رہے، کبھی کسی مسجد میں جاروب کشی کی، اسی اثنا میں کسی بھٹیاری سے اُن کی شادی ہو گئی، جس کی بداخلاقی اور بد اطواری سے اس کے پندارِ شرافت کو ایسا سخت صدمہ پہنچا کہ اس سے کنارہ کش ہو گئے۔ اس وقت بھی وہ ملازمت کی تلاش میں تھا اور ظاہر ہو رہا تھا کہ بھوک و پیاس سے سخت عاجز ہو گیا تھا

اب ہم شاہی مسجد کے قریب آ چکے تھے اور کوچبان کا انتظار کر رہے تھے۔ عبداللہ ہماری پشت پر کچھ فاصلے سے کھڑا ہوا تھا کچھ دیر بعد وہ کھانسنے لگا، میں نے مڑ کر دیکھا وہ منہ پر ہاتھ رکھے اور سر جھکائے آہستہ آہستہ کھانسنے میں مصروف تھا۔ چہرے کی رگ رگ سے عجز و انکسار ٹپک رہا تھا، مگر جو عبداللہ سے واقف تھے کہ اُس کے آنکھوں کی کھڑکیوں میں سے کیسی مضطرب اور قابو میں نہ آنے والی روح جھانک رہی تھی۔ اب تاریکی زیادہ گہری ہونے لگی اور ہم شام کی نمی کی بو باس کو محسوس کرنے لگے، قریب تھا کہ چاند بلند ہو کر کائنات کے ذرہ ذرہ کو عمانِ نور میں ڈبو دے۔ آسمان پر صرف دو چھوٹے چھوٹے بادل کے ٹکڑے نظر پڑ رہے تھے، ان میں سے ایک تو کسی قدر بڑا تھا اور دوسرا بہت چھوٹا مگر یہ ساکت نہ تھے۔ رواقِ نیلی پہ چہل قدمی کر رہے تھے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا ماں کے پیچھے بچہ دوڑ رہا ہے اور اُسے پکڑنا چاہتا ہے ——

"کیسی خوش آیند رات ہے" سلیم نے کہا۔

"حضور! نہایت" عبداللہ نے ادب سے عرض کیا "حضور نے اس قصبہ میں آج کیسے قدم رنجہ فرمایا، حضور! آج تو بہت دنوں کے بعد ہمارا سلام ہوا"

ظاہر ہوتا تھا کہ عبداللہ سلیم سے سلسلۂ کلام شروع کرنا چاہتا ہے۔

سلیم نے کوئی جواب نہ دیا۔ عبداللہ نے ایک سرد آہ بھری سینہ پر ہاتھ رکھا اور بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"حضور! نہایت نالائق ہوں مگر حضور! خدا گواہ ہے آج دوسرا دن ہے ایک روٹی کا ٹکڑا تک نصیب نہ ہوا، ایک فقیر کے کتے سے بھی زیادہ بری حالت ہے۔ اب تو خدا کے لئے میرا قصور ... ... معاف ... ..."

سلیم نے یہ گفتگو شاید سنی ہی نہیں، خاموش کھڑا سنتا رہا، سڑک کی دوسری جانب، بڑے تالاب کے کنارے، شاہی مسجد تھی، جس کے وسط میں مولسری کا ایک بڑا سا سدا بہار درخت تھا۔ سڑک کی دوسری جانب کھیتوں کا لامتناہی سلسلہ تھا۔ ایک طرف فاصلہ پر بہت سی آگ جل رہی تھی، جس کے اردگرد آدمی، عورتیں اور گھوڑے حرکت کرتے ہوئے نظر آرہے تھے، غالباً اس جگہ کسی خانہ بدوش قبیلہ نے پناہ لی تھی۔ اس آگ کی پشت پر بہت فاصلہ سے چند چراغوں کی روشنی آرہی تھی، یہ ایک چھوٹا سا قریہ تھا یہاں سے گانے کی کچھ دھیمی دھیمی آواز آرہی تھی۔ تالاب، چراگاہوں، کھیتوں اور مرغزاروں سے کہر بلند ہوتا ہوا نظر آرہا تھا اور درختوں کی شاخیں، صورتیں بدلتی جاتی تھیں۔ کبھی جھکنے لگتیں، کبھی بلند ہوتیں، کبھی ایک دوسرے سے اس طرح بغل گیر ہوتیں جیسے "ریش بداماں" عبا پہننے والے مولوی ایک دوسرے سے بغل گیر ہوتے ہیں۔ اس منظر نے شاید سلیم کے دل میں بھوتوں کا خیال پیدا کر دیا۔

"ہم اُسی چیز سے خائف ہوتے ہیں جو ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔"

"تو کیا آپ زندگی کے راز اور دنیا کے عجائبات سب سمجھ گئے ہیں۔ فرمائیے؟ کیا آپ اس دنیا کو عالمِ بالا سے کچھ زیادہ جانتے ہیں؟"

سلیم بالکل میرے قریب کھڑا ہوا تھا، یہاں تک کہ میں اُس کی سانس کی آواز بھی بخوبی سن لیتا تھا، شام کی دھندلی روشنی میں اُس کا زرد اور پتلا چہرہ اور اُس کی جھکی ہوئی پیشانی کچھ خوف ناک سی معلوم ہونے لگی، اُس کی آنکھیں غمگین، قدرے خائف، مگر صداقت سے لبریز معلوم ہوتی تھیں، گویا وہ مجھ سے کوئی خوف ناک بات کہنے والا ہے۔ وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنے مخصوص انداز میں کہنے لگا۔

"ہماری یہ زندگی اور قبر کی زندگی دونوں یکساں اُسی قدر خوف ناک ہیں جس قدر کہ ہماری فہم سے بالاتر، اگر کوئی شخص بھوتوں سے ڈرتا ہے تو اُسے مجھ سے چاند کی اس روشنی سے اور تالاب کے پانی سے بھی اُسی قدر ڈرنا چاہئیے، کیوں کہ یہ ساری اشیاء نہ سمجھ میں آئی ہیں اور نہ آسکتی ہیں۔ میں تم سے بحیثیت دوست کے کہتا ہوں کہ اکثر موت کی تصویر میرے پیش نظر رہتی ہے اور میری قوتِ خیال اکثر

"ہزار ہا قسم کے خوف ناک خیالات اور ذہنی تصاویر پیش کرتی رہتی ہے، یہاں تک کہ اکثر میں سوتے سوتے چونک پڑتا ہوں۔ میرا مقصد یہ ہے کہ جس طرح یہ خیالات خوف ناک ہیں اسی طرح یہ زندگی بھی خوف ناک ہے، نہ وہ سمجھ میں آتے ہیں نہ یہ سمجھ میں آتی ہے۔ شاید میں ضرورت سے زیادہ ذکی الحس ہوں، اسی لئے عام طور سے تندرست آدمی جو چیز دیکھتے ہیں اور سنتے ہیں، سمجھتے جاتے ہیں۔ بہرحال کچھ بھی ہو، اس اندرونی خوف سے میں نے اپنی ساری زندگی زہر آلود کر لی۔ جب کبھی میں اپنے باغ کے لان پر بیٹھ کر کسی چھوٹے سے بے حقیقت کیڑے کو دیکھتا ہوں، جس کی عمر شاید ایک دن کی ہی ہوتی ہے، اسی قدر خوف کا باعث ہوتا ہے جس قدر کہ میری ذات اور کسی موت کا وجود۔"——

"تو معلوم تو ہو کہ آپ کس سے خائف ہیں؟" میں نے متانت سے دریافت کیا۔

"ہر چیز سے فطرتاً میں زیادہ سوچ بچار کرنے والا نہیں ہوں اور قبر کی زندگی۔ وجہ تخلیق انسانی اور اس قسم کے سوالات پر کم غور کرتا ہوں۔ درحقیقت یہ بلندیاں میری فکر کی رسائی سے باہر ہیں۔ مجھے روزانہ کے مشغلے ہی خائف کرنے کے لئے کافی ہیں۔ جن سے دنیا کا کوئی فرد بشر رہائی حاصل نہیں کر سکتا —— میں یہ بھی تمیز نہیں کر سکتا کہ میرے کون سے فعل احسن ہیں اور کون سے قبیح۔ پھر بھی میرا ہر فعل بجائے خود میری روح کو منتشر کرنے کے لئے کافی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میری تعلیم نے اور میری زندگی کے حالات نے مجھے مصنوعات کے ایک تنگ دائرے میں گرفتار کر دیا، یہاں تک کہ میری ساری زندگی اور میری کل جد وجہد اپنے آپ کو اور گرد وپیش کے افراد کو دھوکہ دینے میں صرف ہو جاتی، مجھے سب سے زیادہ خوف اس بات کا ہے کہ مرتے وقت تک اس دارو گیر سے مجھے نجات نہ ملے گی۔ آج میں کچھ کرتا ہوں اور کل میری سمجھ میں یہ بھی نہیں آتا کہ میں نے ایسا کیوں کیا —— دہلی میں میں نے ملازمت کی اور وہاں سے خائف ہو کر بھاگ نکلا —— یہاں آکر میں نے زراعت شروع کی، یہاں بھی خوف میرے اوپر غالب آچکا ہے، واقعہ یہ ہے کہ ہم اشیاء کی ماہیت سے بہت کم واقف ہوتے ہیں اور اس لئے روزانہ کثرت سے غلطیاں کرتے رہتے ہیں۔ ہم میں انصاف کا شائبہ تک نہیں۔ ہم ایک دوسرے کو بدنام اور برباد کرنے کے لئے ہر وقت آمادہ رہتے ہیں۔ ہم ان فضولیات پر اپنی قوتیں صرف کرتے ہیں جو ہماری زندگی میں سدِ راہ ہوتی ہیں —— مجھے خوف زدہ کرنے کے لئے یہ چیزیں کافی ہیں۔ میں کسانوں پر بھی خوف سے

نگاہ ڈالتا ہوں اور میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ اُن کی تکالیف اور اُن کی زندگی کا کیا مقصد ہے۔ اگر زندگی خوشی کا نام ہے تو ایسے افراد کا وجود غیر ضروری معلوم ہوتا ہے ــــــ اور اگر زندگی کا مفہوم یہ ہے کہ نہ ختم ہونے والے افلاس اور جہالت میں ہم پڑے ہیں تو اس اذیت کو کیوں ضروری قرار دیا گیا ہے ــــ غرض یہ ہے کہ مجھے دنیا میں کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی، ذرا اسی مثال کو (عبداللہ کی طرف اشارہ کر کے) اپنے ذہن میں لے کر سمجھنے کی کوشش کیجئے ــــ"

سلیم نے ایک درد آفریں انداز میں کہا۔

یہ خیال کرتے ہوئے کہ ہم اسی کی طرف متوجہ ہیں عبداللہ مؤدب ہو کر کہنے لگا ــــ

"حضور! میں آپ ہی صاحبان کا نمک پروردہ ہوں۔ حضور! تمباکو نوشی کی عادت نے میرا ستیاناس کر دیا مجھ غریب پر اگر آپ نے رحم کیا مرتے دم تک غلام بنا رہوں گا ــ"

یہ عجیب بات تھی کہ شراب خواری کی عادت کو عبداللہ ہمیشہ حقہ سے تعبیر کرتا تھا ــــ

"نو بجے ہوں گے۔ کافی رات آچکی" سلیم نے کہا "اب تو ہمیں جلد روانہ ہونا چاہیئے ــــــ

برادرمن! کاش، تمہیں معلوم ہوتا کہ میں ذرا ذرا سی چیزوں اور چھوٹے چھوٹے خیالات سے کس قدر خوف زدہ ہو جاتا ہوں۔ جن میں عوام الناس کے لئے خوف کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا ــــ خیالات کو دور کرنے کے لئے میں کام میں لگ جاتا ہوں اور قصداً اس قدر تھک جانے کی کوشش کرتا ہوں کہ رات کو بے خبر ہو کر سو سکوں ــــ بچے، بیوی، جو عوام الناس کے لئے معمولی باتیں ہیں۔ اُف! میں اُن کے بوجھ سے کس قدر دبا جاتا ہوں ــ"

یہ کہہ کر سلیم نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرے، گلا صاف کیا اور ہنسنے لگا۔

"کاش! میں آپ کو یہ بتا سکتا کہ میں اس زندگی میں کس قدر بے وقوف بنا ہوں"! اُس نے کہا ــــ

"میرے دوست، میری خوبصورت بیوی اور میرے پیارے بچوں پر مجھے مبارک باد دیتے ہیں اور مجھے ایک اچھا شوہر اور ایک اچھا باپ کہتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ میری خوشگوار زندگی لائق رشک ہے، مگر میں یہ راز آپ ہی کو بتانا چاہتا ہوں کہ میری خوشگوار زندگی ایک اندوہ ناک غلط فہمی ہے اور اسی لئے میں اس قدر خائف ہوں"۔ اُس کے زرد چہرے کو ایک الم ناک تبسم نے بدنما کرنا شروع کیا۔ اس نے اپنا ہاتھ میری کمر میں ڈال دیا اور دھیمی دھیمی آواز میں کہتا گیا

"تم میرے سچے دوست ہو، مجھے تم پر اعتماد ہے اور میں تمہارا دل سے احترام کرتا ہوں اور خدا نے دوستی کی یہ

نعمت ہمیں اس لئے دی ہے کہ ہم اپنے دل کھول کر وہ راز ظاہر کر دیں کہ جن کا بوجھ ہماری روح کو برباد کئے ڈالتا ہے۔ اسی لئے میں کل ماجرا آپ سے کہے دیتا ہوں۔ میری گھر کی زندگی جو آپ کو اس قدر دل آویز معلوم ہوتی ہے، وہی میری سوہانِ روح اور میرے اندرونی خوف کا اصلی سبب ہے۔ میری بیوی مجھسے اکثر یہی کہتی ہے کہ مجھے تم سے محبت نہیں، مگر میں تمھاری سچی بیوی بنی رہوں گی —— آپ سمجھے کہ اس کا کیا مطلب ہے —— یہ ایک ایسی تاریکی ہے کہ جس میں روشنی کی ایک بھی جھلک نظر نہیں آتی۔ مجھے اپنی بیوی سے شدید محبت ہے، اس کے خلاف وہ میری جانب سے بے پروا ہے اور یہ گمان غالب ہے کہ میرے باہر چلے جانے سے وہ خوش ہو جاتی ہے —— معلوم نہیں کہ اُسے میری پروا ہے بھی یا نہیں، میں ابھی تک اس کا آخری فیصلہ نہ کر سکا، مگر ہم دونوں ایک ہی مکان میں رہتے ہیں، ایک ہی جائداد کے مالک ہیں، ایک ہی چولھے پر کھانا کھاتے ہیں، صاحب اولاد ہیں۔ ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ آخر اس کا کیا مفہوم؟ اس کا کیا مقصد ہے؟ آپ ہی فرمائیے! کیسی سخت اذیت، چوں کہ آپس کے تعلقات کا علم نہیں اس لئے میں کبھی اُس سے نفرت کرنے لگتا ہوں، کبھی اپنے آپ سے، اور کبھی بہ یک وقت دونوں سے، —— ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرے دماغ میں ایک بھٹّی دھک رہی ہے جو میرے دماغی قویٰ کو جلا کر خاک سیاہ کر دیتی ہے، اس کے برعکس گویا مجھے چڑانے کے لئے روز بروز شکیلہ کا حسن دل آویز تر ہو رہا ہے، مجھے اس سے محبت ہے، مگر اس محبت کی کوئی صدائے بازگشت میں نے کبھی نہیں سنی، حالانکہ ہمارے دو بچے!۔ کیا یہ سمجھ میں آنے والی بات ہے؟ —— کیا اسے تم ایک خوف ناک ماجرا نہ کہوگے؟ —— کیا بھوت اس سے زیادہ دہشت ناک ہوتے ہیں —— ؟"

سلیم کی حالت عجیب تھی، اس موضوع پر وہ گھنٹوں تقریر کرنے کے لئے آمادہ تھا۔ اسی دوران میں کوچبان کی آواز سنائی دی اور گاڑی آگئی اور ہم گاڑی میں بیٹھنے لگے۔

"حضور! میری بھی پرورش ہو جائے، میرے اوپر رحم کیجئے، بھوکوں مر رہا ہوں!" عبداللہ نے کہا۔

"اچھا مکان پر آؤ" سلیم نے کہا۔

"حضور! ابھی حاضر ہوا" عبداللہ نے کہا۔

سلیم کے موضع سے ہم اس وقت پانچ میل کے فاصلہ پر تھے، سلیم کا ہاتھ اب تک میری کمر میں تھا، وہ خوش تھا کہ آخرکار اُس نے اپنا دردِ دل مجھ سے کہکر اپنی روح کا بوجھ ہلکا کیا، اب اس کے اندازِ بیان میں نہ تلخی تھی نہ خوف، بلکہ وہ

خوشی خوشی مجھ سے یہ کہہ رہا تھا کہ اگر میرے گھر کی حالت اطمینان کے قابل ہوتی تو میں دہلی جاکر کسی علمی کام میں اپنا وقت صرف کرتا۔ اس وقت ہندوستان میں کافی غلہ موجود ہے، مگر "کلچر" کا جس قدر فقدان ہے ایسا اور کسی ملک میں نہ ہوگا اور یہی ہماری سیاسی اور معاشرتی خرابیوں کا سبب ہے۔ قوم کے ہونہار نوجوان نہ علم کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور نہ ادب کی طرف اس لہجہ میں وہ دیر تک بات چیت کرتا رہا، اور افسوس کرنے لگا کہ کل صبح مجھے ایک ضرورت سے باہر جانا ہے۔ ایک دن کے لئے تم سے جدا رہوں گا۔

اس وقت میرے دل و دماغ کی عجیب سی حالت ہو رہی تھی، دل اک برف کی قاش کی مانند سرد تھا، اور دماغ معطل ——— میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ میں اپنے دوست کو دھوکہ دے رہا ہوں، خالی الذہن ہوکر میں چاند کے نورانی چہرہ کو غور سے دیکھنے لگا اور عالم خیال میں اسی طلبند و بالا اور حسین عورت سے باتیں کرنے لگا کہ جس کے ریشمی ملبوسات کی مہک سے ایک نہایت دل پزیر انداز میں مشام نوازی ہوتی تھی، مجھے خوشی تھی کہ وہ اپنے شوہر سے مطلق محبت نہیں کرتی ہے۔

مکان پہنچ کر ہم کھانا کھانے بیٹھ گئے، شکیلہ نے سامان خرید و فروخت کو دیکھکر مسکرانا شروع کر دیا، میں نے اُسے غور سے دیکھا، بے شک اُس کے بالوں اور اُس کے تبسم کی دل کشی میں نے اور کسی عورت میں نہ دیکھی تھی۔ میں نے اُسے غور سے دیکھنا شروع کیا اور میں اُس کی نگاہوں سے اور اُس کے حرکات سے اس قدر سکوت لینا چاہتا تھا کہ وہ اپنے شوہر سے متنفر ہے۔ اس سکوت کے ملنے میں زیادہ دیر نہ لگی ——— سلیم نیند کے حملوں کا مقابلہ کر رہا تھا، کھانے کے بعد وہ دس منٹ تک اور بیٹھا رہا اور پھر کہنے لگا۔

"بھئی اب ہمیں اجازت دو، صبح تین بجے جانا ہے، جلد سے جلد واپس آنے کی کوشش کروں گا۔"

اُس نے اپنی بیوی سے اور مجھ سے اجازت چاہی اور اس لئے کہ شاید وقت پر آنکھ نہ کھل سکے، اُسی وقت اسٹیشن پر چلا گیا۔

شکیلہ ملاقات کے کمرے میں دیر تک بیٹھی رہی اور خدا جانے میں کیوں خوش تھا۔

"براہِ مہربانی اس وقت مجھے کچھ سنا دیجئے۔" میں نے عاجزانہ انداز میں شکیلہ سے کہا۔

مجھے اُس وقت موسیقی کی ضرورت نہ تھی، مگر تنہائی میں اس کے علاوہ اور کوئی سلسلۂ گفتگو بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا وہ ہارمونیم پر کچھ گانے لگی۔ مجھے مطلق یاد نہیں کہ اُس نے کیا گایا، میں اُس کے قریب بیٹھا ہوا تھا اور اُس کی نرم و گداز

انگلیوں کو غور سے دیکھ رہا تھا، کبھی یہ کوشش کرتا تھا کہ اُس کے چہرہ سے اُس کے جذبات کا پتا لگاؤں، پھر وہ مسکرا کر میری طرف دیکھنے لگی۔

"شاید سلیم کی عدم موجودگی نے آپ کو بے کیف کر دیا۔" شکیلہ نے کہا۔

میں مسکرانے لگا۔

"محض دوستی کی خاطر مہینے میں ایک دفعہ آنا کافی ہے، مگر میں تو ہر ہفتہ آتا رہتا ہوں۔"

یہ کہکر میں کمرے کے ایک کنارے سے دوسرے تک ٹہلنے لگا۔ وہ بھی کھڑی ہوکر آتش دان کے قریب جا پہنچی۔

جذبات کی فراوانی شاید میری اس حرکت کی ذمہ دار تھی۔

"میں آپ کا مطلب نہ سمجھی۔" شکیلہ نے اپنی بڑی بڑی اور صاف آنکھیں بلند کرکے مجھ سے کہا۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

"آپ تو یہاں صرف سلیم کی خاطر آتے ہیں۔ میں مسرور ہوں۔ ایسے دوست اب خال خال نظر آتے ہیں۔"

"آیئے ذرا باغ میں ٹہل آئیں۔" میں نے شکیلہ سے کہا۔

میں برآمدے میں جا پہنچا، میرا دماغ ایک ارتعاشی کیفیت سے متزلزل ہو رہا تھا اور جذبات کے برانگیختہ ہونے سے مجھے ایک گونہ سردی لگنے لگی۔ مجھے یقین ہوگیا کہ ہماری گفتگو مہمل ہے اور شاید ہم میں سے کوئی اہم بات کہنے کے لئے تیار نہیں۔ مگر ہوا وہی جو ہونا تھا، حالانکہ مجھے اُس کا خواب وخیال بھی نہ تھا۔

"کیسا دلکش موسم ہے!" میں نے بہ آواز بلند کہا۔

"مجھے اس سے کیا؟" شکیلہ نے غمگین لہجہ میں کہا۔

میں ملاقات کے کمرے میں واپس گیا۔ شکیلہ اب تک آتش دان کے پاس کھڑی تھی، اُس کے ہاتھ اُس کی پشت پر تھے اِدھر اُدھر نگاہیں ڈال رہی تھی اور کسی خاص خیال میں منہمک تھی۔

"آپ ایسی اداس کیوں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"کیوں کہ میں ہمیشہ پریشان رہتی ہوں۔ آپ سلیم کے نہ ہونے سے پریشان ہوئے اور میری یہ حالت ہمیشہ رہتی ہے مگر آپ کو اس سے کیا؟" شکیلہ نے جواب دیا۔

میں ہارمونیم کے قریب جا بیٹھا اور بے پروائی سے بجانے لگا۔ اس انتظار میں تھا کہ شاید وہ کچھ کہے۔

"آپ تکلف نہ کیجئے، اگر نیند آتی ہو تو سو جایئے، آپ سلیم کے دوست ہیں' اس کی بیوی کی ملاقات آپ کے لئے ویسی ہی وحشت زا ثابت ہوئی جیسی کہ اُس کے لئے' میں آپ سے کوئی قربانی نہیں چاہتی۔ جی چاہے چلے جایئے۔"

نیند کا کوسوں پتا نہ تھا' اُس لئے میں وہیں ٹھیرا رہا۔ شکیلہ برآمدے میں ٹہلنے لگی' میں ملاقات کے کمرے میں تھا اور اُسی طرح ہارمونیم کو چھیڑ رہا تھا۔ اس کے بعد میں بھی باہر نکل آیا اور ہم دونوں ایک پردے کے سایہ میں قریب قریب کھڑے ہو گئے۔ کوٹھی کی سیڑھیاں چاند کے نور میں غرق تھیں' درختوں کے سیاہ سیاہ سائے' پھولوں کی کیاریاں اور روش کی سرخ بجری تک پھیلے ہوتے تھے۔

"میں بھی کل چلا جاؤں گا" میں نے کہا۔

"بے شک' اگر سلیم ہوتے تو آپ ٹھیرتے" شکیلہ نے طنزاً کہا "اگر آپ کو مجھ سے محبت ہوتی تو یقیناً آپ کی تباہی کا پورا پورا سامان ہو چکا ہوتا۔ ذرا ٹھیریئے۔ ایک دن میں آپ کے سر ہوئی جاتی ہوں' پھر دیکھوں گی کہ آپ کیسے خوف زدہ ہو کر مجھ سے بھاگتے ہیں۔ بڑا دلچسپ معاملہ ہوگا۔"

اُس کے الفاظ اور اُس کے زرد چہرے سے غصے کی حدت محسوس ہو رہی تھی' مگر اُس کی آنکھوں میں محبت و عشق کا نورانی رس ایک خاص دل آویزی کے ساتھ لہریں مار رہا تھا' اُس وقت میں اُس نورانی وجود کو اپنی ملکیت سمجھنے لگا' تب غور سے دیکھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ کوئی عورت اس سے زیادہ دل فریبی کی مالک نہیں ہو سکتی قدرت کا وہ ایک معجزہ تھی کہ جس کی تخلیق شاذ و نادر ہوتی ہے' وہ اگر مسیحا ہونے کا دعویٰ کرتی تو دنیا کی زیادہ سے زیادہ آبادی اُس دعوےٰ پر ایمان لے آتی ——

"اب سونے کا وقت آگیا' اچھا! خدا حافظ!" شکیلہ نے کہا

"مجھے اب کسی حفاظت کی ضرورت نہیں۔ آج کی رات اگر حفاظت نے میرا پیچھا چھوڑا' مجھے یقین ہے میری زندگی دوبھر ہو جائے گی" میں نے قہقہہ لگا کر کہا۔

میں نے اُس کے خواب گاہ کے دروازہ تک پہنچا دیا' اُس نے مجھ پر متبسم نگاہیں ڈالیں۔ میں خوش تھا کہ وہ میرے مقصد سے واقف ہو گئی اور میں نے اُس کے جذبات سے آگاہی حاصل کی۔

میں اپنے کمرے میں چلا گیا، میز پر کتابوں کے بیچ میں سلیم کی ٹوپی رکھی ہوئی تھی، اُس کو دیکھکر مجھے اس محبت کا خیال آگیا جو میرے دوست کو مجھ سے تھی۔ پاک، بے لوث اور گہری محبت ......

نیند کا کوسوں پتا نہ تھا۔ میں چھڑی لے کر باغ میں ٹہلنے لگا، یہاں بھی کہر چھایا ہوا تھا اور رفتہ رفتہ بلند ہو رہا تھا۔ تاریک فضا میں لانبے لانبے بھوتوں کی شکلیں نظر آ رہی تھیں، درختوں کے جھنڈ اور جھاڑیوں کے کنج اس دخانی مخلوق سے لبریز تھے۔ مجھے افسوس ہوا کہ میں کُہر کی ان مصنوعات سے ہمکلام نہ ہو سکتا تھا۔ پتی پتی پر شبنم کے قطرے چمک چمک کر جگنو کے ایک سیلاب کا دھوکہ دے رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا باغ کی ساری خاموش مخلوق مسکرا مسکرا کر آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھ سے ہم کلام ہو رہی ہے۔

میں بنچ پر بیٹھ گیا اور چاند سے اُبلنے والے سیلاب نور کے نظارے میں محو ہو گیا۔ باغ کے وسط میں ایک پختہ چبوترہ تھا، میں اُس پر جا کر بیٹھ گیا۔ میرے دل میں میٹھا میٹھا درد ہو رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ وجود نورانی ایک منٹ میں میرے آغوشِ محبت میں آجائے گا۔ میں چاہتا تھا کہ اس کا یقین نہ کروں اپنے آپ کو دھوکہ دیتا رہوں مجھے افسوس تھا کہ وہ ایسی آسانی کے ساتھ مجھ پر کیسے فدا ہونے لگی، یکایک میں نے پاؤں کی چاپ سنی، ایک پست قامت آدمی سامنے سے آرہا تھا، یہ عبداللہ تھا وہ میرے پاس آکر زمین پر بیٹھ گیا اور سرد آہیں بھرنے لگا ——

"اُف! موت کیوں نہیں آتی؟ ہائے موت!" عبداللہ نے دل درد کے ساتھ یہ الفاظ کہے۔

میں نے عبداللہ کی جھکی ہوئی گردن اور اُس کا مسخ چہرہ دیکھا، اُس کی سرد آہیں سنیں، مجھے اُس کی تلخ کامی اور نامرادی کا یقین آگیا، جس کا اُس نے خود اقرار کیا تھا، یہاں تک کہ میں اپنی شادکامی سے بے چین اور خائف ہونے لگا اور تھوڑی دیر بعد مکان میں واپس چلا آیا۔

شکیلہ برآمدے میں کھڑی تھی، میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا، اُسے شدت سے پیار کرنے لگا۔ میرے کمرے میں آکر اُس نے کہا کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے، مستقل اتحاد و محبت کا وعدہ کرتے ہوئے اُس نے عاجزی سے درخواست کی کہ میں اُسے اپنے ساتھ لے چلوں، بار بار میں اُسے کھڑکی تک لے جاتا اور چاندنی میں اُس کے خد و خال دیکھتا وہ ایک دل فریب خواب تھی اور میں بار بار اُسے اپنے آغوش میں لے کر اُس خواب کو حقیقت میں تبدیل کرنے کی کوشش کرتا۔ فضائے آسمانی سے نور کا چھن چھن کر ارضِ خاکی پر گرنا اور

اُس پری پیکر کا میرے قریب ہونا ایک ایسا منظر تھا جو قبر میں بھی چین سے نہ سونے دے گا۔ مجھے یہ لطف نہ کبھی پہلے حاصل ہوا تھا نہ پھر اُس کے بعد حاصل ہو سکا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر دل کی گہرائی میں مخفی طور سے اس حالت میں بھی ایک ایسی بے چینی موجود تھی کہ جس کی وجہ میں سمجھنے سے قاصر تھا۔ شکیلہ کی محبت کچھ بے محل اور بھدّی معلوم ہوتی تھی، اُس کا جذبہ بہت گہرا تھا، جس میں آنسوؤں اور قسموں کی فراوانی تھی۔ اُس حالت میں ہر آنسو اور ہر قسم کو میں ناپسند کر رہا تھا اور چاہتا تھا کہ مستقبل کا کوئی ذکر ہمارے عیش کو منغص نہ کرے، جی یہ چاہتا تھا کہ ایک شہاب ثاقب کی طرح چاند کی نورانی روشنی ہماری زندگیوں پر جلوہ طراز ہو جائے اور ۔۔ ۔۔ ۔۔ بس ۔۔ ۔۔ ۔۔ !

رات کے تین بجے وہ میرے کمرے سے باہر گئی، میں ابھی دروازہ پر ہی کھڑا ہوا تھا کہ سلیم یکایک آموجود ہوا، وہ چونک گئی اور زرا ہٹ کر اُس پر غائر نگاہیں ڈالنے لگی، اُس کے ہر بُن مُو سے تنفر کا ایک دریا اُبل رہا تھا، سلیم مسکراتا اور کچھ کھانستا ہوا میرے کمرے میں آیا۔

"میں اپنی ٹوپی بھول گیا تھا"۔ اُس نے بغیر مجھے دیکھے کہا۔

اُس نے ٹوپی اپنے سر پر رکھی اور میرے منتشر چہرے پر نگاہیں ڈالیں اور ایک عجیب آواز میں مجھ سے کہنے لگا۔

"غالباً میری قسمت میں بدا ہے کہ میں کچھ نہ سمجھوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر آپ کچھ سمجھتے ہیں تو میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میری آنکھوں کے سامنے تو اندھیرا ہی اندھیرا ہے"۔

یہ کہکر کھنکارتا ہوا وہ چل دیا، میری نگاہوں نے اُس کا تعاقب کیا، وہ اصطبل میں پہنچ چکا تھا اور اپنے ہاتھ سے گھوڑے پر زین کس رہا تھا۔ مگر اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے، اُس کا عضو عضو لرز رہا تھا، مکان کے چاروں طرف اُس نے نگاہیں ڈالنا شروع کیں، غالباً وہ پھر اس وقت شدت سے خائف تھا، وہ گھوڑے پر سوار ہو گیا اور تین چار چابک کھا کر گھوڑا ہوا ہو گیا۔

اُس کے تھوڑے ہی دیر بعد میں بھی روانہ ہو گیا، سورج بلند ہو رہا تھا اور شب گزشتہ کا کہر اب تک جھاڑیوں کی ٹہنیوں اور درختوں کی شاخوں سے لپٹا ہوا تھا، گاڑی کی کوچ بکس پر عبداللہ بیٹھا ہوا تھا۔ اتنی ہی دیر میں وہ خوب شراب پی چکا تھا اور گنگنا رہا تھا۔ سلیم کے "اندرونی خوف" نے اس وقت مجھ پر بھی اثر کیا، میں گزشتہ شب کے واقعات پر غور کر رہا تھا مگر کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیئے۔

آج اس سانحہ کے بعد بیس سال گزر چکے۔ سلیم اب تک لاپتا ہے اور دل شکستہ شکیلہ شہر سے دُور اُسی گاؤں میں مقیم ہے۔

زمزمۂ تغزل

یادش بخیر ہمارے مکرم دوست جناب صدر الجنگ بھوندو بہادر" میگزین کی "خشک موویت" سے تنگ آکر میگزین نوازی پر اس بے طرح پل پڑے کہ بیک قلم دو غزلیں ارسال فرما دیں لیکن حکم یہ ہے کہ ہمارا اسم مبارک کسی کے گوش زد نہ ہونا چاہیے۔ بہتر ؎

ایں ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر

ایڈیٹر

عالمِ وجد ہے طاری ترے دیوانوں پر
دیکھ کر شمع کو رقصاں ہوا پروانوں پر

شیخ جی فکر کریں آپ خود اپنی جاکر
رحمتیں اس کی برستی ہیں سیہ خانوں پر

کس نے یک لحظہ سکوں پہلوئے گل میں پایا
بجلیاں کیوں یہ تڑپتی ہیں خیابانوں پر

اس قدر بھی نہ ہو وارفتۂ بربادی کوئی
گھر کا دھوکا مجھے ہو جاتا ہے ویرانوں پر

والعیاذ تیرہ دروں نے جو دعائے بد کی
چھا گئی برسیہ بن کے وہ میخانوں پر

اللہ اللہ رے شوخی! یہ تغافل! یہ ستم!
حال دل سن کے مرا ہاتھ دھرے کانوں پر

شکوۂ طعنۂ اغیار عبث ہے بھوندو
خندہ زن زخمِ جگر ہے مرے ارمانوں پر

ایضاً

پسِ مردن وہ آئے ہیں گریباں چاک مدفن پر
نگاہیں شرم سے نیچی ہیں دھبے خوں کے دامن پر

یہ کس کا دل تھا جو محشر میں دعویٰ خون کا کرتا
وہ اپنے ہاتھ رکھے تھے مرے گلرنگ دامن پر

جلا کر خاک کر ڈالا چمن کو موسمِ گل میں
ارے او برق! گرنا تھا تجھے میرے ہی خرمن پر

وہ اشک آنکھوں میں بھر لاتے ہیں میرا تذکرہ سن کر
نہ دل جن کا پسیجا عمر بھر فریاد و شیون پر

رہا پاسِ دروں سوزی بھوندو خان انھیں اتنا
چڑھائے پھول اس کے عرس کے دن جلکے گلخن پر

تخلص حقیر کا بھوندو ہے مقصد بیماری کے لئے اس میں اضافہ و تصغیر بھی ضرورت شعری کی وجہ سے ہوتی ہے۔ صدر الجنگ بھوندو بہادر

جلاد بیٹا

(از جناب میاں محمد اسلم صاحب، لاہور)

نپولین کی ہوس رانی نے ایک مدت سے یورپ میں تہلکہ مچا رکھا تھا۔ شاید ہی کوئی خوش قسمت ملک ہوگا جس کی زمین اپنے نوجوانوں کے خون سے لالہ زار نہ بن چکی ہو۔ اس وقت نپولین کی نگاہ ہسپانیہ پر تھی اور اس کا مشہور سپہ سالار مارشل "سنے" ایک جرار لشکر کے ساتھ ہسپانیہ کی سرحد پر طوفان برپا کر رہا تھا اور کئی ایک شہروں پر فرانس کی عظمت کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔

ساحل سمندر کے پاس ہی پہاڑیوں کے دامن میں ایک چھوٹا سا شہر مینڈا تھا۔ شہر سے کچھ فاصلہ پر ہسپانیہ کے ایک مشہور عالی نسب نواب لیگنوس کا عالی شان محل تھا۔ گو نواب نپولین کی اطاعت کا حلف اٹھا چکا تھا لیکن فرانسیسیوں کو کسی طرح یہ معلوم ہوگیا کہ وہ انگریزوں سے ساز باز کر رہا ہے۔

مینڈا اور اس کے گرد و نواح میں نواب لیگنوس کا چونکہ بہت اثر تھا اس لئے اس علاقہ کے فرانسیسی جرنل جو ایک بہت ظالم اور سنگ دل آدمی تھا۔ اہل مینڈا کی حرکات کی دیکھ بھال کے لئے، ایک نوجوان فرانسیسی افسر "وکٹر مارکنڈ" کو فوج کا ایک دستہ دے کر مینڈا میں بھیج دیا۔ تاکہ فرانسیسی سپاہ کی موجودگی میں نواب لیگنوس کو کسی قسم کی شرارت کرنے کی جرأت نہ ہوسکے۔

جب "وکٹر مارکنڈ" اپنے سپاہیوں کے ساتھ مینڈا میں پہنچا تو نواب کے حکم سے اہل شہر نے اس کا شاندار استقبال کیا اور وکٹر کو محل میں رہنے کی دعوت دی گئی۔

وکٹر مارکنڈ نے مینڈا میں آتے ہی اعلان کر دیا کہ رات آٹھ بجے کے بعد شہر میں کسی قسم کی روشنی نہ کی جائے۔ لیکن محل کو اس حکم سے مستثنا رکھا گیا۔

نواب لیگونس کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ ان میں سے کلیرا اپنے حسن جہاں سوز کے لئے تمام ملک ہسپانیہ میں مشہور تھی اور یورپ کے کئی ایک شہزادے کلیرا سے شادی کرنے کی تمنا دل میں لئے بیٹھے تھے۔

وکٹر نے جس روز سے کلیرا کو دیکھا تھا۔ دل ہی دل میں اس کی پرستش کرنے لگا تھا۔ کچھ روز بعد یہ حسینہ بھی اس سے لطف و مدارات سے پیش آنے لگی۔ اب وکٹر اور کلیرا غزالِ صحرا کی طرح کوہسار کی ڈھلوانوں اور وادیوں میں پھرتے نظر آیا کرتے یا چٹانوں پر بیٹھے پہروں تک موج طوفان خیز کی حشر آزمائیوں کا تماشا کیا کرتے۔

ایک روز جب عروس شب کی گود ستاروں سے بھر چکی تھی وکٹر مارکنڈ ایک چٹان پر بیٹھا دل میں یہ سوچ رہا تھا کہ کس طرح نواب کو کلیرا کی شادی کا پیغام دے۔ اچانک اس کی نگاہ شہر پر جو کچھ فاصلہ پر دامن کوہسار میں تھا پڑی۔ آج خلاف معمول شہر میں چراغوں کی روشنی نظر آتی تھی لیکن شہر سنسان پڑا تھا۔ وکٹر حیران تھا کہ آج اہل شہر کو اس قسم کی جسارت کس طرح ہوئی۔ وہ دریافت حال کے لئے پہاڑ سے نیچے اترنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ پتھروں پر کسی کے آہستہ آہستہ چلنے کی اسے آہٹ سنائی دی۔ وکٹر اِدھر اُدھر تاریکی میں دیکھنے لگا۔ اس وقت اسے سمندر میں دور فاصلہ پر ساتھ ساتھ کچھ مدہم سی روشنی نظر آئی۔ یہ روشنی دیکھتے ہی وکٹر کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی اور وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سمندر کی طرف دیکھنے لگا۔ اتنے میں کسی نے اس کا نام لے کر اسے آہستہ سے آواز دی۔ وکٹر نے پلٹ کر جو دیکھا تو اس کا ایک سپاہی اس کے پاس ہی کھڑا تھا۔ وکٹر نے پوچھا۔

"کیوں کیا ہوا؟"

سپاہی "شہر کے لوگ مسلح ہو کر چپکے چپکے ساحل کی طرف جا رہے ہیں اور مختلف مقامات پر پھانسی دینے کے لئے لکڑیاں استادہ کی گئی ہیں اور ان کے نیچے خشک گھاس کے انبار لگے ہوئے ہیں ۔۔۔۔

سپاہی اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ بندوق چلنے کی آواز سنائی دی۔ گولی سپاہی کے سر میں لگی اور وہ پتھر پر گر کر ٹھنڈا ہو گیا ساتھ ہی سمندر کی جانب سے توپوں کے چلنے کی آواز آنے لگی اور شہر میں مختلف مقامات پر سے آگ کے شعلے بلند ہونے لگے۔ وکٹر صورتِ تصویر حیران کھڑا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس کے سپاہیوں کو پھانسی دے کر جلا دیا گیا ہے اور انگریزی فوج ساحل پر اترا ہی چاہتی ہے۔ اب اسے اپنی زندگی کی کوئی آس نہ رہی۔ کیونکہ فوجی قانون کی رو سے غفلت کی سزا صرف موت تھی۔ آخر دل میں یہ سوچ کر کہ رسوائی اور ذلت کی موت سے خودکشی بہتر ہے۔ وہ قلۂ کوہ سے سر کے بل

نیچے کودنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اسے پھر ایک بار پتھروں پر پاس ہی کسی کے آہستہ آہستہ چلنے کی آہٹ سنائی دی اور ساتھ ہی کسی نے اندھیرے میں اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ یہ کلیرا تھی۔

"وکٹر! میرے بھائی تمھاری تلاش میں ہیں۔ اگر جان کی خیر چاہتے ہو تو بھاگو۔ پہاڑی کے دامن میں ایک گھوڑا تیار کھڑا ہے۔ الوداع"

یہ کہکر کلیرا اندھیرے میں غائب ہو گئی۔ گھوڑے تک پہنچتے پہنچتے کئی گولیاں سرسراتی ہوئی اس کے پاس سے گزر گئیں لیکن اسے خراش تک نہ آئی۔ وکٹر گھوڑے پر سوار ہوا اور اسے صدر مقام کی طرف سرپٹ ڈال دیا۔

جنرل کے سامنے جاکر وکٹر نے اپنی تلوار اس کے سامنے رکھدی اور بولا

"جنرل! میں قصوروار ہوں۔ جیسا سلوک چاہو کرو۔"

اور پھر ایک کرسی پر بیٹھ کر تمام واقعات کہہ سنائے۔ جنرل کچھ دیر تو خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر بولا:

"میرے خیال میں تم رحم کے مستحق ہو۔ ایک فرانسیسی افسر اہل ہسپانیہ کی بدعہدی کا کس طرح ذمہ دار قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ لو اپنی تلوار۔ میں تم کو تمھارے عہدے پر بحال کرتا ہوں لیکن کون جانے مارشل کیا سلوک کرے۔"

وکٹر "اور اگر یہ خبر شہنشاہ تک پہنچ گئی؟"

جنرل "تو پھر تمھارا سینہ ہوگا اور سپاہی کی بندوق۔" اور پھر ایک قہقہہ لگاکر "لیکن گھبراؤ نہیں۔ وقت پر دیکھا جائے گا۔ ہاں دیکھو تو سہی میں ان دغابازوں کو ایسی سزا دوں گا کہ پھر کسی کو اس قسم کی جرأت نہ ہو سکے۔"

ایک فرانسیسی پیادہ پلٹن سواروں کا ایک رسالہ اور توپ خانہ کی ایک بیٹری اسی وقت مینڈا کی طرف روانہ کر دی گئی اور ان کے پیچھے جنرل اپنے اسٹاف کے ساتھ روانہ ہوا۔

اہل مینڈا تو انگریزی فوج کی آمد آمد کے منتظر تھے۔ لیکن اچانک فرانسیسی سپاہ کو دیکھکر حیران رہ گئے جنرل کے آتے ہی اہل شہر نے ہتھیار ڈال دیئے اور اپنے اہل و عیال کے لئے رحم کے طالب ہوئے۔ جنرل کے حکم سے شہر میں سے وہ سب لوگ جو سرغنہ متصور ہوتے تھے گرفتار کرکے اسی وقت گولی سے

اتار دیئے گئے اور باقی لوگوں کو امان دی گئی اور پھر وکٹر کو حکم دیا کہ وہ محل میں جاکر نواب اور اس کے سب متعلقین کو حراست میں لے لے۔

ادھر ساحل سمندر کی جانب پہاڑیوں پر توپیں نصب کر دی گئیں اور مختلف مقامات پر دشمن کی مدافعت کے لئے فوج مقرر کر دی گئی۔ ان انتظامات سے فارغ ہوکر جنرل محل میں داخل ہوا۔ اور حکم دیا کہ نواب اور اس کے عزیز و اقارب اور سب خدام کو پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔

وکٹر جب یہ خبر وحشت اثر لے کر نواب کے پاس پہنچا تو اس نے صرف اس قدر درخواست کی کہ اسے اور اس کے بچوں کو عوام الناس کی طرح پھانسی نہ دی جائے بلکہ اس کے مرتبہ کا لحاظ کرتے ہوئے ان کو قتل کرا دیا جائے اور اس کے سب سے بڑے بیٹے کو تاوان لے کر معاف کر دیا جائے۔

وکٹر جنرل کے پاس جاکر بولا :

"جنرل! مجھے امید ہے کہ آپ میری ایک درخواست قبول کریں گے ؟"

جنرل (وکٹر کی طرف تعجب سے دیکھکر) "تمھاری درخواست ؟"

وکٹر "نواب لیگنوس آپ سے صرف اس قدر رحم چاہتا ہے کہ آپ اسے اور اس کے اہل و عیال کو عام لوگوں کی طرح پھانسی نہ دیں۔ بلکہ اسے قتل کروا دیا جائے۔"

جنرل "منظور ہے۔ محل کے برآمدہ میں قتل کا انتظام کر دو تاکہ لوگ بھی یہ تماشا دیکھ لیں۔"

وکٹر "نواب کی یہ بھی درخواست ہے کہ آپ جس قدر تاوان چاہیں لے لیں لیکن اس کے بڑے بیٹے کو بخش دیں۔"

جنرل "خوب۔ میں اس بوڑھے کی چالوں کو خوب سمجھتا ہوں۔ چلو یوں ہی سہی۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کی نسل قائم رہے۔ منظور۔ لیکن شرط یہ ہے کہ اس کا بیٹا خود اپنے ہاتھ سے اپنے باپ اور بھائیوں کو قتل کرے۔"

یہ کہکر جنرل اپنے افسروں کے ساتھ کھانے کے کمرے میں چلا گیا اور وکٹر قیدیوں کی طرف ان کو جنرل کا حکم سنانے چل دیا۔

وکٹر کے اتنی جلدی واپس آنے سے سب قیدی جن کی مشکیں بندھی تھیں۔ اشتیاق سے اس کی طرف دیکھنے لگے وکٹر نے اپنے ہاتھ سے کلیرا کے بند کھولے اور پھر سپاہیوں کو حکم دے کر کہ خدام کے سوا باقی سب کے بند بھی کاٹ دیئے جائیں

کلیرا کو ایک طرف لے جا کر جنرل کا حکم سنایا۔

بوڑھا نواب سر جھکائے ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے پاس ہی اس کا سب سے بڑا بیٹا جانیٹو کھڑا تھا اور کچھ فاصلہ پر دوسرا بیٹا فلیپی اور چھوٹا مینوئل بیٹھے تھے نواب کے سامنے ایک کرسی پر اس کی بیگم اور چھوٹی بیٹی میری کونٹا کھڑی تھی کلیرا اپنے باپ کے پاس آکر دو زانو ہو کر بولی!

"ابا جان! آپ جانیٹو سے حلف لیں کہ وہ آپ کے حکم کی تعمیل کرے گا۔ اگر جانیٹو وعدہ کرے تو پھر کچھ خوف نہیں" کلیرا کے منہ سے یہ الفاظ سن کر سب کے پژمردہ چہرے چمکنے لگے لیکن جب انھوں نے جنرل کا حکم سنا تو سب کا رنگ خوف سے سپید ہو گیا۔

اتنے میں کچھ سپاہی کمرے میں داخل ہوئے اور نواب کے خدام کو پھانسی پر لٹکانے کے لئے باہر لے گئے ان لوگوں کے جانیکے بعد نواب کھڑا ہوا اور اپنے بڑے بیٹے کی طرف دیکھکر بولا۔

"جانیٹو! سنتے ہو بیٹا؟"

نوجوان جانیٹو نے ایک کلیجہ مسل دینے والے انداز سے اپنی ضعیف ماں اور سال خوردہ باپ کی طرف دیکھا اور سر جھکالیا۔ لیکن کلیرا اپنے بڑے بھائی کے پاس جا کر بیٹھ گئی اور محبت سے اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی:۔

"جانیٹو! خدا کی قسم مجھے تمھارے ہاتھ سے گردن کٹانے میں اتنی ہی راحت ہوگی جیسی ایک اجنبی جلاد کے ہاتھ سے قتل ہونے میں مصیبت۔ جانیٹو! میرے ماں جائے پیارے بھائی اپنی کلیرا پر رحم کرو .... جانیٹو! جانیٹو! تم بولو تو سہی۔ کیا تمھاری غیرت اور حمیت یہ گوارا کرے گی کہ میں کسی کی لونڈی بن کر رہوں؟"

وکٹر نے جو پاس ہی کھڑا تھا یہ سن کر بہت پیچ و تاب کھایا۔ لیکن خاموش ہو رہا۔

پھر اس کا چھوٹا بھائی فلیپی اٹھا اور بڑے بھائی کے شانہ پر ہاتھ رکھ کر بولا:

"جانیٹو! کیا تم یہ کہلانا چاہتے ہو کہ تم بزدل ہو۔ بھائی ہم پر رحم کرو"

اب نواب اٹھا اور اپنے بڑے بیٹے کے سامنے کھڑا ہو کر بولا:

"جانیٹو اٹھو۔ میں تم کو حکم دیتا ہوں"

لیکن جانیٹو اسی طرح سر جھکائے بیٹھا رہا۔ آخر کار بوڑھا نواب بیٹے کے سامنے دو زانو ہو گیا اور اس کے

بچے بھی باپ کی طرح دو زانو ہو کر بیٹھ گئے۔

بوڑھا نواب پھر بولا :

"بیٹا ! ہسپانوی غیرت کیا ہوئی ! خدا کی قسم بیگنوس کے خاندان میں آج تک کوئی بزدل پیدا نہیں ہوا ..... جانیٹو ! تمھیں شرم نہیں آتی کہ تمھارا بوڑھا باپ تمھارے سامنے دو زانو بیٹھا ہے ؟ (اور پھر بیگم کی طرف دیکھ کر) کیوں اسی بیٹے پر تم ناز کیا کرتی تھیں ؟"

بوڑھی بیگم جو بڑے غور سے اپنے لخت جگر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر کچھ شکن پڑتے دیکھ کر بولی :

" بے شک مجھے اس بچہ پر ناز ہے۔ جانیٹو تمھارے حکم کی تعمیل کرے گا "

ساتھ ہی چھوٹا مینوئل اور سب سے چھوٹی بیری کوٹا محبت سے اپنے بڑے بھائی سے لپٹ گئی اور بولی :

" جانیٹو ! کیا تم ہم کو جلاد کے حوالہ کردو گے ؟"

تھوڑی دیر بعد پادری صلیب لئے کمرے میں داخل ہوا۔ اس وقت تک شہر کے لوگ نواب اور اس کے بچوں کا قتل دیکھنے کے لئے جنرل کے حکم سے محل کے نیچے جمع ہو چکے تھے۔

جس جگہ نواب کے خدام پھانسی پر لٹک رہے تھے۔ اس مقام سے کوئی پچاس قدم کے فاصلہ پر محل کے ایک اونچے برآمدہ میں لکڑی کی ایک بھدی سی تپائی رکھی تھی اور اس تپائی پر ایک تلوار پڑی چمک رہی تھی۔ پاس ہی جلاد سیاہ کپڑے پہنے کھڑا تھا۔

لوگوں کے دیکھتے دیکھتے محل کے ایک کمرے میں سے نواب اس کی بیگم اور بچے ایک دوسرے کے پیچھے قطار باندھے ہوئے نکلے اور برآمدہ میں آکر اس خوفناک تپائی سے کچھ فاصلہ پر دو زانو ہو کر بیٹھ گئے۔

پادری جانیٹو کا ہاتھ پکڑے اسے تپائی کے پاس لے آیا اور تلوار اٹھا کر اسے پکڑا دی۔ پھر جلاد نے آگے بڑھ کر آہستہ آہستہ جانیٹو کے کان میں کچھ ہدایات دیں

کلیرا جو ماں کے پاس بیٹھی تھی۔ تپائی کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی اور بولی۔

" جانیٹو ! میں ایک کمزور عورت ہوں۔ مجھ سے یہ خونی نظارہ نہ دیکھا جائے گا۔ پہلے مجھے ٹھکانے لگا دو "

استنے میں وکٹر ایک طرف سے آیا اور بولا :

" جنرل نے اجازت دی ہے کہ اگر تم مجھ سے شادی کرلو تو تم آزاد ہو "

کلیرا نے بڑی نفرت اور حقارت سے وکٹر کی طرف دیکھا ۔ اور تپائی پر گردن رکھ کر بولی :

" پیارے جانیٹو ! اپنی بہن کی آبرو بچالو "

یہ الفاظ کلیرا کے زبان سے نکلتے ہی جانیٹو نے اس کا سر تن سے جدا کردیا ۔ ماںتا کی ماری بوڑھی خاتون نے آنکھیں بند کرلیں ۔ لیکن منہ سے ایک لفظ بھی نہ کہا ۔

کلیرا کا سر کٹتے ہی فلپی آگے بڑھا اور گرم جوشی سے بھائی سے بغل گیر ہوکر تپائی پر گردن رکھدی ۔

فلپی کے قتل کے بعد چھوٹا مینوئل آگے آیا اور جلدی سے تپائی پر سر رکھ کر بولا :

" جانیٹو ! دیکھ لیجیو ۔ ٹھیک ہونا "

آخری لفظ کے ساتھ معصوم مینوئل کی لاش خون میں تڑپنے لگی ۔

مینوئل کے بعد چھوٹی میری کوٹا روتی ہوئی آگے آئی ۔ جانیٹو نے اسے اٹھا کر گلے لگالیا اور بولا :

" میری پیاری میری تم کیوں روتی ہو ؟ "

میری کوٹا " جانیٹو ، میں اس لئے روتی ہوں کہ میرے بعد تم دنیا میں اکیلے رہ جاؤگے ۔ پھر تم کو کون پیار کیا کرے گا ۔ "

جانیٹو نے کئی بار اپنی معصوم بہن کا منہ چوما اور آخر وہ بھی اپنے بھائیوں سے جا ملی ۔

اب نواب لیگنوس خود آگے بڑھا ۔ بوڑھے نواب نے ایک ایک کرکے اپنے مقتول بچوں کے سر کو بوسہ دیا ۔ اور پھر جانیٹو سے بغل گیر ہوکر اہل وطن کو مخاطب کرکے بولا ۔

" دوستو ! میرے بچوں نے وطن کی آبرو پر گردن کٹوائی ہے ۔ میرا یہ بہادر بیٹا جس پر آنے والی نسلیں فخر کریں گی اب خدا کے اور تمہارے سپرد ہے ۔ اب میں وطن پر قربان ہوتا ہوں ۔ "

لیگنوس نے تپائی کو جہاں اس کے پیارے بچوں کا خون پڑا تھا بوسہ دیا اور پھر اپنا سر اسی جگہ رکھ کر بولا :

" میرے بہادر جانیٹو ! اپنے بوڑھے باپ کو اس مصیبت سے نجات دلاؤ ۔ خدا تم کو برکت دے ۔ "

چشم زدن میں نواب لیگنوس اپنے بچوں سے جاملا - اب صرف جانیٹو کی بوڑھی ماں باقی رہ گئی تھی - خاوند کے قتل کے بعد یہ بہادر خاتون اپنی جگہ سے اٹھی لیکن جب وہ تپائی کے پاس آ کر جھکنے لگی تو بے اختیار جانیٹو کے منہ سے یہ لفظ نکلے :

" ہائے اس نے تو مجھے اپنا دودھ پلا پلا کر پرورش کیا تھا "

بوڑھی خاتون نے سر اٹھا کر اپنے نور نظر کی طرف دیکھا اور پھر اس خوف سے کہ شاید اس کا بیٹا اپنا فرض نہ ادا کر سکے وہ فوراً برآمدہ میں سے نیچے کود پڑی اور اتنی بلندی سے چٹانوں اور پتھروں پر گر کر جاں بحق تسلیم ہوئی -

لوگوں نے تحسین اور مرحبا کا نعـــرہ بلند کیا اور ساتھ ہی جانیٹو بے ہوش ہو کر مقتولوں کے اوپر گرا -

---

کچھ مدت کے بعد جب ہسپانیہ پر سے فرانسیسیوں کی آفت ٹل گئی تو شاہ ہسپانیہ نے ایک بہت بڑے دربار میں جانیٹو کو طلب کر کے اپنے ہاتھ سے فاخرہ خلعت پہنایا اور اس عدیم المثل اور حیرت انگیز بہادری اور اس کے خاندان کی فیاضانہ قربانی کے لئے صرف جانیٹو کی ذات کے لئے " جلاد " کا لقب ایک معزز ترین خطاب قرار دے کر شاہی نوازشوں اور عنایتوں سے مالا مال کر دیا -

گو تمام ملک نواب جانیٹو کی عزت کرتا تھا اور جاہ و منزلت کے لحاظ سے مملکت ہسپانیہ میں کوئی اس کے ہمسر کا نہ تھا - لیکن وہ جب تک زندہ رہا کبھی کسی خوشی کی تقریب میں شامل نہ ہوا -

مینڈا کے اسی محل میں جہاں اس کے پیارے بہن بھائی اور فیاض ماں باپ مدفون تھے وہ نہایت سادہ زندگی بسر کرتا تھا -

خدا نے اسے دو بیٹے عطا کئے - دوسرے بیٹے کی پیدائش سے کچھ عرصہ بعد وہ بیمار ہو کر ان پیاری روحوں سے جن کی یاد میں وہ خون کے آنسو بہاتا تھا ایک روز جا ملا ؎

بقا بعد مردن اگر ہے تو یہ ہے
زمانے میں رہنا تو مشہور رہنا

غزل

از جناب قدرت احمد صاحب (ایف اے) انٹرمیڈیٹ کالج علیگڑھ

عشقِ صنم کا دل میں ہمارے گزر نہ ہو
کعبہ خدا کرے بُتِ کافر کا گھر نہ ہو

جھگڑے ہیں سارے تیری رکاوٹ سے تیغِ ناز
سر ہو نہ دوش پر تو کوئی دردِ سر نہ ہو

مدت ہوئی کہ سلسلہ اشکوں کا بند ہے
جو چشم ترسے آتا ہے لختِ جگر نہ ہو

یارب ہوں میں جو خجلتِ عصیاں سے اشکبار
شرمندہ روزِ حشر مری چشمِ تر نہ ہو

حسرت میں مر گئے ہیں کسی شعلہ رو کی ہم
شمعِ مزار نذرِ نسیمِ سحر نہ ہو

یارب وہ بے کسی جو رہی ساتھ عمر بھر
ڈر ہے کہ میرے بعد کہیں دربدر نہ ہو

رونا ہے شمع کا کہ نہ ہو خونِ آرزو
پروانوں کی تڑپ ہے کہ جلدی سحر نہ ہو

وہ لطف آرہا ہے انھیں بزمِ غیر میں
ہم مر بھی جائیں راز تو ان کو خبر نہ ہو

غزل

دل بہ ایں جوشِ تپشِ برقِ ادا ہے تو سہی
کیوں نہ ہو آپ کی نظروں میں رہا ہے تو سہی

دوست وارفتۂ اندازِ جفا ہے تو سہی
یہ بھی اک صورتِ امیدِ وفا ہے تو سہی

دل ز خود مائلِ تسلیم و رضا ہے تو سہی
گو خرد کو نہ ہو معلوم خدا ہے تو سہی

آپ ہی کچھ ہمیں مایوس کئے دیتے ہیں
ورنہ اس دردِ محبت کی دوا ہے تو سہی

سطوتِ حسن سے ہے عشق کو تعلیمِ نیاز
جور تیرا سبق آموزِ وفا ہے تو سہی

رونقِ باغ نہیں رہنِ نوائے بلبل
بوئے گل خندۂ گل اس سے سوا ہے تو سہی

پردۂ شوق میں کچھ نغمے ہیں اللہ! اللہ!
دل تیری یاد میں بے تاب ہوا ہے تو سہی

کیا عجب ہے کہ میسر ہو رضاؔ سمعِ قبول
نالۂ درد بہ آہنگِ دعا ہے تو سہی

"رضاؔ"

بہرام

(گزشتہ سے پیوستہ)

از

جناب شمیم بلہوری

دبیریہ منزل کا راز

ترشح ہو چکا تھا۔ مگر بادل ایسے گھرے ہوئے تھے کہ ۴ بجے بعد دوپہر ہی کو شام کا گمان ہوتا تھا۔ میں دہلی سے چند میل کے فاصلہ پر بہرام کے ذاتی مکان واقع ...... کی بالائی منزل پر بیٹھا ہوا تھا اور سامنے ایک کرسی پر بہرام دراز تھا۔ اس وقت بہرام کے لبوں پر وہ پرمسرت تبسم عیاں تھا جو اس کی شگفتہ طبعی کی خاص علامت ہے۔ میں اس سے بے تکلف ہونے کے علاوہ اس کی عادات سے بخوبی واقف ہوں۔ اس لئے میں نے بہ سلسلۂ گفتگو سوال کیا،

"حضرت! کان پور میں آپ کا "بھوتوں والے بنگلہ" سے غائب ہو جانا لوگوں کو فوق الفطرت معلوم ہوتا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ میں نے اس واقعہ کے بیان کرنے میں یا تو قطعی جھوٹ بولا، یا مبالغہ سے کام لیا"۔

"آخر آپ کا کیا خیال ہے؟ .... میں کوئی جن تو ہوں نہیں کہ یکایک نظروں سے غایب ہو گیا"۔ بہرام نے کہا۔ "میں کیا عرض کروں! اگر مجھے اس کے بعد کے واقعات کا علم ہوتا تو میں ظاہر ہی نہ کر دیتا۔ لوگوں کو اعتراض کا موقع کیوں دیتا"۔ "واللہ مجھے اُن لوگوں کی بیوقوفی پر بیحد ہنسی آتی ہے جو اتنا نہیں سمجھتے کہ مجھ جیسا شخص، جس نے تمام دنیا کے خود غرض رئیسوں، ظالم دولت مندوں، اور پولیس کے خلاف عَلَم جہاد بلند کر رکھا ہے۔ اگر ایسے وسیع اور لامحدود ذرائع اپنی حفاظت کے نہ رکھے تو ایک منٹ بھی آزاد نہیں رہ سکتا۔ دنیا جانتی ہے کہ میرا کوئی فعل پیش بینی سے خالی نہیں ہوتا۔ میں جس جگہ قدم رکھتا ہوں۔ وہاں اپنی حفاظت کا سامان پہلے ہم پہنچا لیتا ہوں۔ یہ تمام باتیں جانتے ہوئے بھی اگر لوگ تعجب کریں تو سوائے اس کے کہ "بریں عقل و دانش بباید گریست" اور کیا کہا جا سکتا ہے"۔ ....

"خیر اب تو ظاہر کر دیجئے"۔ میں نے کہا۔

"تو کیا آپ بھی اُن ہی کے ہم خیال ہیں؟ اجی حضرت! کیا

آپ کو بنگلوں میں سے والا مسٹر کہ یاد نہیں رہا جس میں محض اسپرنگ کے خراب ہو جانے کی وجہ سے تین منٹ کے لئے گرفتار ہو گیا تھا۔ مجھے ہنسی تو اس پر آتی ہے کہ "بھوتوں والے بنگلہ میں میرے آنے پر کسی نے تعجب نہ کیا اور نکل جانے پر اس قدر حیرت! ارے میاں! میں جس راستہ سے آیا تھا اسی راہ سے واپس چلا گیا"۔

(بجا ہے" میں نے کہا۔)

"خیر آپ نے اسی کے متعلق سوال کیا ہے اس لئے بتلاتا ہوں کہ بنگلے کے اس کمرہ کے ملحق۔ جہاں پروفیسر صاحب سے گفتگو ہوئی تھی۔ دوسرا کمرہ ہے اس کی شمالی دیوار میں ایک سرخ لکیر بنی ہوئی ہے۔ اور اوپر کی جانب خاتمہ پر ایک آہنی کیل دیوار میں لگی ہوئی ہے۔ بادی النظر میں یہ کوئی چیز ٹانگنے کے لئے کھونٹی معلوم ہوتی ہے۔ مگر نہیں۔ اس کے علاوہ وہ ایک خاص چیز ہے جس کا علم سوائے میرے شاید کسی اور کو نہیں۔ آپ اس آہنی کیل کو تین مرتبہ سیدھی طرف گھما کر اندر کو دابیں تو دیوار سرخ لکیر کے پاس سے پھٹ کر علیحدہ ہو جاتی ہے اور دریچہ سا نمودار ہوتا ہے اس میں داخل ہو کر آپ اندر کا بٹن دبائیں تو دیوار پھر مل کر برابر ہو جاتی ہے دیوار کی خلا میں داخل ہونے کے بعد آپ کو پچیس سیڑھیوں کا ایک زینہ اتر کر سرنگ کا دہانہ ملے گا جو تقریباً ۲ فرلانگ لمبی ہے اور گنگا کے کنارے جاجمؤ کے اس میدان میں ختم ہوتی ہے جہاں کسی زمانہ میں سرکاری تحصیل کی عمارت تھی۔ یہاں ایک غار ہے جس میں گنگا کا پانی بھرا رہتا ہے اور ایک طرف دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پانی کے زور نے کسی زمانے میں اس کی زمین کو کاٹ ڈالا ہے مگر حقیقتاً یہ بات نہیں۔ یہ کٹی ہوئی جگہ پانی کی زد سے محفوظ ہے اور اس سرنگ کے ختم ہونے کی جگہ ہے۔ میں بنگلہ میں شانتی کو لئے ہوئے اسی راستہ سے گیا تھا احتیاطاً اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی کہ کہیں سرنگ کی تاریکی سے خوف نہ کھائے۔ یا شاید اس راز کو کسی پر ظاہر کر دے۔ چنانچہ وہاں سے فارغ ہو کر پھر اسی راستہ سے اپنی سنہرے بالوں والی رفیقہ کو ساتھ لئے باطمینان واپس آ گیا۔ گنگا کے کنارے باہر نکلا اور کنارے کنارے ہوتا ہوا گنگا برج اسٹیشن پر پہنچا۔ یہاں سڑک پر میری طلبیدہ موٹر انتظار میں کھڑی تھی۔ اس میں سوار ہو کر ۴۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اناؤ پہونچا۔ ۷ بجے کانپور سے آنے والی اکسپرس میں تین منٹ کی دیر تھی اس پر سوار ہو کر لکھنؤ پہنچ گیا۔ وہاں میرے آدمی مل گئے اور نو بجے شب کو بیوقوف کاٹھ کا الو اسد بھوتوں والے بنگلہ میں میری تلاش کی دھن میں اپنا سر مار رہا تھا۔ اور میں امین آباد پارک میں مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا ٹہل رہا تھا! واللہ۔ اگر انسان میں عزم و استقلال، چستی، چالاکی اور مستعدی ہو تو ہر کام آسانی سے ہو جاتا ہے کہ دوسرے لوگ فوق الفطرت سمجھنے لگتے ہیں۔ اب

آپ ہی بتلائیے کہ اس تمام کارروائی میں کونسی بات عجب ہے جو پہلوان نہ کرسکتا ہو۔ چنانچہ دوسرے ہی روز نمبر ۱۴۲ امین آباد پارک میں اس جانب کامران مرزا صاحب مصور اور پینٹر کے نام سے دکان لگا کر بیٹھ گئے اور ایک دوسرے معرکہ کی کارروائی شروع کردی؟

"اسی تفصیل کے سننے کا بیحد اشتیاق ہے۔"

"میں آج اسی کو بیان کروں گا۔ آپ سمجھتے ہیں کہ میں آپ سے جب کوئی تفصیل بیان کرتا ہوں تو صرف اس لئے کہ دنیا کو اس سے آگاہی ہو جائے اور میری زندگی لوگوں کے لئے ذریعہ دلچسپی بنے آپ سے یہ بھی مخفی نہیں کہ "پان کے پتے" والے معاملے سے میں آپ کو اپنا صادق دوست سمجھتا ہوں۔ اور شکر ہے کہ آج تک مجھے آپ کی طرف سے کوئی شکایت کا موقعہ نہیں ملا اس لئے یاد رکھئے کہ جس وقت میں نے آرام کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا تو انشاء اللہ ایسا معاوضہ دوں گا کہ آپ عمر بھر بہرام کا کلمہ پڑھتے رہیں۔"

"میں یوں ہی آپ کی عنایات کا ممنون ہوں کہ آپ مجھے اپنا سچا بہی خواہ تو تصور کرتے ہیں۔"

"بیشک۔ جہاں تک رازداری کا تعلق ہے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ آپ نے میرے متعلق کوئی بات اس وقت تک ظاہر نہیں کی جب تک میں نے خود اجازت نہیں دی۔ یہی وجہ ہے کہ میرا تمام حال سوائے آپ کے اور کسی کو معلوم نہیں۔"

"اور نہ انشاءاللہ تعالیٰ کسی کو معلوم ہوگا۔ کم از کم میری جانب سے اطمینان رکھئے۔"

"مجھے اطمینان ہے .... ہاں تو لکھنؤ میں "دیرینہ منزل" کا معرکہ سناؤں۔ آپ سے یہ تو مخفی نہیں کہ "نیلگوں ہیرے" والے معاملہ میں میری اور انسپکٹر شاہد حسین کی کیسی سخت کشمکش ہوئی تھی کہ تمام دنیا دلچسپی لے رہی تھی۔ لکھنؤ میں پھر مجھے معلوم ہوا کہ یہ کمبخت بھی "دیرینہ منزل" کے راز کو حل کرنے کی نیت سے بلایا جا رہا ہے۔ بس دل میں امنگ اٹھی کہ ایک مرتبہ پھر اسے نیچا دکھاؤں۔ خدا کی قسم! مجھے اس سے مقابلہ کرنے میں بڑا لطف آتا ہے اس لئے کہ یہ واقعی کسی حد تک مد مقابل ہے۔ معمولی لوگوں سے مقابلہ میں لطف تو آتا نہیں صرف تھوڑے دنوں کی دل لگی ہو جاتی ہے!"

"ضرور بیان کیجئے۔" میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

اس کے بعد اس نے اپنی لکھنؤ والی داستان نہایت دلچسپ پیرایہ میں ہنس ہنس کر بیان کرنا شروع کی۔ چونکہ اس کا بیان اور میرا سننا بہ سلسلۂ گفتگو تھا۔ اس لئے اس طریق پر ناظرین کے سامنے پیش کرنا طوالت سے خالی نہیں میں اصل معرکہ کو حسب معمول اپنے مخصوص انداز میں حوالہ قلم کرتا ہوں امید ہے کہ آپ اس کو بھی غیر معمولی دلچسپی سے ملاحظہ کرینگے۔

(۱)

"بھئی واللہ۔ کامران مرزا! تمہاری شکل بالکل بہرام سے

طی عجیب ہے۔"

"اوہو۔ کیا آپ اُسے پہچانتے ہیں یا کبھی دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے؟"

"جس طرح دوسرے لوگ پہچانتے ہیں۔ میں نے بھی اس کی مختلف تصویریں دیکھی ہیں۔ گو اُن میں سے ایک بھی کسی دوسرے کے مطابق نہ تھی۔ مگر سب میں چہرہ مہرہ کی شباہت یکساں ہے۔ چنانچہ تمھیں دیکھ کر بہرام کا گمان ہوتا ہے۔"

کامران مرزا کے چہرہ پر خفیف علامات پریشانی نمایاں ہوئیں فوراً کہنے لگا "میرا خیال ہے کہ آپ بالکل صحیح فرماتے ہیں یقین جانئے اس کا اعتراف کرنے والے آپ ہی پہلے شخص نہیں۔"

"خدا جانتا ہے۔" نواب خاقان نے کہا "اگر تم سے میرا تعارف میرے عم زاد بھائی بھائی نواب جاوداں نے نہ کرایا ہوتا اور میں تمھیں ایک ماہر فن مصوّر و پینٹر سمجھ کر قدر کی نگاہ سے نہ دیکھتا تو واللہ! کان پور کے معرکہ کے بعد میرا قدرتاً گمان کچھ اور ہوتا اور میں پولیس کو لکھنؤ میں بہرام کی موجودگی کی اطلاع دے دیتا۔"

"اس مذاق پر عام فرمائشی قہقہہ پڑا۔ دبیریہ منزل کے بڑے کمرہ میں سامان کا اہتمام تھا۔ کامران مرزا کے علاوہ فرنگی محل کے مجتہد علاّمہ شمس الحسنین صاحب اور دس بارہ دیگر صاحب مدعو تھے۔ ان میں سے ایک صاحب فوجی افسر بھی تھے۔ فرمانے لگے:

"کیوں صاحب۔ کیا اس میں بھی کوئی شک ہے کہ کانپور کے معرکہ کے بعد لوگوں نے بہرام کو دریائے گنگ کے کنارے پل کی طرف جاتے دیکھا؟"

"بالکل صحیح۔ اس کو تقریباً تین ماہ کا عرصہ ہوا۔ اس کے ایک ہفتہ بعد ہی کشمیری ہوٹل امین آباد میں میری ملاقات کامران مرزا سے ہوئی جو اُس وقت سے آج تک تین مرتبہ مجھے شرف نیاز کا موقعہ دے چکے ہیں۔ اگر یہ اس سنجیدہ تشریف آوری کا تفریحی پیش خیمہ ہے جس سے ہمارے دوست مرزا جی عنقریب کسی دن .... یا کسی رات میں مجھے سرفراز فرمانا چاہتے ہیں!"

اس پر پھر فرمائشی قہقہہ اڑا اور جماعت اُٹھ کر اُس قدیم وضع کے وسیع کمرہ میں پہونچی جو منارہ غلامان کا نچلا حصہ ہے اور جس میں دبیریہ منزل کے گزشتہ مالکوں نے اپنی اپنی پسند کے نادرات جمع کئے تھے۔ صدیوں کی پرانی چیزیں یہاں موجود تھیں۔ جھاڑ، فانوس، نادر روزگار قمقمے، چوبی تصاویر دیواروں اور چھتوں پر آویزاں تھیں۔ چاروں دریچوں کے اندرونی گوشے پیتل سے منڈھے ہوئے، کھڑکی اور دروازوں کے درمیان پُرانی وضع کی کتابوں کی الماری جس کے ایک تختہ پر سنہری جلی حرفوں میں لکھا تھا۔

"دبیریہ منزل"

اور اس کے نیچے اس خاندان کا فاتحانہ مسلک کندہ تھا

"....... مرد باید کہ ہراساں نشود"

یہاں پہنچتے ہی خاقان صاحب نے کہا "کامران مرزا! تم کو جلدی کرنا پڑے گی کیوں کہ آج کی رات آخری سمجھو۔ اس کے بعد شاید پھر موقع نہ مل سکے۔"

"یہ آخری کیسی ......؟" مصوّر نے ہنس کر سوال کیا جو اس بہرام کی شباہت کے مذاق کو نہایت شگفتہ طبعی سے برداشت کر رہا تھا۔ نواب خاقان کچھ جواب دینے کو ہی تھے کہ کسی کی آواز سُننے پر رُک گئے۔ کھانے کا اہتمام اور مہمانوں کی دلچسپی کا خیال اس وقت نواب صاحب کے لئے زیادہ اہم باتیں تھیں۔

"ارمان! ہٹاؤ بھی" خاقان نے بڑبڑاتے ہوئے کہا "اب میں ان سب سے کیوں نہ کہہ دوں آخر ڈرنے کی کونسی وجہ ہے؟"

یہ سُن کر سب اُن کے گرد شوق بھرے انداز سے بیٹھ گئے۔ خاقان صاحب کے انداز سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بڑی اہم خبر سنانے والے ہیں۔ کہنے لگے "کل چار بجے شام کو ہندوستان کا مایۂ ناز جاسوس انسپکٹر شاہد حسین میرا مہمان ہوگا جس کے لئے راز کوئی چیز نہیں۔ اہم ترین رازہائے بستہ کا حل کرنے والا وہ محیر العقول ہستی جو کسی ناول نویس کے لئے بہترین کیرکٹر بن سکتا ہے۔ ہر شخص اس خبر کو سُن کر حیران رہ گیا..... شاہد حسین دبیریہ منزل میں! ...... معاملہ واقعی اب سنجیدہ صورت اختیار کر رہا تھا۔ اس کا بالفاظ دیگر یہ مطلب تھا کہ بہرام بھی لکھنؤ میں موجود ہے۔

"بہرام اور اس کے رفقا بھی یہیں آس پاس موجود ہیں نیلی چھتری' بیوی کا انتخاب' نیلگوں ہیرا' دل سکھ رائے کا معاملہ ظاہر ہو جانے کے بعد کیا یہ ہو سکتا ہے کہ بہرام اس راز کا جویا نہ بنے؟ کل اس کا وار ان لوگوں پر تھا اب میں اس کا ہدف بنوں گا۔"

"تو کیا آپ کو اس کی طرف سے کسی قسم کی اطلاع موصول ہو چکی ہے؟"

"اجی حضرت! ایک ہی ترکیب ہر جگہ کارگر نہیں ہوتی"

"پھر دیکھئے......؟"

"یہ دیکھئے......"

"نواب صاحب کتاب کی الماری میں دو کتابوں کے درمیان ایک جگہ خالی کی طرف اشارہ کر کے فرمانے لگے" دیکھئے۔ اس جگہ ایک پُرانی کتاب موسومہ بہ "روایات دبیریہ منزل" رکھی ہوئی تھی۔ یہ کتاب دبیریہ منزل کے تعمیر کے وقت کی تھی جس کو تقریباً ۵۰ سال سے کم کچھ عرصہ نہیں ہوا۔ اس میں تین منقوش تختیاں تھیں ایک پر دبیریہ منزل کے علاقہ کا' دوسری پر عمارت کا نقشہ اور تیسری پر ایک زمین دوز راستہ کا خاکہ تھا میں اسی کے متعلق آپ سب حضرات کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں' اس زمین دوز راستہ کا ایک دہانہ بیرونی فصیل

کی پبلک لائبریری میں کسی جگہ ہی اور دوسرا اس کمرہ میں جہاں ہم سب اس وقت بیٹھے ہوئے ہیں ...... ہاں تو وہ کتاب یہاں سے غائب ہی! ...... اب کہئے"

خدا کی قسم! نواب صاحب سچ کہئے گا" کامران مرزا نے کہا "یہ تو بُرا ہوا! مگر صرف اتنی سی بات پر انسپکٹر شاہد حسین کی طلبی کچھ گلے نہیں اُترتی"

"بیشک .... مگر اسی پر اکتفا نہیں۔ میرے بیان کردہ واقعہ کے علاوہ اگر ایک بات اور نہ ظاہر ہوتی تو میں انسپکٹر شاہد حسین کو کبھی طلب نہ کرتا۔ اسی کتاب کی ایک دوسری نقل پبلک لائبریری واقع حیدر منزل میں تھی۔ ان دونوں کی تحریریں زمین دوز راستہ کے متعلق چند جزوی اختلاف تھے۔ مثلاً ایک حصہ کا خاکہ' نشان پیمائش۔ کچھ ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریریں۔ سیاہی کے مٹے ہوئے نشانات وخطوط وغیرہ مجھے یہ تمام حالات معلوم تھے اور میں جانتا تھا کہ زمین دوز کا حل ان دونوں کتابوں کے نقشہ جات کو باہم مطابق کرنے سے معلوم ہو سکتا ہی۔ چنانچہ جس روز میرے یہاں سے کتاب غائب ہوئی ہی اس کے دوسرے روز لائبریری میں کسی شخص نے وہاں کی کتاب پڑھنے کے لئے طلب کی اور بلا کسی نام ونشان کے اُسے ساتھ لیکر چلتا بنا! گویا صریح چوری کی!"

اس پر سب نے تائید کی۔ کامران مرزا کہنے لگا" ہاں اب تو معاملہ کچھ سنجیدگی اختیار کرتا جاتا ہے"

نواب خاقان صاحب نے فوراً جواب دیا "جی ہاں اس کے بعد پولیس کو اطلاع دیکر باضابطہ تفتیش کرائی گئی مگر اس کا نتیجہ کچھ نہ نکلا"

"جس طرح کہ بہرام کی ہر کارروائی کی تفتیش میں ہوا کرتا ہو"!

"جی ہاں۔ صحیح فرمایا اس کے بعد ہی مجھے خیال آیا کہ اگر اس میں شاہد حسین کی امداد لی جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ میں نے اُسے لکھا تو جواب آیا کہ بہرام کے مقابلہ پر آنے سے زیادہ مسرت اُسے کسی بات میں نہیں ہوتی"

"واللہ بہرام کی کیا عزت افزائی ہی! کامران مرزا نے کہا" لیکن اگر بقول جناب کے ہمارا یہ نیک نہاد چور حیدر منزل کے متعلق کوئی ترکیب نہیں سوچ رہا ہی تو انسپکٹر شاہد حسین کی آمد فضول ہی ہو گی اور خواہ مخواہ مکھیاں مار کر چلا جائے گا!"

"یہ نہ سہی پھر بھی ایک ایسا قصہ موجود ہی جو اس کے لئے باعث دلچسپی ہو۔ یعنی زمین دوز راستہ کا حل۔

"کیوں جناب آپ نے ابھی فرمایا تھا کہ اس کا ایک دہانہ بیرونی فصیل میں کسی جگہ ہی اور ایک یہاں ہی"

"ہاں مگر اس جگہ کے کس حصہ میں؟ وہ سطر جو زمین دوز راستہ کا نشان بتلاتی ہے یک بیک ایک گوشہ کے قریب آکر ختم ہو جاتی ہی۔ جہاں ایک دائرہ میں حروف "م ع" تحریر ہیں جس کا یہی مطلب "منارہ غلامان" ہے۔ مگر یہ مدور مینار بیرونی مسجد کا ہی یا معبد کا؟ یہ کون کہہ سکتا ہی

وہ اذیں لکیر مینار کے کس حصے کی طرف اشارہ کرتی ہے اور کس جگہ ختم ہوتی ہے؟" نواب صاحب نے پیچوان کا ایک کش لگا کر پانی طلب کیا لوگوں نے سوالات کی بھرمار شروع کر دی نواب صاحب اس خیال سے خوش ہو رہے تھے کہ اُن کی باتوں نے لوگوں میں ایسی دلچسپی پیدا کر دی ہے۔ آخرکار فرمانے لگے،

"افسوس! یہ راز ہمیشہ کے لئے ہاتھ سے جاتا رہا۔ اب کوئی بھی اس سے واقف نہیں۔ روایت یہ ہے کہ اس راز کو حکمران نوابانِ اودھ یکے بعد دیگرے منتقل کرتے رہے اور ہر ایک نے بستر مرگ پر اس کو اپنے جانشین پر ظاہر کر دیا۔ یہاں تک کہ حضور پُرنور جانِ عالم مرزا واجد علی شاہ نے اس کو اپنے لختِ جگر شہزادہ برجیس قدر کے سپرد کر دیا۔ مگر افسوس کہ شہزادہ موصوف اس کے بعد ہی ایسے لاپتہ ہوئے کہ آج تک اُن کا علم کسی کو نہیں۔"

"جناب والا! اس کو تو تقریباً پچاس سال کا عرصہ ہوتا ہے کیا اتنے زمانے تک کسی نے اس پر توجہ نہیں کی؟"

"کوشش تو بہتوں نے کی مگر لاحاصل۔ خود میری دادی جان نے جب "دبیریہ منزل" کو نواب احتشام الدولہ صاحب سے خرید کیا ہے تو اس راز کو حل کرنے کی بھی کوشش کی تھی پھر میں نے خود اسی سلسلہ میں چند مقامات کھدوائے مگر بیکار۔ یہ آپ سب حضرات کو معلوم ہے کہ اس مینارہ کے چاروں طرف خندق ہے جس میں پانی بھرا رہتا ہے اور یہاں جانے کے لئے بالائی منزل اور صحن مکان سے آہنی پل بنے ہوئے ہیں اس سے ظاہر ہے کہ زمین دوز راستہ خندق کی گہرائی سے بھی نیچے ہے۔ کتابوں کے نقشہ میں چار زینوں کا نشان ہے جس میں ہر ایک زینہ ۸۰ سیڑھیوں کا ہے اس کی لمبائی ۱ گز کے حساب سے سمجھ لیجئے۔ دوسرے نقشوں میں جو حساب پیمائش دیا ہے اس کا کل مجموعہ دوسو گز کے قریب آتا ہے غرض کہ ہر ایک حل اسی فرش، اسی چھت اور ان ہی آہنی دیواروں میں مضمر ہے۔ مگر یہ یقین رکھئے کہ محض اس کے لئے میں اس کو منہدم کرانا گوارا نہیں کر سکتا۔"

"بس اس کے سوا کوئی اشارہ نہیں؟"

"کوئی نہیں"

اتنے میں مجتہد صاحب بولے "نواب خاقان صاحب دیکھئے۔ ہمارے پیش نظر دو نقشے ہیں۔"

"آہا ......!" نواب صاحب نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "ہمارے قبلہ محترم خاندانی کاغذات پڑھنے میں بڑے فرد ہیں کتب تاریخ و سیر کا بھی بیحد شوق ہے خصوصاً دبیریہ منزل کے راز سے جو دلچسپی آپ کو ہے اس کا اظہار ہی لاحاصل ہے۔ مگر جس امر کی طرف وہ اس وقت اشارہ کر رہے ہیں اس سے حل کی پیچیدگی اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔"

"آخر معلوم تو ہو کہ ہے کیا بات؟"

"تو کیا آپ لوگ سننا چاہتے ہیں۔"

"کیوں نہیں ...... ضرور۔"

"تو سنیئے۔ قبلہ محترم نے بغور مطالعہ کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ شاہان اودھ میں سے دو بادشاہ ایسے تھے جن کو اس راستے کے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔"

"یعنی کون سے ؟"

"حضور نواب آصف الدولہ خلد مکانی اور اعلیٰ قدر شاہ غازی الدین حیدر آنجہانی۔"

"گویا اپنے زمانے کے دونوں کیتا۔ مگر مجتہد صاحب قبلہ کو اس کا علم کیوں کر ہوا ؟"

"اوہ - یہ کوئی خاص بات نہیں۔" نواب خاقان نے زور دے کر فرمایا۔ "زمانہ قحط سالی میں ایک مرتبہ حضور آصف الدولہ کو ایک شب دبیر یہ منزل میں بسر کرنے کا اتفاق ہوا۔ اور اس موقعہ پر دبیر یہ منزل کے مالک نواب ذوالفقار علی صاحب نے اعلیٰ حضرت کو اس راز سے آگاہ کیا۔ بعد ازاں حضور ممدوح نے یہ راز اپنے معتمد وزیر پر ظاہر کر دیا جس نے اپنی کتاب "اسرار لکھنؤ" غیر مطبوعہ میں اس واقعہ کو مشرح بیان کیا ہے اور راز کو بلا کسی تشریح کے صرف ایک مہمل و بے معنی فقرہ لکھ کر ختم کر دیا ہے۔ وہ فقرہ بھی ملاحظہ ہو:۔

"لاتقلب ولاتحرف: نگاہ دار ابجد۔ وہ شمس آمیختہ دہ دارسی ......"

سب خاموش ہو گئے۔ کامران مرزا نے تالی دے کر کہا۔ "بھئی واہ فقرہ کیا ہے۔ عربی، فارسی، عبرانی و ترکی کا مجموعہ مرکب ہے!"

"جی اور کیا۔"

"لیکن کیا اس کا مطلب صاف نہیں ہو سکتا۔"

"میرا خود بھی یہ خیال ہے کہ کتاب کے مصنف نے اس معمہ کو ان بے معنی الفاظ میں حل کر دیا ہے تاکہ کاتب کتاب اس راز سے آگاہ نہ ہونے پائے۔"

"واللہ۔ کیا اچھوتی ترکیب سوچی ہے!"

"یہ سچ ہے لیکن اب کوئی اس کا مطلب تو سمجھے۔ معلوم تو ہو کہ اس میں کیا مخفی ہے؟"

"خیر یہ تو بتلائیے۔ شاہ غازی الدین حیدر آنجہانی یہاں کیوں تشریف لائے تھے؟" کامران مرزا نے سوال کیا۔

"حضور ممدوح بھی ۱۸۲۲ء میں ایک مرتبہ اس مقام میں تشریف لائے تھے۔ اس کے بہت عرصہ بعد ایک آہنی محفوظ تجوری کو کھلوایا گیا تو اس میں حضور پر نور کے دست مبارک کا لکھا ہوا ایک پرچہ کاغذ ملا جس میں یہ تحریر تھا:۔

دبیر یہ منزل ...... ۲ ...... ۵ ...... ۱۰

کامران مرزا نے زور کا قہقہہ لگایا۔

"بس کامیابی ہو گئی۔ معمہ حل ہو گیا۔ ارے میاں دو کو پانچ سے جوڑو یا دو کو ۵ سے ضرب دو۔ ۱۰ ہو گئے۔"

"اجی حضرت جتنا چاہے ہنس لیجیے۔ مگر واضح رہے۔ ان ہی دو تحریروں میں اس راز کا حل ہے۔ اور مجھ ایسے نہیں۔ کل تک کوئی نہ کوئی آ ہی جائے گا جو اس کو حل کرنے کا اہل ہو۔ مجتہد صاحب نے فرمایا۔

"سب سے پہلے انسپکٹر شاہد حسین!" نواب خاقان نے کہا۔

"بشرطیکہ اس سے پہلے میاں بہرام نظر عنایت نہ کریں۔

"کیوں بھائی کامران مرزا! تمھارا کیا خیال ہے؟"

کامران مرزا اپنی جگہ سے اٹھا اور نواب خاقان صاحب کے بازو پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا "میں یہ عرض کروں گا کہ آپ کی کتاب اور پبلک لائبریری کی کتاب دئیے نشانات میں جو خاص بات کم تھی وہ اس وقت ظاہر ہو گئی۔ واللہ میں آپ کا بیحد ممنون ہوں۔

"اجی اور کیا۔ بس معاملہ حل ہونے کو ہی ہے۔ ۲ کو ۲ سے ضرب دیا ہو گئے وس اب دیر اتنی ہے کہ میں اس طرف توجہ شروع کر دوں۔"

"ضرور۔ ایک منٹ ضائع کئے بغیر۔"

"اجی حضرت۔ ایک سکنڈ کہئے۔ آپ سمجھتے ہیں کہ میری مہم کل کو آج ہی کی رات میں آپ کے مکان کو لوٹنا ہے۔ اگر کل شاہد حسین آگیا تو پھر کیا لطف ہوگا!"

"نواب خاقان اس مذاق سے بہت خوش ہوئے، کہنے لگے! "ٹھیک کہتے ہو۔ بہرحال ابھی وقت کافی ہے۔ مگر آپ ذرا میرے ساتھ چلیں۔ ذرا آغا میر کی ڈیوڑھی تک۔"

"یہ کیوں خیریت تو ہے؟"

"ہاں میرے دوست نواب یعقوب علی بیگ معہ اپنی بیگم صاحبہ اور ایک نوجوان انگریزی خاتون کے بارہ بجے والی چھوٹی لائن سے آنے والے ہیں۔ اُن کو اسٹیشن پر لینے کے لئے جانا لازمی ہے۔" اس کے بعد نواب خاقان صاحب نے دیگر مدعو احباب کی طرف مڑ کر کہا۔

"حضرات! اب ہم کل پھر انشاءاللہ اسی جگہ جمع ہوں گے اُمید ہے کہ آپ مکرر تکلیف فرما کر مجھے شکریہ کا موقع دیں گے"

سب نے اس دعوت کو قبول کر لیا۔ اور یکے بعد دیگرے رخصت ہو گئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک اعلیٰ موٹر پر نواب خاقان اور کامران مرزا بھی سوار ہو کر آغا میر کی ڈیوڑھی کی طرف روانہ ہوئے۔ راستہ میں کامران مرزا کو امین آباد میں اُتار کر خود اسٹیشن پر پہونچے۔ بارہ بجے کی گاڑی سے نواب یعقوب علی بیگ معہ ہمراہیوں کے تشریف لے آئے اور وہاں سے نواب خاقان صاحب کی معیت میں ساڑھے بارہ بجے دبیر بہ منزل پہونچے۔ ایک بجے رات کو کچھ تھوڑا سا کھانا کھا کر ہر ایک آرام کرنے کی نیت سے لیٹ رہا۔ روشنی گل کر دی گئی اور گہری خاموشی نے دبیر بہ منزل کو بھی اپنی آغوش میں لے کر سلا دیا۔۔۔۔۔

(٢)

ماہتاب سیاہ بادلوں کی نقاب سرکا کر دو کھڑکیوں کی راستے وبیریہ منزل کے بڑے کمرہ کو اپنی ضیا ریز جلوہ ریز کا مرکز بنا رہا تھا۔ مگر یہ عارضی صورت صرف لمحہ بھر قایم رہی۔ اس کے بعد وہ یکایک بادلوں کی اوٹ میں روپوش ہوکر دنیا کو ماتمی لباس میں چھوڑ گیا۔ جوں جوں رات کی خاموشی بڑھتی۔ تاریکی مہیب ہوجاتی۔ گاہے گاہے گھر کے سامانِ آرائش کی کھڑکھڑاہٹ یا اندرونی خندق کے پانی کی سرسراہٹ ضرور مخل ہوتی۔ اسی کیفیت میں رات کے دو بج گئے۔ پھر گھڑی نے اپنی ہم آہنگ رفتار سے چلنا شروع کیا .... اور لیجئے تین بھی بج گئے۔

کہ یکایک ایسے کھٹکے کی آواز آئی جس طرح کسی زرین کی آمد پر سنگل کے گرنے کی آواز ہوتی ہے اور معاً روشنی کی ایک پتلی لکیر بڑے کمرہ کے ایک سرے سے ایک گوشہ پر اس طرح نمودار ہوئی جس طرح کوئی تیر کمان سے نکل کر اپنے راستہ کو منجمد بناتا چلا جائے یہ روشنی اس چھید کے سے نکل رہی تھی جس سے وابستہ دہنی طرف کتابوں کی الماری رکھی تھی اولاً یہ سامنے والے شیشہ پر خیرہ کن دائرہ کی صورت میں دکھائی دی اس کے بعد تاریکی میں ڈھونڈنے والی نگراں نظروں کی طرح اس روشنی نے ہر سمت کا جائزہ لیا اور پھر ایک دم غائب ہوگئی کہ اتنے میں کتابوں کی الماری کا ایک پٹ آہستہ سے کھلا اور ایک محرابی دراز پیدا ہوئی اور پھر ایک مرتبہ روشنی چمکی

ایک شخص ہاتھ میں برقی لیمپ لئے ہوئے کمرہ میں داخل ہوا۔ اس کے بعد دوسرا۔ پھر تیسرا جن کے ہاتھوں میں رسی اور کھدائی کے دیگر آلات تھے پہلے شخص نے پھر کمرہ میں نگاہ دوڑائی۔ کان لگا کر سنا اور کہنے لگا "آدمیوں کو بلاؤ۔ ہٹے کٹے آدمی زمین دوز راستہ سے اندر داخل ہوئے اور کمرہ کے سامان کے ہٹانے کی کارروائی شروع ہوگئی۔ اس میں زیادہ عرصہ نہیں لگا۔ بہرام ہر ایک چیز کو بغور دیکھتا اور اس کی جسامت یا فنی خصوصیات کو دیکھ کر حکم دیتا۔ "یہ جا تو جائے گی"۔ چنانچہ اسی طرح ہر ایک چیز اٹھا کر زمین دوز راستہ کے دہانے سے شکم زمین میں پہونچا دی گئی۔ چہ شانشین متعدد آرام کرسیاں، مخملی صوفے، قالین، قیمتی جھاڑ فانوس بیش قیمت قمقمے، خوبصورت مجسمے غرضیکہ ہر قیمتی و نادر چیز دہانہ سرنگ میں پہنچ گئی! متعدد بار ایسا ہوا کہ بہرام کسی بھاری میز یا بڑی تصویر کے سامنے کھڑے ہوکر ایک آہ سرد کھینچتا اور کہتا،

"افسوس یہ بہت بھاری ہے۔ یہ جا نہیں سکتی" اور پھر دوسری چیز کو دیکھنے لگتا۔

صرف چالیس منٹ میں کمرہ کا صفایا ہوگیا اور یہ تمام کارروائی اس خوبصورتی سے عمل میں لائی گئی کہ نہ کسی قسم کا دھماکا ہوا اور نہ کوئی کھٹکا۔ تمام چیزوں کو بہ احتیاط کپڑوں میں لپیٹ دیا گیا۔ جب آخری آدمی بھی دہانہ میں اتر چکا تو بہرام نے کہا؛

"دیکھو تمہارے واپس آنے کی حاجت نہیں۔ خوب سمجھ لو جس وقت موٹر سامان سے بھر جائے تو تم لوگ سیدھے سکندرآباد پہنچ کر جانا اور وہیں کی عمارت میں یہ سامان رکھ دینا۔ جس کا پتہ بتا دیا گیا ہے۔"

"اور حضور کب تک......؟"

"میری فکر نہ کرو میں موٹر سائیکل پر آجاؤں گا۔"

جب یہ آدمی بھی چلا گیا تو بہرام نے کتابوں کی الماری کے متحرک حصے کو اس کی اصلی جگہ پر درست کیا۔ چیزوں کے اٹھائے جانے اور قدموں کے نشانات مٹا دیئے اور ایک دروازہ کا پردہ وہ اس حصہ پر پہونچا جو مینارہ سے دوسری منزل میں آنے کا ذریعہ تھا۔ اس جگہ شیشہ کی ایک بڑی الماری رکھی ہوئی تھی۔ اور یہی وہ چیز تھی جس کے لئے بہرام نے اس وقت تک اپنی تلاش کو جاری رکھا تھا۔ اس میں نہایت بیش قیمت نادرات تھے۔ نادر رنگدار انگوٹھیاں قیمتی جواہرات، ہاتھی دانت کی بہترین چیزیں بھری پڑی تھیں۔ اس نے قفل کھولا چیزیں نکال کر باہر رکھیں۔ چار پانچ عمدہ انگوٹھیوں کو پہن کر خوب ہنسا۔ اور گلے میں لٹکے ہوئے تھیلے میں ان کو احتیاط سے بھرا جب وہ بھر گیا تو اپنی جیبوں کو پُر کیا۔ اس کے بعد وہ سچے موتیوں کے ڈھیر سے اپنی دونوں مٹھیاں پُر کرنا چاہتا تھا کہ یکایک اس کے کانوں میں کچھ آواز آئی۔ اُس نے کان لگا کر سُنا۔ معلوم ہوا کہ دھوکہ نہیں ہوا آواز صاف سُنائی دے رہی تھی۔

اب اُسے یاد آیا کہ گیلری کے خاتمہ پر اندرونی زینہ نچلی منزل کے ایک کمرہ میں ختم ہوتا تھا۔ شام تک یہ کمرہ خالی تھا مگر رات ہی میں اُس کو نواب یعقوب علی بیگ کی ہمراہی انگریزی خاتون کے لئے آراستہ کیا گیا تھا۔ بس یہی بات تھی۔ بجلی کی طرح تیزی سے اس نے اپنے برقی لیمپ کو بٹن دبا کر گل کیا اور جلدی سے دریچہ کے خالی حصہ میں چھپ کر پردہ تان لیا ادھر زینہ کا دروازہ کھلا اور دھندلی سی روشنی گیلری میں دکھائی دی وہ چونکہ پردہ کی آڑ میں چھپا ہوا تھا اس لئے آنے والے کی کسی حرکت کو نہ دیکھ سکتا تھا، اس نے خیال کیا، شاید وہ زینہ سے نیچے اتر رہا ہو اور اب آگے نہ بڑھے۔ مگر نہیں۔ آنے والے کے قدموں کی چاپ نزدیک تر آتی گئی اور چند قدم چل کر ایک ہلکی سی چیخ سُنائی دی۔

یہ کیوں؟ .... اُس نے شاید ٹوٹی الماری اور اس کے تقریباً ½ حصہ کی صفائی دیکھ لی۔ چیخ سے معلوم ہو گیا کہ آنے والا شخص عورت تھی۔ اُس کا لباس اس پردہ سے مَس ہو رہا تھا جہاں بہرام چُھپا ہوا دبکا بیٹھا تھا۔ اُف! موقعہ کی نزاکت کتنی اہم تھی! صرف پردہ کی آڑ تھی۔ اس طرف بہرام۔ دوسری طرف نامعلوم دشمن! بہرام اس کے دل کی حرکت تک محسوس کر رہا تھا۔ تو کوئی وجہ نہ تھی کہ اُس کے دشمن کو اپنے قریب کسی ہستی کی موجودگی کا احساس ہو تاہم بہرام نے دل ہی دل میں کہا: "معلوم ہوتا ہے ڈر گئی اب وہ واپس چلی جائے گی۔ یہ خوب ہوا۔ اسے مجبوراً

واپس جانا پڑے گا۔ مگر وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلی۔
روشنی تیز کر کے اُس نے مُنہ موڑا۔ ایک لحظہ توقف کیا۔ کان
لگا کر عجیب خاموشی کا اندازہ کیا اور کسی غیر اختیاری حرکت کے
زیر اثر پردہ کھول دیا.........!

دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں......!

بہرام نے سر کھجلا کر کہا "آف! ...... اخاہ.....
تم کون؟......... ارے تم مس جولیا انڈر ڈاؤن...!
یہ وہی مس جولیا تھی جس کی جاں ستاں اداؤں نے بہرام کو
ایک بار حواس سے خارج کر دیا تھا! اس سے بہرام کی
ملاقات جہاز "پروین" پر رنگون جاتے ہوئے ہوئی تھی۔
اور اس سے جدا ہونے پر اکثر اس کی یاد بہرام کو ستایا
کرتی تھی۔ اب دبیر یہ منزل میں رات کو ایسے بے وقت یہ ملاقات
اس قدر اچانک، اتفاقیہ اور غیر متوقع تھی کہ دونوں محو حیرت
رہ گئے۔ نہ اپنی جگہ سے ہلے۔ نہ زبان سے کوئی لفظ نکلا
اور جس طرح مسمریزم کے اثر سے کوئی شخص کسی کی روح کو
دیکھ کر غرق محویت ہو جاتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے
کی شکل دیکھ کر مبہوت تھے۔ بہرام نے ندامت کے زیر اثر
ایک فقرہ کو اٹک اٹک کر ادا کیا۔ مگر اس کے بعد اس کی
زبان بھی بند ہوگئی!

جولیا وفور اضطراب کی تاب نہ لا کر پاس ہی ایک کرسی
پر گر پڑی۔ بہرام اس کی آنکھوں کے سامنے کھڑا تھا۔ بتدریج
وقت گزرنے کے ساتھ ہی اُسے خیال آیا کہ اس کی یہ حالت،
کہ نادرات سے جیبیں پُر، تھیلا اتنا ٹھسا ہوا کہ معلوم ہوتا ہے
کہیں پھٹ نہ جائے۔ دونوں ہاتھ اس میں پھنسے ہوئے۔ اس
حسین نازنین کے دل میں کیا اثرات پیدا کر رہی ہوگی؟ احساس
ندامت نے اس پر غلبہ کیا اور وہ رہزنوں کی طرح عین چوری
کی حالت میں پکڑے جانے سے بے حد شرمندہ ہوا۔ نازنین کا دل
خواہ کچھ سمجھے۔ مگر وہ یقیناً ایک چور، گرہ کٹ، اٹھائی گیرا،
نقب زن، دوسروں کا مال سینہ زوری سے اڑانے والا مشہور
شخص تھا نہ کہ عین حالت سرقہ میں پکڑا جانا۔ بہرام کے لئے
بلا کا صدمہ تھا۔ ایک گھڑی ہاتھ سے گری، اور اس کے بعد
دوسری بھی آرہی! غرضیکہ اس کی بغل اور ہاتھوں سے بہت
سی چیزیں بے اختیارانہ نیچے گرتی گئیں۔ اس کے ہاتھ اس کے
قابو میں نہ تھے۔ یکایک کسی خیال کے آتے ہی۔ اُس نے
مال غنیمت کا ایک حصہ نکال کر کرسی پر رکھ دیا۔ جیبوں کو بالکل
خالی کر دیا اور گلے سے جھولا اتار کر ایک طرف رکھا۔ اب اس
کا دل اس قابل ہوا کہ حسینہ سے آنکھ ملا کر گفتگو کر سکے۔ اُس نے
بات کرنے کے لئے بڑھنا چاہا مگر خاتون نے بے کس انداز سے پرے
رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ جلدی سے اُٹھی اور دوڑ کر مینارۂ غلاباں
کی طرف بھاگی۔ بہرام پیچھے پیچھے تھا۔ وہ وہاں جا کر کھڑی ہو گئی
بدن کانپ رہا تھا۔ زبان کو یارائے گفتگو نہ تھا۔ آنکھیں کمرہ کی
تباہ حالت کا مشاہدہ کر رہی تھیں۔ بلا کسی تامل کے بہرام کی

زبان سے نکلا۔ "نازنین آفرین حسینہ! کل تین بجے دن کو ہر چیز اپنی جگہ واپس آجائے گی۔ یعنی یہ تمام چیزیں واپس لوٹا دی جائیں گی۔"

خاتون نے کوئی جواب نہ دیا۔ مگر بہرام نے مکرر اعادہ کیا۔ "کل تین بجے دن کو۔ میں قسم کھا کر یقین دلاتا ہوں دنیا کی کوئی طاقت مجھے اپنے ایفائے وعدہ سے باز نہیں رکھ سکتی ...... بس کل تین بجے دن تک! ......"

مہیب خاموشی دونوں پر محیط ہوگئی۔ حسینہ کا اضطراب بہرام کو اس درجہ گراں ہو رہا تھا کہ وہ خود اس مہر خاموشی کو توڑنے کی جرأت نہ کرسکتا تھا۔ چنانچہ زبان سے اور کوئی لفظ کہے بغیر وہ آہستگی کے ساتھ وہاں سے مڑا اور دل میں کہنے لگا "اب اس کو سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ اب ہر طرح آزاد ہے۔ یہ آخر مجھ سے کیوں ڈر رہی ہے؟ مجھ سے تو اسے کسی قسم کا خوف ہونا ہی نہ چاہیئے۔

مگر یکایک حسینہ چونکی، اور رک رک کر اس کی زبان سے نکلا۔ "ذرا سننا! ...... قدموں کی آواز! ...... کیا کوئی آرہا ہے؟"

بہرام نے اس پر حیرت بھری نگاہ ڈالی۔ گویا وہ کسی آنے والے خطرہ سے اُسے بچانے کی متمنی تھی۔ کہنے لگا۔

"مجھے تو کچھ سنائی نہیں دیتا ...... اگر ہو بھی تو ......"

"اچھا تم کو ... چاہیئے ...... جلدی کرو ... نکل جاؤ ...... کہیں ......"

"بھاگ جاؤں ...... آخر کیوں؟ ......"

ضرورت اسی کی بڑی لازم ہے ...... آہ تم میرے دل کی حالت کیا جانو؟ .... جاؤ ٹھیرو نہیں"

وہ جھپٹ کر گیلری کے سرے پر پہنچی، کان لگا کر سنا۔ وہاں کوئی موجود نہ تھا۔ شاید یہ آواز کہیں باہر سے آئی تھی۔ یا ممکن ہے محض واہمہ کا دھوکا ہو۔ اُس نے ایک سکنڈ منتظر رہ کر اپنا اطمینان کیا۔ اور پھر مڑکر بہرام سے کچھ کہنے والی تھی کہ کیا دیکھتی ہے ...... بہرام جاچکا تھا!

(۳)

صبح کو یہ معلوم ہو کر کہ دبیریہ منزل کو خوب ہی اچھی طرح نشانہ غارت گری بنایا گیا ہے۔ نواب خاقان کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ یہ تھے۔ "یہ سب بہرام کا کیا دھرا ہے مجھے کامران مرزا ہی کو دیکھ کر گمان ہو گیا تھا کہ کہیں یہ دونوں ایک ہی چیز نہ ہوں"۔ بس اس کے سوا اور کونسی صورت تھی جس سے اس معاملہ پر روشنی پڑتی۔ ہر ایک بات اسی قیاس سے حاصل ہوئی تھی۔ مگر پھر ایک بار دل میں تذبذب پیدا ہوتا تھا کہ آئین آباد کا مشہور و معروف مصور کامران مرزا ہی کیا کامران مرزا نہیں؟ .... نہیں ...... وہ ان کے چچازاد بھائی نواب جاودان کا مجلسی دوست تھا۔ چنانچہ جس وقت پولیس کا ایک دستہ مع سب انسپکٹر صاحب کے موقعہ

پر پہنچا نواب خاقان کو اس کے اعتراف کی جرأت نہ ہوئی

صبح کا سارا وقت دبیریہ منزل میں یوں ہی تو تو میں میں میں گزرا
جمعدار پولیس، شہری پولیس۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب، شہر کے
لوگ، غرضیکہ ایک مجمع سا لگا ہوا تھا۔ اُس پر فوج کی آمد
اُن کی بندوقوں، سنگینوں کی جھنکار نے اس منظر پر سونے پر
سہاگے کا کام دیا۔

ابتدائی تفتیش سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ نہ کوئی کھڑکی اکھاڑی گئی تھی، نہ کوئی دروازہ توڑا گیا تھا۔ اس لئے اس میں ذرا شک نہ تھا کہ چیز کو زمیں دوز راستہ سے چرایا گیا تھا۔ مگر دیوار یا فرش پر کسی قسم کا کوئی نشان یا اور کوئی قطعی علامت نہ تھی۔ تاہم ایک غیر معمولی بات ایسی تھی جس سے ہرام کی کارروائی کا گمان ہوتا تھا یعنی کتاب "روایات دبیریہ منزل" الماری میں اپنی جگہ رکھی ہوئی تھی! اور اس سے ملی ہوئی ایک دوسری جلد تھی جو بلاشک وشبہ وہی نسخہ تھا جس کو پبلک لائبریری سے چرایا گیا تھا!

پولیس کے اعلیٰ حکام اور دیگر افسر تقریباً گیارہ بجے موقع پر پہونچے۔ نواب خاقان نے اُن کا بجندہ پیشانی استقبال کیا۔ گو انھیں اپنی نادر اشیا چوری جانے پر سخت ملال تھا تاہم اللہ نے اُن کو اتنی کافی دولت عطا کی تھی کہ وہ اس نقصان عظیم کو بآسانی برداشت کر سکتے تھے۔ نواب یعقوب علی بیگ مع انگریز اتالیقہ مس انڈرڈراؤن کے باہر کمرہ میں موجود تھے ان کا تعارف تمام حکام سے کرایا گیا۔

اب صرف ایک مہمان کی کمی رہ گئی تھی یعنی کامران مرزا .... کیا وہ نہ آئے گا! .... اگر وہ نہ آیا تو نواب خاقان کے شکوک تازہ ہو جائیں گے .... مگر نہیں عین اسی گھڑی نے بارہ بجائے کامران مرزا مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا کھٹ سے آ داخل ہوا۔ نواب خاقان کی زبان سے بیساختہ نکلا۔ "اخاہ! .... خدا کی قسم! ...... تم آہی گئے!"

"کیوں؟ .... کیوں خیر تو ...... کیا مجھے دیر ہو گئی؟"

"نہیں .... مگر ایسی مضطرب کن رات کے بعد تمھیں تو کہیں اور ہونا چاہیئے .... اللہ توبہ! میں کیا کہہ رہا ہوں! میرا مطلب تمھارے ہم شکل سے .... کچھ تم نے بھی سُنا، یا نہیں؟"

"کیا کوئی تازہ خبر .... ؟"

"یہی کہ تم نے رات کو دبیریہ منزل میں خوب غارتگری مچائی!"

"فضول لغویت نہ کیجئے، بات بتلائیے۔"

"میں سچ کہتا ہوں۔ تمھارے ہم شکل نے مجھے رات کو لوٹ لیا! .... خیر۔ اب مس انڈرڈراؤن کو ساتھ لے کر کھانے کے کمرہ میں چلئے۔ مس انڈرڈراؤن صاحبہ! اجازت دیجئے کہ میں آپ کا تعارف اپنے ایک عزیز دوست ....."

نواب صاحب یکایک رُک گئے۔ انگریزی خاتون کے چہرہ کی پریشانی نے ایک خاص اثر کیا۔ مگر یکایک انہیں کچھ یاد آگیا کہنے لگے "افاہ میں بھول گیا تھا۔ مجھے خوب معلوم ہے ایک مرتبہ آپ کو بہرام کے ساتھ کلکتہ سے رنگون تک سفر کرنے کا اتفاق ہوا ہے اور اس وقت آپ ایسی عجیب شباہت سے پریشان خاطر ہو گئیں کیوں یہی بات ہے نا؟" خاتون نے کوئی جواب نہ دیا۔ کامران مرزا سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس نے جھک کر تسلیم کی اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کھانے کے کمرہ میں لے چلا اور اس کو اپنے پہلو میں بٹھا کر خود بھی بیٹھ گیا۔

کھانے کے درمیان سوائے بہرام 'مال مسروقہ' اور انسپکٹر شاہد حسین کے اور کسی موضوع پر گفتگو نہیں ہوئی۔ جس وقت کھانا ختم ہونے لگا تو دوسرے موضوع پر بھی گفتگو چھڑی۔ اس وقت تک کامران مرزا خاموش تھا مگر اب وہ بھی شامل ہو گیا چنانچہ اس نے متانت آمیز ظرافت سے ایسی باتیں کیں کہ ہر شخص کی طبیعت خوش ہو گئی۔ اس کا حقیقی منشا انگریزی خاتون کو خوش کرنا تھا مگر جولیا اپنے خیالات میں کچھ ایسی محو تھی کہ اس نے اس کی باتوں پر چنداں توجہ نہیں کی۔ اس کے بعد صحن باغ میں چاء کی ضیافت ہوئی۔ دیر یہ منزل میں ہر طرف چہل پہل تھی۔ لوگ باغ کی روشوں پر چہل قدمی کرتے ہوئے باہم خوش گپیاں اڑا رہے تھے۔ فوجی بینڈ ہم آہنگی کے ساتھ بج رہا تھا۔ جولیا صرف بہرام کے وعدہ پر غور کر رہی تھی جس کے الفاظ یہ تھے: "تین بجے ہر چیز اپنی جگہ پر واپس آجائیگی اس کا میں حلفیہ وعدہ کرتا ہوں!"

تین بجے! .... اور اس وقت کلاک کی سوئیاں بتلا رہی ہیں کہ تین بجنے میں صرف بیس منٹ باقی ہیں باوجود ہر ممکن روک تھام کے جولیا کی نظریں بار بار گھڑی کی جانب اٹھ جاتیں اور وہ کبھی کامران مرزا کو غور سے دیکھنے لگتی جو ایک جھولے دار آرام کرسی پر بڑے مزے سے ہل رہا تھا۔

تین بجنے میں دس منٹ! .... اور اب صرف پانچ ہی رہ گئے..!

جوان خاتون کے دل میں ایسی بےچینی اور درد سا ہو رہا تھا۔ جس کی نوعیت خود اس کی سمجھ سے باہر تھی کیا کوئی معجزہ ظہور میں آنے والا تھا! .... کیا یہ تھا کہ ہر طرف لوگوں کی موجودگی میں ٹھیک تین بجے سامان آسمان سے اتر آئے گا؟ .... حتیٰ کہ تفتیش کنندگان حکام ابھی تک بہ سلسلہ تحقیقات یہیں موجود تھے کچھ سمجھ کام نہیں کرتی تھی .... مگر..... ...مگر .... بہرام حلفیہ وعدہ کر چکا تھا جو جھوٹ نہیں ہو سکتا۔

جولیا نے کہا "ہوگا وہی جو اس نے کہا ہے [illegible] مردانہ وقار، فاتحانہ انداز، حکمانہ طریق کبھی غلطی نہیں کرتا۔"

سوچتے سوچتے وہی معجزہ ایک معمولی بات معلوم ہونے لگی جو روزانہ زندگی میں پیش آیا کرتی تھی کہ یکایک کامران مرزا سے اس کی آنکھیں چار ہوگئیں۔ جولیا شرما گئی...... اور اپنا رخ پھیر لیا۔

لیجئے تین بھی بج گئے...... پہلا...... دوسرا...... تیسرا گھنٹہ بج گیا! کامران مرزا نے اپنی جیب سے بھی گھڑی نکالی اور دیکھ کر پھر رکھ لی...... یکایک باہر مجمع میں ہڑ بڑ ہوا۔ لوگ دائیں بائیں ہٹنے لگے۔ دو فوجی گاڑیاں اسباب سے بھری ہوئی باغ میں داخل ہو چکی تھیں جن میں اعلیٰ درجہ کے فوجی خچر جتے ہوئے تھے۔ یہ گاڑیاں فوجی حکام اور سپاہیوں کے لئے اشیاء خوردنی لانے کی تھیں۔ دونوں ڈیوڑھی کے برآمدہ میں کھڑی ہوگئیں۔

ایک گورے سپاہی نے اتر کر نواب خاقان کا پتہ دریافت کیا۔ نواب خاقان صاحب اسی وقت نیچے آ گئے۔ اور کیا دیکھتے ہیں کہ ان کی تمام مسروقہ تصاویر، جملہ نادرات، اسباب وغیرہ احتیاط سے کاغذوں میں لپٹے رکھے ہیں!

گورے نے سوالات کے جواب میں جیب سے ایک حکم نامہ نکال کر پیش کیا۔ جو اس کو اسی روز صبح اردلی روم سے ملا تھا۔ حکم نامہ صاف تحریر تھا کہ چوتھی بٹالین کی جماعت نمبر ۲ اپنی گاڑیاں لے کر سکندر باغ جائے اور وہاں کی ویران عمارت میں جو کچھ سامان ہو اسے لا کر ٹھیک تین بجے نواب خاقان صاحب کے پاس دبیر یہ منزل پہنچ جائے۔ اس پر کرنیل بوڈل کے دستخط تھے۔ اس کے بعد گورا کہنے لگا "جس وقت ہم لوگ وہاں پہنچے ہیں تو ہر چیز احتیاط سے گھاس پر رکھی ہوئی تھی، اور اس کی خبر گیری ایک راہرو خواہ مخواہ کر رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بات تو مجھے بھی عجیب معلوم ہوئی۔ مگر حکم نامہ واضح و صاف تھا۔ اس لئے تعمیل کرنا ضروری تھا۔

فوجی افسروں میں سے ایک نے دستخط کا معائنہ کیا اور اسے ماننا پڑا کہ نقل خوب کی تھی مگر جعلی!

فوجی بینڈ رک گیا۔ سامان اتر اتر کر اندر پہنچنے لگا۔

اس گڑبڑ میں جولیا سب سے علیحدہ ایک محراب کی آڑ میں کھڑی ہوئی، ملول و محزون، پریشان کن خیالات کا شکار بن رہی تھی کہ یکایک اس نے کامران مرزا کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ حتی الامکان اس سے بچنا چاہتی تھی۔ مگر وہ یکایک اس طرح سامنے سے آن پہنچا کہ جولیا کے لئے کوئی راہ فرار نہ رہی بانس کے ایک درخت کی پتیوں سے آفتاب کی شعاعیں چھن چھن کر اس کے بالوں پر عجیب بہار دکھا رہی تھیں۔ کہ اسے ایکدم یہ آواز سنائی دی۔ "ناز آفریں حسینہ! جو وعدہ میں نے گزشتہ رات کو کیا تھا اس میں سر مو فرق نہیں ہوا!"

آہ!...... یہ کون تھا؟...... خود بہرام! جو اس کے پہلو میں کھڑا مسکرا رہا تھا! اس نے پھر انھیں الفاظ

کا اعادہ کیا۔ "میں نے رات کو جو وعدہ کیا تھا اُسے حرف بحرف پورا کر دیا۔"

بہرام کو امید تھی کہ جولیا جواب میں شکریہ کے الفاظ کہے گی یا کسی ایسی علامت کا اظہار کرے گی جس سے اس کی خوشنودی عیاں ہو مگر .... — ..... وہ خاموش رہی۔

اس ذلت آمیز خاموشی نے بہرام کے بدن میں حرارت پیدا کر دی اور اُسے احساس ہوا کہ ایک بار صحیح حالات جاننے کے بعد وہ جولیا سے کتنی دور ہٹ جاتا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنی سحر آگیں گفتگو سے جولیا کو اپنی زندگی کی وسعت و رفعت سے آگاہ کر دے مگر الفاظ لبوں تک آکر رُک گئے اور اُسے تمام کوششیں بیکار نظر آنے لگیں۔ یکایک پُرانی یاد اور جذبۂ محبت نے اس کے دماغ میں ہیجان پیدا کیا اور اُس نے غمگین لہجہ میں کہا۔

"پیاری جولیا! گذشتہ ایام کی یاد بھی کس درجہ بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے۔ کیا تمھیں وہ ساعتیں یاد ہیں جب ہم دونوں پروین جہاز پر رنگون کا سفر کر رہے تھے؟ آہ نہیں۔ ذرا ٹھہرو۔ تمھیں یاد ہوگا کہ ایک روز تم ہاتھ میں گلاب کا پژمردہ پھول لئے ہوئے تھیں اور میں نے تم سے مانگا تھا مگر تم نے اُسے دیا نہیں۔ یا میری درخواست کو سنا ان سنا کر دیا۔ لیکن جوں ہی کہ تم اپنے کمرہ میں گئیں وہ پھول مجھے مل گیا۔ وہ غالباً تمھارے ہاتھ سے گر گیا تھا۔ مگر غور کرو وہی پھول میں نے آج تک کلیجے سے لگائے رکھا .... اور دیکھو .... یہ موجود ہے۔

جولیا نے اب بھی کوئی جواب نہ دیا معلوم ہوتا تھا وہ کچھ سُن ہی نہیں رہی ہے۔ بہرام نے سلسلۂ گفتگو جاری ہی رکھا۔

"خدارا! اُن خوش گوار ساعتوں کی خاطر۔ جو کچھ تمھیں اب معلوم ہوا ہے اسے بھلا دو۔ ایام گزشتہ کو پھر ایک بار حال میں شامل کر دو۔ ذرا دیر کے لئے سمجھ لو کہ میں رات والا شخص نہیں، بلکہ وہ ہستی ہوں جو جہاز پروین پر تمھاری ہم سفر تھی۔ ذرا اپنی آنکھیں اوپر اُٹھا کر دیکھو۔ ذرا ہی دیر کے لئے مگر للہ اس طرح جس طرح جہاز پر تم نے ایک بار دیکھا تھا میری یہی التجا ہے۔ پیاری جولیا! کیا میں وہی نہیں جو ہمیشہ تھا؟"

یہ سنتے ہی جولیا کی آنکھیں اوپر اُٹھیں۔ بہرام پر محبت بھری نگاہیں ڈال کر جھک گئیں اور کہا:

"پیارے بہرام! افسوس دل دکھانے کا نہیں ورنہ تمھیں معلوم ہوتا کہ یہ دلِ مایوس تمھارا کتنا والہ و شیدا ہے! تم خواہ کسی صورت میں ہو دل تمھارا پرستار بن چکا مگر کیا کروں میرے اور تمھارے درمیان ایسی خلیج حائل ہے جسے نہ تم عبور کر سکتے ہو نہ میں، اس لئے تمھارے عشق کا بہتر علاج

یہ ہے کہ میں تمھاری یاد دل میں لیے ہوئے دنیا سے گذر جاؤں اور جلد یا بدیر وہی راہ اختیار کروں جو شاہزادی زربانو نے کی۔ یقین رکھو۔ دو دل تمھاری سلامتی کی ہر دم دعائیں مانگیں گے اور جب تک زندگی ہے۔ اللہ تمھاری حفاظت کرے گا۔"

بہرام کے چہرے پر حیا کی سرخی دوڑ گئی۔ اس نے جھجک کر کہا:

"عزیز از جان جولیا! بے شک تم ٹھیک کہتی ہو۔ بہرام ہمیشہ بہرام ہی رہے گا۔ دنیا اسے ایک ذلیل بدمعاش کے نام سے یاد کرتی ہے اور غالباً ہمیشہ کرے گی۔ مگر خدا علیم ہے کہ میری سرشت کتنی ارفع و اعلیٰ ہے۔ میں نے جس کام کا بیڑا اٹھایا ہے اُس کی نوعیت بنایت نیک ہے جولیا! معاف کرنا میں بھی انسان ہوں۔ پہلو میں دل رکھتا ہوں کسی وقت تمنائے محبت عود کر آتی ہے۔ حتّٰی کہ میں یہ جانتا ہوں کہ نتیجہ سوائے حسرت و ناکامی کے اور کچھ نہیں۔ میری قسمت کا لکھا یہی ہے کہ کوئی مجھ سے محبت کرے گا مگر میں اُسے اپنی آغوشِ تمنا میں نہ لے سکوں۔ مگر آہ! مقتضائے فطرت یہی ہے کہ میں مجبور ہو جاتا ہوں۔ گو میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تمھارے پاک و معصوم پہلو میں میری موجودگی بھی قابلِ نفریں ہے۔ اچھا خدا حافظ!" بہار ہو کے رہو تم بھی جس چمن میں رہو!"

جولیا محل کے اندر جارہی تھی اور بہرام کی حسرت بھری نگاہیں اُسے اوجھل ہوتے دیکھ رہی تھیں۔ چند لمحہ بعد جب جذبہ فرو ہوا تو بہرام مسکرایا اور بڑبڑا کر کہنے لگا۔

بیٹا بہرام! روتے کیوں ہو۔ اللہ کا شکر کرو۔ سوائے عشق کے تمھیں کسی معاملہ میں ناکامی نہیں ہوئی۔ چنانچہ یہاں بھی تمھارا کام ختم ہو چکا۔ اب چلنا چاہیے۔ اگر انسپکٹر شاہد حسین آگیا تو پھر مفت میں اس کی فکر کرنا پڑے گی اور یہ کامران مرزا کا روپ بھی باقی نہ رہے گا! کیوں بھرم کھلے۔ آپ ہی جھک مار کر چلا جائے گا۔ اچھا بس۔ اب رخصت ہونا ہی بہتر ہے!"

جلسہ ختم ہوتے ہی دبیریہ منزل میں بھیروں ناچنے لگا۔ تماشائی اور بے فکروں نے اپنی اپنی راہ لی۔ دروازہ پر چند سپاہیوں کے علاوہ بہت کم آدمی نظر آتے تھے بہرام نے فصیل کی طرف رُخ کیا اور ایک جگہ دیوار پر سیڑھی لگا کر نیچے اُترا۔ میدان سے ایک پگڈنڈی راستہ اختیار کر کے اسٹیشن کی طرف چل دیا۔ سات آٹھ منٹ بعد وہ سڑک آگئی۔ جو ریڈ کرسچین کالج کے درمیان ہوتی ہوئی رفاہ عام کلب کے قریب بڑی شاہ راہ سے مل جاتی ہے سب جانتے ہیں کہ کالج کے بورڈنگ اور پیر جلیل کے مزار کے نیچے یہ سڑک بہت ہی نشیب میں واقع ہے اس طرف بہرام داخل ہوا اور دوسری جانب فاصلہ پر ایک دوسرا شخص دکھائی دیا۔

یہ شخص تقریباً پچاس برس کا معلوم ہوتا تھا۔ بدن کا مضبوط۔ ڈاڑھی صاف۔ صورت سے پنجابیت برس رہی تھی۔ ہاتھ میں ایک ہلکی سی چھڑی اور دوسرے میں سفری بیگ لئے ہوئے تھا۔ جب دونوں قریب سے گذرنے لگے تو اس نووارد شخص نے لکھنوی لب ولہجہ سے کوسوں دور بھدّے طریق پر کہا۔

"جناب معاف کرنا۔ کیا میں دیرہ منزل کے لئے ٹھیک راستہ پر جارہا ہوں؟"

"بالکل سیدھے چلے جائیے اور جب اس راستہ کے اختتام پر پہنچیں تو بائیں طرف گھوم جائیے گا۔ وہاں لوگ بے صبری سے آپ کا انتظار کررہے ہیں۔"

"اوہو!۔"

"جی ہاں۔ گزشتہ شب کو میرے دوست نواب خاقان صاحب نے آپ کی آمد کا حال بیان کیا تھا۔"

"اگر انھوں نے ظاہر کر دیا۔ تو سخت غلطی کی۔"

"اور مجھے اس پر مسرت ہے۔ کہ آپ کو خوش آمدید کہنے والا پہلا شخص میں ہوں۔ انسپکٹر شاہد حسین کا دلی تپاک سے خیر مقدم کرنے والا مجھ سے بڑھ کر اور کوئی نہیں۔"

بہرام کے لہجہ میں کچھ ایسا طنز آمیز پہلو تھا۔ کہ بعد ازاں اُسے خود بھی افسوس ہوا۔ شاہد حسین نے اس کا سر سے پیر تک ایسی تیز و تند نظروں سے جائزہ لیا کہ بہرام کو احساس ہونے لگا۔ کہ وہ ان نظروں کے سامنے اپنی کشش و گرفت میں آگیا جس طرح تصویر کھنچاتے وقت فوٹوگرا کے سامنے بننا پڑتا ہے۔ دل ہی دل میں ہنس کر کہنے لگا "جائزہ تو ہو چکا۔ جب میرا اور اس کا مذاق شروع ہو جائے تو پھر بھلا میں اپنے کو کس طرح چھپا سکتا ہوں۔ اب سوال یہ ہے کہ اس نے بھی مجھے پہچانا یا نہیں۔"

دونوں نے خم ہو کر مصافحہ کیا۔ کہ یکایک سڑک پر گھوڑوں کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ یہ آرم پولیس کے سوار تھے۔ دونوں بچنے کے لئے ہر دو جانب سڑک کے نشیب میں گر پڑے۔ سوار تیزی سے گزر گئے۔ چونکہ دونوں سڑک کے اس طرف اس طرف ہو گئے تھے۔ بہرام نے دل میں کہا۔ "خدا معلوم اس کمبخت نے مجھے پہچانا بھی یا نہیں۔ اگر پہچان لیا ہے تو اس موقعہ سے فائدہ نہ اٹھانا چہ معنی دارد۔ واللہ یہ تکلیف دہ ہے۔"

جب آخری سوار بھی گذر گیا۔ تو انسپکٹر شاہد حسین نے اٹھ کر کپڑوں سے گرد صاف کی۔ اور سواروں کو اس بے احتیاطی سے گھوڑے دوڑانے پر گالیاں دینے لگا۔ اس کا سفری بیگ کانٹوں میں گر کر پھنس گیا تھا۔ بہرام نے فوراً اسے نکالنا شروع کیا پھر دونوں کی نگاہیں ایک دوسرے سے ملیں۔ اُف کس بلا کی نظریں تھیں اگر اس وقت کوئی شخص دیکھنے والا ہوتا۔ تو یہ عارضی نظارہ عمر بھر فراموش

نہ ہوتا۔ کہ وہ ہستیاں جو اپنی اپنی نوعیت میں فوق الفطرت ایک دوسرے کے خلاف پوری سطح۔ عدیم النظیر کارناموں میں لازوال شہرت رکھنے والی ایسے اچانک اور غیر متوقع طریق پر ایک دوسرے سے مدمقابل ہوجائیں۔ معاذاللہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ فطرت کے دو زبردست عناصر اپنی اپنی قوت سے باہم ایک دوسرے پر حملہ کرنے کی تیاری میں مصروف ہوں کہ بھلے پنجابی دوست نے کہا" میں آپ کا واقعی بہت ممنون ہوں۔"

"اجی حضرت۔ آپ کیوں مجھے کانٹوں میں گھسیٹتے ہیں میں تو خادم ہی ہوں" بہرام نے جواب دیا۔

"عنایت، مہربانی۔ بندہ نوازی۔"

"آداب بجالاتا ہوں۔"

"تسلیم"

دونوں نے منہ پھیر کر اپنی اپنی راہ اختیار کی۔ بہرام اسٹیشن کی طرف اور شاہد حسین۔ دبیریہ منزل کی طرف چل دیا۔

---

(۴)

سپرنٹنڈنٹ پولیس۔ کوتوال صاحب اور افسران تفتیش کنندہ عرصہ تک بے سود تحقیقات کرنے کے بعد رخصت ہوگئے تاہم کچھ حضرات انسپکٹر شاہد حسین کے انتظار میں چشم براہ تھے اور اس کی عدیم النظیر شہرت کو مدنظر رکھ کر ان کا اشتیاق بیتابی کی صورت میں تبدیل ہو رہا تھا مگر جس وقت وہ آگیا تو ان سب کو اس کے سادہ پن کے مشاہدہ سے سخت حیرت ہوئی۔ انھوں نے اس کی شکل وصورت کے متعلق جو جو منصوبے سوچے تھے وہ ان سے قطعی مختلف نکلا۔ نہ اس میں کوئی فوق الفطرت بات تھی نہ انسپکٹر شاہد حسین کے کارناموں سے موازنہ کرتے ہوئے اس میں کوئی پیچیدہ، ناقابل فہم اور شیطانی کیفیت پائی جاتی تھی۔ بہرحال نواب خاقان صاحب نے دلی تپاک سے خیر مقدم کیا۔ اور فرمایا "آخر کار آپ تشریف لے آئے۔ واللہ مجھے بیحد مسرت ہے میں کب سے یہ امید کر رہا تھا کہ .... خیر جو کچھ ہوا۔ اس سے مجھے اس لئے خوشی ہے کہ کم ازکم آپ سے تو شرف ملاقات کا موقعہ مل گیا۔ اچھا یہ تو بتلائیے۔ آپ پہونچے کس وقت ؟"

"ابھی چھوٹی لائن کی گاڑی سے۔"

"افسوس میں نے موٹر چہار باغ روانہ کیا تھا اور کہہ دیا تھا کہ وہاں دیکھ کر آغا میر کی ڈیوڑھی جائے۔"

"خوب گویا آپ نے میری آمد علانیہ سمجھی تھی کہ میں مشہور کرتا ہوا یہاں آتا۔ حضرت۔ میرے پیشہ کے لئے ایسی باتیں ضرور ہیں اور اگر ایسا نہ کیا جائے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ جو کام کرنا ہو وہ ماشاءاللہ اور آسان ہو جائے۔ کیا خوب

نواب صاحب کو یہ طنزیہ طریقِ گفتگو ناگوار ہوا۔ تاہم تامّل
میں ٹال کر فرمانے لگے۔

"خوش قسمتی سے وہ کام جس کے لئے میں نے آپ کو
تکلیف دی تھی اور اپنی تحریر میں بہت کچھ لکھا تھا۔ امید سے زیادہ
آسان ثابت ہوا۔"

"یہ کیوں کر؟"

"یوں کہ واردات نقب رات کو ہو چکی۔"

"اگر آپ نے میری آمد کی خبر کا اعلان نہ کر دیا ہوتا تو
گزشتہ رات کو کبھی نقب زنی نہ ہوتی۔"

"تو پھر کب ہوتی۔"

"کل یا کسی دوسرے دن۔"

"اس کے بعد۔"

"بہرام جال میں پھنس جاتا۔"

"اور میری چیزیں۔"

"یہاں سے جانے ہی نہ پاتیں۔"

"حتیٰ کہ وہ یہیں موجود ہیں۔"

"یہاں! ......"

"جی ہاں۔ آج ہی تین بجے دن کو واپس بھیجدی گئیں"

"بہرام کی معرفت۔"

جی ایک فوجی سارجنٹ کی معرفت اور فوجی
بار برداری کی گاڑیوں میں۔

انسپکٹر شاہد حسین نے کلاہ ٹھیک کر کے صافہ باندھنا شروع
کیا۔ اور اپنا سفری بیگ درست کرنے لگا۔ نواب صاحب
نے گھبرا کر پوچھا۔

"اجی حضرت۔ آپ یہ کیا کر رہے ہیں۔"

"اب میں رخصت ہوتا ہوں۔"

"کیا خوب .... یہ کیوں؟"

"آپ کی چیزیں موجود۔ بہرام جا چکا۔ اب میرے لئے
کونسا کام رہ گیا۔"

"مہربان بندہ۔ یہ آپ کیا فرماتے ہیں۔ اب بھی اصل کام
باقی ہے۔ جو بغیر آپ کے ہو نہیں سکتا۔ جو واردات گزشتہ
شب کو ہوئی۔ وہی پھر کل ہو سکتی ہے کیوں کہ ہم کو اصل حقیقت
کا علم نہیں۔ بہرام کس طرح داخل ہوا اور کیوں کر باہر نکلا۔ اور چند
گھنٹوں بعد اس نے مال مسروقہ کیوں واپس کر دیا۔ یہ باتیں
حل طلب ہیں۔"

"اخاہ۔ یہ کہئے۔ آپ کو ان باتوں کا علم نہیں۔"

راز کو حل کرنے کا خیال آتے ہی شاہد حسین کا مزاج درست
ہوا۔ اور کچھ نرمی سے کہنے لگا۔

"بہت خوب۔ تو اب اس معاملہ کی جانچ کرنی چاہئے
مگر براہ کرم اس مجمع کو کم کیجئے۔ تنہائی اچھی ہے ذرا
جلدی کیجئے۔"

اس کا اشارہ تماشائی اور بیکار کھڑے ہونے والوں

کی طرف تھا۔ نواب خاقان صاحب مفہوم سمجھ گئے اور انسپکٹر کو وہاں سے ہٹا کر غلام گردش کی طرف لے گئے۔ شاہد حسین نے گزشتہ شب کے متعلق چند سوالات پوچھے۔ مہمانوں اور دیرینہ منزل میں روزانہ آنے والوں کے حالات دریافت کئے۔ اس کے بعد وہ دونوں کتابیں دیکھیں نقشوں کا مقابلہ کیا۔ زمین دوز راستوں کے حالات سُنے اور مجتہد صاحب کے فقرات کا نواب صاحب سے اعادہ کرایا اس کے بعد پوچھنے لگے۔

"آپ یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ نے اُن نقشوں کی بابت کل ہی تذکرہ کیا تھا۔"

"بس کل ہی"

"اس سے پہلے کبھی آپ نے اس کا ذکر میاں کامران مرزا سے نہیں کیا تھا۔"

"کبھی نہیں۔"

"بہت اچھا۔ آپ اپنی موٹر تیار کرنے کا حکم دیدیں میں ایک گھنٹہ کے اندر کان پور روانہ ہو جاؤں گا۔"

"آہا۔ ایک گھنٹہ میں!"

"جب بہرام نے اس راز کو حل کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تو پھر میں کس طرح اس سے پیچھے رہ سکتا ہوں آپ نے اسے بھی اتنا ہی موقعہ دیا تھا۔"

"میں نے ..... میں نے کونسا موقعہ دیا۔"

"جی ہاں بہرام اور کامران مرزا ایک ہی چیز ہیں۔"

"آہ ..... میرا بھی یہی خیال تھا...... اخاہ .... بات تری بدمعاش لفنگے کی ....."

"جی۔ کل دس بجے رات کو آپ نے اُسے وہ واقعات بتلا دیئے جن کی وہ ہفتوں سے تلاش کر رہا تھا اور رات ہی رات میں اس نے ان واقعات کی مختلف کڑیاں ملا کر نتیجہ اخذ کیا۔ اپنے آدمیوں کو جمع کر کے آپ کا سامان چرا لیا خیر۔ میں بھی اسی طرح عجلت میں اس کو حل کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ کمرہ میں ادھر سے ادھر ٹہلنے لگا۔ کچھ سوچتا جاتا تھا یکایک ایک جگہ بیٹھ کر اُس نے ایک ٹانگ پر دوسری ٹانگ رکھی اور آنکھیں بند کر لیں۔ نواب خاقان صاحب اضطراب کے ساتھ دیکھ کر دل میں کہنے لگے۔ "یہ سوچ رہا ہے۔ یا سو گیا...." اور باہر کچھ ہدایات دینے کے لئے چلے گئے۔ جب واپس آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ انسپکٹر شاہد حسین گیلری کے زینہ کے اختتام پر دری کا معائنہ کر رہا ہے۔

"اجی حضرت۔ کیا بات ہے۔"

"ذرا یہ موم بتی کے تازہ داغ دیکھئے۔"

"میں نے دیکھ لئے یہ تو بالکل تازہ معلوم ہوتے ہیں"

"جی ہاں۔ اسی طرح کے نشانات آپ کو زینہ کے اوپر بھی نظر آئیں گے۔ اور شیشہ کی الماری کے قریب بھی جس کو کھول کر

بہرام نے نادرات نکالے اور قریب ہی کرسی پر رکھا۔"

"پھر اس سے کیا خاص بات معلوم ہوئی۔"

"جی۔کچھ نہیں۔ انھیں سب باتوں سے واضح ہوگا۔ کہ اس نے چیزیں کیوں واپس کردیں۔ مگر سوال کا یہ پہلو ایسا نہیں جس پر دماغ سوزی کی جائے۔ لازمی امر سرنگ کا سراغ لگانا ہے۔"

"تو کیا آپ کو اب بھی امید ہے۔"

"امید کیسی۔ جناب میں جانتا ہوں۔ اس عمارت سو دو تین سو گز پر کوئی شکستہ مزار یا مسجد ہے۔ فرمائیے۔ میرا خیال ٹھیک ہے۔"

"بالکل درست۔ ایک شکستہ مزار ہے۔"

"تو براہ کرم آپ اپنے موٹر ڈرائیور سے کہئے کہ اسی کے سامنے ہمارا انتظار کرے۔"

"موٹر ڈرائیور تو ابھی واپس نہیں آیا۔ خیر میں یہاں کہہ دوں گا۔ انتظام ہوجائے گا۔ ہاں۔ کیا آپ کا یہ خیال ہے کہ سرنگ اسی شکستہ مزار میں جاکر ختم ہوتی ہے۔ آخر آپ نے کن علامات سے یہ بات اخذ کی۔"

شاہد حسین نے قطع کلام کرکے کہا

"براہ مہربانی ایک لالٹین اور چھوٹی سیڑھی کا انتظام کرائیے۔"

"خوب ... کیا واقعی آپ کو ان چیزوں کی ضرورت ہے۔"

"جی ہاں۔ خیال تو یہی ہے۔ اگر ضرورت نہ ہوتی تو کہنے کی کیا ضرورت تھی۔"

نواب صاحب نے اس سخت جواب سے منہ پھیر کر نوکر کو آواز دی۔ دونوں چیزیں آگئیں۔ اس کے بعد احکامات فوجی طریق پر دئے جانے لگے۔ "کتابوں کی الماری کے پاس۔ لفظا دیگر یہ منزل کے بائیں طرف سیڑھی لگاؤ۔"

نوکروں نے حسب ہدایت سیڑھی لگادی۔ شاہد حسین نے کہنا شروع کیا۔ "ذرا بائیں طرف ..... ذرا اور ... اب داہنی جانب سرکاؤ .... بس رک جاؤ ..... اوپر چڑھو ...... بس ٹھیک ہے ..... دیکھو ..... حروف سب ٹھیک ہیں نا؟ ....."

"جی ہاں"

"اچھا اب ذرا حرف "ب" پر انگلی رکھ کر دیکھو آیا یہ نیچے کو دبتا ہے یا نہیں۔"

نواب صاحب فرطِ شوق میں خود اوپر چڑھ گئے۔" اوہو یہ تو ڈھیلا ہے اور نیچے کو سرکتا ہے۔ خدا کی قسم آپ نے یہ کیسے معلوم کیا۔"

شاہد حسین نے اس پر دھیان نہ دیکر پھر کہا" اب دیکھئے آپ کا ہاتھ حرف "ی" پر پہونچتا ہے۔ ہاں پہنچ جائے گا ذرا اس کو بھی دبائیے۔ مگر اتنی طاقت سے گویا آپ دروازہ کی چٹخنی کھول رہے ہیں۔

نواب صاحب نے حرف "ی" کو بھی دبایا اور انھیں اندر کی طرف زنجیر کھلنے کی طرح آواز سن کر سخت حیرت ہوئی۔

"بالکل ٹھیک ہے" شاہد حسین نے کہا "اب ذرا اُتر آیئے سیڑھی سرکا کر لگائیے ۔ اب حرف 'ل' کو حرکت دیجئے اگر میرا خیال صحیح ہے تو بس راز کھلا جاتا ہے"

نواب صاحب نے بہت ہی سنجیدگی سے حرف 'ل' پر انگلی رکھی ۔ اور اس کو دباتے ہی نواب صاحب چھوٹی سیڑھی سے گر کر نیچے آرہے ۔ اس لئے کہ جس جگہ زینے پر سیڑھی کا وزن تھا ۔ اتنا حصہ کھل کر کسی غار کا دہانہ نظر آنے لگا ۔ سیڑھی کا نچلا حصہ اس میں جاتا رہا ۔ یہی سرنگ کا دہانہ تھا ۔ شاہد حسین نے دوڑ کر نواب صاحب کو اٹھایا اور پوچھنے لگا ۔

"کہئے کہیں چوٹ تو نہیں آئی ۔"

"نہیں ۔ جی نہیں ۔" نواب صاحب نے کھڑے ہو کر ادھر اُدھر پونچھتے ہوئے کہا ۔

"سچ بتائیے ۔۔۔"

"واقعی مجھے چوٹ تو بالکل نہیں آئی مگر حیرت حد سے سوا ہے ۔ یہ حرکت کرنے والے حرف ۔۔۔۔۔۔ یہ دہانہ ۔۔۔"

"تعجب کی کیا بات ہے ۔ کیا یہ اس عبارت سے مطابق نہیں ۔۔۔"

"کیا مطلب؟"

"اجی جناب یہی مہمل عبارت ۔۔۔۔ دو ششی آمیختہ دہ دارسی ۔"

"میں اب بھی نہیں سمجھا ۔"

"بقاعدہ ابجد ۔ ۲ عدد 'ب' کے ۱۰ 'ی' کے اور ۳۰ 'ل' کے ۔"

"اخاہ ۔۔۔۔ یہ 'دارسی' کے معنی ۳۰ کے ہیں افسوس یہ کبھی سمجھ میں نہ آیا ۔"

"خیر افسوس نہ کیجئے ۔۔۔"

"مگر نواب غازی الدین حیدر آنجہانی کا لکھا ہوا رقعہ ۔۔۔۔۔"

"انھوں نے واقعی اس راز کو بڑی حد تک حل کر دیا تھا کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو ان کا کیا قصور ۔ حضور پُرنور نے اس یادداشت کو اس طرح ظاہر کیا ہے ۔۔۔۔ ۲ ۔ ۵ ۔ ۱۰ ۔۔۔۔ یعنی دوسرا ۔ پانچواں اور دسواں حرف دبیر یہ منزل کا ب ۔ ی ۔ ل اس کا حل ہے ۔"

"شاباش ۔ مرحبا ۔ اب میری سمجھ میں آگیا ۔ ذرا یہ دیکھئے کہ آپ اس کمرہ سے باہر نکل سکتے ہیں ۔ مگر یہاں داخلہ کی کیا صورت تھی کہ بہرام آگیا ۔ اس لئے کہ اس میں ذرا کلام نہیں ۔ کہ وہ باہر سے یہاں داخل ہوا ۔۔۔"

شاہد حسین نے لالٹین روشن کی اور سرنگ میں داخل ہو گیا ۔

"آہا۔ یہ دیکھئے شین بالکل گھڑی کی طرح اس جانب حروف اُلٹے ہیں۔ بہرام کے لئے اُن کو اس طرف سے حرکت دینا کیا دشوار تھا"۔

"آپ کے پاس اس کا ثبوت"۔

"ثبوت۔ یہ دیکھئے پرزوں میں تیل دیا گیا ہے۔ بہرام سمجھتا تھا کہ یہ زنگ خوردہ ہوں گے"۔

"تو گویا اُسے سرنگ کا دوسرا دہانہ بھی معلوم تھا"

"بیشک۔ جس طرح مجھے معلوم ہو گیا۔ آئیے میرے ساتھ آئیے"۔

"کہاں۔ اس سرنگ میں؟"۔

"جی ہاں۔ کیا آپ خوف کھاتے ہیں"۔

"نہیں۔ خوف تو نہیں۔ مگر کیا آپ کو یقین ہے کہ آگے راستہ مل جائے گا۔

"جی آنکھ بند کرکے......"

وہ پہلے بارہ سیڑھیوں کا ایک زینہ اترے۔ اس کے بعد ایک اور طے کیا۔ اور اسی طرح پھر دو زینوں کو طے کرنے کے بعد وہ ایک ایسے زمین دوز راستہ میں داخل ہوئے۔ جس کی خشتی دیواروں میں پرانے زمانہ کے وقتاً فوقتاً مرمت کے آثار معلوم ہوتے تھے۔ بعض بعض مقامات سے پانی ٹپک آیا تھا۔ نیچے کی زمین نم تھی۔

"معلوم ہوتا ہے۔ کسی تالاب کی دلدل میں چل رہے ہیں" نواب صاحب نے بے چینی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ سرنگ جہاں ختم ہوئی وہاں بھی پہلے کی طرح ایک بارہ سیڑھیوں کا زینہ اور اس کے بعد تین اور زینے تھے۔ ان سب کو مکمل طے کرنے کے بعد وہ ایسی جگہ پہونچے جو بظاہر کسی چٹان میں بنایا ہوا خول معلوم ہوتا تھا بس اس کے آگے کوئی راستہ نہ تھا۔

"ارے توبہ" شاہد حسین نے کہا۔ اب آگے کچھ نہیں محض دیواریں ... یہ کیا واہیات ہے"۔

"فرض کیجئے۔ کہ ہم واپس چلیں" نواب صاحب نے فرمایا "اب زیادہ دیکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ میں جو کچھ چاہتا تھا۔ دیکھ چکا۔

مگر آنکھ اٹھاتے ہی شاہد حسین نے اطمینان کی لمبی سانس لی۔ اُن کے سر پر ویسی ہی مشین لگی ہوئی تھی جیسی کہ وہ دروازہ پر دیکھ آئے تھے اس میں بھی اسی طرح تین حرفوں کو حرکت دینا تھی کھٹکے کے ساتھ سامنے سے کوئی چیز ہٹی۔ نظروں کے سامنے وہی مزار تھا! ورجلی حرفوں میں "دبیریہ منزل" ایک جانب لکھا تھا۔

"سیدھا گھر خدا کا"۔ شاہد حسین نے مسکرا کر کہا۔

نواب صاحب نے فرمایا۔ "واللہ میں آپ کی ذکاوت اور بیدار مغزی کی داد دیتا ہوں"۔

"تسلیم۔ آپ مبالغہ فرما رہے ہیں۔ دیکھئے پبلک لائبریری کی کتاب میں اس سرنگ کا نقشہ دیکھئے پر اختتام داہنی جانب ایک دائرہ پر ہوتا ہے۔ اور دوسری جانب بائیں طرف ایک نقطہ گنبد نما بنا ہوا ہے جو دوربین سے صاف نظر آتا ہے۔ یہ گنبد یقیناً مزار کی طرف اشارہ کرتا ہے"۔

نواب صاحب فرط حیرت سے منہ کھولے ہوئے تھے۔ بولے "واللہ کتنی عجیب بات ہے۔ مگر ایسی سادہ و سہل گویا الف بے پڑھنا حیرت ہے

کہ آج تک کسی کے دماغ نے اس راز کا حل دریافت نہ کیا۔"

"صرف اس لئے کہ کسی نے دونوں کتابوں، مختلف نقشوں اور واقعات کو یکجا کر کے غور ہی نہیں کیا۔ بس کیا تو بہرام نے پہلے اور بعد ازاں میں نے۔"

"جی۔ میں نے بھی" نواب صاحب تڑپ کر بولے" اور ان کے بعد مجتہد صاحب نے۔ ہم دونوں اس کے متعلق اتنا ہی علم رکھتے تھے جتنا کہ آپ ... مگر ...۔"

شاہد حسین مسکرا دیا۔" نواب صاحب نیا کا ہر فرد رازہائے سربستہ کو حل کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔"

"واقعی میں دس برس سے اسے حل کر رہا تھا اور آپ نے دس منٹ میں حل کر لیا۔"

"اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں سب باتیں مشق اور عادت پر موقوف ہیں۔"

دونوں مزار سے باہر نکلے۔ تو شاہد حسین نے خوش ہو کر کہا" اخاہ لیجئے موٹر انتظار میں کھڑا ہے۔"

"جی ہاں یہی میرا موٹر ہے۔"

"آپ کا۔ مگر آپ تو فرماتے تھے کہ آپ کا موٹر ڈرائیور اس وقت تک واپس ہی نہیں آیا تھا۔"

"جی ہاں۔ مگر میں کہہ آیا تھا۔ اب پوچھنے سے معلوم ہو جائیگا۔"

دونوں موٹر کے قریب پہونچے۔ نواب صاحب نے ڈرائیور سے پوچھا۔

"کیوں میاں رحمت علی۔ تم سے یہاں آنے کے لئے کس نے کہا۔"

"حضور کامران مرزا صاحب نے۔ آدمی نے جواب دیا۔

"کامران مرزا نے! ..... کیا تمھاری اس سے ملاقات ہوئی تھی۔"

"جی ہاں حضور۔ اسٹیشن کے قریب ملے تھے۔"

"پھر ......"

"مجھ سے کہنے لگے۔ سیدھے مزار پر چلے جاؤ۔"

"مزار پر چلے جاؤ .... کس لئے۔"

"حضور اور حضور کے دوست کا انتظار کرنے کے لئے۔"

شاہد حسین اور نواب کی آنکھیں دوچار ہوئیں۔ نواب صاحب نے کہا "معلوم ہوتا ہے۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ یہ راز آپ کے لئے بچوں کے معمہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ واللہ کس نزاکت سے داد دی ہے۔"

شاہد حسین کے لبوں پر ہلکا سا تبسم نمودار ہوا۔ گویا اس تعریف سے اُسے خوشی ہوئی۔ اس نے سر کو جنبش دے کر کہا۔

"خدا کی قسم ... کیا آدمی ہے میں نے اُسے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔"

"ارے .... تو کیا آپ بھی اس سے ملے تھے۔"

"جی۔ ابھی ابھی ہم ایک دوسرے سے مل کر آ رہے ہیں۔ مگر دیکھئے ... گیا آغا میر کی ڈیوڑھی کی طرف۔ اور پہونچا چار باغ۔"

"اور آپ کو علم تھا۔ کہ کامران مرزا یا بالفاظ دیگر بہرام یہی ہے۔"

"جی نہیں ... بہرحال مجھے جلد ہی معلوم ہو گیا۔ کہ یہ میاں بہرام ہیں۔ اس کی گفتگو کا طنزیہ لہجہ مجھے کبھی فراموش نہیں ہو سکتا۔"

"افسوس۔ باایں ہمہ آپ نے اُسے نکل جانے دیا۔"

"بیشک حتیٰ کہ اگر میں چاہتا تو صرف ہاتھ ہلانے کی دیر تھی ۵ سوار پولس کے اُسی وقت قریب سے گذرے۔"

"توبہ۔ توبہ۔ اب اس سے اچھا موقعہ کہاں مل سکتا ہے۔"

"نواب صاحب آپ بالکل بجا فرماتے ہیں مگر واضح رہے کہ جب انسپکٹر شاہد حسین بہرام کے مانند حریف سے مقابل ہوتا ہے تو وہ فطرتی موقعہ سے فائدہ اُٹھا کر پھانسنا نہیں چاہتا۔ بلکہ موقعہ پیدا کر کے اُسے دام میں لانا چاہتا ہے"۔

وقت تنگ تھا۔ بہرام نے ازراہ اخلاق موٹر بھیجدی تھی۔ نواب صاحب اور شاہد حسین اس میں بیٹھ گئے۔ رحمت علی نے انجن کو حرکت دی اور موٹر تیزی سے کانپور کی سڑک پر چلا کھیت اور درخت نظروں کے سامنے سے بھاگنے لگے۔ بیرونی اور جگہتی سے نکل کر جب اناؤ قریب آیا۔ تو موٹر کی رفتار ذرا کم ہوئی۔ یکایک نواب صاحب کی نگاہ موٹر کے خانہ میں ایک پلندہ پر پڑی۔ چلا کر کہنے لگے۔

"ارے میاں! دیکھنا۔ یہ پلندہ کیسا؟ کس کے لئے رکھا ہے

اخاہ ..... یہ تو آپ کے نام پارسل ہے"

"میرے لئے"۔ شاہد حسین نے حیرت سے پوچھا۔

"جی ہاں۔ پڑھ لیجئے لکھا ہے بخدمت جناب انسپکٹر شاہد حسین صاحب من جانب خاکسار بہرام"

"انسپکٹر صاحب نے پارسل ہاتھ میں لے کر اس کے تاگے کھولے کاغذوں کو علٰحدہ کر کے دیکھا۔۔ تو گھڑی رکھی ہوئی ہے۔ ار..... ر..... رے غصہ کے ساتھ اس کے منہ سے رک رک کر نکلا

"یہ گھڑی!....." نواب صاحب نے فرمایا "کیا اس کے پاس گھڑی بھی تھی"۔

شاہد حسین چپ تھا۔ نواب صاحب نے پھر چھیڑ کر پوچھا۔

"آپ کو خدا کی قسم سچ بتلائیے گا۔ یہ کیا آپ کی گھڑی ہے کیا بہرام آپ کو آپ کی چیز اسی طرح واپس کر رہا ہے۔ جس طرح میری چیزیں چرا کر واپس کر دیں۔ اس سے اظہار برتری مقصود ہے آخر اس نے چرائی ہوگی..... ضرور آپ سوتی ہوگی۔ آہا.. ہا.. کیا عمدہ مذاق کیا ہے۔ شاہد حسین کی گھڑی اور بہرام اڑا لے۔ اور شاہد حسین کو علم تک نہ ہو۔ واللہ اس پھبتی کا جواب نہیں ہو سکتا۔ نہیں ہرگز نہیں آپ کو سر عزیز کی قسم بُرا نہ مانئے گا۔ ہنسی کے مارے میرے پیٹ میں بل پڑے جاتے ہیں"۔

نواب صاحب کا ہنستے ہنستے بُرا حال ہوگیا۔ یہاں تک کہ آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے۔ جب ذرا ہنسی کم ہوئی تو فرمانے لگے۔

"ضرور آپ جیسا فرماتے تھے۔ یہ ایسا ہی آدمی ہے"۔

انسپکٹر شاہد حسین کے چہرہ پر شکن تک نہ آئی۔ وہ برابر آسمان کی جانب دیکھ رہا تھا اور جب تک گنگا کا پل نہیں آیا وہ بالکل خاموش رہا۔ اس کی خاموشی بھی بجد پر اسرار نا قابل فہم اور صدہا علامات غصہ سے بڑھ کر تھی۔ اُس کی زبان سے جو الفاظ نکلے وہ اُن کے آہنی عزم اور زبردست استقلال کا پتہ دیتے تھے۔

"جی ہاں ..... یہی وہ آدمی ہے اور یہ ہاتھ جو اس وقت جناب کا ہاتھ پکڑے ہوئے ہیں۔ انشاء اللہ کسی دن اس شخص کو گرفتار کر کے نیچا دکھائیں گے۔ یاد رکھئے میں آج پیشین گوئی کرتا ہوں۔ کہ انسپکٹر شاہد حسین اور بہرام پھر عنقریب ملیں گے۔ ملک خدا تنگ نیست۔ ہم دونوں کے لئے ہزاروں موقع ہیں مگر یہ کب! اللہ ہی علیم ہے......"

ایم۔ شمیم بلہوری

"سازِ انانیت"

آہوئے رم رمیدہ ہوں　　شعلۂ دل طپیدہ ہوں
یوں ہی تو شوخ دیدہ ہوں

آنکھ سے میری ہے نہاں　　میری نشاطِ جاوداں
کون ہے میرا رازداں

خم کدۂ شہود ہوں　　بُت کدۂ نمود ہوں
غازۂ ہست و بود ہوں

حُسنِ رخِ مجاز ہوں　　دیدۂ نیم باز ہوں
خال و خطِ ایاز ہوں

حُسن ہے جانِ آرزو　　عشق ہے رمزِ رنگ و بو
چھیڑ نہ میری گفتگو

نغمہ نوازِ دل ستاں　　کیفِ خمارِ مے کشاں
میں ہوں طرازِ لعبتاں

میں ہوں شبابِ خوشاں　　میں ہوں فرازِ خاکداں
دنیا ہے میری داستاں

نغمۂ ناؤ نوش ہوں　　رندِ سبو بدوش ہوں
دشمنِ ننگ و ہوش ہوں

آبِ رواں اُمنگ ہو　　سبزۂ خط ، ترنگ ہو
میں ہوں صدائے چنگ ہو

ابو النظر رضوی امروہی

"نکوئی باَبداں..."

از "تماشائی" بریلوی

اس کی سخت ترین احتیاط کی گئی کہ خاندان کا یہ راز عوام الناس کے کانوں تک نہ پہنچ سکے۔ نصف کے قریب نوکروں کو آم کے باغ کی حفاظت کے لئے شہر سے باہر متعین کر دیا گیا۔ باقی نوکر شاگرد پیشہ میں بند رہے۔ انھیں اجازت نہ تھی کہ وہ کوٹھی کی چار دیواری کے باہر قدم رکھ سکیں اور اس بات کا حکم دے دیا گیا تھا کہ کوئی صاحب بھی کوٹھی میں داخل نہ ہو سکیں۔ کرنل کریم الدین خاں کی بیوی اُن کی بہن اور اُن کے بچوں کی دایہ اس وحشت ناک خبر سے واقف ہو چکی تھیں۔ مگر وہ یہی ظاہر کرتی رہیں کہ گویا وہ اس تمام معاملہ سے سراسر بے خبر ہیں۔ خاندان کے تمام افراد کھانے کے کمرے میں جمع تھے۔ اور اس معاملہ پر سرگرمی سے گفتگو کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک بھی ملاقات کے کمرے میں نہ آیا۔ پورا سجا سجایا ہال جو مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا رہتا تھا دن بھر خالی پڑا رہا۔ گھڑی کی آواز کے علاوہ اور کوئی آواز عمارت کے اس حصہ میں سُنائی نہ دی۔

ظفر کی اس وقت عمر پچیس چھبیس سال کی ہوگی۔ اُسی نے یہ ہنگامہ برپا کیا تھا اور وہی اس تلاطم کا حقیقی طور سے ذمہ دار تھا۔ تھوڑا ہی عرصہ ہوا کہ اُسے اس طوفان کی اطلاع مل گئی تھی۔ اور اُس کے رفیق ماموں کی معرفت آئے روئداد سے واقفیت حاصل ہو چکی تھی اس کا ماموں مرزا اصغر حسین اس کی مدد پر کمربستہ تھا۔ ملاقات کے کمرے کے کنارے پر دیوار سے لگا ہوا ظفر ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ اور وہ تیار تھا کہ اگر ضرورت ہو تو میں کل معاملہ من و عن بیان کر دوں۔ دروازہ کی دوسری طرف افراد خاندان کی ایک کونسل ہو رہی تھی۔ معاملہ زیر بحث نہایت نازک اور شدت سے تکلیف دہ تھا۔ ظفر نے بنک میں ایک جعلی پرامیسری نوٹ بھنا لیا تھا جس کی ادائگی کی تاریخ تین دن ہوئے گزر چکی تھی۔ اب اس کے دونوں چچا اور اس کا ماموں یہ طے کر رہے تھے کہ آیا وہ روپیہ ادا کر کے خاندان کی عزت کو بچائیں۔ یا اس سے ہاتھ دھو کر معاملہ میں پولیس کو معمولی کارروائی کرنے دیں۔

وہ اصحاب جن کا براہ راست کوئی ذاتی تعلق نہیں ہوتا ایسے معاملہ کو بالعموم نہایت سادہ اور سلیس تصور کرتے ہیں

اور وہ حضرات جن کو ایسے معاملات سلجھانا پڑتے ہیں سخت ترین مشکلات میں پھنس جاتے ہیں۔ بہت دیر سے اس معاملہ پر غور ہو رہا تھا اور بحث مباحثہ میں کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔ مگر معاملہ فیصلہ سے اسی قدر دور تھا جس قدر کہ نور سے ظلمت اور تصنع سے حقیقت ہوتی ہے۔

"برادران عزیز"! کرنل کریم الدین خاں نے کہا جس کی آواز میں پژمردگی اور تلخی پائی جاتی تھی۔ کون کہتا ہے کہ خاندان کی عزت محض ایک وہم باطل ہے؟ میں اس کے باور کرنے کے لئے ہرگز طیار نہیں ہوں۔ میں آپ کو ایک غلط زاویۂ نگاہ سے متنبہ کرنا چاہتا ہوں۔ میں ایک ناقابل معافی گناہ کی جانب اشارہ کر رہا ہوں۔ افسوس یہ کہ آپ اب بھی نہیں سمجھتے، میری زبان نہ چینی ہے نہ لاطینی میں ٹھیٹھ اردو بول رہا ہوں!"

"برادر عزیز! ہم آپ کی تقریر کو بخوبی سمجھ گئے" مرزا صفدر حسین نے نرمی سے کہا۔

"آپ خاک بھی نہ سمجھے، میں کب کہتا ہوں کہ خاندانی عزت کا میں قائل نہیں۔ مگر میں پھر وہی دہراؤں گا۔ خ۔ا۔ن۔د۔ا۔نی۔عز۔ت درحقیقت ایک تعصب۔ ایک مہمل تعصب۔ یہی میری گفتگو کا لبّ لباب ہے۔ ایک بدمعاش کو پردۂ خفا میں رکھنے (چاہے وہ کوئی بھی ہو) اور اس کو سزا سے بچانے میں کوئی خیال بھی متحرک ہو مگر یہ سب خلاف قانون اور ایک شریف انسان کے لئے ناسزاوار ہے۔ اس سے خاندانی عزت قایم نہیں رہتی۔ یہ ایک سوشل بزدلی ہے۔ مثلاً فوج کا حال لو۔ ہمارے لئے سب عزتوں سے زیادہ فوج کی عزت مقدم ہے پھر بھی ہم مجرم فوجی کو نہ چھپاتے ہیں اور نہ اسے سزا سے بچاتے ہیں۔ کیا اس طرزِ عمل سے فوجی عزت زائل ہو جاتی ہے؟"

ظفر کا دوسرا چچا رحیم الدین خاں جو سرکاری خزانہ کا ایک افسر تھا خاموش بیٹھا رہا اور بولنے پر بھی اسی بات پر زور دیتا کہ مقدمہ چلنے کی صورت میں ظفر کا نام اخبارات میں شائع ہو جائے گا۔ اس کی یہ رائے تھی کہ قبل اس کے کہ مقدمہ کی رُوداد پبلک کی ملکیت بنے اُسے دبا دینا چاہیئے۔

اس کے علاوہ اُس نے نہ کوئی تقریر کی اور نہ اور کوئی وجوہات بیان کئے۔ وہ بالطبع خاموش طبیعت تھا۔ اسی لئے اس مباحثہ میں اُس نے سب سے کم حصّہ لیا۔ ظفر کا ماموں مرزا صفدر حسین نرمی اور صلاحیت کے ساتھ گفتگو کرتا رہا۔ اُس کی آواز میں نمایاں سوز و گداز تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ جوان کے بعض حقوق ایسے ہیں جس میں چند لغزشیں لازمی طور سے ہو جاتی ہیں۔ ہم میں سے کون جوان نہیں ہوا۔ اور کس نے یہ لغزشیں نہیں کیں؟ معمولی انسانوں

کا تو کیا کہنا دنیا کے بڑے بڑے افراد بھی شباب کی غلطیوں اور بے اعتدالیوں سے محفوظ نہ رہ سکے۔ بڑے بڑے مورخین کی سوانح عمری دیکھنے سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ اُن میں کتنے ایسے تھے جو جوئے اور شراب میں ملوث ہوئے اور عالم شباب میں بزرگوں کے مورد الزام بنے۔ اگر ظفر کی غلطی جرم کی حد تک پہنچ گئی ہے تو ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس کی نہ تعلیم ہوئی اور نہ تربیت، وہ ہائی اسکول کے پانچویں درجے سے نکال دیا گیا تھا۔ بچپن میں وہ اپنے والدین کے سایہ سے محروم رہا اور اس لئے چھوٹی سی عمر میں وہ ہر خوشگوار اور خوش آئند اثر سے مستفیض نہ ہو سکا۔ علاوہ ازیں وہ جلد اثر قبول کرنے والا اور جلد مشتعل ہونے والا مزاج رکھتا ہے۔ پھر وہ کس قدر بدنصیب ہے جس کام میں اس نے ہاتھ ڈالا وہ سرسبز نہ ہوا۔ اور جس طرف اُس نے توجہ کی ناکامی اور بربادی اس کے شامل حال رہی۔ اگر وہ مجرم بھی ہے تب بھی وہ ہمارے رحم اور ہمدردی کا حق دار ہے۔ اُس کو سزا ضرور ملنا چاہئے مگر میرا خیال ہے کہ اُس کے ضمیر نے اُسے کافی سزا دے لی۔ اور وہ تکالیف اور روحانی کلفتیں جو اُس نے اب تک برداشت کی ہیں یقیناً کافی سے زائد ہیں۔ اب بھی اُس کی اذیت میں کوئی تخفیف نہیں ہے۔ اس حالت میں بھی وہ اپنے اعزا کا فیصلہ سننے کے لئے ہمہ تن گوش ہے۔ فوجی مجرم کی مثال ایک حد تک خوش آئند ہے جس سے ہمارے ہر دل عزیز کرنل کی اعلیٰ ذکاوت کا پتہ چلتا ہے۔ اُنھوں نے جو ہماری پبلک فرض شناسی کے جذبہ کو مشتعل کرنے کی کوشش کی اُس سے اُن کی روح کی بیداری اور اُن کی خیالات کی وسعت کا اندازہ ہونا ایک بدیہی امر ہے۔ مگر یہ فراموش کرنا نہیں چاہیئے کہ شہر کا ہر باشندہ رحیم بھی ہے اور رحم کا مستحق بھی ہے۔

" تو کیا ایک غلطی کرنے والے لڑکے کو مدد پہنچا کر پبلک فرض شناسی فراموش کر دی جاتی ہے۔ مرزا اصغر حسین نے سنجیدگی سے کہا۔

مرزا صاحب خاندانی عزت پر برابر زور دیتے رہے۔ گو وہ خود اس خاندان سے منسلک نہ تھے۔ مگر وہ اس خاندان کے حالات سے کماحقہ واقف تھے۔ اور انھیں یہ بات بھی فراموش نہیں ہوئی تھی کہ اُن کی محبوب مرحومہ بہن اس خاندان کے ایک نمایاں رکن سے منسوب تھی۔ انھی وجوہات سے یہ خاندان اُنھیں بہت عزیز تھا اور ان کو ہرگز گوارا نہ تھا کہ پندرہ سو روپیہ کی خاطر خاندان کی اُس عزت پر داغ لگ جائے کہ جس کی قیمت ان کی نگاہ میں کوئی خزانہ نہیں دے سکتا۔ اس گفتگو کا خاطر خواہ اثر دیکھ کر مرزا اصغر حسین نے یہ دریافت کرنا شروع کیا کہ آپ کے نزدیک جرم کا کیا

مفہوم ہے۔ جرم ایک بداخلاقی ہے جس کا دارومدار بری نیت پر ہوتا ہے۔ مگر انسان کی نیت اور انسان کا عزم آزاد نہیں۔ فلسفہ خود اس مسئلہ پر کوئی فیصلہ کن جواب نہیں دے سکتا۔ علماء کے خیالات اب بھی اس معاملہ پر مختلف ہیں۔ فلسفیوں کا ایک مقتدر گروہ انسانی ارادے کی آزادی کا قائل نہیں اور ہر جرم کو سوسائٹی کے اثرات اور فرد کے خصائل کا نتیجہ تصور کرتا ہے۔ اور ان خصائل کو بھی سوسائٹی کا ثمر مانا جاتا ہے۔

"صفدر" کرنل نے عاجزانہ لہجے میں کہا۔ ہم ایک اہم معاملہ پر سنجیدگی سے گفتگو کر رہے ہیں اور آپ خواہ مخواہ فلسفہ اور فلسفیوں کو معرض بحث میں لاکر موضوع کو پیچیدہ تر بنا دیتے ہیں۔ ذرا غور کیجیے آپ کی اس تقریر کا لب لباب کیا ہے۔ کیا آپ کی خوش بیانی سے معاملہ سلجھ جائے گا؟

ظفر دروازہ کے قریب چھپا ہوا یہ سب سن رہا تھا نہ وہ خائف تھا۔ نہ شرمندہ اور نہ ملول وہ فقدان جذبات کی وجہ سے کچھ تھک گیا تھا اُس کو اس کی مطلق پرواہ نہ تھی کہ اُس کے اعزا اس کو معاف کرتے ہیں یا نہیں۔ وہ ان کا فیصلہ سننے اور اپنے جوابات دینے اس لئے آیا تھا کہ صفدر حسین نے اُسے مجبور کردیا تھا۔ وہ مستقبل سے خائف نہ تھا۔ اسے اس کی کوئی پرواہ نہ تھی کہ آج وہ کریم منزل میں بیٹھا ہے اور کل جیل خانہ کی چار دیواری کے اندر بند ہو جائے گا۔

"اگر جیل خانہ ہوا تو خیر جیل خانہ ہی سہی اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔"

وہ زندگی سے عاجز آچکا تھا۔ زندگی کے مصائب اُسے بہتر سے زیادہ سخت اور کٹھن معلوم ہوتے تھے وہ قرض کی دلدل میں کانوں تک دبا ہوا تھا اور جس قدر نکلنے کی کوشش کرتا تھا اسی قدر اور زیادہ دھنستا چلا جاتا تھا۔ اُس کی جیب میں ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ اس کا خاندان اس کے نزدیک سب سے زیادہ نفرت کے قابل تھا وہ اپنے دوستوں سے اور اپنے احباب سے قطع تعلق کرنے پر آمادہ تھا کیوں کہ وہ خود اُس سے گریزاں تھے اُس کا مستقبل تاریک تھا۔ ایسا تاریک کہ ایک گز بعید کا منظر اُسے نظر نہ آسکتا تھا۔ ظفر کے بے پروایانہ انداز کی کوئی انتہا نہ تھی۔ مگر ایک بات اس کے دل پر برابر چرکے لگا رہی تھی۔ دروازہ کی دوسری جانب اُسے اُسی کے خاندان کے افراد آزادی سے "ایک بدمعاش مجرم" کے لقب سے یہ آواز ذیل پکار رہے تھے۔ قریب تھا کہ وہ کود پڑے اور دوسرے کمرے میں داخل ہو کر حقارت آمیز لہجے میں کرنل کریم الدین خاں سے کہے۔ "تم جھوٹ بول رہے ہو!!!"

"مجرم" دراصل ایک ہولناک لفظ ہے۔ قزاق، ڈاکو، چور اور قاتل، اس نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔

یعنی وہ لوگ جن کے پاس کوئی اخلاقی سرمایہ نہیں ہوتا اور یقیناً ظفر کی حالت اس سے بہت مختلف تھی۔ یہ صحیح ہے کہ وہ بے حد مقروض تھا۔ یہاں تک کہ یہ قرض ادا کرنا محال ہوگیا تھا۔ مگر مقروض ہونا کچھ جرم نہیں۔ دنیا میں بہت کم ایسے لوگ ہیں جو مقروض نہیں ہوتے۔ خود کرنل کریم الدین خاں اور مرزا صفدر حسین مقروض تھے اور کافی مقروض!

"مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ میں نے کیا غلطی کی" ؟ ظفر نے متعجب ہو کر اپنے دل سے پوچھا۔

ظفر نے محض ایک جعلی پرامیسری نوٹ کیش کرایا تھا اور وہ جانتا تھا کہ سارے نوجوان اکثر ایسی ہی کرتے ہیں۔ اُس کے دوست شوکت اور رفعت نے بھی ہمیشہ یہی طرز عمل اختیار کیا اور گھر سے روپیہ آنے کے بعد واجب الادا ہونے سے قبل رقمیں ادا کر دیں۔ ظفر نے بھی ایسا ہی کیا مگر تاریخ معینہ سے قبل وہ اس قدر رقم بنک میں اس لئے داخل نہ کر سکا کہ شوکت حسب وعدہ اسے روپیہ دینے سے قاصر رہا مگر اس میں اس کا کیا قصور تھا۔ اس میں محض گردش کے حالات کا قصور ہے۔ یہ صحیح ہے کہ دوسرے شخص کے جعلی دستخط کو کام میں لانا ممنوع ہے۔ مگر یہ کوئی جرم نہیں۔ ایک مسلمہ گو بھدی رسم ہے۔ مگر اس سے کسی فرد کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ کرنل کریم الدین خاں کے جعلی دستخط کر کے ظفر نے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہونچایا۔

"نہیں اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ میں مجرم ہوں.." ظفر نے خیال کیا" یہ میرے کردار کے خلاف ہے کہ میں ایسا جرم کروں میری طبیعت میں نرمی اور میرے جذبات میں اشتعال انگیزی ہے.... جب میرے پاس روپیہ ہوتا ہے میں فیاضی کے ساتھ غرباء کی مدد کرتا ہوں"

ظفر اسی انداز میں غور و فکر کرتا رہا۔ اور اُس کے اعزا دروازہ کے دوسری جانب سرگرم مباحثہ رہے۔ "مگر دوستو! اس معاملہ کو اب ختم کرنا چاہئے" کرنل نے مشتعل ہو کر کہا " فرض کرو ہم نے اُسے معاف کر دیا اور روپیہ ادا کر دیا.... ہمیں معلوم ہے کہ وہ اپنی واہیات طرز معاشرت کو نہیں بدل سکتا اسی طرح روپیہ تباہ کرتا اور قرض لیتا رہے گا۔ اور اُسی طرح ہمارے دوکانداروں کے پاس جا کر ہمارے نام سے سامان لاتا رہے گا۔ کیا آپ اس کی گارنٹی لے سکتے ہیں کہ یہ اُس کی آخری حرکت ہے؟ جہاں تک میرا خیال ہے مجھے مطلق امید نہیں کہ اُس کی اصلاح ہو سکے!"

خزانہ کے افسر نے جواب ایک متین اور دبے لہجہ میں دیا۔ اس کے بعد مرزا صفدر حسین حسب معمول جذبات رحم و کرم کو مشتعل کرنے لگے۔ کرنل کریم الدین خاں نے اپنی کرسی کو حرکت دی اور کھڑے ہو کر اپنی پھٹی پھٹی آواز میں سامعین کی سمع خراشی کی آخر کار دروازہ کھلا اور مرزا صفدر حسین برآمد ہوئے۔ ان کے پتلے پتلے سے سفید چہرہ پر سُرخی کے نشانات تھے۔ اُنھوں نے ظفر سے غمگین لہجہ میں کہا۔

"آؤ اندر آؤ اور صفائی سے اپنے دل کی بات کہو"

ظفر ان کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ رحیم الدین خاں کرسی پر بیٹھے تھے۔ کرنل میز کے سامنے کھڑے تھے۔ ان کا ایک ہاتھ جیب میں تھا اور ایک پاؤں کرسی پر، کمرہ نسبتاً تاریک اور روشنی سے محروم تھا۔ ظفر نے کسی پر نظر نہ ڈالی یکایک اُس پر شرمندگی اور انفعال کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ بے چینی سے مرزا اصغد حسین کی طرف دیکھ کر وہ بڑبڑانے لگا۔

"میں ادا کر دوں گا.... میں سب واپس دیدوں گا....."

"نوٹ کیش کراتے وقت تمھیں کہاں سے روپیہ کی توقع تھی" کرنل کی آواز یہ مفہوم ادا کرتی ہوئی اس کے کان کے پردے کو سختی سے مرتعش کرنے لگی۔

"مجھے........ شوکت نے مجھے آج سے پہلے روپیہ دینے کا وعدہ کیا تھا"

ظفر نے اور کچھ نہ کہا۔ کمرے سے باہر جاکر دروازے کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گیا" وہ چلا جانا پسند کرتا، مگر نفرت کا ایک شدید جذبہ اس کے سینے کو چاک کئے ڈال رہا تھا۔ گلے میں اس کی آواز پھنس رہی تھی۔ آنکھیں اُس کی مشعل کی طرح روشن تھیں۔ اپنے چچا کرنل کے پندار تمکنت کو وہ ایک کاری ضرب لگانا چاہتا تھا۔ وہ بیٹھ کر یہی غور کرنے لگا کہ اپنے چچا کی خدمت میں وہ کس نوع سے گستاخی کرے کہ اسی اثنا میں ایک عورت شام کی دھندلی روشنی میں ملفوف ہال کے دروازہ پر نمودار ہوئی۔ یہ کرنل کریم الدین خاں کی بیوی زہرہ تھی اُس نے ظفر کو اشارہ سے بلایا اور کفِ افسوس ملتی اور روتی ہوئی کہنے لگی۔

ظفر! میں جانتی ہوں کہ تم مجھ سے نفرت کرتے ہو۔ پھر بھی میں تمھاری منت کرتی ہوں..... مگر ظفر........ یہ ماجرا کیسے ہوا...... خوفناک نہایت خوفناک.......... برائے خدا! ان سب کی خوشامد کرلو کہ تمھاری جان تو چھوٹے

ظفر نے اس کے لرزتے ہوئے شانے اور اس کے وہ موٹے موٹے آنسو جو اُس کی آنکھوں سے مسلسل بہ رہے تھے دیکھے اور اس کے ساتھ ساتھ دوسری طرف سے خاندان کے تھکے ماندے افراد کی خستہ و نحیف آوازیں بھی سنیں جو اس کی قسمت کے فیصلے کو بے نقاب کر رہی تھیں۔ اُسے یہ ذرا توقع نہ تھی کہ اُس کے دولتمند اور صاحب ثروت سرمایہ دار اعزا پندرہ سو روپیہ کے پیچھے یہ قیامت برپا کریں گے۔

زہرہ کے آنسوؤں کا مفہوم اور دوسری جانب کی آوازوں کا ارتعاش اس کے لئے اب تک سراسر بے معنی تھا۔ ایک گھنٹہ کے بعد اس نے معلوم کیا کہ کرنل کریم الدین خاں سب پر حاوی ہو رہا ہے اور سب اس بات کے لئے تیار ہیں کہ پولیس کو کارروائی کرنے کی اجازت دی جائے۔

" معاملہ طے ہوگیا" کرنل نے ایک آہ بھر کر کہا۔

اس فیصلہ کے بعد خاندان کے تمام افراد حتیٰ کہ خود کرنل کریم الدین خاں ملول نظر آنے لگے۔ پہلے کمرے میں متعدد آوازیں ایک ہی وقت میں گونجتی تھیں۔ یا فیصلہ کے بعد سرا سر خاموشی طاری ہوگئی۔

" یا رب غفور!" مرزا صفدر حسین نے ایک سرد آہ بھر کر کہا" میری بدنصیب بہن!"

مرزا صفدر حسین دبی آوازیں کہنے لگے "مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ ظفر کی والدہ میری مرحومہ بہن اس وقت اس کمرہ میں موجود ہے۔ اور وہ فرشتہ صفت مرحومہ روتی پیٹتی ہوئی اپنے بچے کی رہائی کے لئے منت کر رہی ہے۔ ظفر کو اس لئے معاف کرنا چاہیئے کہ شاید اُس غریب کو قبر میں سکون حاصل ہو سکے۔"

سسکیوں کی آواز نے کمرے کے گوشہ گوشہ میں حزن و ملال کی کیفیت پیدا کر دی۔ مرزا صفدر حسین روتے جاتے تھے اور کچھ کہتے جاتے تھے جو دوسرے کمرے میں بیٹھنے والے کی سمجھ میں نہ آسکتا تھا۔ کرنل کریم الدین خاں کھڑے ہو کر کمرے کی وسعت میں چہل قدمی کرنے لگے۔ ایک طویل مکالمہ پھر شروع ہوگیا۔ اسی اثنا میں گھڑی نے دو بجائے۔ خاندانی کونسل ختم ہوئی۔ اس غرض سے کہ "ظفر ملعون" کو نہ دیکھے۔ کرنل کریم الدین خاں ہال میں آنے کی بجائے 'بہشت کے' کمرہ کی جانب سے نکل گئے۔ مگر مرزا صفدر حسین کونسل سے فارغ ہوتے ہی ظفر کے پاس آئے۔ خوشی کے آثار نہ صرف اُن کے چہرے اور آنکھوں سے بلکہ اُن کی ہاتھوں کی حرکت سے بھی ظاہر ہو رہے تھے۔ آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔ اُن کے لبوں پر تبسم کی جھلک نمایاں تھی۔ انھوں نے ظفر سے کہا۔

" خدا کا شکر ہے۔ جاؤ سیدھے گھر چلے جاؤ اور اطمینان سے سو جاؤ۔ ہم نے اس رقم کے ادا کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ مگر اس شرط پر کہ تم اپنا رویہ بدلو اور میرے ساتھ گاؤں میں چل کر زراعت کرنا شروع کر دو۔"

ایک منٹ بعد مرزا صفدر حسین اور ظفر نے اپنے اپنے کوٹ پہنے اور ٹوپیاں اوڑھے کریم منزل کی سیڑھیوں پر سے اُتر رہے تھے۔ مرزا صاحب کی زبان پر اب تک پند و نصائح کا ہجوم تھا جو ظفر سب بے پرواہی کے ساتھ سُن سُن کر 'ہوں' 'ہاں' کرتا جاتا تھا۔ اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ گویا اُس کے شانوں پر سے ایک بے چین کر دینے والا بوجھ دور ہو رہا ہے۔ اُسے معافی عطا ہو چکی تھی وہ آزاد تھا۔ خوشی کے جھونکے نے اس کے دل پر ایک لرزہ کی سی کیفیت پیدا کر دی، وہ سانس لینا۔ آزادی سے حرکت کرنا۔ گویا زندہ رہنا چاہتا تھا، اُس نے بجلی کے قمقموں"

اور سیاہ آسمان پر نگاہیں دوڑائیں۔ اُسے معاً یاد آگیا کہ آج پکچر پیلیس Picture palace میں ایک سنسنی خیز تماشہ کا افتتاح ہونے والا ہے جس میں کروہ اپنے دوستوں کے ساتھ جانے والا تھا۔ اس خیال نے اس کی روح میں خوشی کا ایک دریا بہادیا۔

"میں ضرور جاؤں گا" یہ اس نے قطعی فیصلہ کرلیا تھا۔

مگر اب اُسے یاد آیا کہ اس کی جیب میں سوائے قرض خواہوں کے خطوط کے ایک پیسہ بھی نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ ابھی اُسے ہوٹل میں اپنے کھانے اور تماشہ کے ٹکٹ خریدنے کا انتظام کرنا تھا۔ اس لئے ضروری تھا کہ ہر چہ بادا باد، جس طرح ممکن ہو تھوڑی سی رقم کا ضرور بندوبست کرنا چاہیئے۔

"ماموں جان! آج مجھے سو روپیہ دے دیجئے۔ سخت ضرورت ہے"۔

مرزا صاحب نے حیرت زدہ ہوکر اس کے چہرہ کو دیکھا اور لیمپ کے ایک کھمبے سے ٹیک لگا کر کھڑے ہوگئے۔

"ماموں صاحب! ضرور دیدیجئے"۔ یہ کہہ کر ظفر بے چینی کے عالم میں کبھی ایک پاؤں پر بوجھ دیتا، اور کبھی دوسرے پر اور یہی کہتا جاتا۔

"ضرور دیدیجئے۔ خدا کی قسم آج جیب میں ایک پیسہ نہیں۔ آپ میرا جائزہ لے لیجئے"۔

ظفر منت کرتا ہوا اپنے ماموں کے چہرے پر للچائی ہوئی اور عاجزانہ نگاہیں ڈالنے لگا۔ آخر کار مجبور ہوکر کہنے لگا۔

"سنئے اگر آپ نہیں دیتے ہیں تو میں خود اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کردوں گا اور کل پھر ایک جعلی نوٹ بنانے کا بندوبست کروں گا"۔

غریب مرزا مبہوت کھڑا تھا، اور کچھ غیر مسلسل کلمات اپنے استعجاب کی شدت میں کہتا جاتا تھا۔ مجبور ہوکر اُس نے اپنی جیب میں سے ایک سو روپیہ کا نوٹ نکالا اور ظفر کے حوالے کیا۔ اُسے لے کر نوجوان ایک تانگے پر سوار ہوکر نظروں سے غائب ہوگیا۔ تانگے میں بیٹھتے ہی ظفر ایک دوسرے عالم میں پہنچ چکا تھا، اُس کی نگاہوں کے سامنے شراب ناب کے بلوریں جام چھلک رہے تھے، اُس کے کانوں میں قلقل کی صدائیں آرہی تھیں، کبھی وہ دوستوں کے قہقہوں کو یاد کرتا، اور کبھی حسن کی جلوہ طرازیوں سے دل ہی دل میں مسحور ہوتا۔ عالم خیال کی اس دلکش تصویر نے اُس کی رگ رگ میں خون کی حرکت پیدا کردی اور اس کے لبوں پر بے ساختہ تبسم دوڑنے لگا۔

"بے شک اب میں آزاد ہوا — سراسر آزاد —"

مرتعش صدائیں

از

جناب محمود زماں خاں صاحب محمودؔ

زنجیرِ خامشی تھیں جلوہ کی ابتدائیں
تفسیرِ بےخودی ہیں حیرت کی انتہائیں

رکھا قدم جو دل نے مقتل کے گل کدہ میں
خنجر کے پھل کی ڈالی لے کر بڑھیں ادائیں

سیری ہو کیا جھلک سے، ہے لطفِ دید اس میں
چہرہ پہ ٹکٹکی ہو نظریں نہ تلملائیں

جسم و جگر ہے ان کا، دل ان کا، جان اُن کی
سب ہو گئے ان پہ قرباں صورت تو وہ دکھائیں

حالت بگڑ چلی ہے اے ضبطِ دل خبر لے
جنبش نہ ہو زباں کو نالے نہ لب پہ آئیں

ہوگا جنوں کی خاطر سب خارزارِ گلشن
صحرا کو لے چلی ہیں چھالوں کی التجائیں

کن حسرتوں کی جامع میری بھی بزمِ غم ہے
ہے پاس صدرِ محفل ساقیٔ غم بلائیں

تنگ آ کے زندگی سے کیوں موت کو نہ چاہیں
کچھ انتہا بھی آخر کب تک ستم اٹھائیں

کم بخت بےخودی نے لوٹی متاعِ عشرت
آغازِ وصل میں تھیں فرقت کی انتہائیں

ہستی کے نقش وہمی نقاش کی طلب میں
مٹ مٹ کے کہہ رہے ہیں گم ہوں تو اُن کو پائیں

کس درد سے بھرا ہے محمودؔ تیرا نغمہ
پردے بھی مضطرب ہیں اور مرتعش صدائیں

بچوں کی کہانی

حق بہ حق دار

از جناب خواجہ احمد عباس صاحب، متعلم انٹرمیڈیٹ کالج

بہت مدت کا ذکر ہے کہ ایک غریب بڑھیا اور اس کا چھوٹا بیٹا زید جنگل میں رہا کرتے تھے۔ وہ ایک جھونپڑے میں رہتے تھے۔ اور بہت غریب تھے، اتنے غریب کہ اکثر بیچارے زید کو ایک ہی وقت کھانا نصیب ہوتا تھا۔ آخر کار ایک دن جب ان کے پاس کھانے کو بھی نہ رہا تو انھوں نے اپنی گائے کو بیچ دینے کا فیصلہ کیا اور زید گائے کو لے کر شہر کی طرف چلا تاکہ جو شخص سب سے زیادہ قیمت لگائے اس کے ہاتھ بیچ دے۔

راستہ میں اس کو ایک آدمی ملا جو ایک تھیلے میں پھلیاں لئے جا رہا تھا۔ زید کو وہ پھلیاں اس قدر پسند آئیں کہ اُس نے اُس آدمی سے کچھ پھلیاں مانگیں، اُس نے جواب دیا "میں تم کو یہ جادو کی پھلیاں مفت نہیں دوں گا، اگر چاہو تو گائے سے بدل لو۔" زید فوراً راضی ہوگیا اور اس کو گائے دے کر پھلیاں لے لیں۔ وہ اس خوشی میں دوڑا دوڑا گھر گیا۔ اور اپنی ماں کو تمام حال بتایا۔ بیچاری غریب بڑھیا اپنی بدقسمتی پر بہت روئی کیوں کہ ان کے پاس صرف یہی ایک گائے رہ گئی تھی۔ اس نے غصہ میں ان پھلیوں کو اُٹھاکر باہر پھینک دیا اور زید بیچارہ بھی روتا روتا سوگیا۔

جب صبح کو زید اُٹھا تو اُس نے اپنی کھڑکی کے سامنے کوئی چیز اُگی ہوئی پائی۔ جب وہ اس کے پاس گیا تو دیکھا کہ جادو کی پھلیاں جو رات اس کی ماں نے باہر پھینک دی تھیں ایک اونچا درخت بن گئی ہیں جس کی چوٹی نظر بھی نہیں آتی تھی۔

زید نے درخت پر چڑھنا شروع کیا۔ ابھی وہ آدھے ہی راستہ پر تھا کہ ہانپنے لگا، آخر جب وہ درخت کی چوٹی پر پہنچا تو اُس نے اپنے آپ کو ایک بالکل نئے مُلک میں پایا۔ وہ تھوڑی ہی دور گیا ہوگا کہ اُس کو ایک بوڑھی عورت ملی جس کو اُس نے کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن وہ زید کو دیکھتے ہی بولی "میں تم کو خوب جانتی ہوں، بہت سال گزرے

ایک ظالم دیو نے تمھارے باپ کو مار کر وہ تمام مال جو محل میں تمھارا تھا لے لیا، اگر تم اُس سے بدلہ لینا چاہتے ہو تو میں تمھاری مدد کروں گی۔" زید نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور کہا " ہاں میں اس سے بدلہ لینا چاہتا ہوں، تم مجھ کو بتاؤ کہ وہ کہاں رہتا ہے" بوڑھی جادوگرنی نے زید کو اس دیو کا مکان بتا دیا۔

زید بہادروں کی طرح قلعہ کی طرف بڑھا اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک عورت نے دروازہ کھولا اور اُس سے پوچھا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ زید نے اُس سے ایک رات کے لئے پناہ دینے کی درخواست کی۔ عورت بولی " افسوس میرا خاوند ایک دیو ہے اور اگر اُس نے تم کو دیکھ لیا تو کھا جائے گا" زید نے کہا کہ کیا وہ اُس کو چھپا بھی نہیں سکتی۔ عورت نے کہا " ہاں میں تم کو چھپا تو سکتی ہوں اگر تم یہ وعدہ کرو کہ صبح اٹھتے ہی چلے جاؤ گے، پھر وہ اس کو باورچی خانہ میں لے گئی اور کھانا کھلایا۔ ابھی زید کھانا کھا ہی رہا تھا کہ ایک خوفناک آواز آئی اور اُس عورت نے زید سے کہا۔ جلدی بھٹی میں گھس جاؤ۔ یہ سنتے ہی زید بھٹی میں گھس گیا اور تھوڑی دیر میں دیو آموجود ہوا اور بولا " بیوی مجھے گوشت کی خوشبو آتی ہے" اس کی بیوی بولی کہ تم تو پاگل ہو گئے ہو دیکھو تو میں نے تمھارے لئے کیسا اچھا کھانا تیار کیا ہے۔ کھانا تمام تر تیار تھا کہ دیو فوراً کھانا کھانے کے لئے بیٹھ گیا اور کھانے کے بعد اپنی بیوی سے مرغی لانے کے لئے کہا اور جب اُس کی بیوی مرغی لے آئی تو اُس نے اُس کو انڈا دینے کا حکم دیا۔ مرغی نے فوراً ایک سونے کا انڈا دے دیا۔ زید نے سوچا کہ یہ مرغی لے لینی چاہئے اس کے بعد دیو بالکل مدہوش ہو کر سو گیا اور اُس کے خراٹوں سے دیواریں ہلنے لگیں۔ جونہی زید نے اُس کے خراٹوں کی آواز سُنی وہ فوراً بھٹی سے نکل آیا، مرغی اُٹھائی اور بھاگ گیا۔ وہ بہت تیز بھاگا یہاں تک کہ وہ پھلیوں کے درخت تک پہنچ گیا پھر اُس نے نہایت پھرتی سے اترنا شروع کیا اور گھر جا کر اپنی ماں کو تمام حال بتایا اس کی ماں یہ سن کر بہت خوش ہوئی اور اُس کو بہادر زید کا خطاب دیا۔

وہ دونوں بہت مدت تک سونے کا انڈا بیچ کر گزارہ کرتے رہے لیکن کچھ دنوں کے بعد زید کو پھر شوق ہوا اور وہ اُس درخت پر چڑھ کر دیو کے قلعہ میں پہونچ گیا اور پھر اس کی بیوی سے رہنے اور کھانے کی درخواست کی مگر وہ عورت بولی " نہیں میں کسی کو پناہ نہ دوں گی۔ پچھلی دفعہ میں نے ایک لڑکے کو اجازت دے دی تھی۔ مگر وہ ایسا ناشکرا تھا کہ وہ میرے سونے کے انڈے دینے والی مرغی چرا کر لے گیا۔"

زید نے اُس سے اس قدر عاجزی سے درخواست کی کہ دیو کی بیوی کو اجازت دینی ہی پڑی۔ اس دفعہ اُس نے

زید کو الماری میں چھپایا، اتنے ہی میں دیو بھی آگیا اور چلا کر بولا "بیوی مجھے تازے گوشت کی خوشبو آتی ہے" اُس کی بیوی بولی ۔ "تم تو پاگل ہو گئے ہو، دیکھو تو سہی میں نے تمھارے لئے کیسا اچھا کھانا تیار کیا ہے"

جب دیو کھانا ختم کر چکا تو اُس نے بیوی سے اشرفیوں کے تھیلے منگوائے۔ اشرفیاں گنیں اور پھر تھیلوں میں بھر کر سو گیا دیو کے سوتے ہی زید نکلا تھیلے اُٹھائے اور درخت کی طرف بھاگا۔ گھر پہونچ کر اُس نے اپنی ماں کو اشرفیاں دیتے ہوئے کہا " اماں تم ان کے خرچ کرنے میں پس و پیش نہ کرنا کیوں کہ یہ سب چیزیں اُس دیو نے میرے باپ کے پاس سے چرائی تھیں۔

کچھ دنوں کے بعد زید پھر دیو کے مکان کو روانہ ہوا مگر اس دفعہ اس نے زنجیر نہیں ہلائی بلکہ موری کے راستہ اندر گھس گیا اور چھپ کر اندر بیٹھ رہا۔ اتنے میں دیو بھی آگیا اور اُس نے آتے ہی چلانا شروع کیا " مانس گند مانس گند" اس کی بیوی نے کہا " میں تم سے شرط لگاتی ہوں کہ گھر میں کوئی نہیں ہے"

دیو نے کھانا کھا کر اپنا ستار منگایا اور جب اس کی بیوی نے اس کو میز پر لگا دیا تو دیو کے حکم پر ستار آپ سے آپ ہی بجنے لگا۔ زید نے سوچا کہ اس ستار کو لینا چاہیئے۔ جوں ہی دیو کی آنکھ لگی زید ستار کو لے کر بھاگا۔ لیکن جادو کا ستار فوراً بول اُٹھا کہ "چور چور" یہ سنتے ہی دیو زید کے پیچھے بھاگا لیکن زید بہت آگے نکل چکا تھا۔ اُس نے درخت پر پہونچتے ہی پھرتی سے نیچے اُترنا شروع کیا۔ اور نیچے پہونچتے ہی چلایا " اماں کلہاڑی لاؤ، جلدی کرو" اس کی ماں فوراً کلہاڑی لے آئی۔ بہادر زید نے ایک ہی وار میں درخت کے تنے کو کاٹ ڈالا۔ دیو اوپر سے ایک دھماکے کے ساتھ گرا اور گرتے ہی مر گیا۔

زید اور اُس کی ماں مدت تک آرام سے زندگی بسر کرتے رہے۔ اور جب بہادر زید جوان ہوا تو اُس نے ایک شہزادی سے شادی کر لی۔

(ترجمہ)

تنقید و تبصرہ

از

اڈیٹر

(۱) کتب

سفرنامۂ شاہ افغانستان حصۂ اوّل | مرتبہ جناب مولانا زاہد القادری صاحب ادیب فاضل ایم آر اے ایس
کتابت، طباعت دیدہ زیب، ۵۷ کے قریب مختلف مناظر کے خوبصورت فوٹو، حجم ۲۵۰ صفحات، قیمت قسم اول مجلد دو روپیہ - قسم دوم بلا جلد عہ قسم سوم بغیر تصاویر عمہ - ملنے کا پتہ :-

حامد حسین صاحب قریشی خوش نویس، کوچۂ چیلاں، دہلی۔

زیر نظر کتاب اعلیٰحضرت شاہ غازی امان اللہ خلد اللہ ملکہ تاجدار دولت مستقلۂ افغانستان کی سیاحت یورپ کا پہلا حصہ ہے جس میں ہندوستان، عدن، مصر، اٹلی، فرانس، بلجیم، انگلستان اور روس کی سیاحت کے دلچسپ حالات درج ہیں اور ملک کے مختلف مواقع کے فوٹو بھی دئے گئے ہیں۔ کتاب کے آخر میں اعلیٰحضرت امیر اور علیا حضرت ملکۂ معظمہ کے مختصر سوانح حیات بھی درج ہیں

جناب مولانا زاہد القادری صاحب نے اردو داں طبقہ پر ایک بہت بڑا احسان کیا ہے کہ ہز امپیریل مجسٹی شاہ افغانستان کے اس معنی خیز سفر کے دلچسپ حالات کو شرح و بسط کے ساتھ یکجا کر دیا۔ کتاب کی مقبولیت کی سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ بہت تھوڑے عرصہ میں دوسرا اڈیشن شایع کرنے کی ضرورت پڑ گئی۔ مختلف ممالک میں شاہانہ استقبال، اعلیٰحضرت کی مساوات پسندی اور مراحم خسروانہ کی پُر اثر مثالیں، اور اسی طرح تمام سفر کے حالات اس قدر دلچسپ پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں، کہ کتاب کو ختم کرنے سے پیشتر چھوڑنے کو طبیعت نہیں چاہتی، اور پھر بھی باقی حالات معلوم کرنے کے لئے دل پھڑکتا رہ جاتا ہے۔ البتہ چند الفاظ

مثلاً "ولیسرائن" - اشین (یعنی ایشیائی) "کنگ موصوف" اور "دُور بینانہ" کانوں کو ثقیل ضرور معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن کتاب کی مجموعی دلچسپی پر کوئی اثر نہیں ڈالتے۔ اسی کے ساتھ ایک خرابی کسی حد تک قابلِ اعتنا ضرور ہے اور وہ تصاویر کی بے ترتیبی ہے۔ اگر مناسب مواقع پر مضمون کتاب کو دیکھتے ہوئے تصاویر لگائی جاتیں، تو کتاب کی جاذبیت میں اور اضافہ ہو جاتا۔ بہر حال سیاسیات موجودہ سے دلچسپی لینے والے حضرات اس سفرنامے میں اپنی دلچسپی کے لئے اچھا مواد پائیں گے۔ ہم اس کے دوسرے حصّہ کا بھی بےچینی سے انتظار کر رہے ہیں۔

ابتدائے آرزو

ایک انگریزی ناول کا ترجمہ از جناب شمیم طہوری۔ کتابت وطباعت معمولی۔ ضخامت ۷۰ صفحات قیمت صرف ۸/۔ مصنف موصوف سے ڈاکخانہ طہور ضلع کانپور کے پتہ پر مل سکتا ہے۔

انگلستان کے مشہور فسانہ نگار سر آرتھر کانن ڈائل نے اپنے ملک کی عظمت دکھانے کے لئے "شرلاک ہومز" جیسے سراغ رساں کا کیرکٹر پیش کیا، تو فرانس کے جادو نگار ناولسٹ موریس لی بلانک کے قلم نے اس کے مقابلہ پر "آرسین لوپن" کو لا بٹھایا۔ جو شریف بدمعاش تھا۔ اس قابلِ عظمت چور کے حیرت انگیز کارنامے پڑھنے والے کو انگشت بدنداں کر دیتے ہیں۔ اسی شخصیت کو ہندوستان میں جناب ظفر عمر صاحب بی۔اے (علیگ) نے "بہرام" کا جامہ پہنایا اور ان کے اتباع میں آج کل تمام فسانہ نویس "بہرام" کا کوئی ایک کارنامہ پیش کر کے مقبولیت حاصل کر رہے ہیں۔

ہمارے مکرم دوست جناب شمیم صاحب اس سلسلہ میں بالخصوص مستحق ستایش ہیں۔ کیوں کہ ظفر عمر صاحب کے بعد "بہرام" کے دیگر مختصر فسانے زیادہ تر آپ ہی کی کوشش سے ہمارے سامنے آئے۔ "ابتدائے آرزو" بھی اسی "آرسین لوپن" کے ایک محیر العقول کارنامے کا تذکرہ ہے جس کو شمیم صاحب نے اردو میں ترجمہ کر کے شائع کیا ہے۔ کتاب کی دلچسپی کے لئے مصنف کا نام اور حضرت شمیم کا ترجمہ کہہ دینا کافی ضمانت ہوگا۔ ایک "پان کا ستہ" جس حیرت انگیز طریقہ پر اس عجیب و غریب راز کا انکشاف کرتا ہے وہ ہر انسان کو سکتہ میں ڈال دیتا ہے "بہرام" سے تعلق رکھنے والے حضرات اس کو "آرسین لوپن" کے اصل رنگ روغن میں ضرور ملاحظہ کریں۔

(۲) رسائل

عصمت دہلی جوبلی نمبر

مرتبہ جناب مولانا رازق الخیری صاحب، کتابت وطباعت دیدہ زیب، کئی خوبصورت اور مفید

تصاویر سے مزیّن، ضخامت جوبلی نمبر ۲۰۸ صفحات، چندہ سالانہ مبلغ صہ، قیمت جوبلی نمبر صرف عہ

دارالسلطنت دہلی کا زنانہ ماہوار رسالہ عصمت ایک مدت سے مصوّرِ غم علامہ راشد الخیری صاحب کی سرپرستی میں شایع ہو رہا ہے اور ادبی حلقوں میں بہت کافی وقعت حاصل کر چکا ہے۔ زیر نظر نمبر اس کا جوبلی نمبر ہے۔ جس کی تیاری میں تمام کاوشوں کو ختم کر دیا گیا ہے۔ اس نمبر میں رنگین و سادہ تصاویر بے اندازہ ہیں۔ جن میں سے اکثر کے بلاک جرمنی میں بنوائے گئے ہیں۔ ان تصاویر سے جو بے انتہا دلچسپ، جاذبِ نظر اور طبقۂ نسواں کے لئے مفید ہیں، مرتب کے ذوق انتخاب کا پتہ چلتا ہے۔ مضامین کے لحاظ سے بھی جوبلی نمبر تمام زنانہ رسائل کے خاص نمبروں پر فوقیت لے گیا ہے۔ مستورات کے لئے اس میں ہر قسم کے مضامین موجود ہیں۔ جن سے رسالہ کے بلند معیار کا بھی بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ عصمت بالعموم چھوٹی تقطیع پر شائع ہوتا ہے، مگر اس نمبر کی تقطیع بھی بڑھا کر عام رسائل کی برابر کر دی گئی ہے۔ تاکہ مضامین کی کھپت زیادہ سے زیادہ ہو سکے۔ اس پر بھی مدیر صاحب کو تنگیٔ دامن کا گلہ ہے۔

ہم نہایت مسرت کے ساتھ کارکنانِ عصمت کی خدمت میں اس شان دار اور قابل قدر نمبر کی اشاعت پر دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں، اور امید کرتے ہیں کہ علمی اور ادبی حلقے بالخصوص طبقۂ نسواں اس کی کماحقہٗ قدر کریں گے، اور لائق مدیر کی کوششوں کی داد دیں گے۔

عالمگیر لاہور۔ سالانہ نمبر	رئیس التحریر حافظ محمد عالم صاحب۔ کتابت و طباعت خوبصورت۔ کئی اعلیٰ اور جاذبِ نظر تصاویر سے مزیّن۔ ضخامت ۱۲۲، تقطیع کلاں، چندہ سالانہ چار روپیہ (للعہ)

قیمت سالانہ نمبر صرف ایک روپیہ عہ۔

"عالمگیر" لاہور کے دیگر علمی و ادبی رسائل کی طرح خاص نمبر نکالنے میں ایک گونہ امتیاز رکھتا ہے۔ اپنے خریداروں کو سال میں دو خاص نمبر، جو بڑی تقطیع پر شائع ہوتے ہیں، اسی چندہ میں دیتا ہے۔ کارکنان رسالہ ان نمبروں کے مرتب کرنے میں کافی مہارت حاصل کر چکے ہیں اور ان کا ترتیب دیا ہوا ہر نمبر ایک دوسرے پر فوقیت لے جاتا ہے۔

زیر تنقید نمبر" عالمگیر" کا سالانہ نمبر بابت ۱۹۲۸ء ہے جو گزشتہ جون میں شائع ہوا تھا۔ کئی خوبصورت رنگین اور سادہ تصاویر اس نمبر کی زینت کو دوبالا کر رہی ہیں " وقارِ حسن" اور " عمر خیام کی ایک رباعی" ایسی دیدہ زیب تصاویر ہیں، جو ہر رسالہ کے لئے باعث صد افتخار ہو سکتی ہیں۔ ان کے علاوہ سادہ تصاویر ہیں، جو تصویریں کہ " آثار اسلامیہ اُندلس" سے تعلق رکھتی ہیں انتہائی دل کش، موثر اور عبرت خیز ہیں۔ المختصر یہ کہ تصاویر کا انتخاب قابل داد ہے۔

مضامین کا حصہ بھی اسی طرح مدیر کے بلند معیارِ ادب کا پتہ دیتا ہے۔ اس سالانہ نمبر کے لئے خاص طور پر اردو کے مشاہیر اہل قلم سے مضامین لکھوائے گئے ہیں، جن میں افسانوں کا عنصر زیادہ غالب ہے۔ علمی مضامین کے سلسلہ میں جناب سالک کا مضمون "عہد عالمگیری کے تین ہندو مورخ" جناب قاضی ولی محمد صاحب سکرٹری ہز ہائنس والئی بھوپال کا مضمون "آثار اسلامیہ اندلس" اور جناب نکہت بی اے کا مضمون "بے نقاب نپولین" بے انتہا پر از معلومات، سبق آموز اور دلچسپ ہیں فسانوں میں "اندھی کوٹھڑی" "دولھا کی روح" اور "خفیہ خزانہ" اعلیٰ پایہ کے دلچسپ فسانے ہیں۔ بہ حیثیتِ مجموعی ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ سالانہ نمبر دلکش، جاذب نظر اور قابل داد ہے۔ امید ہے کہ علم دوست اور ادب نواز حضرات اس کی قدر کریں گے، اور کارکنانِ عالمگیر کے "حوصلہ شکن مصارف" کی عملی طور پر داد دیں گے۔

القاسم دیوبند

زیر ادارت حضرت مولانا محمد حبیب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند و جناب طاہر بن احمد القاسمی صاحب۔ تقطیع کتابی۔ چندہ سالانہ مع محصول ڈاک عہ

یہ رسالہ حضرت مولانا شاہ محمد قاسم صاحب نانوتوی مرحوم مغفور بانی دارالعلوم دیوبند کی یادگار میں دارالعلوم دیوبند سے کسی زمانہ میں جاری ہوا تھا۔ لیکن انقلابات زمانہ کی وجہ سے بند ہو گیا تھا۔ اس سنہ ہجری کے شروع سے از سر نو جاری ہوا ہے۔ اور "دارالعلوم دیوبند کا علمی، مذہبی، اخلاقی، تمدنی، تاریخی، ماہوار رسالہ" ہے۔ جس کی عنانِ ادارت حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کے قابل ہاتھوں میں ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے اس کے دو نمبر ہیں۔ پہلا دارالعلوم نمبر جو محرم و صفر کے مہینوں پر حاوی سمجھا گیا ہے اور دوسرا ربیع الاول نمبر۔

پہلا نمبر "دارالعلوم نمبر" کے عنوان سے شایع ہوا ہے، جس میں زیادہ تر مدرسہ دیوبند کے مختصر حالات، اُس کی بابت مختلف آرا کا خلاصہ، اور اس کے اغراض و مقاصد کا مجمل نقشہ کے متعلق مضامین زیادہ ہیں۔ اسی حیثیت سے دارالعلوم کی مختلف عمارتوں کے عکسی فوٹو بھی رسالہ کی زینت ہیں۔ خاص نمبر ہونے کی وجہ سے اس کی تقطیع بھی عام رسائل کی برابر کر دی گئی ہے۔ رسالہ بحیثیت مجموعی دلچسپ ہے۔

دوسرا نمبر پہلے سے بہت مختصر اور کتابی تقطیع پر ہے۔ مضامین کے لحاظ سے مفید اور دلکش ہے۔

مسلمانوں کے لئے اس مذہبی رسالہ کی اعانت ضروری ہے، تاکہ اکثر اوقات وہ اپنے فرائض دینی سے آگاہ ہوتے رہیں اور مسلک اسلامیہ کے صحیح راستہ سے گمراہ نہ ہونے پائیں۔

تعلیم و تربیت لاہور | اڈیٹر۔ ایم عبدالحمید خاں صاحب، پروپرائٹر۔ ایم فیروزالدین اینڈ سنز تقطیع عام رسائل کے برابر۔ چندہ سالانہ عہ۔ فی پرچہ ۳ر

یہ رسالہ بھی دوبارہ جاری کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے ۱۹۱۷ء میں جاری ہوا تھا۔ لیکن بوجوہات بند کر دیا گیا تھا اور "دس سالہ آرام کے بعد اب پھر بفضل خدا جیتی جاگتی محفل دنیا میں دیکھنے بھالنے اور بسنے چالنے کے لئے حاضر ہو گیا" اس رسالہ کے اجراء کے مقاصد کلیتہً تعلیمی ہیں۔ زیر نظر رسالہ دورِ جدید کا پہلا نمبر ستمبر ۱۹۲۸ء کا ہے مضامین کا معیار بلند ہونے کے علاوہ ان سے رسالہ کے مقاصد اجراء پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ بعض علمی و تحقیقی مضامین خوب ہیں اور طلباء اور اساتذہ کے لئے بہترین لائحہ عمل کے حامل ہیں۔ اس بزم میں علامہ ڈاکٹر عبداللہ یوسف علی، پروفیسر سید عبدالقادر میرولی اللہ وکیل، پنڈت شیو نرائن شمیم، پروفیسر محمد شجاع منعمی، خان بہادر مرزا سلطان احمد اور جناب ساغر سیمابی جیسے ناموران ادب جلوہ آرا نظر آتے ہیں۔ مضامین کے سلسلہ میں ایک فسانہ بھی نظر آتا ہے جس کا مقصد اچھی اور بری تربیت کے نتائج دکھلانا ہے لیکن افسوس ہے کہ رسالہ کے عام معیار سے یہ فسانہ بالکل گرا ہوا ہے، اور کسی طرح "تعلیم و تربیت" کے شایان شان نہیں، ہمیں یقین ہے کہ اس مضمون کو اس سے کہیں بہتر انداز میں بھی لکھا جا سکتا تھا۔

بہرحال ہم رسالہ کے مقاصد اجراء کی تعریف کرتے ہیں۔ ایسے رسائل کی بھی ملک کو بہت سخت ضرورت ہے جو خوشامد اور بیجا تعریفوں سے الگ رہ کر تعلیم و تربیت کے لئے ایک صحیح راستہ اور قابل تقلید طریق عمل کی بنیاد ڈالیں ہمیں امید ہے کہ اہل وطن اس رسالہ کی کماحقہٗ قدر کریں گے اور کارکنانِ رسالہ کی ہمت افزائی فرمائیں گے۔

انکشاف لکھنؤ رسول نمبر | زیر ادارت جناب سید محمد نسیم صاحب انہوتوی۔ طباعت و کتابت دیدہ زیب ٹائٹل خوبصورت رنگین۔ ضخامت ۴۸ صفحات۔ تقطیع عام رسائل کے برابر۔

چندہ سالانہ عہ۔ قیمت رسول نمبر ۸ر

شکستہ مساجد اور دیگر مذہبی عمارات کی ترمیم کے لئے لکھنؤ میں "ایک آنہ فنڈ" قایم کیا گیا ہے۔ یہ رسالہ اسی فنڈ کی مدد کی غرض سے جاری ہوا ہے تاکہ اس کے چندہ سے ایک عالیشان مسلم لائبریری کی بنیاد رکھی جائے "ایک آنہ فنڈ" کے اغراض و مقاصد بہر حیثیت بہترین ہیں۔ مسلمانوں کے تنزل اور ادبار کی سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ ان کی مساجد شکستہ اور بے رونق اور ان کی مذہبی عمارات بیکار اور قابل مرمت پڑی رہتی ہیں۔ مسلمانان لکھنؤ نے اس طرف پہلا قدم اٹھایا ہے

خدا اُن کے ارادوں میں برکت عطا فرمائے اور تمام مسلمانوں کو اُن کی تقلید کرنے کی ہمت بخشے۔

"انکشاف" گزشتہ دو تین ماہ سے ہی مجلس ادب میں داخل ہوا ہے۔ زیر تنقید رسالہ اس کا رسول نمبر ہے جو ظاہری اور باطنی خوبیوں میں جاذبِ نظر ہے۔ اس نمبر میں جس قدر مضامین نظر آتے ہیں اُن کا معیار کسی حد تک گرا ہوا ہے جس کے بلند کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ ہمیں امید ہے کہ رسالہ اپنی ابتدائی منازل طے کرنے کے بعد ایک متین اور سنجیدہ روش اختیار کرے گا، اور علمی و ادبی رسائل کے حلقہ میں کافی قدر و منزلت حاصل کرے گا۔

مولوی دہلی، رسول نمبر | مرتبہ جناب مولوی عبدالحمید خاں صاحب دہلوی۔ کتابت و طباعت نہایت نفیس، ٹائٹل باتصویر رنگین، کئی خوبصورت اور مفید تصاویر سے مزین حجم سوا سو صفحات سے زائد۔ تقطیع عام رسائل کے برابر۔ چندہ سالانہ صرف ایک روپیہ (عہ) قیمت رسول نمبر صرف ۱۲ار

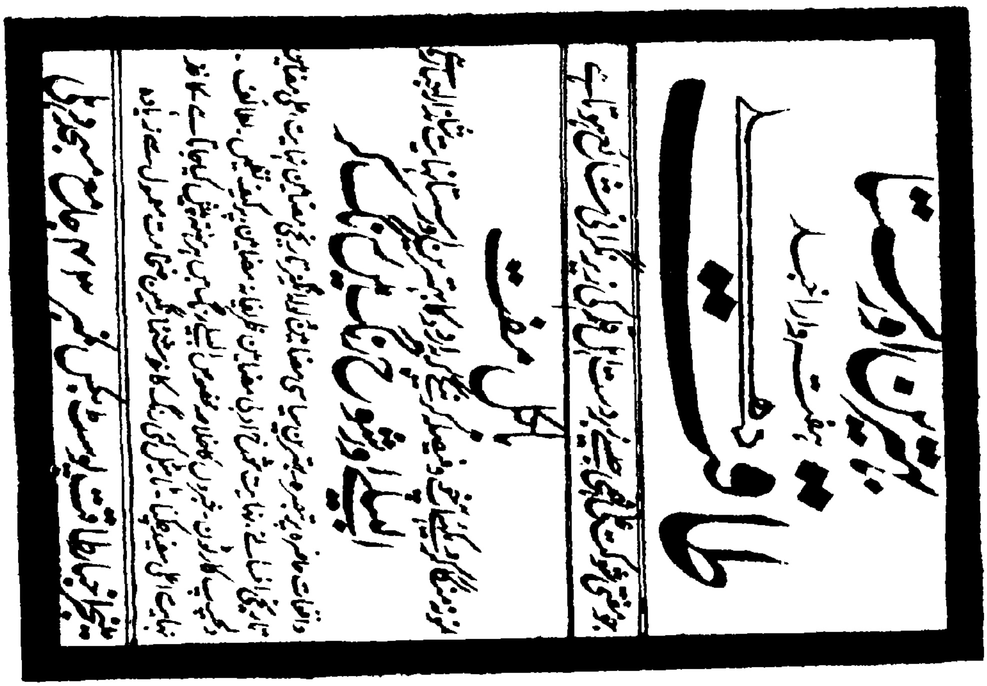
"مولوی" دہلی کا ایک ماہوار مذہبی رسالہ ہے، جو مقتدر علماء کی سرپرستی میں تقریباً چار سال سے شائع ہو رہا ہے زیر تنقید نمبر اس کا رسول نمبر ہے، جو صفر اور ربیع الاوّل کے مہینوں پر حاوی ہے۔ رسول نمبر کی ظاہری اور باطنی خوبیاں یکسر جاذبِ نظر ہیں اور ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ صرف ایک روپیہ سالانہ چندہ میں اس قدر ضخیم اور شاندار نمبر کس طرح دیا جا سکتا ہے۔ کئی خوبصورت اور اعلیٰ پایہ کی تصاویر اس رسالہ کی زینت کو دوبالا کر رہی ہیں جو تمام تر مذہبی عمارات و مواقع سے تعلق رکھتی ہیں لیکن ہمیں دیکھ کر واقعی افسوس ہوا کہ ان تصاویر کے سلسلہ میں ایک تصویر "حجاز میں گھوڑ دوڑ" کی بھی ہے کم از کم اس قسم کے مذہبی رسالہ کو اپنے "رسول نمبر" میں ایسے لہو و لعب کی تصاویر شایع کرنے سے احتراز کرنا بہتر تھا کسی معمولی نمبر میں اگر شایع کر دی جاتی تو زیادہ قابلِ گرفت نہ ہوتی لیکن "رسول نمبر" کی شان ان خرافات سے بالاتر تھی۔

بہر حال کارکنان "مولوی" ہماری دلی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ ایسا عظیم اور مفید نمبر نکالنے میں کامیابی حاصل کی ہے حضور سرورِ کائنات فخرِ موجودات علیہ التحیۃ والتسلیم کی حیاتِ مقدسہ کے مختلف پہلوؤں پر اس نمبر کے لئے ملک کے مشاہیر علماء اور ادباء نے مضامین تحریر کئے ہیں، جن کا مطالعہ ہر مسلمان کے لئے فرض اور ہر غیر مسلم کے لئے ضروری ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ یہ نمبر توقع سے زیادہ مقبول ہوگا۔ اور اہلِ ذوق کارکنانِ رسالہ کی کافی ہمّت افزائی کریں گے۔

اخبار پیغامِ صلح لاہور آخری نبی نمبر | زیر ادارت جناب دوست محمد صاحب و جناب محمد انعام الحق صاحب ہوشیار پوری۔ کتابت و طباعت خاصی۔ ضخامت ۳۲ صفحات تقطیع عام اخبارات کے برابر چندہ سالانہ سے، طلبا سے للعہ، اس نمبر کی قیمت درج نہیں۔

"پیغام صلح" جماعت احمدیہ لاہور کا خاص اخبار ہے، جو ہفتہ میں دو بار شائع ہوتا ہے۔ یہ نمبر اس کا آخری نمبر ہے اس میں مختلف النوع مسائل پر فلسفیانہ انداز میں بہترین مضامین لکھے گئے ہیں۔ ختم نبوت پر اصولی بحث، محاسنِ اخلاق نبوی، ختم نبوت کے خلاف اعتقادات کا رد، غیر مسلم اصحاب کی طرف سے عقیدت کے پھول، خواتین کے مضامین اور ان کے علاوہ دیگر عنوانات پر مشاہیر اہل قلم نے اپنے قلم کا زور دکھایا ہے۔ نثر کے علاوہ نظم کا حصہ بھی خوب ہے اور ٹائٹل کے دوسرے صفحہ پر تین عکسی تصاویر بھی دی گئی ہیں۔

ان حالات کے تحت ہم امید کرتے ہیں کہ "آخری نبی نمبر" بہت مقبول ہوگا، اور کارکنانِ اخبار کی مساعی جمیلہ بار آور ہوں گی۔



دین و مذہب کا زبردست مناد۔ امت مسلمہ کا حقیقی ترجمان۔ مسلم طلبہ کے حقوق کا واحد نگراں

نمونہ مفت منگائیے

نمونہ مفت منگائیے

مہاجر دیوبند

اگر آپ

ہفتہ وار اخبار "مہاجر" دیوبند کے فاضلانہ علمی مقالات تبلیغی ارشادات سیاسی مضامین عربی جرائد کے دلچسپ تراجم۔ اہم خبریں بلند پایہ نظمیں ملاحظہ فرمائیں گے تو ضرور پسند کریں گے۔ اخبار مہاجر کا چندہ کم۔ مضامین بیش قیمت۔ طباعت و کتابت اعلیٰ اور

چندہ سالانہ بہت کم یعنی صرف ۳ ششماہی ۲؍

مہاجر کی خصوصیات

مہاجر کو حضرت علامہ سید انور شاہ صاحب مدظلہ کے عالمانہ نایاب مضامین اور فاضلانہ نظموں کی اشاعت کا فخر حاصل ہے۔

مہاجر میں حضرت مفتی اعظم ہند مولانا عزیز الرحمٰن صاحب کے شرعی فتاوی اور دینی احکام خاص طور پر درج کئے جاتے ہیں۔

مہاجر کے ادارہ تحریر کو ہندوستان کے مستند علماء کی سرپرستی حاصل ہے۔

مہاجر اسلامی طلبہ کی تنظیم کا خواہشمند اور ان کے حقوق کا زبردست حامی ہے۔

مہاجر کے متعلق جرائد ہند کی آراء

طاقت دہلی - پرچہ بہت ہونہار معلوم ہوتا ہے۔

روزنامہ الوحید سندھ - مہاجر میں عام خبروں کی بہترین ترتیب کے ساتھ بلند پایہ عالمانہ مضامین کا کافی حصہ ہوتا ہے۔ مسلمانوں کی موجودہ تحریکات پر شرعی نکتہ نظر سے بحث کرنا اس کا طرۂ امتیاز ہے۔ **علی گڑھ میل** (انگریزی) مہاجر کا مقصد عربی اسلامی درس گاہوں کی ترقی اور بہبود کے لئے مسلمانان ہند کا اعتماد قائم کرنا ہے۔ **صداقت** (سندھ) مہاجر طرز تحریر اور حقائق شناسی کے لحاظ سے قابل دید پرچہ ہے۔ **مبلغ دہلی** - یہ اخبار جس ظاہری اور باطنی صورت سے نکلنا شروع ہوا ہے وہ امید افزا ہے۔ **مدینہ بجنور** مہاجر کی زبان شیریں لہجہ استبداد شکن اور حریت آموز اور ترتیب پسندیدہ ہے۔

حق (لکھنؤ) مہاجر ظاہری اور باطنی محاسن سے آراستہ اور بہمہ وجوہ دیدہ زیب ہے۔

معارف (لکھنؤ) مہاجر مضامین اور ترتیب کے لحاظ سے الانصار سے بہتر ہے۔

مینیجر مہاجر دیوبند

مہاجر کو اسلامی درس گاہوں اور اسلامی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں خصوصی نامہ نگاروں کی ضرورت ہے۔ نامہ نگاروں کو اخبار مفت بھیجا جائے گا۔

علی گڑھ میگزین

جلد (۶)

شمارہ (۱۱و۱۲)

علی گڑھ مُسلم یونیورسٹی

کا

علمی اورادبی دوماہی رسالہ

علی گڑھ میگزین

مرتّب : انیس الدین احمد رضوی ایم اے (علیگ)

طابع وناشر : محمّد مقتدیٰ خاں شروانی

مقام طبع ونشر: مُسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ

فہرست مضامین

مجلس عاملہ علی گڑھ میگزین

سنئر چیرمین

خواجہ غلام السیّدین صاحب بی اے (علیگ) ایم ای ڈی (لیڈز)

اڈیٹر

انیس الدین احمدؒ رضوی ایم اے (علیگ)

مرتبہ: سید انیس الدین احمد رضوی ایم اے (علیگ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علی گڑھ میگزین

مرتبہ

سید انیس الدین احمد رضوی ایم اے (علیگ)

اشاعت ماہ جنوری و فروری ۱۹۲۹ء

شذرات

کوائف دار العلوم دسمبر، جنوری و فروری کے مہینے یونیورسٹی میں ہر حیثیت سے پُر از مشاغل اور انتہائی مصروفیت کے ہوتے ہیں۔ ہر شعبہ ایک حیات تازہ کا مظہر اور ہر محکمہ ایک روحِ عمل کا آئینہ دار ہوتا ہے جس طرف نظر جاتی ہے ایک عجیب دل خوش کن جوش کار برسرِ کار نظر آتا ہے۔ انسانی فطرت ؎

دمادم نقش ہائے تازہ ریزد — بہ یک صورت قرارِ زندگی نیست
اگر امروز تو تصویرِ دوش ست — بہ خاکِ تو شرارِ زندگی نیست

کی صحیح اور سچی ترجمان بن جاتی ہے۔

یونیورسٹی کے طلباء اس فرصت کو مغتنم سمجھکر زندگی کے ہر شعبے میں ایک نئی روح دوڑا دیتے ہیں، کیوں کہ اس عہدِ مسرت کے بعد وہ دَور آتا ہے، جب امتحانات کا عفریت اپنے روح فرسا دہانے اور مہیب دست و بازو کے ساتھ ہر شخص کے دل و دماغ پر مسلط ہوتا ہے

گویا کہ یہ زمانہ "کالج لائف" کا عہد زریں کہلائے جانے کا بجا طور پر مستحق ہے۔

---

۸ و ۹ دسمبر کو انجمن خیابانِ اُردو انٹرمیڈیٹ کالج کی طرف سے سالانہ مشاعرہ منعقد ہوا جس میں ملک کے مشاہیر شعراء نے شرکت فرمائی۔ مولانا حسرت موہانی، حضرت فانی بدایونی، حضرت مانی جائسی، حضرت جگر مرادآبادی، جناب جگت موہن لال صاحب رواں اور دیگر معتدد اہلِ سخن نے اپنے کلام سے طلباء کو مستفیض فرمایا۔ مشاعرہ بہر حیثیت کامیاب رہا۔ ہم اراکینِ انجمن اور بالخصوص حضرت مولانا احسن صاحب رہروی کی خدمت میں اس شاندار کامیابی پر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

اس موقع پر ایک امر کا اظہار ضروری ہے۔ آج کل ملک کے دروبست میں مشاعروں کی قدیم لغو اور بے کار قیود کے خلاف ایک عام احتجاج پایا جاتا ہے۔ ترتیبِ نشست، مصرع طرح، مصرعوں کا اٹھانا اور اس قسم کی دیگر رسمیات کو ترک کرنے کی تحریک ہو رہی ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ ان میں سے اکثر قیود کی پابندی ان مشاعروں میں بالکل نہیں کی گئی اور بقیہ قدیم رسموں کے اتباع میں بھی اس قدر سختی روا نہیں رکھی گئی جتنی کہ ملک کے عام مشاعروں میں ہمیشہ برتی جاتی ہے۔ علی گڑھ نے اپنی تحریک سے احیاءِ زبانِ اُردو میں خاص حصہ لیا تھا، آج بھی علی گڑھ کو ہی منظرِ عام پر آ کر ان زنجیروں کو توڑ دینا چاہیئے، جنھوں نے ملک کی ذہنیت کو جکڑ کر معطل کر رکھا ہے۔

چنانچہ اس کا مشاہدہ ۱۰ دسمبر کے مشاعرہ میں ہوا جس میں انجمن حدیقۃ الشعر مسلم یونیورسٹی کی طرف سے پنجاب کے نامور شاعر حضرت ابوالاثر حفیظ جالندھری مدیر مخزن نے اپنا کلام سنا کر حاضرین کو محظوظ فرمایا۔ قدیم الخیال اصحاب اس مجلس کو مشاعرہ کے نام سے شاید موسوم نہ کریں، کیوں کہ وہاں نہ کوئی مصرع طرح دیا گیا تھا، نہ عنوانِ نظم، نہ شعراء کا مجمع تھا، نہ مصرع اٹھانے کی چیخ پکار۔ صرف حفیظ صاحب نے اپنی نئی تصنیف "شاہنامۂ اسلام" کے چند ابواب اور اس کے علاوہ دو ایک دیگر نظمیں سنائیں اور مشاعرہ ختم ہو گیا، لیکن اہلِ ذوق سمجھ سکتے ہیں کہ اس "مجلس" میں ہی بڑے سے بڑے مشاعروں سے زیادہ حظ حاصل ہوا۔

بی اے پارٹ فرسٹ کے ممتحن کی حیثیت سے حفیظ صاحب علی گڑھ تشریف لائے تھے، ہماری خوش قسمتی کہ دو ایک دوستوں کی وساطت یا "رسوخیت" سے ہمیں بھی شرفِ نیاز حاصل ہو گیا اور ہم نے بلا تکلف انجمن حدیقۃ الشعر کا سکریٹری

ہونے کی حیثیت سے حفیظ صاحب کی خدمت میں استدعا پیش کردی، جو بحمد اللہ کہ قبول کرلی گئی اور اسی کے ساتھ ملک کے مقتدر صاحب قلم جناب سید سجاد حیدر صاحب یلدرم نے اس جلسہ کی صدارت بھی منظور فرمالی۔ سید صاحب موصوف نے اپنی افتتاحی تقریر میں "شاہنامۂ اسلام" اور حفیظ صاحب کے کلام پر روشنی ڈالتے ہوئے آپ کو "اردو کا بانسری بجیّا" اور "اسلام کا شہنائی نواز" کہہ کر مخاطب کیا۔

۲۱ر جنوری کو اسٹریچی ہال میں کانووکیشن کا جلسہ منعقد ہوا۔ یونیورسٹی کی سنہ ۱۹۲۸ء کی رپورٹ پیش کی گئی۔ کامیاب طلباء اپنی محنت اور کاوش کے ثمرات سے بہرہ اندوز ہوئے اور آخر میں حکومت ہند کے مشیر تعلیمی آنریبل مسٹر لیسٹل ہیلیر نے اپنا فاضلانہ خطبہ پڑھا۔ ہم اس موقع پر جناب پرو وائس چانسلر صاحب کا ان حوصلہ افزا خیالات کے لئے شکریہ ادا کرتے ہیں جو آپ نے علی گڑھ میگزین کی بابت ظاہر فرمائے اور امید کرتے ہیں کہ میگزین بھی حتی الامکان ان توقعات کو پورا کر دکھائے گا جو اس کی جدید نظامت سے وابستہ ہیں۔

کانووکیشن کے فوراً بعد یونیورسٹی یونین کا الیکشن ۲۴ر جنوری کو ہوا۔ اس سال ڈے اسکالرس کو شامل کرلینے کی وجہ سے رائے دہندگان کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ ہوگیا تھا۔ تاہم یونین کے وائس پریسیڈنٹ، مسٹر عطاء اللہ جان خاں صاحب اور ان کی منسٹری نے نہایت حسن انتظام اور اہلیت کا ثبوت دیا اور الیکشن بہ حسن و خوبی ختم ہوا۔ ہم کامیاب امیدواران یعنی قاضی غیاث الدین صاحب وائس پریسیڈنٹ، حفیظ الرحمن صاحب سکرٹری اور ذکی الدین احمد صاحب لائبریرین اور جملہ اراکین کابینہ کی خدمت میں ان کی اس کامیابی پر دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ اپنے دور کارکردگی میں اپنی تمام ذمہ داریوں کو محسوس کرکے یونین کی قدیم مایۂ ناز روایات کو قائم رکھیں گے۔

گزشتہ سال ہمیں ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب کو پیغام وداع دینا پڑا تھا، اس سال زمانہ کی رفتار نے ایک اور ہستی کے فیضان اثر سے ہمیں محروم کردیا۔ اردو زبان کا مایۂ ناز فرزند یلدرم آج علی گڑھ سے رخصت ہوچکا ہے اور علی گڑھ کی فضا اس کے وداع پر اشکبار ہے۔ سید سجاد حیدر یلدرم کا وجود علی گڑھ میں اردو کی بنیاد کو قائم کئے ہوئے تھا اور اس صحبت دوشینہ کی

یاد تازہ کر رہا تھا، جس کا خمار ابھی تک اُردو کے متوالوں کو سرشار بنائے ہوئے ہے۔ ترکی زبان کے ماہر ہونے کی وجہ سے آپ نے علی گڑھ میں ایک ایسی پُرکیف فضا قائم کردی تھی، جس میں ترکی اور اُردو ادب کے شاہکار بایک دگر ہم آغوش ہوکر مسرت کی لہریں لے رہے تھے۔

بالآخر آج ہم اُردو کے اس قابل صد نازش ادیب اور علی گڑھ کے اس موجبِ صد افتخار فرزند کو الوداع کہہ رہے ہیں جس نے اس مادرِ علمی کے آغوشِ محبت میں اپنی عمر کا عزیز ترین حصہ بسر کیا اور جس نے اپنی قوم اور اپنی زبان کے لئے طفلی اور شباب کے سنہری زمانوں کو قربان کردیا۔ اس امر کا اظہار بے سود ہے کہ علی گڑھ کی یاد یلدرم کے دل سے کبھی محو نہ ہوسکے گی اور یہاں کے کیفِ محبت سے سرشار مناظر ان کے دل کو ہمیشہ بے چین رکھیں گے، تاہم اتنا کہہ دینا بھی ضرور ہے کہ علی گڑھ کی فضا بھی اپنے عزیز ترین دوست کو کبھی فراموش نہ کرسکے گی اور یلدرم کی آواز علی گڑھ کے گوشہ گوشہ میں برابر گونجتی رہے گی۔

اس عرصہ کا اہم ترین واقعہ جو یونیورسٹی کے دورِ حیات میں شاید تاریخی اہمیت حاصل کرلے ۹ و ۱۰ فروری کو یونیورسٹی کورٹ کا اجلاس ہے۔ قوم و ملت کی عظیم ترین ہستیاں اپنے واحد قومی ادارۂ تعلیمی کو بدنظمیوں سے بچانے اور رحمت اللہ کمیٹی کی رپورٹ پر کامل غور و خوض کرنے کے لئے، رامپور حامد ہال میں جمع ہوئیں۔ ہر ہائنس والدہ بیگم صاحبہ اور ہز ہائنس نواب صاحب بھوپال نے بھی اپنی چند در چند مشغولیات کے باوجود یونیورسٹی کی بہتری کو مدنظر رکھا اور تشریف لانے کی زحمت گوارا فرمائی۔

کامل دو دن مجلس مشاورت گرم رہی اور بالآخر قوم کے بہترین دماغوں نے یونیورسٹی کی مشکلات کا حل سوچ لیا۔ سید راس مسعود، جو سرسیّد کے پوتے ہونے کی وجہ سے ایک بڑی حد تک اس عہدہ کے مستحق اور حیدرآباد میں انتظامی امور کا تجربہ حاصل کرلینے کی بنا پر سب سے زیادہ اہل تھے، وائس چانسلر مقرر کئے گئے۔ سید صاحب کے انگلستان سے واپس آنے تک اس عہدہ کا عارضی چارج ڈاکٹر سلیمان، چیف جسٹس الہ آباد ہائی کورٹ کو دیا گیا۔ پرو وائس چانسلر کا تقرر فی الحال ملتوی کردیا گیا لیکن اس کے لئے ایک کمیٹی بنادی گئی۔ اس کے علاوہ اگزیکٹیو کونسل کے نظام ترکیب میں بھی چند اصلاحات کی گئیں۔ مختصر طور پر یہ ہیں وہ تحریکات اور اصلاحات جو پیش ہوکر منظور کی گئیں۔ آج یہ کہنا شاید قبل از وقت ہوگا کہ یونیورسٹی کے

تمام لاینحل امور کا کما حقہ فیصلہ ہوگیا اور تمام مشکلات ایک دم رفع ہوگئیں۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ اس جدید نظامت سے قوم و ملت کی توقعات بہت کچھ وابستہ ہیں اور ہمیں امید ہے کہ یہ توقعات اگر حرف بہ حرف نہیں، تو ایک بڑی حد تک ضرور پوری ہوکر رہیں گی۔

ہم مندرجۂ بالا توقعات کا اظہار ہی کرنے پائے تھے کہ ایک عجیب وحشت اثر خبر نے تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اور یہ ساری توقعات قبل از وقت ہی پژمردہ ہوکر رہ گئیں یعنی یہ کہ سید راس مسعود صاحب نے ریاست حیدرآباد کی سیاسی نظامت کا عہدہ قبول فرمالیا، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلر شپ سے آپ کو انکار کردینا پڑے گا۔ اس خلافِ توقع خبر نے علی گڑھ کو پھر اسی حالتِ تذبذب میں مبتلا کردیا، جو کورٹ کے اجلاس سے قبل طاری تھی اور سکون اور اطمینان کی وہ فضا جس نے اس قلیل عرصہ میں علی گڑھ کے در و بست پر تسلط جمالیا تھا، منتشر ہوکر رہ گئی۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ علی گڑھ کی قسمت کا تصفیہ کس طرح ہوتا ہے۔ ہم بھی آئندہ واقعات کے ظہور پزیر ہونے کے بے چینی کے ساتھ منتظر ہیں۔

ایک اہم تجویز یونیورسٹی کی تاریخ صحافت پر اگر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ گزشتہ عرصہ میں حدود یونیورسٹی سے علی گڑھ میگزین کے علاوہ متعدد رسالے اور جرنل برآمد ہوئے، کچھ مدت تک منصۂ شہود پر جلوہ فگن رہے اور پھر کتم عدم میں روپوش ہوگئے۔ یونیورسٹی میں کئی سوسائٹیاں قائم ہیں اور آج کی تاریخ تک تقریباً ہر سوسائٹی اس عرصہ میں کبھی نہ کبھی ایک رسالہ ضرور نکال چکی ہے۔ دی جاگرفیر ہماری نظر سے گزر چکا ہے۔ فلاسوفیکل جرنل کو ہم دیکھ چکے ہیں۔ سہیل اپنی نظر فریب آب و تاب سے ہماری نگاہوں کو خیرہ کرچکا ہے۔ سائنٹفک جرنل اپنا جلوہ دکھا چکا ہے اور آج فضائے بسیط پر کیمیکل سوسائٹی کا سیارہ نیا نیا نمودار ہوا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ جب یہ تمام رسالے صرف چند روزہ حیات لے کر آتے ہیں، تو ان کے اجراء سے کیا فائدہ متصور ہوتا ہے۔ مانا کہ نوجوان ذہنیتیں جوشش فراواں کی علمبردار ہوتی ہیں اور سوسائٹی کو تقریباً ہر سال ایک جدید سکرٹری کے دورِ عمل سے سابقہ پڑتا ہے، لیکن یہ کیا ضرور ہے کہ ہر جدید سکرٹری اور ہر نوجوان ذہنیت صرف اپنے زمانۂ نظامت سے سروکار رکھے اور اپنے جانشینوں کے لئے مستقبل کا خوفناک غار چھوڑ جائے۔ کیا وہ کوششیں جو فرداً فرداً دنیائے صحافت میں اپنا نام پیدا کرنے کے لئے کی جاتی ہیں، یکجا نہیں کی جاسکتیں؟ رسالہ نکلتا ہے، دو چار روز دوست احباب کے گروہ میں اڈیٹر صاحب کی تعریفیں ہوتی ہیں کہیں کہیں سے ایک آدھ غیر مانوس مخالف آواز بھی آجاتی ہے، غریب سوسائٹی کے اوپر کچھ بار ہوجاتا ہے

اسی طرح ایک آدھ نمبر اور نکل جاتا ہے، پھر اڈیٹر صاحب علی گڑھ سے انتقال فرما جاتے ہیں اور اس کے بعد رسالہ کا کہیں نام بھی نہیں سنائی دیتا۔ اجراء کے وقت لوگوں کے ذہن اس فریبِ تخیل میں گرفتار ہوجاتے ہیں کہ اس سے علی گڑھ کا نام روشن ہوگا۔ اس سوسائٹی منظرِ عام پر آجائے گی۔ لیکن خیال تو فرمائیے، کیا یونیورسٹی کا نام روشن کرنے کا واحد ذریعہ یہی ہے، کیا آپ کی سوسائٹی صرف اسی طریقہ سے مشہور ہوسکتی ہے۔ غور کیجئے تو صاف ظاہر ہوجائے گا کہ جس کام کو آپ شہرت کا ذریعہ سمجھ کر اُٹھاتے ہیں، بالآخر وہی یونیورسٹی کی رسوائی اور بدنامی کا باعث بن جاتا ہے اور اغیار کو انگشت نمائی کا موقع مل جاتا ہے کہ اس یونیورسٹی کے طلباء کسی کام کو بڑے جوش و خروش کے ساتھ اُٹھاتے ہیں لیکن چلانے کی مقدرت اور اہلیت نہیں رکھتے کیا یہ آپ کی سوسائٹی سے زیادہ آپ کی عزیز یونیورسٹی کے لئے باعثِ توہین نہیں؟ پھر کیا وجہ ہے کہ عام قومی مفاد کو ذاتی اور شخصی مفاد پر بلا تکلف قربان کردیا جاتا ہے۔

اب تصویر کے دوسرے رخ پر نظر ڈالئے۔ اگر یہی کوششیں، جو ہر سکرٹری اپنا علیحدہ رسالہ نکالنے میں صرف کرتا ہے متحدہ طور پر یونیورسٹی کے واحد علمی اور ادبی مجلہ یعنی علی گڑھ میگزین کے لئے استعمال کی جائیں تو بہت زیادہ مفید ثابت ہونگی۔ اُردو سیکشن کا معیار بلند سے بلند تر ہوجائے گا، اس کے مضامین کا تنوع الگ جاذبِ نظر ہوگا اور اس کی ظاہری آب و تاب میں اور اضافہ ہوجائے گا۔ انگریزی سیکشن کی حالت کہیں بہتر ہوجائے گی، اس میں طلباء کے دماغی جواہر پاروں کی افراط ہوگی اور اس کے بعد ہم ملک اور اہلِ ملک کے سامنے کوئی چیز پیش کرکے مفخرانہ طور پر سربلند ہوسکیں گے۔

ان تمام رسائل میں اگر کسی رسالہ نے کچھ عرصہ ہنگامہ آفرینی کی ہے اور دنیائے ادب میں درخشاں ستارہ ہو کر چمکا ہے، تو صرف انجمن اُردوئے معلیٰ کا سہ ماہی علمی رسالہ سہیل، جو پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی ایم اے کی ادارت میں ڈیڑھ سال تک جاری رہ کر بالآخر اسی آب و ہوا کا شکار ہوگیا، جو منفردہ مساعی کے لئے فطرت نے روزِ ازل ہی سے مقسوم کردی تھی۔ چند معتبر حلقوں میں یہ افواہ بھی گرم ہے کہ اس کا ایک وداعی نمبر نکلنے والا ہے، جس کے بعد اسے "باقاعدہ طور پر" بند کردیا جائیگا۔ خدا کرے کہ یہ وداعی نمبر ہماری علی گڑھ کی زندگی کے دوران میں ہی برآمد ہوجائے گا، تاکہ اس کا آخری دیدار جی بھر کے کرلیا جائے لیکن ہماری عرض یہ ہے کہ بالآخر رشید صاحب کی مساعی کا بھی وہی انجام ہوا، اور اُردو دنیا اس اعلیٰ پایہ کے علمی رسالہ سے ہمیشہ (؟) کے لئے محروم ہوگئی۔

ان واقعات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اور اس کے بعد اس آئندہ ماحول پر توقعات قائم کرتے ہوئے جو انجمن ترقی اُردو کا

دفتر اورنگ آباد سے علی گڑھ منتقل ہونے اور اُردو کے قدیم "موروثی" محسن جناب سید راس مسعود صاحب کے وائس چانسلر مقرر ہونے سے لازمی وابستہ ہیں، کیا یہ ہماری تجویز قابلِ غور نہیں ہو سکتی کہ تہیں اور اس کے علاوہ تمام دیگر انفرادی رسائل کو علی گڑھ میگزین میں مدغم کرکے یونیورسٹی کے واحد مجلّہ کو بہتر سے بہتر بنانے کی ہر امکانی کوشش کی جائے۔ ہم یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد سے اور بالخصوص ان لوگوں سے جو ادبیات سے شغف رکھتے ہیں' درخواست کرتے ہیں کہ اپنے لمحاتِ فرصت میں اس تجویز پر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں اور بشرطِ پسند اپنی امکانی کوششیں اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے میں صرف کر دیں۔

کوائف افغانستان | نیا سال ہر ملک اور ہر قوم کے لئے نئی نئی توقعات لے کر آیا کرتا ہے اور انھیں توقعات کی بدولت ہر جگہ اس کا خیر مقدم دلی تپاک اور جوش وخروش کے ساتھ کیا جاتا ہے لیکن ۱۹۲۹ء دولت افغانستان کے لئے توقعات کے بجائے توہمات کا انبار اور نامرادیوں کے خزانے لے کر آیا' اور اپنے سبز قدموں کی "سعادت" سے اس کوہستانی علاقہ کو جہالت اور قدیم الخیالی کے تاریک غاروں میں ٹھوکریں کھانے کے لئے پھینک گیا۔ وہ ملک جو آج سے دس سال پیشتر متمدن اور مہذب ممالک میں سب سے زیادہ جاہل' سب سے زیادہ غیر ترقی یافتہ اور سب سے زیادہ وحشی گنا جاتا تھا' ایک اولوالعزم شہریار کی بدولت اس قلیل ترین مدت میں بامِ ترقی کی فلک بوس رفعتوں پر پرواز کرنے لگا تھا۔ لیکن فطرت کو ابھی یہ منظور نہ تھا' ابھی افغانستان نے خود غرض اور حریص ملاؤں کے دامِ تزویر کا تجربہ نہیں اٹھایا تھا۔ ابھی اس کو جہالت اور روشن خیالی میں تمیز کرنے کی اہلیت نہیں پیدا ہوئی تھی' اور فطرت افغانیوں کو یہ سبق دینا ضروری سمجھتی تھی۔

صرف ہندوستان ہی نہیں' بلکہ دنیائے اسلام کا گوشہ گوشہ اعلیٰ حضرت شہریار غازی امان اللہ خاں خلد اللہ ملکہ کے ساتھ ان کے ایام مصیبت اور دورِ ابتلاء میں ہمدردی کا اظہار کر رہا ہے' صرف زبانی ہی نہیں بلکہ عملی طور پر بھی آزادی کی جد وجہد میں حصہ لینے کو تیار ہے۔ افغانستان میں حالات وواقعات اس قدر سرعت سے تغیر پزیر ہو رہے ہیں کہ یقینی طور پر کوئی بات نہیں کہی جا سکتی۔ ہر طرف طوائف الملوکی کا دور دورہ ہے جو جرگہ ذرا قوت واقتدار حاصل کر لیتا ہے' اس کا سردار بلا تامل تخت وتاج کے خواب دیکھنے لگتا ہے اور اس طرح اُمیدواروں کی فہرست میں ایک کا اضافہ اور ہو جاتا ہے۔

بہرحال مستقبل کی بابت کوئی صحیح پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی۔ واقعات کی رفتار دیکھئے اس اسلامی ملک کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہے مسلمانانِ ہند کی آنکھیں بے چینی کے ساتھ اپنے ہمسایہ کی کش مکش حیات کا نظارہ کر رہی ہیں' کیوں کہ ہندوستان

کی آئندہ معاشرت اور رفتارِ ترقی کا انحصار بہت کچھ اسی ملک کی قسمت کے فیصلہ پر ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ دل سے شہریار غازی ہی کو کابل کے تخت پر دیکھنا چاہتے ہیں۔

حوادثِ ارتحال حال ہی میں مسلمانانِ ہند کو اپنی دو باکمال ہستیوں کا ماتم کرنا پڑا یعنی سر محمد رفیق اور مسٹر ڈی۔جی۔ ایسن۔ دونوں ہستیاں رفاہِ عام کے لئے اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے جو خدمات انجام دے رہی تھیں وہ محتاجِ تشریح نہیں۔ سر محمد رفیق علی گڑھ کے اولڈ بوائے تھے اور ان شخصیتوں میں سے تھے، جن پر علی گڑھ بجا طور پر فخر و ناز کر سکتا ہے۔ مسٹر ایسن ان انگریزوں میں سے تھے، جنھوں نے قومی تعصب اور تنگ نظری کو بالائے طاق رکھ کر اسلام کے پاکیزہ اصول کو قبول کر لیا تھا۔ اور دینِ برحق کے سچے پیرو بن گئے تھے۔ آپ "مسلم آؤٹ لک" کے اڈیٹر تھے اور اس حیثیت میں ہر موقع پر مسلمانوں کے حقوق کی نگہداشت کرنا اور ان کی آواز حکومتِ ہند کے کانوں تک پہنچانا، اپنا فرض سمجھتے تھے۔ ہم ان دو باکمال ہستیوں کی رحلت پر اپنے دلی رنج و الم کا اظہار کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ انھوں نے اسلام اور مسلمانوں کی جو خدمات انجام دی ہیں خداوندِ کریم ان کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے۔

اس کے بعد علی گڑھ کے ایک نوجوان فرزند کا ماتم کرنا ہے۔ سید حسن رضوی جو چار پانچ سال سے یہاں تعلیم پا رہے تھے اور گزشتہ سال ہی چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر اپنی تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنے پر مجبور ہوئے تھے، جنوری کے آخری ایام میں بعارضۂ طاعون حیدرآباد میں انتقال کر گئے۔ مرحوم نے دو سال بی ایس سی کا امتحان دیا، لیکن دونوں مرتبہ قسمت نے یاوری نہ کی۔ اس کے بعد طبیہ کالج میں داخلہ لیا، لیکن صرف چند ماہ تعلیم حاصل کر کے چھوڑ دینا پڑا۔ مرحوم نے اپنی عمر کی ۲۸ منزلیں بہ مشکل ختم کی ہونگی کہ داعیِ اجل کا پیغام آ گیا۔ ہم اس حسرت ناک موت پر ان کے پس ماندگان، بالخصوص ان کے برادرِ خرد سید محسن رضوی، ایم ایس سی (علیگ) سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ خداوندِ کریم مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

الوداع

علی گڑھ میگزین کا دورِ حیات، زمانہ کے تغیر و تبدل کا ہمیشہ سے آئینہ دار رہا ہے۔ جس طرح زمانہ کبھی ایک صورت پر قرار پذیر نہیں ہوتا اسی طرح میگزین کے ادارۂ تحریر کو ایک حال پر قرار نہیں آتا۔ ہر نیا سال نئی اُمنگوں اور نئے ولولوں کے ساتھ ایک نئے مدیر کو دنیائے ادب کے سامنے پیش کرتا ہے اور اپنے اختتام پر اس کو برطرف کرکے "مایۂ خویش" کو دوسروں کے سپرد کر دیتا ہے۔ چنانچہ اسی کلیہ کے تحت آج ہمیں بھی اس بزم سے رخصت ہونا پڑ رہا ہے، حالانکہ ابھی تک تیقن کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہمارے بعد اس "مئے مرد افگن" کا حریف ہونے کے لئے زمانہ کس کو برسرِ کار لائے گا۔

بہرحال ہمارا زمانۂ ادارت ختم ہو گیا۔ اس ایک سال میں ہم نے جس بُری یا بھلی طرح میگزین کی خدمت کی اور میگزین کے ذریعے سے جو مواد دنیائے ادب کے سامنے پیش کیا، اس کی بابت ہم خود کچھ کہنا نہیں چاہتے، بلکہ اس کا اندازہ ناظرین ہی کے حسنِ تخیل پر چھوڑتے ہیں۔ البتہ اتنا عرض کرنا ضروری ہے کہ اپنے افتتاحی نمبر میں ہم نے جو مواعید کئے تھے، کم از کم اپنے نزدیک تو ان کو حرف بہ حرف پورا کرنے کی امکانی کوشش کی ہے۔ اور میگزین کی قدیم روایات کو اپنے معیار کے موافق قائم رکھنے میں اپنی طرف سے کوئی کمی نہیں کی۔ اسی لحاظ سے آج ہم سمجھتے ہیں کہ اپنے فرائضِ منصبی سے فخر و ناز کے ساتھ عہدہ برآ ہو رہے ہیں۔

لیکن میگزین کو اس کامیابی کے ساتھ چلانے کی ذمہ داری بہت حد تک ہمارے معاونین کے سر ہے، جن کا دلی شکریہ ادا کرنا ہم اس موقع پر اپنا فرضِ اولین خیال کرتے ہیں۔ اگر خدا کے فضل و کرم کے ساتھ ہمارے معاونین کی امداد ہمارے شاملِ حال نہ ہوتی، تو ہم اپنی ذمہ داریوں سے اس قدر آسانی کے ساتھ کبھی سبکدوش نہ ہو سکتے تھے۔ سب سے پہلے ہم اپنے بزرگ مکرم جناب قاضی جلال الدین صاحب ایف آر جی ایس اور ان کے جانشین جناب خواجہ غلام السیدین صاحب بی اے، ایم ای ڈی کا شکریہ ادا کرتے ہیں، جنھوں نے بہ حیثیت سنسر کسی طرح ہماری امداد و اعانت سے دریغ نہیں کیا اور میگزین کے ساتھ انتہائی شغف اور دلچسپی کا اظہار کیا۔ اسی کے ساتھ انٹرمیڈیٹ کالج کے سنسر جناب محمد عبدالشکور صاحب ایم اے، بی ٹی (علیگ) کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے کہ آپ نے برابر میگزین کا خیال رکھا اور بالخصوص تعلیلات نمبر کی ترتیب میں ہماری ہر طرح امداد فرمائی۔

اس کے بعد ان مضمون نگار حضرات کی خدمت میں ہدیۂ امتنان پیش کرتا ہے جنھوں نے اپنے رشحاتِ قلم اور نتائجِ افکار سے میگزین کی قلمی معاونت فرمائی، بالخصوص مولوی محمد عبدالرزاق صاحب کانپوری، جناب شمیم لاہوری، جناب میاں محمد اسلم صاحب لاہوری

حضرت ابوالنظر رضوی امروہوی، جناب کیفؔ مرادآبادی، جناب محمد علی خاں صاحب اثرؔ رامپوری اور دیگر اہل قلم حضرات نے ہماری درخواستوں کو کبھی "عرقِ مئے ناب" نہ بننے دیا۔ لیکن ان سب سے زیادہ ہمارے محترم دوست جناب ضیاء احمد صاحب ایم اے لکچرار اردو انٹرمیڈیٹ کالج علی گڑھ، ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں۔ اس عرصہ میں ہمیں جب کبھی ان کی امداد کی ضرورت پیش آئی ہم نے بلا تکلف آپ کا دروازہ جا کھٹکھٹایا، اور آپ نے بھی کبھی ہماری مدد و اعانت سے دریغ نہیں کیا۔ ان تمام اصحاب قلم کی خدمت میں ہم دلی امتنان و تشکر کا ہدیہ پیش کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ ہمارے جانشین بھی ان حضرات سے اسی طرح مستفید ہونے کی کوشش کرتے رہیں گے۔

میگزین کے دیگر امور کو سرانجام دینے میں ہمیں اپنے چند دوستوں سے بھی بہت زیادہ امداد ملی، جن میں سب سے پہلے ہمارے سابق معاون جناب حبیب اللہ خاں صاحب غلزئی کا شکریہ ضروری ہے۔ بہ حیثیت معاونِ مدیر جب تک آپ کا میگزین سے تعلق رہا، آپ ہر طرح اس کے کام میں نہایت دلچسپی کے ساتھ حصہ لیتے رہے اور ہمارا ہاتھ بٹانے میں ہر امکانی کوشش کرتے رہے آپ کے علاوہ جناب شفیق احمد صاحب غازی بی اے (علیگ) اور جناب قاضی نعمان جلالی صاحب جو نہایت خلوص اور دلچسپی کے ساتھ میگزین کے متفرق امور میں ہمارے شریک کار رہے۔ ان سب حضرات کا شکریہ ادا کرنا ہمارا فرض ہے۔

سب سے آخر میں جناب مولانا حاجی محمد مقتدیٰ خاں صاحب منیجر مسلم یونیورسٹی پریس اور ان کے عملہ کا شکریہ ادا کرنا ہے آپ نے اور پریس کے دیگر اصحاب نے ہمیشہ میگزین کے کام کو دوسرے کاموں پر مقدم رکھا اور ہم بلاخوفِ تردید کہہ سکتے ہیں کہ میگزین کی دیدہ زیبی اور ظاہری محاسن کا سہرا تمام تر پریس کے سر ہے۔

انیس رضوی

اڈیٹر

تصویر | اس اشاعت میں ٹیپو سلطان والیٔ میسور کی ایک اریجنل تصویر کا چربہ شائع کیا جا رہا ہے۔ یہ تصویر یارکوس آف ولزلی کی خدمت میں ہدیۃً پیش کی گئی تھی۔ افسوس ہے کہ تصویر چھاپنے والے (کلکتہ آرٹس پرنٹنگ ورکس لاہور) کی غلطی سے اس پر خاکسار اڈیٹر کا نام بھی خواہ مخواہ چھپ گیا۔

علوم العرب

(عہد جاہلیت)

جزیرۃ العرب ایک ریگستانی اور سنگ لاخ ملک ہے، جس میں چاروں طرف پہاڑوں کا زنجیرہ ہے۔ اس وجہ سے جاہلیت میں بھی عرب فن زراعت میں ترقی نہ کر سکے اور چوں کہ یہ قانون قدرت ہے کہ ملک کی طبعی حالت، انسان کی عام معاشرت پر زبردست اثر ڈالتی ہے، اس لئے عرب مویشی پالنے پر مجبور ہوئے اور مویشی میں بھی گھوڑا اور اونٹ اُن کا خاص رفیق تھا اور بکریاں خوراک میں کام آتی تھیں۔

جب ان حیوانات کی ترقی ہوئی تو چراگاہوں میں ان کو اپنے اپنے مقام سے نکلنا پڑا اور یہی بدوی زندگی ان کا شعار ہو گئی۔ چوں کہ موجودہ ذریعۂ معاش (گلہ بانی) فارغ البالی کے لئے کافی نہ تھا، اس لئے لوٹ اور قتل و غارت کی ضرورت ہوئی اور اس میں بھی اس قدر انہماک ہوا کہ اقارب اور اغیار کا امتیاز اُٹھ گیا اور اس خانہ جنگی کی بدولت ان کو ایک جگہ جم کر رہنا دشوار تھا۔ قبائل کی اگرچہ یہ معمولی نقل و حرکت تھی، لیکن انھیں اسباب سے اُن میں علوم و فنون کی بنیاد پڑی مثلاً گھوڑوں اور اونٹوں کی کثرت سے **تربیت الخیل** اور **بیطاری** کا فن ایجاد ہوا۔

اسی طرح روزمرہ کے کوچ و مقام اور طبعی حوادث نے **علم الانواء** (نچھتر) اور **علم ہبوب الریاح** (موسمی ہواؤں کا چلنا) کا راستہ دکھایا، کیوں کہ منزلوں کے طے کرنے میں اس وقت عربوں کے راہ نما صرف ستارے تھے اور عرب کا مطلع بھی دیگر ممالک کے مقابلہ میں بہت زیادہ صاف تھا لہٰذا روز بروز جدید انکشاف ہونے لگے اور فلکیات کا علم ترقی کر گیا اور اسی قسم کے قدرتی اور طبعی اسباب نے طبعیات (طب وغیرہ) کی بنیاد ڈالی۔ بحر قلزم بحرِ ہند اور خلیج فارس کے قرب اور وسائل تجارت نے **علم الملاحۃ** (کشتی رانی) میں اُستاد بنا دیا۔ جنگ و جدال میں قبائل ایک دوسرے کی اعانت کے محتاج تھے اور اُن میں عصبیت، ارتباط اور اتحاد کی سخت ضرورت تھی لہٰذا

اس مقصد نے علم الانساب کو رواج دیا اور چوں کہ قتل و غارت کے بعد ہر ایک قبیلہ اپنے دشمن کے تعاقب میں جاتا تھا اس ضرورت سے علم الاہتداء (جنگل اور ریگستان میں صحیح راستہ پر چلنا) اور علم القیافہ (علم نقش قدم) ایجاد ہوا۔

عرب میں کوئی دریا نہیں ہے اور ریگستان میں پانی نایاب ہوتا ہے اور پھر لطف یہ ہے کہ آئے دن قحط کا سامنا رہتا ہے۔ اس ضرورت سے علم الریافہ (زمین سونگھ کر دریافت کر لینا کہ پانی کس قدر گہرائی میں ہے) کی بنیاد پڑی اور جنگ و جدال سے علم الرمی بالسہام (نیزہ بازی) پیدا ہوا۔

خلاصہ یہ ہے کہ ضرورت نے بہت سے مفید علوم پیدا کر دیئے۔ باقی رہے معارف علمیہ یہ اس ملک کا حصہ ہے جہاں ایک مہذب گورنمنٹ کی حکومت ہو اور رعایا فکر معاش سے مطمئن اور ہر فرد بشر کا جان و مال محفوظ ہو۔ اس اعتبار سے عہد جاہلیت میں جس قدر علوم ایجاد ہوئے وہ عربوں کی ذہانت اور فراست کی ایک بین دلیل ہیں۔ کیوں کہ انھوں نے یہ علوم کسی مدرسہ میں حاصل نہیں کئے اور کیوں کر حاصل کرتے جب کہ اکتساب کے وسائل ہی مفقود تھے، البتہ اس کی تفصیل یہاں کرنا مشکل ہے کہ عرب البائدہ[1] میں کس قسم کے علم و فن موجود تھے، کیوں کہ ان قبائل کا زمانہ عہد تاریخ سے بہت پہلے تھا۔ باقی رہے عرب العاربہ (بنو قحطان) یہ علوم و فنون، صنائع اور تمدن میں سیکڑوں برس پہلے ترقی کر چکے تھے۔

عربوں کا تیسرا طبقہ عرب المستعربہ (بنی اسمٰعیل و عدنان) انتہائی ضلالت اور جہالت میں مبتلا تھا اور اسی بناء پر یہ طبقہ اُمت الامیہ (ان پڑھ قوم) کہلاتا تھا اور قرآن کریم نے بھی ان کو اسی لقب سے یاد کیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ	وہی ہے کہ جس نے ان پڑھوں میں انھی میں سے
رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ	ایک رسول بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے
اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ	اور ان کو پاک کرتا اور ان کو علم کتاب و حکمت سکھاتا ہے
وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ	اور بے شک اس سے پہلے تو وہ صریح گمراہی میں پڑے
لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ	ہوئے تھے

---

[1] عرب البائدہ سے وہ قومیں مراد ہیں جو فنا ہو چکی ہیں۔ مثلاً قوم عاد (سنہ ۲۲۰۰ ق م لغایۃ سنہ ۱۵۰۰ ق م) و ثمود (سنہ ۱۸۰۰ ق م لغایت سنہ ۱۶۰۰ ق م) اور جن کا تذکرہ قرآن حکیم میں موجود ہے۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ اُمیّین سے یہی جاہل عرب مراد ہیں اور ان کی انتہائی جہل کی تصدیق لفظ میان سے ہوتی ہے اور اسی بنا پر ان کی ہدایت کے لئے ایک خاص رسول بھیجا گیا جس نے ان کی کایا پلٹ دی اور وہ علوم و فنون ایجاد کئے جن کا تذکرہ عہد اسلام میں آئے گا۔ اس اعتبار سے کہہ سکتے ہیں کہ عربوں کا دور جاہلیت یونان کے عہد ظلمت سے مشابہ تھا اور دونوں کی تمدنی ترقی کی ایک ہی شان تھی۔ بلکہ ایک معنی کر کے عربوں کو فوقیت ہے کیوں کہ یونان کے مصلح (لیڈر) بڑے بڑے حکماء تھے اور عربوں کا راہ نما ایک رسول امّی تھا۔

قحطانیوں کے مقابلہ میں بنی اسمٰعیل کیوں جاہل اور غیر مہذب تھے؟ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ یہ قبائل جنوبی عرب میں آباد تھے، جو جزیرۃ العرب کا ایک خشک اور غیر آباد حصہ ہے اور ظاہر ہے کہ ایسے بلاد و ممالک تمدنی ترقیوں سے ایک زمانۂ دراز تک محروم رہتے ہیں، اگر ملکی فضا اچھی ہوتی تو اس خطہ کے عرب بھی اپنے کلدانی اور بابلی بھائیوں کی طرح معارف کے عالم ہوتے۔ اس مختصر تمہید کے بعد اب ہم علوم جاہلیت عرب لکھتے ہیں۔

علم الشعر

۱۔شعروشاعری | ہر قوم میں شاعری کا مادہ کم و بیش قدرتی ہوتا ہے اور ملک کی طبعی حالت اس کو ترقی دیتی ہے اور مبدء فیاض کی طرف سے وحشی اقوام میں شاعری کی قابلیت، متمدن اقوام کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہوتی ہے۔ جس کی نظیر عرب کی شاعری ہے جو نہایت وسیع اور پر اثر جذبات سے لبریز ہے۔

عربوں کی شاعری دیگر اقوام کے مقابلہ میں حقیقی شاعری تھی۔ کیوں کہ وہ جو آنکھوں سے دیکھتے تھے، وہی نظم کرتے تھے۔ اُن کی شاعری کی بنیاد مناظر قدرت اور فطری جذبات پر تھی چنانچہ عربوں کا تمام کلام اندرونی حسیّات کا مرقع ہوتا تھا۔

عہد جاہلیت کی شاعری میں شجاعت، فیاضی، فخر و مباہات، غیرت، عزم و استقلال کا عنصر غالب تھا اور عشق و محبت کا اظہار کرنا شاعری کا اصلی موضوع نہ تھا۔ بلکہ وہ ایک ضمنی مضمون تھا اور یہ قدرتی اسباب کے نتائج تھے، جو عبرانیوں کے مقابلہ میں عربوں کو بہت زیادہ حاصل تھے ملکی فضا میں عربوں کے سامنے صاف ستھرا آسمان، ایک غیر متناہی مسطح میدان کی طرح پیش نظر تھا۔ مختلف ثوابت اور سیارے ہر روز اپنا جلوہ دکھلاتے تھے کبھی ڈوبتے اور کبھی اُچھلتے تھے۔ اسی طرح سطح زمین پر

چاروں طرف پہاڑوں کے سلسلے پھیلے ہوئے تھے۔ صحرا میں نخلستان بھی تھے اور سبزہ زار بھی، ریگستان میں جا بجا آب رواں کے چشمے بھی تھے اور سراب بھی۔ مناظر قدرت کی نیرنگیوں اور دلچسپیوں کے ساتھ ہولناک جنگل بھی تھے اور مشاغل زندگی میں گلہ بانی اور قتل و غارت کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس مخصوص حالت نے عربوں میں حمایت اور شجاعت کا زبردست مادّہ پیدا کر دیا تھا، برخلاف اس کے عبرانیوں کے اشعار میں ذلت اور تواضع کا رنگ غالب ہے۔ علاوہ بریں عرب عبرانیوں کے مقابلہ میں بہت آزاد تھے اور اس آزادی کے سبب سے بدویوں کی طبیعت ہمیشہ جوالا مکھی پہاڑیوں کی طرح مشتعل رہتی تھی اور یہی عربوں کی فطری شاعری تھی، جس کی ایک یہ بھی دلیل ہے کہ متمدن حکومت کے آغاز سے قبل عرب میں اعلیٰ درجہ کے فصیح و بلیغ شاعر موجود[1] تھے اور بقول[2] پروفیسر نکلسن "عربوں کے یہ غیر مکتوب الفاظ (اشعار) صحرائے عرب میں تیروں سے زیادہ تیز دوڑتے پھرتے تھے۔"

یہ واقعہ ہے کہ نظم کی قوت نثر سے بہت زیادہ ہے اور نثر سے نظم زیادہ خوب صورت ہے۔ اس لئے مشہور ہے کہ "کل منظومٍ احسنُ من کل منثورٍ" یعنی ہر نثر سے ہر نظم اچھی ہوتی ہے اور واقعات کے حفظ کے لئے بھی نظم نہایت موزوں ہے۔

عربوں کی یہ شاعری محض تفریح کا ذریعہ نہیں تھی بلکہ اتحاد باہمی کا بھی سبب تھی اور انھی اشعار سے ان کے اخلاق و عادات کی شہرت ہوئی۔

نظم کی یہ قوت عرب کے تقریباً ہر مرد اور عورت میں تھی۔ اور یہ ایک فطری جوہر تھا جو قدرت نے ان کو عطا کیا تھا۔ عرب خود شاعر تھے اور دوسروں کے کلام پر تنقید کرتے تھے اور اُن کا ہر قول کم و بیش شعر ہوتا تھا اور صنائع شعری (عروض و قافیہ، معانی، بیان اور بدیع) سے وہ واقف نہ تھے اور نہ اُن کو ضرورت تھی۔ البتہ متاخرین میں جب شعر گوئی کی اصلی اور طبعی قوت جاتی رہی، تو اُن کو وسائط صناعیہ کی ضرورت لاحق ہوئی، لیکن یہ ایک حیرت انگیز واقعہ ہے کہ علم عروض کی بنیاد بھی شعرائے جاہلیت کے کلام سے پڑی اور مختلف اوزان اور بحریں اسی کلام سے اخذ کی گئیں۔

---

۱ رومیوں میں قیام سلطنت کے کئی صدی بعد شاعری کا عروج ہوا ہے۔ اسی طرح لاطینی شاعری کا دور ترقی قیام حکومت کے آٹھ صدی بعد آیا ہے اور یہی حال یورپ کے دوسرے ممالک کا ہے۔

۲ لٹریری ہسٹری آف عرب صفحہ ۲۔

تاریخ عرب میں یہ امر بھی تعجب خیز ہے کہ ڈاکو اور رہزن بھی اعلیٰ درجہ کے شاعر تھے اور دیوانے بھی شعر کہتے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ کوئی عورت، شاعری میں مردوں سے بڑھ جاتی تھی اور شاعری کا آغاز عہد طفلی سے ہوتا تھا اور جو شاعر نہ ہوتے تھے وہ شعرا کا کلام حفظ کرتے تھے اور لوگوں کو سناتے پھرتے تھے۔ چنانچہ یہ لوگ رُواۃ کہلاتے تھے اور انھیں راویوں میں حماد الراویہ[۱] (ابوالقاسم بن میسرہ بن المبارک بن عبید الدیلمی متوفی ۱۵۶ھ) بھی ہے جس کو ۲۰۰۰ شعر سے لے کر ۱۰۰۰ شعر تک کے قصائد ہر ہر ردیف و قافیہ کے یاد تھے اور یہ لوگ اس عہد کے زندہ اخبار میگزین اور رسالے تھے جن کے ذریعے سے کلام کی اشاعت ہوتی تھی۔ یہ رُواۃ، لغات اور اشعار عرب اور قصص و حکایات زبانی یاد کر لیتے تھے اور لوگوں کو سناتے پھرتے تھے۔

۲۔ شعر کی قدامت | عربوں کی شاعری نہایت قدیم ہے کیوں کہ اقوام سامیہ (سام بن نوح کی اولاد) میں عرب سب سے زیادہ عالم خیال سے دلچسپی رکھتے تھے اور اسی لئے اعتقاد توحید اور غیر محسوس اشیاء پر ایمان لانے والوں میں وہ سب سے مقدم تھے۔ امم سامیہ کا سب سے قدیم شاعرانہ اثر توراۃ کے متعدد ابواب سے ظاہر ہے۔

لامک نے اپنی بی بی عادہ اور ضلہ سے جو گفتگو کی تھی وہ بھی نظم کا ایک ٹکڑا ہے اور عبرانی شعر کی یہ نہایت قدیم مثال ہے (تکوین ۴ - ۲۳) سفر ایوب، سفر اشعیا اور مزامیر داؤد میں بھی تصورِ شعری کی مثالیں موجود ہیں۔

جس طرح دیگر اقوام کی قدیم تاریخ کا ذخیرہ نظم میں موجود ہے مثلاً ہندوؤں کی مہابھارت اور رامائن یونانیوں کی الیڈ (Iliad) اور اوڈیسی (Odyssey) رومیوں کی ان یڈ (انیادہ) مصنفہ ورجل اور ملٹن کی پیراڈائز لاسٹ (Paradise Lost) (گم شدہ بہشت) یہ سب کتابیں نظم میں ہیں۔ اسی طرح عربوں کا بھی ذخیرہ نظم میں تھا

دنیا کا سب سے بڑا شاعر کون ہے۔ اس میں اختلاف ہے لیکن قدامت کے لحاظ سے ہومر (مصنف الیڈ) کا بڑا درجہ ہے۔ اگر قومی عقیدت سے علٰحدہ ہو کر فیصلہ کیا جائے تو دنیا میں سب سے بڑا شیخ الشعرا، ہومر ہے۔ مسلمان بھی اس کے نام اور کمال سے بے خبر نہ تھے۔ ابوالعلاء معری کے کلام میں (کانی امیروس لدین محمل) سے

---

[۱] حماد عجرد کوفی اور حماد بن زبرقان نحوی اور حماد الراویہ ہم عصر ہیں اور ان میں بڑی دوستی تھی۔ (کتاب الشعر قتیبہ صفحہ ۴۹۰)

ہومر ہی مراد ہے جس کا نام عربی تاریخوں میں امیروس اور ہومیروس ہے[۵۱]۔

ارسطو نے ہومر کے اشعار کی ویسی ہی شرح لکھی ہے جس طرح آج کل شیکسپیر کے کلام کی شرحیں لکھی گئی ہیں۔ فن شاعری اور بلاغت کے تمام اصول ارسطو نے ہومر ہی کے کلام سے اخذ کئے ہیں۔

ہومر کا تذکرہ محض اس لئے کیا گیا ہے کہ ہومر کے خیالات، شعراء جاہلیت عرب کے خیالات سے اکثر جگہ لڑ گئے ہیں[۵۲]۔ حال آنکہ قدیم عرب، ہومر اور اس کے کلام سے واقف نہ تھے۔ خصوصاً عنترہ کا کلام بہ آواز بلند کہتا ہے کہ وہ ہومر کے خیالات کا ترجمہ ہے۔ اس اتحاد خیال کا یہ سبب ہے کہ وحشی اقوام کی شاعرانہ تخئیل اپنے ماحول کے زیر اثر ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ عبرانیوں اور یونانیوں کی طرح عربوں میں بھی شاعرانہ فطری قابلیت موجود تھی، لیکن بعد میں عرب، عبرانیوں سے بڑھ گئے اور اس کا یہ سبب تھا کہ عربی زبان میں متوارد اور مترادف الفاظ اور مادّے عبرانی سے بہت زیادہ تھے۔ اس لئے شعرائے عرب نے ایک ہی خیال کو متعدد اسلوب سے بیان کیا ہے اور ملک کی فضا بھی شاعری کی معین و مددگار تھی۔

۳۔ عربی شاعری کا آغاز | علم الشعر کا عربی میں دوسرا نام قریض ہے اور قریض اونٹ کے گلے کی وہ ہلکی آواز ہے جو جُگالی کرتے وقت اُس کے مُنھ سے نکلتی ہے۔

ایک نکتہ سنج کہہ سکتا ہے کہ یہی آواز عربوں میں شعر کی ایجاد کا سبب ہوئی۔ کیوں کہ نظم عربی کی ابتدا نثر کے مقفیٰ جملوں سے ہوئی ہے جس میں وزن کا خیال نہیں رکھا جاتا تھا اور اسی قسم کی عبارت مسجع کہلاتی تھی۔

لغت عرب میں اونٹنی، کبوتر اور قمری کی نغمہ سرائی کا نام سجع ہے جس سے یہ اصطلاح وضع ہوئی ہے۔

عہد جاہلیت[۵۳] میں سجع کا استعمال صرف پیشین گوئی یا الہامی باتوں میں ہوا کرتا تھا اور روزمرّہ کی گفتگو سادہ ہوتی تھی مثلاً:

---

۵۱ ملاحظہ ہو کتاب الیادہ (ترجمہ عربی الیڈ) پروفیسر بستانی۔ مطبوعۂ بیروت

۵۲ دیکھو مقدمہ کتاب الیادہ۔

۵۳ بلوغ الارب جلد ۳ تذکرہ کہان وعرافین

(الف) سطیح بن مازن کاہن نوشیرواں کے خواب کی تعبیر ایک موبد کے سامنے بیان کر رہا ہے جس میں نبی کریمؐ کی بعثت کی طرف اشارہ ہے۔

"بعثک ملک ساسان لارتجاج الایوان وخمود النیران ورویاء الموبذان رأی ابلاً صعاباً تقود خیلاء ابا قد؛ قحمت فی الواد، وانتشرت فی البلاد۔"

(ب) زبراء کاہنہ پیشین گوئی کرتی ہے۔

واللیل الغاسق واللوح الخافق والصباح الشارق والنجم الطارق والمزن البوارق، ان شجر الوادی لیادوا اختلاد یحرق انیاباعصلا"

(ج) آلِ غسان کی فتح کی ایک کاہنہ پیشین گوئی کرتی ہے۔[1]

والقمر الباھر والکوکب الزاھر والغمام الماطر وبالجوّ من طائر السیف الباتر بینکما دائر والغلبۃ للغسّان ظاھر وانتظر ما یظھر فی الآخر۔"

چنانچہ اسی سجع سے وہ مختصر نظم پیدا ہوئی جس کا نام رجز ہے۔ سجع کی طرح رجز میں ہر مصرع کا قافیہ یکساں ہوتا تھا اور رجز کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ فی البدیہہ ہوتی تھی جس میں ذاتی جذبات، تجارب، مشاہدات اور فخریہ امور کا اظہار کیا جاتا تھا۔ رجز[2] حقیقت میں ایک عارضہ کا نام ہے جو اونٹ کے سُرین میں ہوتا ہے جس سے اس کی رانیں کانپتی رہتی ہیں اور قرآن میں "رِجزاً مِّنَ السَّمَاءِ" آیا ہے۔ یہاں رجز سے مطلق عذاب مراد ہے۔ مختصر یہ ہے کہ جب انسان کی زبان سے یہ مسجع جملے نکلے اور ہوا کی گونج سے اس میں ایک قسم کی موسیقیت پیدا ہوئی تو یہی جملے رجز کہلائے۔ رجز کے نمونے بہت کم باقی ہیں۔ تاہم کتاب الشعر والشعراء ابن قتیبہ اور تذکرۂ محمد بن سلام وغیرہ میں چند رجز موجود ہیں۔

---

[1] بطور نمونہ اس مثال کا ترجمہ لکھا جاتا ہے:

"اور چمکنے والے چاند، روشن ستارے اور برسنے والی بدلی اور اُڑنے والے طائر کی قسم۔ فریقین میں قاطع تلوار چکّر کاٹ رہی ہے جس میں آلِ غسّان کو غلبہ ہوگا اور منتظر رہو کہ اخیر میں کیا ظاہر ہوتا ہے۔"

[2] التوجیہ الوافی بمصطلحات العروض والقوافی۔ نواب صدیق حسن خاں مرحوم صفحہ ۲۶

۱۔ درید (دوید) بن زید بن نہد قضاعی مرتے وقت کہتا ہی[1]

اَلیومَ یُبنیٰ لِدُریدٍ بیتُہٗ　　لوکانَ للدھرِ بِلٰی اَبلیتُہٗ

اَو کانَ قِرنی واحداً کفیتُہٗ　　یاربَّ نَھبٍ صالحٍ حویتُہٗ

وربَّ عبلٍ خشنٍ لویتُہٗ

جن شعراء نے رجز لکھے ہیں اُن میں عجاج، روبۃ بن عجاج[2]، ابونخیلہ، ابوالنجم، دُکین، شماخ، الاغلب عجلی عمر بن لجأ اور ابوالزحف بہت مشہور ہیں اور یہ سب راجز کے لقب سے مشہور ہیں۔ خلیل نحوی بصری (۱۷۵ھ / ۷۹۱ء) نے جب عروض ایجاد کیا تو من جملہ پندرہ بحروں کے ایک کا نام رجز رکھا۔ جس کا وزن (عربی میں) ۶ مرتبہ مستفعلن ہی۔ ایک زمانہ دراز تک رجز خوانی کا نام شاعری رہا اور ضرب الامثال بھی رجز میں داخل ہیں اور شتربانوں کا ابتدائی راگ جس کو حدی کہتے ہیں یہی مسجع جملے تھے اور اسی سے عربی شاعری کی بنیاد قائم ہوئی اور رجز میں قصائد کے مضامین لکھے گئے۔ یہ حدی، ہندوستان کے اہیر اور گوالوں کے بِرہا سے مشابہ تھی (برسات کے موسم میں جنگلوں میں برہا کی بہار رہتی ہی) اگر رجز خوانی قائم رہتی تو عربی شاعری میں مثنوی کا رواج ہو جاتا جس کا ایک نمونہ کتاب السفینہ بن مالک ہی۔

عربوں کی ذہانت کا ہر موقع پر قائل ہونا پڑتا ہی کہ انھوں نے موسیقی کا پہلا تجربہ حیوانات پر کیا اور رجز کو بانسری پر ایسی لَے سے گایا کہ اونٹوں کی رفتار دوچند ہو گئی اور چوں کہ راگ و نغمہ کو انسان سے بھی طبعی مناسبت ہی اس لئے رجز کو سندِ قبولیت حاصل ہوئی اور رجز تسکینِ قلب کا باعث ہوئے اور اشعار پڑھنے کا نام انشاد و نشید ہوا۔ جو سُرود کا مرادف ہی۔ اس سے ظاہر ہی کہ نظم کو موسیقی سے خاص نسبت ہی۔ بعدازاں مخصوص قافیوں پر کبھی دو اور کبھی تین مصرعے لگائے گئے۔ اور مفاخرت، منافرت، سخاوت اور شجاعت کے جذبات نے روز بروز رجز میں ترقی کی اور عربی شاعری

---

[1] کتاب الشعر ابن قتیبہ صفحہ ۳۷ و ۵، مطبوعہ ہالینڈ ۱۲

[2] عجاج اور روبۃ صاحبِ دیوان تھے۔ جس میں رجز تھے۔ روبۃ کا ۱۴۵ھ / ۷۶۲ء میں انتقال ہوا۔ یہ لغت کا امام تھا اور رجز گوئی میں کوئی روبۃ سے بڑھ کر نہیں ہوا۔ (مواسم الادب صفحہ ۱۲۹ حصہ اول و کتاب العمدہ رشیق قیروانی صفحہ ۷۵ مطبوعہ مصر ۱۲

میں نئے نئے اسلوب پیدا ہو گئے اور قصیدہ کی ایجاد ہوتے ہی شاعری نے غیر معمولی ترقی کی۔ جس کا موجد اول مہلہل بن ربیعہ تغلبی ہے۔ قصیدہ کی ابتدا سات شعروں سے ہوئی۔ پھر یہ تعداد دس تک بڑھ گئی اور بعد ازاں پچیس سے ترقی کر کے سو ہو گئی اور متاخرین نے غیر معمولی اضافہ کر دیا۔ یہ پانچویں صدی عیسوی کے واقعات ہیں۔

محمد بن سلام اپنے تذکرہ شعراء میں لکھتے ہیں۔

ولم یکن لاوائل العرب من الشعر الا ابیاتا	قدیم عربوں کی شاعری ابیات تک محدود تھی۔ جب کوئی
یقولها الرجل فی حادثة وانما قصدت القصائد	حادثہ ظہور پذیر ہوتا تو لوگ ابیات میں اظہار خیال کرتے
وطول الشعر علی عهد عبد المطلب هاشم	تھے اور قصائد وطویل اشعار کا رواج عہد عبد المطلب (متوفی
بن عبد مناف وذلك يدل على اسقاط	۵۷۹ء) اور ہاشم بن عبد مناف میں ہوا۔ اس سے ظاہر ہے
عاد وثمود وحمير وتبع۔	کہ عہد عاد وثمود، حمیر اور تبابعہ میں شاعری کا وجود نہ تھا

عرب کی ابتدائی شاعری میں وزن کی رعایت نہ تھی، صرف قافیہ کا لحاظ رکھا جاتا تھا اور یہی حال عبرانی شاعری کا تھا۔ لیکن بعد میں وزن اور قافیہ دونوں کا لحاظ رکھا گیا جس سے شعریت میں اضافہ ہو گیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وزن اور قافیہ کو شعر کی تعریف میں کچھ دخل نہیں ہے جس کی بیّن مثال خطبات ہیں کہ ان میں وزن و قافیہ کی رعایت نہیں ہوتی ہے اور پھر بھی یہ خطبات دلکش اور موثر ہوتے ہیں۔

واقعات مندرجہ بالا سے ظاہر ہے کہ سامی عربوں میں شاعری کا فطری مادہ تھا جس کا سبب ان کی صحرا نوردی اور جوش حریت تھی اور بدویانہ زندگی میں تنازع، تفاخر اور تنافر کا پیدا ہونا لازمی تھا اور یہ وہ طبعی اسباب ہیں جن سے اذہان میں تیزی اور جدّت پیدا ہوئی۔ اس بنا پر یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ عربوں کی قوم عاد و ثمود بھی شاعر ہونگی۔ لیکن چوں کہ یہ قومیں تباہ ہو گئیں اور ان میں فن کتابت کا بھی رواج نہ تھا، لہذا ان کا علمی سرمایہ بھی تلف ہو گیا۔ بعض تاریخوں میں عہد تبابعہ کے اشعار موجود ہیں لیکن الفاظ سے پتا چلتا ہے کہ یہ نئی زبان ہے اور قدیم واقعات کو شعرائے مابعد نے اپنے عہد کی زبان میں نظم کر دیا ہے۔

---

[۱] المزہر سیوطی صفحہ ۲۴۳ جلد ۲ مطبوعہ مصر

۴۔ اشعار کی کثرت | عہد جاہلیت کے اشعار کا جس قدر ذخیرہ موجود ہے وہ اسلام سے تقریباً دو صدی قبل کا ہے اور با فراط ہے اور تمام اقوام کی نظم سے عربوں کا مجموعۂ نظم زیادہ ہے جس کا اندازہ اس طرح پر ہو سکتا ہے کہ ایلیڈ میں ۳۰ ہزار، مہابھارت میں ۱ ہزار، رامائن میں ۴۸ ہزار اور شاہنامہ میں ۶۰ ہزار (ایک روایت میں ۳۰ ہزار) اشعار ہیں۔

اب عربوں کی حالت دیکھیے کہ حماد راویہ کو ۲۷ ہزار قصائد حفظ تھے۔ اور وہ بھی اس ترتیب سے کہ ہر حرف تہجی کے ایک ایک ہزار اور خلیفہ ولید بن یزید نے خاص طور پر حماد کا امتحان لیا تھا اور جب وہ امتحان میں کامیاب ہوا تو ولید نے اس کو ایک لاکھ درہم انعام دیئے[1]۔ ابو تمام صاحب حماسہ کو علاوہ مقاطیع اور قصائد کے چودہ ہزار جوزے (بڑے قصیدے) عہد جاہلیت کے یاد تھے جس کا مختلف مواقع پر امتحان لیا گیا۔

علامۂ اصمعی کو سولہ ہزار جوزے حفظ تھے۔ ابو ضمضم[2] ۸۰ شاعروں کے اشعار روایت کرتا تھا جن کا نام عمرو تھا[3] اور پھر بھی ابو عمرو بن العلا کو شکایت ہے کہ عہد جاہلیت کا کلام بہت کم ملا ہے۔ اشعار کے علاوہ ضرب الامثال کا ذخیرہ بھی محفوظ رہا اور کلام عرب میں امثال کو بڑا دخل ہے کیوں کہ یہ چھوٹے چھوٹے جملے نہایت لطیف اور سبق آموز تھے اور خاص صفت یہ ہے کہ امثال میں اوزان بھی موجود تھے جس کا زمانۂ مابعد کے شعرا کو خاص طور پر احساس ہوا۔

آج ان تاریخی روایات کو لوگ فسانہ سمجھیں گے لیکن یہ واقعات ہیں جس سے عربوں کی قوت حافظہ کا اندازہ ہو سکتا ہے اور اسی غرور نے ان کو کتابت سے بے نیاز کر دیا تھا۔ غزوات اسلام میں اکثر رواۃ قتل ہو گئے ورنہ نظم عربی کا دائرہ آج بہت وسیع ہوتا۔

۵۔ شعر کی تعریف | شعر کا مادۂ اشتقاق[4] شعور ہے۔ یعنی کسی شے کا علم اور اس سے واقفیت عامہ حاصل کرنا۔ حکماء کی نزدیک شعر کا مفہوم بہت وسیع ہے جس پر ایک مستقل مضمون کی ضرورت ہے اور متفق علیہ ہے کہ شعر کا مقصد جذبات پر اثر ڈالنا ہے جس طرح طبائع انسانی پر مصوری اور موسیقی کا اثر ہوتا ہے۔

ملٹن اور ارسطو کی نزدیک پرُاز جذبات صداقت کا نام شاعری ہے اور شاعری انسان کے ان خیالات کا نام ہے جس کا خمیر حسیات اور جذبات سے ہوتا ہے اور انسان کا ہر خیال شاعری کی صورت اختیار کر سکتا ہے۔ لہذا شاعری ایک

---

[1] ابن خلکان صفحہ ۱۲۱ جلد اول [2] کتاب الشعر ابن قتیبہ صفحہ ۴ [3] مزہر سیوطی صفحہ ۲۲۳ جلد ۲

[4] کتاب العمدہ قیروانی تعریف شعر ۱۲

خلوت نشین فلسفی کی تقریر ہی جس کا مخاطب اولی اس کا نفس ہوتا ہی۔ بعد ازاں انھیں خیالات سے دوسرے مستفید ہوتے ہیں اور یہ ایک فطری شے ہی جس کو اکتساب سے کوئی تعلق نہیں ہی اور محض کلام موزوں کو شعر کہنا جہالت ہی۔

مدارج شعراء | مضمون کی بلندی اور پستی کے اعتبار سے عربوں نے شاعروں کے درجے مقرر کئے ہیں اور وہ ان کو مختلف ناموں سے یاد کرتے ہیں جس کی یہ تفصیل ہی۔

(۱) خنذیذ — وسیع الخیال، فصیح البیان، نادرہ کار

(۲) متشاعر — جس کا کلام متوسط درجے کا ہو

(۳) شویعر۔ شعر در قوّت طبعی کے خلاف جو زبردستی شاعر بن جائے یا صنائع شعریہ کے ذریعے سے

متشاعر شعر کہے

جب صنعت کے ذریعے سے شاعری کا آغاز ہوا تو شعر کے واسطے چار چیزیں لازم قرار دی گئیں یعنی لفظ، وزن، معنی اور قافیہ اور ترقی مدارج کے لئے معانی اور بیان کا فن ایجاد ہوا۔ لیکن شعرائے جاہلیت ان قیود سے آزاد تھے۔

۷۔ شاعر کی عزت | قبائل عرب[1] میں تین تقریبیں بڑی خوشی کی ہوتی ہیں جس میں شاندار دعوتیں ہوتی ہیں:—

(۱) جب کسی کے یہاں بیٹا پیدا ہو کیوں کہ بیٹا ہر معرکہ میں باپ کا رفیق اور قوت بازو ہوتا ہی۔

(۲) جب کوئی اصیل گھوڑی بچہ جنے۔

(۳) کسی قبیلہ میں کوئی نامور شاعر ہو اور جب اس کی شہرت درجۂ کمال پر پہنچ جائے تو دوسرے قبائل سے مبارک باد کے وفد آتے تھے۔ اور اس جشن مسرت میں عورتیں بھی حصہ لیتی تھیں اور دف بجا کر گاتی اور ناچتی تھیں کیونکہ شعرا عورتوں کے حقوق کے بھی محافظ ہوتے تھے۔

یہ واقعہ ہی کہ جن ناکتخدا لڑکیوں کی تعریف میں شعرا قصائد کہتے تھے اُن کی شادی اونچے گھرانوں میں بہت جلد ہو جاتی تھی۔ یہ شاعر انساب کے بھی حافظ ہوتے تھے اور قومی فضائل بیان کرتے تھے جس سے قبیلہ کی عظمت بڑھ جاتی تھی۔ عربوں میں شاعر کا وجود ایک ماہر فن پہلوان سے زیادہ قیمتی ہوتا تھا۔ شاہوں کے دربار میں بھی شعرا

---

[1] کتاب العمدہ باب اجتماع القبائل لشعرا ئہا۔ باب شفاعات الشعرا و بلوغ الارب ۱۲

مقرب ہوتے تھے اور ان کی سفارش سے بعض وقت بڑے کام نکل جاتے تھے

عوام کا یہ بھی خیال تھا کہ شاعروں کے قبضے میں ایک جن ہوتا ہے جو ان کو مضامین القاء کرتا ہے اور غیب کی خبریں بتاتا ہے۔ چنانچہ یہ عقیدہ بھی شاعر کی عزت کا سبب تھا۔

میدانِ کارزار میں شعراء کی قیادت سے جنگ ہوتی تھی اور وہی نقیب بھی ہوتے تھے۔ چراگاہوں کا انتخاب بھی شعرا کے مشورہ سے ہوتا تھا۔ کوچ و مقام کی حالت میں شاعر کے حکم سے خیمے اکھاڑے اور لگائے جاتے تھے۔ یہ مشہور واقعہ ہے کہ جریر شاعر کی ایک ہجو نے قبیلۂ نمیر کو ہمیشہ کے لئے ذلیل و تباہ کردیا اور اس ہجو کی شہرت کے بعد اس قبیلہ کے آدمی اپنا نام و نسب بتاتے ہوئے شرماتے تھے اور یہ وہ خصوصیات ہیں جن سے اقوام عالم کے شعرا محروم ہیں۔

شعرائے عرب بڑے دلیر اور آزاد خیال ہوتے تھے وہ بادشاہوں سے مطلق نہیں ڈرتے تھے اور ان کے سامنے ہجو کے اشعار پڑھتے تھے جس کی نظیر عمرو بن کلثوم تغلبی کا واقعہ ہے۔ شعرا کا کلام شاہوں کو بقائے دوام کی سند دیتا تھا اور یہ بھی ممدوح کی ذات سے حیات جاوید پاتے تھے۔

۸۔ مجالس ادب | شعر و سخن کی ترقی کے لئے عربوں میں مجالس ادب بھی قائم تھیں، جہاں شعرا اپنی نظمیں سناتے تھے۔ یہ مجالس ندوہ یا نادی کہلاتی تھیں (قریش کی مجلس شوریٰ ندوہ جداگانہ تھی) اس کے علاوہ جزیرۃ العرب کے مختلف مقامات میں جو موسمی بازار اور میلے ہوا کرتے تھے وہاں بھی مشاعرے ہوتے تھے۔ ان بازاروں میں سوق عکاظ سب سے زیادہ مشہور ہے۔ اس قومی اکھاڑے کے کامیاب شعرا کے قصائد خانۂ کعبہ میں آویزاں کئے جاتے تھے جو سب سے بڑی قومی عزت تھی اور اسی جگہ یہ بھی فیصلہ ہوتا تھا کہ موجودہ شعرا میں اشعر الشعرا یا ملک الشعرا کون ہے۔ عورتیں بھی سوق عکاظ میں اپنا کلام سناتی تھیں اور خراج تحسین حاصل کرتی تھیں اور اس مقام کے علاوہ ان کی جداگانہ مجلسیں بھی تھیں جہاں وہ اپنا کلام سناتی تھیں اور مردوں کے کلام پر تنقید کرتی تھیں۔ عہد اسلام میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے والیان صوبہ کے نام جو تعلیمی احکام جاری کئے تھے ان میں شعر کی تعلیم بھی شامل تھی، کیوں کہ اخلاق، اصابت رائے اور نسب کی تعلیم شعر سے ہوتی تھی۔ شعر کے متعلق حضرت عمرؓ کا یہ قول مشہور ہے۔

۱ه تاریخ یعقوبی، کتاب الشعرا ابن قتیبہ جلد اول۔ کتاب العمدہ

"نعلم ما تعلمته العرب الابیات من الشعر یقدمها الرجل فیتنزل بها الکریم و یستعطف بها اللئیم"۔

عربوں کا سب سے بہترین علم اشعار ہیں جس کے ذریعے انسان ایک فیاض شخص سے انعام حاصل کرتا ہے اور بخیل کو اپنی جانب مائل کرلیتا ہے۔

قصائد کے انتخاب کے لئے سوق عکاظ میں ایک ملک الشعرا صدر جلسہ کیا جاتا تھا اور اس کا فیصلہ ناطق ہوتا تھا۔ سوق عکاظ میں دنگل بھی ہوتا تھا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ بھی اسی اکھاڑے کے ایک مشہور پہلوان ہیں۔ اور یہ واقعہ قبول اسلام سے پہلے کا ہے۔ مورخین یورپ نے بازار عکاظ کو ہائڈ پارک لندن سے تشبیہ دی ہے جہاں ہر قسم کے علمی مذاکرے ہوا کرتے ہیں لیکن ہماری رائے میں عکاظ کو مقدس مقام دلفی سے تشبیہ دینا زیادہ مناسب ہے کیوں کہ دلفی کے سالانہ میلہ میں گھڑدوڑ، کشتی، اور نیزہ بازی کے کمالات دکھائے جاتے تھے اور ان کرتبوں میں جو کامیاب ہوتا تھا اس کے سر پہ پھولوں کا ایک طرہ باندھا جاتا تھا۔

عہد جاہلیت کے کلام سے متاخرین نے کیا فوائد حاصل کئے

۹۔ جس علم نے ہزاروں شاعر بنادیئے وہ علم العروض کی تدوین ہے۔ اس کا موجد خلیل بن احمد بصری ہے جس نے کلام جاہلیت اور امثال عرب سے مختلف اوزان اور بحریں ایجاد کیں۔[۲] حال آنکہ مہلہل اور امرؤ القیس وغیرہ اوزان و بحور سے ناواقف تھے لیکن ان کا کوئی قصیدہ اور نظم صنعت عروض سے خالی نہیں ہے۔

۲۔ عرب قدیم کی تاریخ کا اکثر حصہ اشعار جاہلیت سے مرتب کیا گیا ہے۔

۳۔ سجستانی کی کتاب المعمرین (عرب کے بوڑھے) اور کتاب البخلاء (عرب کے مشہور بخیل اور کنجوس) کا ماخذ بھی یہی اشعار ہیں۔

۴۔ ابن قتیبہ وغیرہ نے تذکرہ شعراء اشعار سے مرتب کئے ہیں۔

۵۔ جغرافیہ کے مبادی، مشہور دیہات، قصبات، پہاڑ، چشمے، نخلستان، ریگستان، قدیم راستے، جنگل اور وادیوں کے حالات بھی اشعار سے لکھے گئے ہیں۔

---

[۱] البیان جاحظ ۱۲

[۲] علم عروض کی بنیاد خلیل سے پہلے پڑی ہوگی جس کی تصدیق امثال وغیرہ کے اوزان سے ہوتی ہے۔ لیکن جب تک تاریخ سے تصدیق نہ ہو خلیل ہی موجد سمجھا جائے گا۔

۶ - جاحظ کی کتاب الحیوان اور ابو حنیفہ دینوری کی کتاب النبات کا ماخذ بھی اشعار ہیں۔

۷ - انساب العرب کا اصل سرمایہ شعرائے جاہلیت کا کلام ہے۔

۸ - ادیان العرب، کہانت، عام معاشرت، رسم و رواج اور ایام العرب (قومی لڑائیاں) کی تاریخ اشعار سے مرتب ہوئی ہے۔

۹ - عہد اسلام میں مفسرین نے قرآن و حدیث کے محاورات اور خاص خاص الفاظ کی تشریح کلام جاہلیت سے کی ہے جس کی نظیر حضرت ابن عباسؓ کی تفسیر ہے اور حضرت کا یہ قول بھی مشہور ہے[۱]:

اذا قراتم شیئاً من کتاب اللہ فلم تعرفوہ	جب تم قرآن پڑھو اور کوئی محاورہ نہ جان سکو تو اس کو
فاطلبوا فی اشعار العرب	اشعار عرب میں تلاش کرو

اور محض اسی خیال سے ابن قتیبہ نے شعرا کو بھی رواۃ حدیث و اخبار سے تشبیہ دی ہے۔

۱۰ - رزمیہ فسانے شہسواروں اور نامور پہلوانوں کے حالات بھی اشعار سے مرتب ہوئے ہیں۔

۱۰ - طبقات الشعرا | شعرائے عرب[۲] چار طبقات پر تقسیم ہیں:

(۱) جاہلی — وہ شاعر ہے جو عہد جاہلیت میں پیدا ہوا اور اسی زمانہ میں فوت ہوا یا یہ کہ اس نے اسلام کا بھی زمانہ دیکھا مگر اسلام قبول نہیں کیا۔ مثلاً امرؤ القیس، امیہ بن ابی الصلت وغیرہ۔

(۲) مُخَضرَمی — وہ شاعر ہے جس نے دونوں زمانے (کفر و اسلام) دیکھے ہوں۔ پھر ان میں جنھوں نے امیہ اور عباسیہ دونوں دور دیکھے وہ "مخضرم الدولتین" کہلاتے ہیں۔ مثلاً حسان بن ثابت کعب بن زہیر، لبید بن ربیعہ وغیرہ۔ یہ اصطلاح لفظ مخضرمہ سے نکلی ہے۔ مخضرمہ وہ اونٹنی ہے جس کا کان کٹا ہو۔ یعنی وہ شاعر جو جاہلیت سے قطع تعلق کر کے اسلام کی طرف آگیا ہو، مخضرمی ہے۔

(۳) اسلامی — وہ شاعر ہے جو خاص عہد اسلام میں پیدا ہوا ہو۔ چنانچہ عہد رسالت سے بنی اُمیہ تک جس قدر شاعر ہوئے ہیں وہ اسلامی کہلاتے ہیں۔

---

[۱] کتاب العمدہ صفحہ ۱۱ [۲] کتاب العمدہ صفحہ ۲۷

۴- مولدین یا محدثین قدماء کے مقابلہ میں محدثین (نئے) کا لفظ ہے۔ دولت عباسیہ اور اس کے بعد جس قدر شعراء ہوئے ہیں وہ سب محدثین کہلاتے ہیں۔ مثلاً جریر، فرزدق، اخطل وغیرہ

بعض علماء کی نزدیک تیسری صدی کے جملہ شعرا اسی طبقہ میں داخل ہیں۔ اور نیز وہ بھی جنہوں نے صنائع شعریہ کے وساطت سے شعر کہا ہو۔ گویا یہ حقیقی شاعر نہ تھے۔ اور خود عرب جاہلی شعرا کو دوسرے طبقہ والوں پر فوقیت دیتے تھے اور یہی امام فن مانے جاتے تھے اور جب کسی اسلامی شاعر کی تعریف کرتے تھے تو کہتے تھے کہ اگر اس نے جاہلیت کا ایک دن بھی پایا ہوتا تو یہ سب سے بڑا شاعر ہوتا۔

مختصر یہ ہے کہ عرب میں جو سب سے بڑے شاعر تھے وہ جاہل مطلق تھے گویا علمی فضل و کمال شاعری کے منافی تھا۔ اور یہی فطری شاعری کی تعریف تھی، کیوں کہ تہذیب و تمدن کے دور میں تصنع بڑھ جاتا ہے اور حقیقی جذبات فنا ہو جاتے ہیں اور یہی وہ جہالت ہے جس پر خود عرب فخر کرتے تھے۔

الالا یجھلن احد علینا — خبردار! کوئی ہم سے جہالت نہ کرے۔

فنجھل فوق جھل الجاھلینا — ورنہ ہم سو جاہلوں سے بڑھکر ایک جاہل ہیں

۱۱- شعراکے القاب خطاب شعرائے عرب کے خطاب والقاب[1] بھی ہیں۔ یہ خطاب اوصاف کی بنیاد پر ہوتے تھے اور کبھی ان میں ہجو کا بھی پہلو ہوتا تھا۔ یہ القاب قصیدہ وغیرہ کے کسی شعر سے اخذ کئے جاتے تھے۔ مثلاً جریر بن المسیح متلمس مشہور تھا۔ جس کا ماخذ تلمس تھا اور یہ ایک شعر سے اخذ کیا گیا تھا۔ دیگر مشہور خطاب حسب ذیل ہیں:

۱- عوف بن سعد وائلی	مرقش
۲- زیاد بن معاویہ	نابغہ
۳- عمرو بن العبد بکری	طرفہ
۴- غیلان بن عقبہ	ذوالرمہ
۵- مسلم بن الولید	صریع الغوانی
۶- عامر بن مجنون	مدرج الریح

[1] لطائف المعارف وکتاب الشعر ابن قتیبہ وحماسہ ۱۲

۷۔ عامر بن حارث نمری — جران العود

۸۔ عبداللہ بن روبہ (راجز) — عجاج

۹۔ عتبہ بن سعد — اعصر

۱۰۔ صریم بن معشر تغلبی — افنون

۱۱۔ ثابت بن جابر — تابط الشراء

۱۲۔ جرول بن اوس — حُطَیّہ

۱۳۔ مغیرہ بن الاسود — الاقیشر

۱۴۔ زہیر بن علس — مُسَیّب

۱۵۔ تیرید بن ضرار — مُزَرِّد

۱۶۔ غیاث بن غوث — اخطل

یہ خطاب والقاب کس بنا پر دیئے گئے ہیں۔ اس کی تفصیل تذکرۂ شعرا میں موجود ہے۔

۱۲۔ شعرائے مشہور قبائل

قبائل عرب میں شاعری کا آغاز قبیلۂ ربیعہ سے ہوا جس میں مہلہل بن ربیعہ، مرقش اکبر، مرقش اصغر، طرفہ، عمرو بن قمیّہ، حارث بن حلزہ، متلمس، اعشیٰ، مسیب، عدی اور سعید بن مالک مشہور ہیں۔

دوسرا قبیلہ قیس کا تھا، جس میں نابغہ ذبیانی، نابغہ جعدی، زہیر بن ابی سلمیٰ، کعب بن زہیر، لبید بن ربیعہ، حطّیہ، شماخ، مزرد اور خداش بن زہیر ہیں۔

تیسرا قبیلہ تمیم کا تھا جس میں جریر، فرزدق، اخطل، اوس بن حجر مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ قبیلہ حمیر اور قریش میں بھی شاعر تھے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ عرب قریش کو جملہ اوصاف میں افضل جانتے تھے مگر ان کی شاعری کے قائل نہ تھے قریش متمدن اور تجارت پیشہ تھے۔ امصار و دیار میں جاتے تھے ان کی زبان میں دیگر اقوام کے الفاظ شامل ہو گئے تھے ممکن ہے کہ اس بنیاد پر ان کی شاعری مسلم نہ ہو۔ اسی طرح حجازی عرب، حمیر کی زبان کے قائل نہ تھے۔

۱۳۔ تدوین کلام | عہد اسلام (دوسری صدی ہجری) میں بصرہ اور کوفہ کے علماء نے عہد جاہلیت کے کلام کو مختلف حیثیتوں سے جمع کیا ہے۔ بعض نے صرف ایک شاعر کا دیوان مرتب کیا۔ اور بعض نے کلیات ترتیب دیئے۔ جن شعرا کے دیوان مرتب ہوئے وہ حسب ذیل ہیں۔

نابغہ، عنترہ، طرفہ، زہیر، علقمہ، لبید، عروہ، حاتم، اوس بن حجر، امرؤ القیس، حادرہ اور خنساء (یہ دیوان مصر، بیروت اور یورپ میں چھپ گئے ہیں) ان کے علاوہ دیوان مختارات شعراء عرب (مرتبہ ابن الشجری) اور ہذیلین کے مجموعے جداگانہ ہیں۔ مفضل ضبی (متوفی ۱۶۸ھ) نے شاہزادوں کی تعلیم کے لئے خلیفہ منصور عباسی کے حکم سے ۱۲۸ نظموں کا مجموعہ مرتب کیا تھا جو مفضلیات کے نام سے یورپ نے شائع کیا ہے۔ اسی ذیل میں حماسہ (ابو تمام) اور حماسہ (بحتری)، کے کلیات ہیں۔ ایام العرب میں حرب داحس اور حرب بسوس کی رزمیہ نظمیں جداگانہ ہیں۔ بعض ادیبوں نے جمہرات کے نام سے مختلف شعرا کا کلام جمع کیا ہے چنانچہ ان میں جمہرہ ابو زید انصاری بہت مشہور ہیں۔ ان کی علاوہ ادب اور تاریخ کی کتابوں میں اشعار جاہلیت کا بڑا سرمایہ موجود ہے۔

خلفائے امیہ اور عباسیہ نے عہد جاہلیت کی کلام کی بڑی قدر کی اور انعامات دے کر یہ کلیات مرتب کرائے اور مفسرین نے اشعار جاہلیت کو مفتاح القرآن قرار دیا۔ عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں: الشعر دیوان العرب فاذا خفی علینا الحرف من القرآن رجعنا الی دیوانها۔

علماء و شعرا کے علاوہ تحفظ کلام جاہلیت میں رُواۃ بھی قابل تذکرہ ہیں۔ جن اصحاب نے اشعار جاہلیت کو اپنے حافظہ میں محفوظ رکھا وہ رواۃ (جمع راوی) کہلاتے ہیں۔ ان لوگوں کا زبان عربی پر بڑا احسان ہے جن کی بدولت یہ ذخیرہ تلف ہونے سے محفوظ رہا۔ اور تحفظ کا یہ سبب ہے کہ اکثر نظمیں اپنے قبیلہ کی تعریف اور دشمنوں کی ہجو میں ہوا کرتی تھیں جس کا یاد رکھنا بچہ بچہ پر فرض تھا۔ مردوں کے علاوہ عورتیں بھی باجہ کے ساتھ ان نظموں کو گاتی تھیں یہ بھی دستور تھا کہ ہر شاعر کے ساتھ اس کا ایک راوی ہوتا تھا جو اس کا کلام یاد کر لیتا تھا اور ہر وقت ساتھ رہتا تھا۔ یہ رواۃ دوسرے قبائل میں جاکر اپنے شاعروں کا کلام فخریہ سنایا کرتے تھے۔ اور بعض راوی خود بھی شاعر ہوتے تھے مثلاً زہیر اپنے سوتیلے باپ اوس بن حجر کا راوی تھا۔ اسی طرح حطیہ، زہیر کا اور فرزدق، امرؤ القیس کا راوی تھا۔ اس طریقہ سے رواۃ کی ایک بڑی جماعت بن گئی تھی۔ بعض رواۃ نے چالاکی سے دوسرے شعرا کا کلام اپنے نام سے

مشہور کردیا تھا جیسا کہ حماد اور خلف الاحمر کی نسبت مشہور ہے۔

جس طریق سے کلام جاہلیت کی تدوین ہوئی ہے۔ اس سے بہتر طریقہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس پر بھی بعض مستشرقین (پروفیسر مارگولیتھ و طٰہٰ حسین نابینا مصری) کا خیال ہے کہ کلام جاہلیت کے مجموعے فرضی ہیں اور یہ کلام مصنوعی ہے۔ یہ رائے تاریخ اور اصول تنقید کے خلاف ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ کسی قدر تغیر اور تبدیلی ہوئی ہے۔ اور کلام جاہلیت میں عہد اسلام کے قریب زمانہ کا کلام شامل ہوگیا ہے۔ لیکن جملہ امثال اپنی اصلی حالت پر قائم ہیں اور ان میں مطلق تغیر نہیں ہوا ہے۔ بعض الفاظ میں تحریف ہوئی ہے جس طرح اللات کا لفظ اللہ ہوگیا ہے۔

۱۴۔ شعر کی تقسیم | کلام عرب دو حصوں پر تقسیم ہے۔ ایک منظوم دوسرا منثور، پھر انھیں سے ہر ایک کے تین طبقات ہیں جیّد متوسط اور ردیۃ (اعلیٰ، اوسط، ادنیٰ) لیکن نثر سے نظم کا درجہ بلند ہے اور نظم کی بھی متعدد قسمیں ہیں۔ اس مختصر مضمون میں تفصیل کی گنجائش نہیں ہے لہٰذا صرف قصیدہ کے مضامین پر تبصرہ کیا جاتا ہے۔

۱۔ قصیدہ میں عموماً چار قسم کے مضمون ہوتے ہیں۔ مدح، ہجو، تشبیب اور مرثیہ۔ شعرائے عرب مدح و مناقب خوب لکھتے تھے اور قصیدہ میں ممدوح کے وہی اوصاف لکھے جاتے تھے جو اس میں موجود ہوتے تھے اور اشعار کی تعداد بھی کم ہوتی تھی جریر کا قول ہے "اذا مدحتم فلا تطیلوا" (مدح کو طول نہ دو)

عرب میں مدحیہ شاعری کا دائرہ پہلے محدود تھا اور خاص خاص احسانات کے صلہ میں بطور شکریہ مدح کے اشعار لکھے جاتے تھے۔

مثلاً ایک خانہ جنگی میں بنو تمیم نے امرؤ القیس کی مدد کی تھی تو امرؤ القیس نے بطور شکریہ یہ شعر لکھا ؎

اقرحشا امرو القیس بن حجر

بنو تمیمٍ مصابیح الظلامِ

یعنی بنو تمیم اندھیری رات کے چراغ ہیں۔ یہ ایک سادہ مثال تھی اور معمولی تعریف۔ لیکن جب ملک میں امارت بڑھی اور تہذیب و تمدن کا دور آیا۔ تو مداحی کے اسلوب ترقی کر گئے اور مبالغہ بڑھ گیا۔ ذیل کی مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ثلاثۃ تشرق الدنیا ببھجتھم
شمس الضحٰی وابو اسحٰق والقمر

دنیا کو تین چیزوں نے روشن کر رکھا ہے۔ ایک آفتاب، دوسرا ابو اسحٰق (خلیفہ معتصم باللہ عباسی) اور تیسرا چاند

تحکّے افاعلہ فی کل نایلۃ	اور یہ تینوں ابو اسحٰق کے کارناموں کی نقل اتارتے ہیں
الغیث واللیث والصمصامۃ الذکر	یعنی بادل، شیر اور تلوار

جاہلیت کی مدح کے نمونے حسب ذیل ہیں :-

(۱) اخی ثقۃ لا یھلک الخمر مالہ	میرا بھائی قابل اعتماد ہے شراب اس کی دولت کو ضائع نہیں کرسکتی ہے
ولکنہ قد یھلک المال نایلہ	(کثرتِ مے نوشی داخل امارت تھی) البتہ فیاضی اس کی دولت کو برباد کردیتی ہے
(۲) تراہ اذا ما جئتہ متھللا	اس کے پاس کچھ مانگنے جاؤ تو اس کا چہرہ ایسا چمکنے لگتا ہے کہ گویا تم بھی
کانک تعطیہ الذی انت سائلہ	اس کو وہ چیز دیتے ہو۔
(۳) یغشون حتی ما تھر کلابھم	ممدوح کے کُتّے کسی کو دیکھ کر بھونکتے نہیں ہیں کیونکہ وہ تمام
لا یسألون عن السواد المقبل	آنے والوں سے مانوس ہوگئے ہیں۔

(حطیئہ)

اور یہی حال ہجو کا بھی تھا۔ اس عہد میں ہجو سے یہ مقصد نہ تھا کہ کسی کو گالیاں دی جائیں بلکہ اُن عیوب کا اظہار کیا جاتا تھا جس سے قوم کا کوئی سردار اپنے درجہ سے گر کر خوار و ذلیل ہوجائے۔ مثلاً مہمان نوازی، انسانی ہمدردی، فیاضی اور شجاعت میں کوتاہی کی جائے یا نسب میں ہیٹا ہونا، کسی عورت سے قبل اختتام ایام عدۃ نکاح کرلینا یا کسی عورت کی عفت میں خلل ڈالنا۔

مدح کے بعد نسیب کا درجہ تھا، شعرائے عرب کی اصطلاح میں نسیب، تشبیب اور تغزل سب کے ایک ہی معنی ہیں اور یہ عشقیہ شاعری کے اجزا ہیں۔ لغت میں الفاظ ذیل کے یہ معنی ہیں

۱۔ نسیب — غزل گفتن

۲۔ تشبیب — صفتِ محبوب کردن وغزل گفتن در بیان عشق خود

۳۔ تغزل (غزل) — حدیث زناں وعشق ایشاں گفتہ آید

۴۔ مرثیہ (رثاء) — مردہ را ومحاسن اورا شمردن در شعر

قصائد میں مواعظ بھی ہوتے تھے اور افتخار بھی۔ اور اس مضمون میں بڑی بلند پروازیاں کی جاتی تھیں مثلاً شاعر

اپنے قبیلہ کی وسعت دکھلاتا ہے ؎

۱- ما تطلع الشمس الّا عند اوّلنا	جب سورج نکلتا ہے تو اُس کی کرنیں اول سے
ولا تغیب الّا عند اخرانا	آخر تک ہمارے ہی قبیلہ پر پڑتی ہیں۔
۲- وانا نلھو بالحروب کما لھت	ہم لڑائیوں کو کھیل جانتے ہیں جس طرح ایک
فتاۃ بعقد او سخاب قرنفل	لڑکی لونگ کے ہار سے کھیلتی ہے

ان مضامین کے علاوہ قصیدہ میں عتاب، اعتذار، تہنیت، خمریات، رزم بزم، بہار و خزاں اور مناظر قدرت کی بھی تفصیل ہوتی تھی۔

۲- رزمیہ | عربوں میں اگر رزمیہ شاعری نہ ہوتی تو تعجب تھا کیوں کہ ایک ایک بچّہ بہادر تھا لہذا تلوار کے جوھر (جو ہاتھوں سے) دکھاتے تھے۔ زبان قلم اس کو بجنسہ ادا کر دیتی تھی اور اس مضمون میں وہ عجم سے بڑھے ہوئے تھے کیوں کہ عرب کا سپاہی، عجم کی طرح، کسی شاعر کا ممنونِ احسان نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ اپنے کارنامے خود ہی بیان کرتا تھا۔ یہ رزمیہ نظمیں حماسیات کہلاتی ہیں جس کا بہترین مجموعہ کتاب الحماسہ ہے۔

۳- مناظر قدرت | عرب کا ملک سنگلاخ اور ریگ زار ہے۔ دریاؤں سے محروم ہے۔ بدیں وجہ اس کے اندر ممالک عجم کی طرح باغات وغیرہ کی افراط نہیں ہے، نہ گلاب و نرگس کے تختے ہیں نہ بلبلوں کے چہچہے ہیں۔ جدھر دیکھو سیاہ پہاڑ سر اٹھائے کھڑے ہیں جنگل اور ریگستانوں میں کہیں کہیں چشمے اور نخلستان بھی ہیں لہذا عرب شاعر انھیں مناظر کی تصویر کھینچتا ہے۔

عربوں کا کبوترا ور فاختہ کا جوڑہ اپنی نغمہ سنجی میں ایران کی بلبل اور ہندوستان کے پپیہے سے کچھ کم نہیں ہے اور پیلو کا گھنا درخت، سرو و چنار کا قائم مقام ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ عرب شاعر مناظر کی تصویر کشی میں دوسرے ممالک سے کچھ مستعار نہیں لیتا۔ بلکہ جو اطراف و جوانب میں دیکھتا ہے وہی نظم کرتا ہے۔

۴- جذبات | انسانی جذبات سے مرثیہ کی بنیاد پڑی ہے اور مرثیہ گوئی میں عربوں کو بڑی قدرت حاصل تھی۔ حتیٰ کہ اُنھوں نے اپنے گھوڑوں اور راونٹ کے جو مرثیے لکھے ہیں وہ بھی جوش سے خالی نہیں ہیں۔

خنساء نے اپنے بھائی صخر کے جو مرثیے لکھے ہیں اس کے ہر ہر لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا آتش کدۂ نوبہار (بلخ)

دھواں اُٹھ رہا ہے۔ اسی طرح جب غیظ و غضب میں آتا ہے تو نظر آتا ہے کہ کوہ آتش فشاں سے لاوہ ٹپک رہا ہے۔

۵۔ نسائیت | عاشقانہ شاعری میں عرب اور عجم کی تشبیہات میں بہت فرق ہے۔ ایک عجمی جب اپنے معشوق کے دہن کی تعریف کرتا ہے تو اس کو گوہر، غنچہ، چشمہ، شہد اور جوہر فرد سے تشبیہ دیتا ہے۔ لیکن عرب شاعر دہن کو انگوٹھی کا حلقہ کہہ کر چپ ہو جاتا ہے۔

ایک عجمی محبوب کا سراپا ہے ؎

پستہ لب بادام چشم و سیب غبغب سرو قد
ہر دو ۔۔۔ ۔۔ چوں انار و چہرہ اللہ الصمد

ایک ظریف کہہ سکتا ہے کہ یہ عورت نہیں ہے بلکہ کابل میوہ کی خورجی ہے۔ عرب کی تمام شاعری میں ایک شعر اس نمونہ کا نہیں مل سکتا ہے۔

۱۵۔ کلیاتِ اشعارِ عرب | عرب میں ہزاروں شاعر تھے، اس لئے اشعار کی تعداد بھی خارج از شمار تھی۔ لہٰذا ارباب ذوق نے پہلے شعراء کا انتخاب کیا۔ اس کے بعد ۴۹ شاعروں کے کلام سے ایک ایک قصیدہ لے کر ایک مجموعہ مرتب کیا۔ پھر خاص اوصاف کے لحاظ سے ہر حصہ کا ایک جداگانہ نام رکھا چنانچہ عہد جاہلیت کے وہ سات کلیات حسب ذیل ہیں:

(۱) معلّقات (۲) مجمہرات (۳) مُنتَقیات (۴) مذہبات (۵) مراثی
(۶) مشوبات (۷) ملحمات

یہ مجموعہ تقریباً ۳۹۱ھ / ۱۰۰۰ء میں ابو زید انصاری نے مرتب کیا اور اس کا نام "جمہرہ اشعار العرب" رکھا۔ محققین یورپ کی تحقیقات کے مطابق اس مجموعہ میں جس قدر کلام ہے وہ ۵۰۰ء سے ۶۲۲ء / ۱ ہجری (۱۲۲ سال) تک کا ہے اور اسی زمانہ کو وہ عہد جاہلیت کہتے ہیں۔ کیوں کہ ۶۲۲ء سے اسلام کا آغاز ہوا ہے اور زمانہ مابعد کا کلام کتب ادب تذکروں اور تاریخوں میں پھیلا ہوا ہے اور یہ واقعہ ہے کہ بنی امیہ کے عہد تک شعرائے جاہلیت کا وجود مانا گیا ہے اور عہد عباسیہ سے جدید اسلامی دور کا آغاز ہوا ہے۔ اب ہم ان کلیات سبعہ کے مختصر حالات لکھتے ہیں۔ تفصیل سے لکھنا اس شخص کا کام ہے جو اُردو میں شعر العرب پر کوئی مستقل کتاب لکھے۔

۱۔ معلّقات

یہ مجموعہ سبعہ کے نام سے مشہور ہے جس میں نامور شعرائے جاہلیت کے سات قصائد ہیں۔ یہ معلقات فی زماننا سات مشہور ہیں لیکن مورخین نے لکھا ہے کہ یہ تعداد میں بہت زیادہ تھے۔ البتہ تدوین کے زمانہ تک گھٹتے گھٹتے ان کی تعداد صرف سات رہ گئی تھی اور بڑا حصہ ان کا تلف ہو چکا تھا اور قیاس عقل بھی یہی ہے کیوں کہ (۱۲۲) سال کی مدت میں کم از کم ۱۲۲ قصیدوں کو ضرور یہ عزت حاصل ہوئی ہوگی کہ وہ خانہ کعبہ میں آویزاں کئے گئے ہونگے (سالانہ ایک قصیدہ سوق عکاظ میں انتخاب کیا جاتا تھا)

یہ معلقات حماد راویہ نے سنہ ۱۵۶ھ ۷۷۲ء (عہد عباسیہ) میں جمع کئے تھے اور چوں کہ یہ بہترین انتخاب تھا لہذا کل قصائد مقبول ہوئے۔

وجہ تسمیہ | عام مشہور روایت یہی ہے کہ یہ قصائد خانہ کعبہ میں لٹکائے گئے تھے۔ اس وجہ سے معلقات کے نام سے مشہور ہوئے۔ لیکن زمانہ حال کے محققین کا خیال ہے کہ یہ وجہ تسمیہ سطحی اور معمول ہے۔ ان کے نزدیک معلقہ کا مادۂ اشتقاق عِلق ہے۔ جس کے معنی شے نفیس اور قیمتی کے ہیں اور چوں کہ ان قصائد کے اشعار جواہرات کے ہم پلّہ مانے جاتے تھے اس لئے معلقہ کہلائے۔ جس کی تائید دوسرے نام السموط (موتی کی لڑیاں) سے ہوتی ہے اور چوں کہ یہ قصائد بڑے ہیں اس لئے ان کو سبع الطوال بھی کہتے ہیں۔ ابن رشیق نے لکھا ہے کہ معلقات کو مذہبات بھی کہتے تھے کیوں کہ یہ قصائد قباطی (مصر کا ریشمی کپڑا) پر سونے کے پانی سے لکھ کر حرم کعبہ میں لٹکائے جاتے تھے۔
قصائد معلقہ کی شاعری کس درجہ کی ہے اس کی نسبت یہی کہنا کافی ہے کہ عرب اس کو الہامی جانتے تھے اور جس طرح عرب سیکڑوں خداؤں کو سجدہ کرتے تھے اسی طرح یہ معلقات بھی برسوں مسجود خلائق رہے۔ لیکن جب یہ آیت نازل ہوئی۔ وَقِيلَ يَا أَرْضُ ابْلَعِي مَاءَكِ وَيَا سَمَاءُ أَقْلِعِي وَغِيضَ الْمَاءُ وَقُضِيَ الْأَمْرُ (سورۂ ہود)
تو یہ قصائد نظروں سے گر گئے اور ان کی عدیم المثالی میں فرق آگیا۔ جس میں امرؤ القیس کا مشہور قصیدہ قفا نبک بھی داخل ہے اور اسی دن سے سجدہ زمین بوس بند ہوا۔

چوں کہ یہ مجموعہ داخل درس ہے لہذا کسی قدر تفصیل سے اس کے حالات لکھے جاتے ہیں۔

اس میں حسب ذیل[1] سات شاعروں کے قصائد ہیں۔

(۱) امرؤالقیس کندی (۲) طرفہ بن العبد (۳) زہیر بن ابی سلمہ (۴) لبید بن ربیعہ (۵) عمرو بن کلثوم تغلبی
(۶) عنترہ بن شداد (۷) حارث بن حلزہ

بعض قدیم معلقات میں نابغہ ذبیانی اور اعشیٰ کے بھی قصائد شامل ہیں اور بعض نے حارث اور عنترہ کے قصائد اس مجموعہ سے خارج کردیئے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی اختلاف ہے کہ ان سبعہ سیاروں میں سب سے زیادہ روشن کون ہے۔ یعنی اشعر الشعراء کے خطاب کا کون مستحق ہے ؟

عرب کے سب سے بڑے ادیب ابوعبیدہ کی نزدیک بلحاظ فصاحت و بلاغت ان شعراء کی یہ ترتیب ہے۔
امرؤالقیس، زہیر، نابغہ، اعشیٰ، لبید، عمرو بن کلثوم اور طرفہ۔ لیکن جب لبید سے سوال کیا گیا کہ اشعر الشعرا کون ہے ؟ تو اس نے کہا کہ ملک الضلیل (امرؤالقیس)

شاعرانہ نقطۂ نظر سے لبید کا فیصلہ قابل تسلیم ہے۔ کیوں کہ شاعروں کی رقابت اور ان کا غرور ضرب المثل ہے
اصحاب معلقہ کے مختصر حالات یہ ہیں :-

۱۔ امرؤالقیس کندی

اس شہنشاہ اقلیم سخن کا نام جندح اور عام لقب امرؤالقیس اور تاریخی خطاب ملک الضلیل و ذوالقروح ہے۔
نسب نامہ یہ ہے[2]

جندح بن حُجر بن حارث بن عمرو بن حجر آکل المرار بن عمرو بن معاویہ بن حرث بن معاویہ
بن ثور بن کندہ بن مرتع بن عفیر بن عدی بن اطرث بن مرّہ بن اُدد بن زید بن کہلان

امرؤالقیس کا باپ حجر، قبیلہ کندہ (علاقہ نجد) کا فرماں روا تھا۔ جو حکومت کے لحاظ سے شاہانِ حیرہ کا ہم پلہ

---

[1] کتاب العمدہ صفحہ ۱۶ و جمہرہ انصاری صفحہ ۴۳ مطبوعہ مصر ۱۳۰۸ھ

[2] یعقوبی باب الشعراء العرب جلد اول۔ جمہرہ انصاری بلوغ الارب امرؤالقیس و کتاب العمدہ صفحہ ۵۹ و کتاب الشعر محمد بن سلام صفحہ ۲۱ تذکرہ ابن قتیبہ ۱۲

سمجھا جاتا تھا اور اس کی ماں (فاطمہ بنت ربیعہ) تغلبیہ تھی
کُلیب (امرؤ القیس بن ربیعہ) اور مہلہل (عدی بن ربیعہ) اس کا ماموں ہے جن کی سیادت اور خاندانی عظمت مسلم تھی۔ عربوں میں مثل ہے کہ "اعزّ من کلیب وائل" کلیب نہایت نامور سردار تھا جس کے قتل پر حرب بکر و تغلب شروع ہوئی اور مہلہل کی نسبت مشہور ہے کہ اس نے اپنے بھائی کلیب کی موت پر سب سے پہلے قصیدہ لکھا۔ اس لحاظ سے امرؤ القیس خاندانی شاعر تھا اور راہبوں کی صحبت میں عیسائی ہو گیا تھا۔ لیکن خیالات بُت پرستوں کے سے تھے اور بتوں کو پوجتا بھی تھا۔ عربی شاعری کے جو چار رکن ہیں ان میں سے ایک امرؤ القیس (زہیر، نابغہ، اعشیٰ) بھی ہے۔

اصمعی کا قول ہے کہ "کان من فحول شعراء الطبقة الاولیٰ مقدماً علی سائر شعراء الجاهلية"

یونس بن حبیب کے قول کے مطابق علماے بصرہ امرؤ القیس کو، اہل کوفہ اعشیٰ، اور اہل حجاز زہیر و نابغہ کو سب سے مقدم جانتے تھے۔

حضرت عمرؓ اور علی مرتضیٰؓ بھی امرؤ القیس کے مدّاح تھے۔ لیکن جب نبی کریمؐ کے حضور میں امرؤ القیس کا کلام پڑھا گیا تو آپ نے ارشاد فرمایا۔

یجیئ یوم القیامة وبیده لواء الشعراء — قیامت کے دن امرؤ القیس کے ہاتھ میں شاعروں کا علم ہوگا
یقوده الی النار — اور وہ ان کو دوزخ کی طرف لے جائے گا۔

اس کے کلام میں تغزل کا رنگ غالب تھا اس کی وجہ سے وہ ملک الضلیل (شاہ گمراہ) مشہور ہوا (عرب عاشقانہ جذبات کو بہادری کے خلاف سمجھتے تھے) امرء القیس شاعری میں مہلہل کا مقلد تھا۔ لیکن اس نے نئے نئے اسلوب پیدا کئے اور چوں کہ خود شاہزادہ ہے لہذا خیالات بلند ہیں اور مضامین میں ندرت ہے۔ یہ صرف اپنے واقعات قصیدہ میں لکھتا ہے اور کسی کی مداحی نہیں کرتا۔

سبعہ معلقہ میں سب سے پہلے اس کا قصیدہ ہے جو شہرت میں بھی سب سے بالاتر ہے اور عربی میں ایک مثل ہے کہ "اشهر من قفانبك" اس سے قصیدہ مذکور کا مطلع مراد ہے۔ پورا مطلع یہ ہے ؎

قفانبك من ذكری حبیب و منزل — اے میرے دوستو! ذرا ٹھیر جاؤ کہ میں اپنے محبوب اور اُس کے مکان کی
بسقط اللوی بین الدخول فحومل — یاد میں دو آنسو بہالوں۔ یہ مکان ریت کے ٹیلہ کے سرے پر مابین موضع حومل اور دخول کے واقع ہے۔

اس قصیدہ میں وہ اپنی بنت العم، عنیزہ بنت شرجیل سے تشبیب کرتا ہے جس کا نام بھی ایک شعر میں موجود ہے اور اس قصیدہ کی تمہید دیار محبوب کے آثار و کھنڈرات سے اٹھائی ہے اور یہ قانون قدرت ہے کہ یاد ایام سے بھی قلب کو ایک خاص قسم کی مسرت ہوتی ہے اور عہد گزشتہ کے حالات یکایک پیش نظر ہو جاتے ہیں اور عرب کی ملکی فضا کے اعتبار سے بھی یہ اشعار نہایت دل کش ہیں اور دیگر شعراء (جاہلیت و اسلام) نے بھی امرؤ القیس کے تقلید میں قصیدہ کا مطلع اسی تمہید سے شروع کیا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ بعض شعرائے عجم بھی عربوں کے مقلد ہیں۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

اے ساربان منزل مکن — جز در دیار یار من
تا یک زماں زاری کنم — بر ربع و اطلال و دمن
ربع از دلم پُر خوں کنم — اطلال را جیحوں کنم
خاکِ دمن گل گوں کنم — از آب چشم خویشتن
از روئے یار خرگہے — ایواں ہمی بینم تہی
وز قدِ آں سروِ سہی — خالی ہمی بینم چمن

امیر معزی فرماتے ہیں ؎

آنجا کہ بود آں دلستاں — با دوستاں در بوستاں
شد کوف (بوم) و کرگس را مکاں — شد گرگ و روبہ را وطن
در جائے رطل و جام مے — گوراں نہادستند پے
بر جائے چنگ و عود و نے — آواز زاغ ست و زغن

لہ تاریخ آل سلجوق کرمانی صفحہ ۱۱۵ مطبوعہ ہالینڈ۔

لیکن یہ واضح رہے کہ امرؤالقیس دیارِ بنی اسد کے کھنڈرات کا ماتم کرتا ہے۔ ایرانی شعراء شیراز و اصفہان میں بیٹھکر صحرائے عرب کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ اصل ونقل میں زمین وآسمان کا فرق ہوتا ہے۔

تغزل | امرؤالقیس کو بچپن سے عشق بازی کا سودا تھا لہذا اشعار میں بھی یہ رنگ غالب رہا اور چونکہ شاہانِ عرب شاعری کو اپنی ذات کے لئے سرمایۂ فخر نہیں جانتے تھے لہذا باپ نے بیٹے کو اکثر سمجھایا کہ جانِ پدر! شاعری عوام کے لئے قابلِ عزت ہے۔ تم شعر کہنا چھوڑ دو۔ لیکن امرؤالقیس نے اس نصیحت پر عمل نہیں کیا اور جوانی تک شعروشاعری میں منہمک رہا۔

امرؤالقیس کا عالمِ شباب تھا کہ دارۂ جلجل کا واقعہ پیش آیا۔ اس بے حیائی کے واقعہ پر اس کے باپ نے ناراض ہوکر اپنے غلام ربیعہ کو حکم دیا کہ امرؤالقیس کو قتل کرکے اس کی آنکھیں نکال لا۔ ربیعہ نے امرؤالقیس کی جوانی پر ترس کھاکر زندہ چھوڑ دیا اور حجر کے سامنے ایک جنگلی گائے کے بچے کی آنکھیں لاکر رکھدیں۔

ابن رشیق کا قول ہے کہ امرؤالقیس ازحد بدکار اور شراب خوار تھا اور اپنے باپ کی عورتوں (سوتیلی ماؤں اور کنیزوں) سے قصائد میں تشبیب کرتا تھا۔ اس لئے گھر سے نکال دیا گیا تھا۔ اس زمانہ میں وہ جنگلوں میں اپنے دوستوں کے ساتھ آوارہ پھرا کرتا تھا اور شعروسخن سے دل بہلاتا تھا۔ جب اس کا باپ حجر قتل ہوگیا اس وقت گھر آنا نصیب ہوا ہے۔

امرؤالقیس کے دیوان اور قصیدۂ مذکورہ میں متعدد اشعار ہیں جن سے تغزل کا رنگ نمایاں ہے۔ چنانچہ اشعار ذیل میں رات کی درازی اور ہجران نصیب عشاق کی حالت زار کی تصویر کھینچتا ہے ؎

وليلٍ كموج البحر ارخى سدوله	اور جب رات نے (جو سمندر کی موج کی طرح خوفناک تھی)
عليّ بانواع الهموم ليبتلي	مجھ پر رنج وغم کے پردے لٹکا دیئے۔ آزمائش صبر کے لئے)
فقلت له لمّا تمطّى بصلبه	تو میں نے رات سے کہا جب کہ اُس نے انگڑائی لی
واردف اعجازا وناء بكلكل	(سُرین پشت کی جانب کئے اور سینہ ابھارا)
الا ايها الليل الطويل الا انجلي	ہاں! اے لانبی رات، تو کیوں صبح نہیں ہوجاتی
بصبح وما الاصباح منك بامثل	لیکن اے رات، صبحیں تجھ سے بہتر نہیں ہوسکتی ہیں

کیسا لطیف مضمون ہے پہلے درازیٔ شب سے بدحواس ہو کر صبح ہونے کی آرزو کرتا ہے۔ لیکن جب یہ خیال آتا ہے کہ صبح کو پھر انھیں مصائب کا سامنا ہوگا تو عالم یاس میں رات کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ او ڈراؤنی رات! صبح تجھ سے بہتر نہیں ہو سکتی ہے جو لذت تجھ میں ہے وہ صبح میں کہاں؟

۲ - فاطمہ عذریہ (بنت عبید بن ثعلبہ بن عامر) کی کج ادائیوں سے جب پریشان ہو جاتا ہے تو خود اس کو مخاطب کر کے کہتا ہے ؎

أفاطم مهلاً بعض هذا التدلل	اوفاطمہ! ان اداؤں کو چھوڑ دے
وان كنتِ قد أزمعت صرمي فاجملي	اور اگر مجھ سے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا ہے تو سوچ سمجھ کر جدائی اختیار کر
أغرّكِ مني إن حبّكِ قاتلي	کیا تجھ کو یہ غرور ہے کہ میں تیری محبت میں مرجاؤں گا۔
وانكِ مهما تأمري القلب يفعل	اور تیری ہر حکم کی تعمیل کروں گا؟
وان تكُ قد ساءتكِ مني خليقة	اگر تجھ کو میری کوئی عادت بری معلوم ہوئی ہو تو میرے کپڑے سے
فسُلّي ثيابي من ثيابكِ تنسلِ[1]	اپنا کپڑا الگ کرلے (یعنی بہ طیب خاطر مجھ سے الگ ہو جا)

عشاق کا دل بھی کس قدر کمزور ہوتا ہے پہلے تو شیخی میں آکر جو نہ کہنا تھا وہ کہہ گیا لیکن جب فاطمہ امرؤ القیس کی باتوں سے متاثر ہو گئی اور جدائی کا نام سن کر اشکبار ہوئی تو اب گھبرا کر اور بات کاٹ کر کہتا ہے ؎

وما ذرفت عيناكِ الا لتضربي	تیری آنکھوں سے آنسو نہیں بہے ہیں مگر محض اس لئے؟
بسهميكِ في أعشار قلب مقتل	کہ تو میرے دل کے دس حصوں میں دونوں تیر مارے

اس شعر میں قمار بازی کے ایک کھیل کی طرف اشارہ ہے۔ یہ وہ شعر ہے جس کی شعراءِ عرب نے بڑی داد دی ہے۔ کہتا ہے کہ تیری آنکھوں کے آنسو بمنزلہ معلی اور رقیب (تیروں کے نام ہیں) کے ہیں جنھوں نے میرے دل کے دسوں حصے جیت لئے ہیں۔

---

[1] عہد جاہلیت میں طلاق کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ مرد اپنی عورت سے کپڑے مانگتا تھا اور جب وہ اتار کر حوالہ کر دیتی تھی تو طلاق ہو جاتی تھی۔ لیکن شارحین کا خیال ہے کہ یہاں "خلص قلبي من قلبكِ" مراد ہے۔

(جمہرہ انصاری صفحہ ۱۴)

۳۔ گھوڑے کی تعریف میں جو اشعار لکھے ہیں وہ اسی کا حصہ ہے اور یورپ کی متعدد زبانوں میں ان کا ترجمہ ہو چکا ہے۔

مِكَرٍّ مِفَرٍّ مُقبِلٍ مُدبِرٍ مَعاً	جب حملہ کرنا چاہو تو بڑا حملہ آور ہے اور جب پیچھے ہٹانا چاہو تو
كجُلمودِ صَخرٍ حطّه السيلُ من علِ	بکمال سرعت پیچھے ہٹتا ہے یعنی سب کرتبوں میں ہوشیار ہے۔ اس کی
	رفتار ایسی ہے گویا پہاڑ کے سیلاب سے پتھر ڈھلکتا آتا ہے۔
له ايطلا ظبيٍ وساقا نعامةٍ	اس کی دونوں کوکھیں (کمر) مثل ہرن کے پتلی ہیں، ٹانگیں شترمرغ
وارخاء سرحانٍ وتقريبُ تتفلِ	کی طرح سیدھی ہیں اور سرعت رفتار بھیڑیے کی سی ہے اور چال لومڑی کے
	بچہ کی مانند ہے۔

ان اشعار کا نام "قلائد فاخرہ" ہے۔ کیوں کہ اس میں متعدد تشبیہات ہیں۔

۴۔ شاعرانہ تخیل کا اعلیٰ نمونہ ملاحظہ ہو ؎

كأنّ مكاكيَّ الجواءِ غديّةً	وادی کی فضا میں سفید رنگ کی چھوٹی چھوٹی چڑیوں کو
صُبِحنَ سُلافاً من رحيقٍ مُفلفلِ	تڑکے لطیف شراب میں مرچ ڈال کر پلائی گئی ہے۔

شاعر کے خیال میں پانی برس کر کھل گیا ہے، سپیدۂ صبح نمودار ہونے پر جنگل کی چڑیاں ڈالیوں پر چوں چوں کرتی پھرتی ہیں اور سارا جنگل ان کی نغمہ سنجیوں سے گونج رہا ہے۔ اب شاعر عالم محویت میں غور کرتا ہے کہ کس چیز نے ان چڑیوں کو دیوانہ بنایا ہے۔ تو اس کے خیال میں یہ بات آتی ہے کہ ان کو شراب میں مرچ ملا کر پلائی گئی ہے۔ جس کے سبب سے آواز میں ایک سُریلاپن پیدا ہو گیا ہے۔

امرؤ القیس چوں کہ خود شرابی ہے۔ لہٰذا اس کو مطلب کی سوجھتی ہے اور انھیں خیالات کی بنیاد پر کہا جاتا ہے کہ امرؤ القیس تقریر میں مصوری کرتا ہے۔

۵۔ امرؤ القیس پہلا شاعر ہے جس نے عورتوں کو ہرنیوں، نیل گایوں اور شترمرغ کے انڈوں سے اور چہرۂ محبوب کو راہب کے چراغ سے تشبیہ دی ہے۔ ابن قتیبہ نے اس مضمون کو کتاب الشعر میں تفصیل سے لکھا ہے۔

امرؤ القیس کے اس قصیدہ (قفا نبك) میں وہ اشعار نہایت دل چسپ ہیں جس میں عنیزہ کی ملاقات کا تذکرہ ہے۔ عنیزہ کے علاوہ ام الحارث کلبیہ اور ام الرباب سے بھی تشبیب کرتا ہے۔

۲۔امرؤالقیس کی موت | امرؤالقیس کا دادا حارث بن عمرشاہ کندہ گورنمنٹ ایران کا باج گزار تھا۔ جب قباد بن فیروز ساسانی نے مزدک کا دین قبول کرلیا تو منذر سوم شاہ حیرہ اور حارث کندی کو بھی مذہب مزدکیہ کی دعوت دی گئی منذر نے انکار کردیا۔لیکن حارث نے اس جدید مذہب کو قبول کرلیا۔اس عدول حکمی پر قباد نے منذر کو حکومت حیرہ سے معزول کردیا اور حارث کو حیرہ کی بھی حکومت تفویض کردی۔ انتزاع حکومت کے بعد منذر نے حکمت عملی سے حارث کو قتل کرادیا۔ جب حارث قتل ہوگیا تو اس کی حکومت امرؤالقیس کے باپ حجر کی سپرد ہوئی۔لیکن علباء بن حارث اسدی نے بمقام دمون حجر کو قتل کردیا۔ حجر نے عالم سکرات میں ایک وصیت نامہ لکھا اور قاصد کو دے کر ہدایت کی کہ پہلے میرے بیٹے نافع کے پاس جانا، اگر وہ وصیت نامہ پڑھکر اشک بار ہو تو اس کے ہاتھ سے چھین لینا اور میرے دوسرے بیٹے امرؤالقیس کو جاکر دینا۔چنانچہ قاصد نے ایسا ہی کیا۔ امرؤالقیس کو جب باپ کا وصیت نامہ ملا، اس وقت وہ یاران جلسہ میں بیٹھا ہوا شراب پی رہا تھا۔کاغذ لے کر بولا" الیوم خمرٌ و غداً امرٌ" آج بزم ہے کل رزم ہوگی۔ پھر یہ شعر پڑھا ؎

خلیلیّ ما فی الیوم مصحٍ لشارب
ولا فی غدٍ اذ کان ما کان مشرب

اور مسلسل سات یوم تک عیش وطرب میں مشغول رہا۔جب خمار اُترا تو ذوالخلیفہ (مشہور بت جو تبالہ میں نصب تھا) کے مندر میں گیا۔اور نذر مانی کہ جب تک باپ کے خون کا قصاص نہ لے لوں گا نہ شراب پیوں گا نہ حرم میں جاؤں گا نہ گوشت کھاؤں گا، نہ غسل کروں گا (جاہلیت کی یہی نذر تھی) اور منذر کی قتل کی تدبیریں کرتا رہا۔جب کسی طرح کامیاب نہ ہوا تو فوجی امداد کے لئے قبائل عرب میں صحرا نوردی شروع کی، لیکن منذر کے خوف سے کسی قبیلہ نے مدد نہ دی۔تب سموال بن عادیا یہودی کے قلعہ میں گیا اور خاندانی زرہیں اس کے پاس امانت رکھ دیں اور جس ٹی نین اول قیصر روم (۵۲۸ء لغایۃ ۵۶۵ء) کے دربار میں پہنچا۔ قیصر نے[۱] اعزاز واحترام سے امرؤالقیس کا خیرمقدم کیا اور فوجی امداد کا بھی وعدہ کیا۔ درباریوں نے جب دیکھا کہ قیصر اس عرب سردار کا ہمدرد ہے تو انھوں نے

---

[۱] تاریخ ادب عربی پرتھیر نکلسن وتاریخ علم الادب عندالافرنج والعرب وکیٹر ہوگو مطبوعہ مصر ۱۹۰۴ء صفحہ ۳۰ وکتاب الشعر ابن قتیبہ از صفحہ ۳۰ ۔

قیصر سے شکایت کی کہ امرؤالقیس شاہزادی پر عاشق ہوگیا ہے اور یہ بھی عرض کیا کہ اس عرب کو امداد دینا خلاف مصلحت ہے کیوں کہ یہ ممکن ہے کہ اگر امرؤالقیس کو حکومت مل گئی تو وہ ہمارا مقابلہ کرے گا۔ قیصر نے اس رائے کو تسلیم کرلیا اور ایک عرصہ تک مہمان رکھ کر رخصت کیا۔

جب امرؤالقیس روانہ ہوگیا تو قیصر نے طماح بن قیس اسدی (امرؤالقیس کا مشہور دشمن) کے ہاتھ امرؤالقیس کو ایک گراں بہا خلعت بھیجا۔ جو زہر آلود تھا۔ امرؤالقیس نے اس کو فخریہ پہنا اور اس کا زہریلا اثر تمام جسم میں سرایت کرگیا اور انگورہ پہنچ کر ۵۴۰ء میں مرگیا[1]۔ یہ واقعہ ولادت رسول اللہ صلعم سے ۳۱ سال قبل کا ہے۔ زہر کے اثر سے امرؤالقیس کے تمام جسم پر آبلے پڑگئے تھے اور ان زخموں کی وجہ سے اس کا لقب ذوالقروح ہوا۔ فرزدق کہتا ہے ؎

وھب القصائد بی النوابغ اذ مضوا
وابو یزید و ذوالقروح وجرول

وہ تمام شاعر جو نابغہ کے لقب سے مشہور تھے جب دنیا سے رخصت ہونے لگے تو انھوں نے اور نیز ابو یزید مخبل سعدی مینی اور امرؤالقیس ذوالقروح اور حطیہ (جرول) نے قصائد مجھے ہبہ کردیئے

امرؤالقیس انگورہ میں ایک شاہزادی کے قریب دفن کیا گیا۔

معلقات کا ترجمہ | سبعہ معلقہ کا ترجمہ یورپ کی متعدد زبانوں میں ہوچکا ہے اور اس کے عاشقانہ اشعار خاص طور پر پسند کئے گئے ہیں۔

۲۔ زہیر بن ابی سلمہ مزنی

سبعہ معلقہ کا یہ دوسرا[2] رکن ہے۔ اس کا نسب نامہ یہ ہے:

زہیر بن ربیعہ (ابی سلمہ) بن رباح بن العوام بن قرط
بن الحارث بن مازن بن حلاوۃ بن ثعلبہ بن ثور بن ہرمۃ

---

[1] موسیو سدیو نے لکھا ہے کہ امرؤالقیس ۵۰۰ء میں پیدا ہوا تھا تو اس حساب سے ۴۰ سال کی عمر میں فوت ہوا ۱۲
[2] انتخاب از جمہرہ انصاری۔ تاریخ یعقوبی، صناجۃ الطرب، کتاب العمدہ۔ بلوغ الارب۔ دول الاسلام۔ طلعت حب۔ کتاب الشعراء ابن قتیبہ ۱۲

بن لاطم بن عثمان بن مزینہ بن ادبن طابخہ ۔"

اس کے قصیدہ کا مطلع ہے ؎

آمن ام اوفیٰ دمنۃ لم تکلم	کیا یہ اُم اوفیٰ کے مکان کے نشانات ہیں جو سیاہ سیاہ
بحومانۃ الدراج فالمتثلم	نظر آرہے ہیں یہ کیوں چپ ہیں ؟
	یہ آثار موضع دراج اور متثلم کی سخت زمین میں واقع ہیں

اس قصیدہ میں ۶۴ شعر ہیں۔

اس نامور شاعر کے حولیات مشہور ہیں۔ حولیات سے وہ قصائد مراد ہیں جو ایک سال کی محنت میں تیار ہوتے تھے۔ زہیر کا دستور تھا کہ چار مہینے میں صرف ایک قصیدہ لکھتا تھا اور چار مہینے تک اس میں کاٹ چھانٹ کرتا تھا۔ اور چار مہینے تک دوستوں کو سنایا کرتا تھا چنانچہ اس طرح پورے ایک سال (حول) محنت میں قصیدہ مکمل ہوتا تھا، اصطلاح شعرا میں ایسا کلام مصنوع کہلاتا ہے جو مطبوع کی نقیض ہے۔

ام اوفیٰ زہیر کی پہلی بی بی ہے۔ اس کی کوئی اولاد زندہ نہیں رہی۔ البتہ دوسری بی بی سے کعب اور بجیر پیدا ہوئے یہ دونوں شاعر تھے۔ حجاز میں زہیر کا کلام بہت مقبول ہے۔ امیر المومنین حضرت عمر زہیر کو اشعر الشعراء جانتے تھے۔ اور فرماتے تھے کہ لا یمدح الرجل الا بما ھو فیہ یعنی زہیر ممدوح کے صرف وہی اوصاف لکھتا ہے جو اُس میں موجود ہوتے ہیں۔ اسی مضمون کو دوسرے الفاظ میں حسان بن ثابت نے اس طرح ادا کیا ہے ؎

وانّ احسن بیت انت قائلہٗ
بیت یقال اذا انشدتہ صدقا

یعنی شعر کا مضمون سنتے ہی لوگ پکار اٹھیں کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ بالکل سچ ہے۔

اصمعی کے نزدیک بھی زہیر اشعر الشعراء ہے۔

زہیر خاندانی شاعر تھا۔ اس کا باپ، ماموں (بشامہ) اور خسر (اَوس بن حجر) مشہور شاعر تھے۔ زہیر کی بہنیں سلمیٰ اور خنساء (مشہور مرثیہ گو) بھی شاعرہ تھیں۔ زہیر کے پوتے (عتبہ بن کعب) اور پڑپوتے (عوام بن عتبہ) بھی شاعر تھے اور یہ سلسلہ اخیر تک قائم رہا۔

زہیر کا شمار حکمائے عرب میں تھا۔ اس کے کلام میں حکیمانہ اشعار موجود ہیں۔ چنانچہ یہ مشہور شعر ہے ؎

لسان الفتیٰ نصف ونصف فوادہ	انسان دو حصوں پر تقسیم ہے یعنی نصف زبان ہے اور نصف دل ہے
فلم یبق الا صورۃ اللحم والدم	اس کے بعد جو کچھ ہے وہ گوشت اور خون ہے۔

۲۔ دوسرا حکیمانہ شعر یہ ہے جس کو حضرت عمرؓ بہ نظر استعجاب پڑھا کرتے تھے ؎

فان الحق مقطعہ ثلاثٌ	مقدمہ کا فیصلہ تین باتوں پر منحصر۔ ایک قسم پر، دوسرے پنچایت
یمینٌ او نفارٌ او جلاءٌ	(منافرۃ) پر اور تیسری جلاء وطنی پر (سیاست کی یہ آخر سزا ہے)

زہیر کو سرقہ، انتحال، نسخ، مسخ اور سلخ (چوری اور مختلف طریقوں سے دوسرے کلام کی قطع برید کرنا) سے نفرت تھی۔ مرثیہ اور مدح خوب لکھتا تھا۔ اور یہ پہلا شاعر ہے جس نے بادشاہ کی مدح میں قصیدہ لکھا لیکن قصیدہ میں وہی اوصاف لکھے جو ممدوح میں موجود تھے۔ چنانچہ اسی بنیاد پر جب فن شعر پر کتابیں لکھی گئیں تو ابن قدامہ نے مدح کے لئے یہ قاعدہ مقرر کیا۔

لما کانت فضائل الناس حیث انھم	عقلا کے نزدیک فضائل انسانی ایک انسان کی حیثیت سے
ناس، لا من طریق ما ھم مشترکون فیہ	(نہ بحیثیت ان صفات کے جن میں وہ حیوان سے مشترک ہے)
مع سائر الحیوان، علی ما علیہ اھل الالباب	بالاتفاق چار ہیں عقل، شجاعت، عدل اور عفت۔
من الاتفاق فی ذلک انما ھی العقل	چنانچہ جو شاعر اپنے ممدوح کی (جو مرد ہیں) ان اوصاف
والشجاعۃ والعدل والعفۃ کان القاصد لمدح ہم	سے مداحی کرتا ہے وہ تو سیدھے راستہ پر ہے اور جو اس کے
الرجال لھذا الاربع الخصال مصیبا والماد ح بغیرہا مخطئا	خلاف مدح کرتا ہے وہ غلطی پر ہے۔"

اور یہی اصول مرثیہ اور ہجو کے لئے بھی ہے۔

(باقی آئندہ)

محمد عبدالرزاق

شاہ نامۂ اسلام کا ایک ورق

ولادت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم

ہماری درخواست پر جناب حفیظ صاحب نے شاہ نامۂ اسلام کا ایک باب یعنی حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت پاک کا حال میگزین میں اشاعت کے لئے روانہ فرمایا ہے۔ شاہ نامۂ اسلام کے موضوع سے ادبی دنیا بخوبی واقف ہو چکی ہے اور ہمیں امید ہے کہ اردو میں یہ کتاب اپنے طرز کی پہلی کتاب ہوگی۔ اس نوازش کے لئے ہم حفیظ صاحب کا دلی شکریہ ادا کرتے ہیں۔

ایڈیٹر

یہ کس کی جستجو میں مہر عالمتاب پھرتا تھا
ازل کے روز سے بے تاب تھا بیخواب پھرتا تھا

یہ کس کی آرزو میں چاند نے سختی سہی برسوں
زمیں پر چاندنی برباد و آوارہ رہی برسوں

یہ کس کے شوق میں پتھرا گئیں آنکھیں ستاروں کی
زمیں کو تکتے تکتے آ گئیں آنکھیں ستاروں کی

کروروں کروٹیں کس کے لئے ایام نے بدلیں
پیاپے کروٹیں کس دھن میں صبح و شام نے بدلیں

یہ کس کے واسطے مٹی نے سیکھا گل فشاں ہونا
گوارا کر لیا پھولوں نے پامالِ خزاں ہونا

یہ سب کچھ ہو رہا تھا ایک ہی امید کی خاطر
یہ ساری کاہشیں تھیں ایک صبحِ عید کی خاطر

مشیّت تھی۔ کہ یہ سب کچھ تہِ افلاک ہوتا تھا
کہ سب کچھ ایک دن نذرِ شہِ لولاک ہوتا تھا

خلیل اللہ نے جس کے لئے حق سے دعائیں کیں
ذبیح اللہؑ نے وقتِ ذبح جس کی التجائیں کیں

جو بن کر روشنی پھر دیدۂ یعقوبؑ میں آیا
جسے یوسفؑ نے اپنے حُسن کے نیرنگ میں پایا

کلیم اللہؑ کا دل روشن ہوا جس ضوفشانی سے
وہ جس کی آرزو خضرؑ کی جوابِ لَنْ تَرَانِیْ سے

وہ جس کے نام سے داؤدؑ تے نغمہ سرائی کی
سلیمانؑ نے طلب میں جسکی شاہی میں گدائی کی

دلِ یحییٰؑ میں ارماں رہ گئے جس کی زیارت کے
لبِ عیسیٰؑ پہ آئے وعظ جس کی شانِ رحمت کے

وہ دن آیا کہ پورے ہوگئے تورات کے وعدے
خدا نے آج ایفا کردیئے ہر بات کے وعدے

مرادیں بھر کے دامن میں مناجاتِ زبور آئی
امیدوں کی سحر پڑھتی ہوئی آیاتِ نور آئی

نظر آئی بالآخر معنیٔ انجیل کی صورت
ودیعت ہوگئی انسان کو تکمیل کی صورت

اندھیری رات کے پردے سے کی حق نے سحر پیدا
ہوا بہرِ بصیرت کحلِ مَازَاغَ الْبَصَرُ پیدا

ربیع الاول امیدوں کی دنیا ساتھ لے آیا
دعاؤں کی قبولیت کو ہاتھوں ہاتھ لے آیا

خدا نے ناخدائی کی خود انسانی سفینے کی
کہ رحمت بن کے چھائی بارھویں شب اس مہینے کی

ازل کے روز جس کی دھوم تھی وہ آج کی شب تھی
جو قسمت کے لئے مقسوم تھی وہ آج کی شب تھی

مشیّت ہی کو جو معلوم تھی وہ آج کی شب تھی
ارادے ہی میں جو مرقوم تھی وہ آج کی شب تھی

نئے سر سے فلک نے آج بختِ نوجواں پایا
خزاں دیدہ زمیں پر دائمی رنگِ بہار آیا

ادھر سطحِ فلک پر چاند تارے رقص کرتے تھے
اُدھر روئے زمیں کے نقش بنتے تھے سنورتے تھے

سمندر موتیوں کو دامنوں میں بھر کے بیٹھے تھے
جبل لعل و جواہر کو مہیا کر کے بیٹھے تھے

زمرّد وادیوں میں سبزہ بن کر ہر طرف بکھرا
ہوئی بارانِ رحمت ہر شجر کا رنگِ رُخ نکھرا

ہوائیں پے بہ پے اک سرمدی پیغام لاتی تھیں
کوئی مژدہ تھا جو ہر گوشِ گل میں کہہ سناتی تھیں

ہنسے جاتے تھے کھلتے جا رہے تھے پھول گلشن میں
گلے پھولوں سے ملتے جا رہے تھے پھول گلشن میں

تبسم ہی تبسم تھے نظارے لالہ زاروں کے
ترنّم ہی ترنم تھے کنارے جوئباروں کے

جہاں میں جشنِ صبحِ عید کا ساماں ہوتا تھا
ادھر شیطان تنہا اپنی ناکامی پہ روتا تھا

نظر آئیں جو محکم فطرتِ کامل کی بنیادیں
دھڑک کر زلزلے سے ہل گئیں باطل کی بنیادیں

ستوں مکّے میں قائم ہو گئے جب دینِ بیضا کے
گرے غش کھا کے چودہ کنگرے ایوانِ کسریٰ کے

سرِ فاراں پہ لہرانے لگا جب نور کا جھنڈا
ہُوا اک آہ بھر کر فارس کا آتش کدہ ٹھنڈا

ندا آئی دریچے کھول دو ایوانِ قدرت کے
نظارے خود کرے گی آج قدرت شانِ قدرت کے

ہوئی فوجِ ملائک جمع زیرِ چرخِ مینائی
بجائی بڑھ کے اسرافیل نے پُر کیف شہنائی

یکایک ہو گئی ساری فضا تمثالِ آئینہ
نظر آیا معلّق عرش تک اک نور کا زینہ

خدا کی شان رحمت کے فرشتے صف بصف اترے — پرے باندھے ہوئے سب دین و دنیا کے شرف اترے
ہوا عرشِ معلّیٰ سے نزولِ رحمتِ باری — تو استقبال کو اُٹھی حرم کی چار دیواری
سحابِ نور آ کر چھا گیا مکّے کی بستی پر — ہوئی پھولوں کی بارش ہر بلندی اور پستی پر

صدا ہاتف نے دی اے ساکنانِ خطۂ ہستی — ہوئی جاتی ہے پھر آباد یہ اجڑی ہوئی بستی
مبارکباد ہے اُن کے لئے جو ظلم سہتے ہیں — کہیں جن کو اماں ملتی نہیں برباد رہتے ہیں
مبارکباد بیواؤں کی حسرت زا نگاہوں کو — اثر بخشا گیا نالوں کو فریادوں کو آہوں کو
ضعیفوں، بیکسوں، آفت نصیبوں کو مبارک ہو — یتیموں کو غلاموں کو غریبوں کو مبارک ہو
مبارک ٹھوکریں کھا کھا کے پیہم گرنے والوں کو — مبارک دشتِ غربت میں بھٹکتے پھرنے والوں کو
خبر جا کر سنا دو شش جہت کے زیر دستوں کو — زبردستی کی جرأت اب نہ ہوگی خود پرستوں کو
معیّن وقت آیا زورِ باطل گھٹ گیا آخر — اندھیرا مٹ گیا ظلمت کا بادل چھٹ گیا آخر
مبارک ہو کہ دورِ راحت و آرام آ پہنچا — نجاتِ دائمی کی شکل میں اسلام آ پہنچا
مبارک ہو کہ ختم المرسلیںؐ تشریف لے آئے — جنابِ رحمۃ للعالمیںؐ تشریف لے آئے

بصد انداز رعنائی - بغایت حسن و زیبائی
امیں بن کر امانت آمنہ کی گود میں آئی

حفیظ جالندھری

مشرق اور عمر خیام

(۱) کسی شاعر کے کلام سے اُس کے "فلسفۂ زندگی" پر ایک گہری نظر اور درست انداز نظر ڈالنے کے لئے اس کی سوانح کو بھی ایک نظر خواہ سرسری ہی کیوں نہ ہو دیکھتے جانا ضروری ہے۔

(۲) یہ ایک فطرت انسانی ہے کہ ہر ایک شخص اپنے فلسفۂ زندگی سے کسی نہ کسی وقت گریز ضرور کیا کرتا ہے۔ کیوں کہ یک رنگی مختلف عناصر سے پیدا کی ہوئی ہستی میں ہمیشہ کبھی نہیں رہ سکتی۔ اختلاف جو خمیر میں پڑا ہوا ہے کسی طرح اپنی سرشت کو بالکل نہیں بھول سکتا۔ اس لئے کسی شاعر کے ہر شعر کو کسی خاص فلسفہ ہی کی نظر سے نہیں دیکھنا چاہئے اور خصوصاً فلسفۂ لذتیہ اور افادیہ کو جو ہر ایک کا مطمح نظر اور فطرتاً نقطۂ نظر ہے مگر ہم لوگ فلسفۂ لذتیہ سے جو ایک خاص مفہوم سمجھے ہوئے ہیں وہ کبھی نہ کبھی ضرور اپنے رنگ کو بدل دیا کرتا ہے لہٰذا جس کا فلسفۂ زندگی لذتیہ ہو اُس کے اشعار کو ایک ہی ڈھنگ میں بیان کرنا تنگ نظری سے موسوم کیا جائے گا۔

(۳) فلسفۂ لذتیہ کے اپیکیورس (Epicureus) نے چار اصول بتائے ہیں مگر دوسروں کی انگوری بیلوں سے خوشہ چینی کے بجائے یہ بہتر ہوگا کہ اپنے ہی دفینہ سے جواہرات نکالیں۔ اس لئے عمر خیام کے فلسفۂ لذتیہ کو اپیکیورس کے فلسفہ میں نہ تو جذب کرنا چاہئے نہ اس سے منطبق بلکہ ہر ایک کو اپنی اپنی جگہ رکھ کر تسادی توازن یا تساقط پر غور کرنا چاہئے۔

(۴) فلسفۂ لذتیہ کا یہ لازمی اثر ہے کہ اس پر عمل کرنے والا مادیات میں ڈوب کر اپنے حدود سے تجاوز کرتے ہوئے روحانیت کی ہتک پر اُتر آتا ہے یا کم از کم اس کی اہمیت اُس کی نظر میں بالکل گم، کم، یا مادیت کے برابر ہو جاتی ہے۔

(۵) فلسفۂ لذتیہ میں غرق ہونے والے کا دامنِ نگاہ وسیع خوش منظر بلکہ دل کش ہوتے ہوئے دوسروں کے واسطے جاذبِ نظر ثابت ہوا کرتا ہے۔ وغیرہ تفصیل

(۶) فلسفۂ لذتیہ پر عمل کرنے والا کسی نہ کسی وقت ضرور موجودات کی طرف پرواز کرتا ہے کیوں کہ مادیت کی قید اسے محسوس ہونے لگتی ہے اور دوسرے یہ کہ دنیا و مافیہا کی رنگینیاں چوں کہ نظروں کے سامنے سے بہت گزر چکی ہوئی ہیں اس لئے ایک بڑی حد تک استغنائیت کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔

دنیا جب سے ترقی کرتے ہوئے ارتقاء کی کڑیاں کافی حد تک طے کر سکی، اس وقت سے لے کر آج تک جن اسباق کو اُس نے پہلے دن یاد کیا تھا آج تک بعینہٖ ان ہی اسباق کو یا تو دہرا رہی ہے یا تفسیر کر رہی ہے اور تفسیر کی شاخوں میں سے بعض شاخوں کو پھننگوں کے امتیازی نشان سے نواز چکی ہے اور بعض کو نہ ختم ہونے والی شب فرقت کی طرح دراز کرتی جاتی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ جب تک دنیا کا یہ کارخانہ موجود ہے کبھی اس کا سرا ہاتھ نہیں آسکتا۔ خیر ہمیں اس پر زیادہ غور کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہم بعض ان ہی اسباق پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں جن کی شاخیں کسی آخری حد پر جا کر ختم ہو گئیں اور وہ دو شاخیں ہیں (بہت ممکن ہے اور بھی اس قسم کی شاخیں ہوں مگر ہمیں ان سے مطلب نہیں) نبوتؐ کیوں کہ وہ اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ ہمارے روحی فداہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ پر ختم ہو چکی۔ فلسفۂ افادیت کیوں کہ یہ عمر خیام پر اپنے تمام پہلوؤں کو نچھاور کر چکا۔ جہاں تک میری نظر گئی ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ دوسرے محققین نے محض اصول پر فلسفیانہ بحث کرتے ہوئے وقت ضائع کیا ہے مگر عمر خیام ہی ایک ایسی ہستی تھی جس نے کسی پہلو کو رباعیات سے باہر نہ رہنے دیا اور کمال یہ کہ ذوق شعریت کو ہاتھ سے نہ دیتے ہوئے۔ چنانچہ ہم خیال کرتے ہیں کہ اس کے واسطے کسی ثبوت کی ضرورت نہ ہوگی اور اگر ثبوت کی ضرورت ہو تو خود رباعیات پیش کی جاسکتی ہیں۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب۔ ہم مقصد کے عنوان میں صرف ان پہلوؤں پر روشنی ڈالا کریں گے اس وقت تو ہم صرف دو یا تین باتوں پر غور کرنا چاہتے ہیں:-

(۱) یورپ نے اس کی کیوں قدر کی؟

(۲) یورپ اس کے فلسفہ کو سمجھنے کی کہاں تک قابلیت رکھتا ہے؟

(۳) مشرق نے اس کی رباعیات سے کیوں اعتنا نہیں کی؟

(۴) آج اس کی کیوں قدر و قیمت تسلیم کی جانے لگی؟

،،، یہ سوال کہ یورپ نے مشرقی فوقیات میں سب سے زیادہ اس ہی کو کیوں پسند کیا بالکل صاف بات ہے مادیت کی گہرائیوں میں پوری قوت کے ساتھ ڈوب جانے کی وجہ سے اہل یورپ کے حسیات اور جذبات میں بھی مادیت اور اسفلیت کے کثیر اجزا اس قدر شامل ہو گئے ہیں کہ دنیا کی تمام باتوں کو حتیٰ کہ خدا کو بھی اس ہی رنگ میں ڈبونا چاہتے ہیں اور فلسفۂ لذتیہ بھی چوں کہ اس ہی سے تعلق رکھتا ہے اس لئے فطرتاً انھیں اس فلسفہ پر توں کر جھک پڑنا چاہئے ہی تھا۔

گو اس میں شک نہیں کہ جس طرح لذت تین قسم کی ہوتی ہے یا دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ تین درجات رکھتی ہے علیٰ ہذا القیاس فلسفۂ لذتیہ کے بھی تین ہی پہلو نکلنے چاہئیں تھے۔ ایک اور صرف ایک پہلو رکھنا واقعی دو پہلوؤں کا خون کرنے کے معنی رکھتا ہے۔ مگر بات یہ ہے جن لوگوں نے یہ "افادیت" دنیا کے سامنے پیش کی اور جو لوگ اس کو دنیائے عمل میں لانا چاہتے تھے (جیسے عمر خیام بلیاہتے ہیں۔ وہ سب کے سب مادیت ہی کے شیدا تھے اس لئے اس فلسفہ کے دونوں پہلو نظری اور عملی مادیت کی "میٹھی چھری" کے نیچے سے گردن نہ نکال سکے۔ اور جہاں تک مجھے معلوم ہے اپیکورس (جس نے فلسفۂ نظری کی بنیاد عملی پہلو پر بھی کچھ دھندلی سی روشنی ڈالتے ہوئے ڈالی)، سے لے کر عمر خیام (جس نے کہ فلسفہ پر عمل کرتے ہوئے جتنی گھاٹیوں کا پیش آنا ضروری تھا بیان کر دیا) تک مادیت سے کوئی بھی بچ کر نہ جا سکا بلکہ اس سے بھی ترقی کرتے ہوئے ہیں تو یہ عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ آج اس پر عمل ہی وہ کرتا ہے جو کسی بڑی حد تک مادیات میں پھنسا ہوا ہو۔ حالاں کہ اس کے اصول جس طرح مادی لذائذ میں تیر بہدف ثابت ہوا کرتے ہیں اس ہی طرح روحانیت میں بھی بغیر نشانہ پر پہنچے نہیں رہ سکتے۔

بہرحال یورپ نے چوں کہ فلسفۂ لذتیہ کا اصل مطمح نظر مادیت سمجھا تھا اور عمر خیام نے بھی اس فلسفہ کو ان کی حیوانی تمناؤں ہی کے رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ کا بڑا حصہ "خیام کلب" کی طرف اپنی تمام کوششوں کے ساتھ آگے بڑھا اور اُسے دنیا کے سامنے مادیت کے پرفضا باغ ارم کے اندر سبز پری اور رقاصہ سبز پری کے سبز لباس میں پیش کیا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ عمر خیام کی رباعیات پر یورپ کی اعتبار اس کے علاوہ کوئی دوسری وجہ نہیں رکھتی اور اگر ہے تو میں اب تک اس کے سمجھنے سے قاصر ہوں۔

---

(۲) یورپ اس کے فلسفہ کو سمجھنے کی کہاں تک قابلیت رکھتا ہے؟ اس کا جواب سننے سے پہلے آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ کسی چیز یا کسی مضمون کو سمجھنے کی تین صورتیں ہوا کرتی ہیں:-

ا۔ عبارت یا کتاب کا نفس ترجمہ یا مطلب سمجھ لینا۔

ب۔ مضمون کے چند پہلو پیش نظر ہو جانا۔

ج کتاب کی تمام گہرائیوں میں ڈوب کر اس کے تمام دقائق اور تمام پہلوؤں کا روشن ہو جانا۔

(ا) نفس مطلب یا فقط ترجمہ سمجھ لینا کوئی بات ہی نہیں گو اس ہی کے ساتھ حلوائے بے دودھی نہیں کہا جا سکتا چنانچہ اپنے اس دعوے کی تصدیق کرتے ہوئے ایک رباعی[1] کا لفظ "جرم" پیش کرتا ہوں، جرم کے عام معنی گناہ کے لئے جاتے ہیں مگر دقت یہ ہے کہ اگر ان ہی معنی میں اسے لیا جائے تو مطلب بالکل خبط ہو جاتا ہے۔ اس لئے اس کے ایک اور معنی یعنی "کسب و عمل"[2] لینے پڑے جس کے بعد مطلب بالکل صاف ہو جاتا ہے۔

(ب) میرے نزدیک صرف چند پہلوؤں کے پیش نظر ہونے کی وجہ اور وجوہات کے علاوہ ایک اور صرف ایک رنگ میں رنگا ہوا ہونا بھی ہے کیوں کہ قاعدہ ہے کہ جو جس رنگ میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے اس کے ذہن میں ہر پیدا ہونے والا خیال اُسی رنگ میں ڈوبا ہوا ہوگا اور یہ ایک ایسی کھلی ہوئی بات ہے کہ زیادہ غور کرنے کی بھی ضرورت نہ ہوگی۔ اگر کوئی شخص مصنف ہی کے رنگ میں رنگا ہوا ہو یا کم از کم وہ اپنے رنگ کو علاوہ ضرورت کے کسی بات پر چڑھانے کی کوشش نہ کرے تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ اس کے بہت سے پہلوؤں کو ان کے حقیقی رنگ و روغن کے لباس میں دیکھ سکے گا۔

(ج) تمام یا اکثر دقائق کے معلوم ہو جانے کی صرف ایک صورت ہے جو ابھی آپ کو بتائی جا چکی ہے جب تک کوئی آدمی مصنف ہی کے رنگ میں نہ ہوگا کبھی تمام پہلوؤں کو نہیں سمجھ سکتا۔

یہ معلوم ہو جانے کے بعد اب ہمیں صرف دو باتیں دیکھنا رہ گئیں:-

(ا) عمر خیام کا کیا رنگ تھا۔

---

[1] رباعی

اے کردہ ز لطف و قہر تو صنع خدا — درعہد ازل بہشت و دوزخ برپا
بزم تو بہشت است و مرا "جرمے" نیست — تو بست کہ و بہشت رہ نیست مرا

[2] ملاحظہ ہو کشف اصطلاحات الفنون جلد اول۔

(ب) یورپ پر کون رنگ چڑھا ہوا ہے

(۱) عمر خیام ایک مشرقی اور مسلمان شخص تھا اس سے آپ خود خیال فرما سکتے ہیں کہ خواہ فلسفۂ لذتیہ کا کسی قدر شیدا کیوں نہ ہو مگر اس میں سے روحانیت کی جھلک بالکل غائب نہیں ہو سکتی تھی اور خصوصاً جب کہ خود بھی مذہبی علوم میں کامل ہوتے ہوئے اسلامی عروج کی گود میں کھیل رہا ہو اور جب روحانیت کی روشنی بالکل گل نہیں ہو سکتی تھی تو ہمیں یہ سمجھنے کا پورا حق ہے کہ اس کا رنگ وہی رنگ تھا جو ایک روحانیت (خواہ کتنی ہی کم کیوں نہ ہو) رکھنے والے مسلمان اور اس مسلمان کا ہو سکتا ہے جو فلسفۂ لذتیہ کا قائل ہو نہ کہ اس "نیچرسٹ" کا جو روحانیت کے لفظ ہی کو بے کار سمجھ کر لغت کی کتابوں سے نکالنا مناسب خیال کرتا ہو۔

لہذا اگر کوئی دیکھنا چاہے کہ فلسفۂ لذتیہ نے اس پر کیا کیا اثرات ڈالے کس کس قسم کے خیالات اس کے دل میں پیدا کئے تو ان باتوں کو اس کے رنگ کا لحاظ رکھتے ہوئے دیکھنا چاہئے۔ ورنہ "اصول فلسفہ" کے علاوہ رباعیات عمر خیام دیکھنے والے کو یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ خود عمر خیام پر اس نے کیا اثر ڈالا۔ اور اگر کسی کو یہ بھی معلوم ہو گیا تو اس کی حقیقی اہمیت اور پوری اہمیت کبھی ذہن نشین نہیں ہو سکتی اور یہی ایک رباعیات پر غور کرنے والے کا نقص ہے۔

(ب) اس میں شک نہیں کہ یورپ نے اس پر بہت کچھ روپیہ کی بوچھار کی ہے[۵]۔ مگر افسوس ہے کہ ہم اپنی مشرقیت سے مجبور ہو کر یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ یورپ نے علاوہ جلد۔ سرورق۔ کاغذ، تصاویر تمدن قدیم، اور خاموش چڑیوں کے جو محض رونق دوبالا کرنے کے واسطے ہر رباعی پر پر تولے ہوئے گر رہی ہیں اور کون سے دقائق کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ کیا یورپ نے فلسفۂ لذتیہ کے کچھ نئے اصول دریافت کئے؟ کیا یورپ نے عمر خیام کے خیالات کا کوئی جدید کتابی فوٹوگراف پیش کیا؟ کیا یورپ رباعیات کے حقایق کو بے نقاب دیکھ سکا؟ کیا یورپ باوجود اس کد و کاوش کے اہل مشرق جیسے جاہلوں (اپنے خیال میں) کی اس تحقیق تک پہنچ سکا جو انھوں نے "مثنوی مولانا روم" اور "دیوان حافظ شیراز" ہی کے متعلق کی تھی اور کر رہے ہیں اور شاید کرتے رہیں گے جب ان باتوں میں سے کوئی بھی نہیں تو ہم نہیں سمجھتے کہ خیام کلب نے جلد اور کاغذ سے دنیائے حقیقت شناس میں کس انقلاب کی بنیاد ڈال کر اہل مشرق کو شرم سے اپنی گردنیں نیچی کر لینے پر مجبور کر دیا۔ بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر مشرق نے تھوڑے سے غور سے کوشش بھی کی تو وہی

۵؎ امریکن ایڈیشن ملاحظہ ہو

دن میں یورپ سے کہیں آگے نکل جائے گا۔ اس کے بعد میں یہ بتادینا چاہتا ہوں کہ آخر یورپ کیوں نہ سمجھ سکا۔

یورپ آج مادّی ترقی کرتے ہوئے اس "بلند مرتبہ پر" پہنچ چکا ہے کہ اس کے ایک نظرانداز نہ ہوسکنے والے گروہ یا دوسرے الفاظ میں وہاں کے محققین کے نزدیک خدا وہی خدا ہوسکتا ہے جو ہمیں ہماری ہی جیسی مادی اشکال میں نظر آسکے اس لئے آپ خیال فرماسکتے ہیں کہ اس میں روحانیت کس حد تک سرایت کئے ہوئے ہوگی اور وہ روحانیت کے صرف مفہوم ہی کو کہاں تک سمجھ سکا ہوگا۔

جب آپ کو یہ معلوم ہوگیا کہ یورپ روحانیت سے صرف اس قدر واقف ہے جیسے کہ ایک جاہل علم سے یا ایک بے وقوف عقل کے نام سے تو اب ظاہر ہے کہ جو چیز جس قدر بھی روح سے تعلق رکھتی ہوگی اس ہی قدر یورپ اس کی اہمیت سمجھنے سے قاصر ہوگا۔ یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر یورپ روحانیت سے واقف نہ ہو یا ہو تو ایسی روحانیت سے واقف ہو جو تاریکیوں کے سات پردوں میں پوشیدہ ہو تو کم از کم نفسیات انفرادیہ سے تو اچھی طرح واقف ہے۔ چنانچہ سائیکالوجی اس ہی غرض سے مدوّن کی گئی ہے تو میں عرض کروں گا اور یقیناً بالکل درست کہ "چہ نسبت خاک را با عالم پاک" یورپ کی سائیکالوجی اور روحانیت میں کیا تعلق مگر افسوس ہے کہ میں ابھی ان دونوں کے فرقوں پر غور نہ کرنے پر مجبور ہوں۔ ہاں اگر کوئی صاحب اس کا یقین کرنا چاہیں تو "روحانئین" میں سے کسی کے سامنے نفسیات انفرادیہ کے نظریات پیش کرکے تصدیق کرسکتے ہیں بلکہ میں تو خیال کرتا ہوں کہ اس کی بھی ضرورت نہ ہوگی ہر شخص روح اور روحانیات کی عملی تحقیق کرنے پر بھی نہایت صاف طور پر سمجھ سکتا ہے کہ سائیکالوجی روحانیات سے شاید ایسی ہی نسبت رکھتی ہوگی جیسے کہ انسان کو تشریح اعضا یا وظائف الاعضا سے اور ظاہر ہے کہ تشریح اعضا کا ماہر انسان کی حقیقت "جوہر فردہ" سے زائد نہیں جان سکتا اور پھر نفسیات مغرب عمر خیام جیسے روحانی (خواہ کیسی ہی خراب روحانیت کیوں نہ ہو) ہے تو روحانیت اور یورپ کے عقول سے بالاتر روحانیت) شخص کے "موثرات افادیت" جو اُس کی روح پر چوٹ لگا لگا کر کبھی کسی رنگ کی رباعی قوتِ متخیلہ کے سامنے پیش کرتے تھے اور کبھی کیسی رباعی۔ یورپ کس طرح اُن کی اصلیت و اہمیت کو سمجھ سکتا ہے۔

---

(۳) یہ سوال کہ مشرق نے رباعیات عمر خیام پر کیوں اعتنا نہیں کی ایک ایسا سوال ہے جس کو میرے نزدیک ہر اہل مشرق ذرا سے غور پر سمجھ سکتا ہے اور وہ یہ کہ مسلمانوں میں صرف وہی تصانیف اور افکار دماغی قبول عام کا

تمغۂ امتیازی حاصل کر سکتے ہیں جن کی ترکیب و تقویم میں روحانیت کا عنصر غالب ہو۔ کیوں کہ مشرق اور خصوصاً مسلمانوں کے نزدیک حقائق اشیاء بسیط 'مجرد' اور روحانی ہیں' اس ہی لئے جس شے پر جتنا ترکّب یا بالفاظ دیگر مادیت غالب ہوگی اس ہی قدر اس کی حقیقت اور کنہ کا نظروں سے اوجھل ہو جانا ضروری ہے اور ظاہر ہے کہ فلسفیانہ دماغ ہمیشہ مادیت 'میں' حقیقت اور کنہ کی گہرائیوں کو تلاش کرتا ہے۔ بدیں غرض وہ کبھی ایسے نظریہ کو وقعت کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا سطحیت سے ہم کنار ہوتے ہوئے حقیقی تدبر اور معنی خیز قوت فکریہ کی زد سے باہر ہو چکا ہو۔

چنانچہ حال ہی میں ایک صاحب کا کتب خانہ دیکھتے ہوئے ایک کتاب تنزع المدائح نظر پڑی جو سلطان مراد بخش کے حضور میں پیش کرنے کی غرض سے تصنیف کی گئی تھی۔ اُس میں ایک موقعہ پر مصنف نے چند متقدم شعراء پہ ناقدانہ نظر ڈالتے ہوئے ہر ایک کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ عمر خیام پر بھی چند سطور سپرد قلم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ چوں کہ اس کی شاعرانہ زندگی کا خمیر رشتہائے غور و فکر سے نہیں بگڑ گیا اس لئے نہ قابل اعتماد ہے اور نہ اس کو کبھی قبول شہرت عام کی ڈگری حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ رباعیات عمر خیام کے مقبول نہ ہو سکنے کی اپنے ذہن کے اندر علت قرار دیتے ہوئے تھا وہ کسی حد تک غلط نہیں کہی جا سکتی۔ اس میں شک نہیں کہ فلسفۂ لذتیہ کے دقائق اور اس کے مختلف پہلو پیش کرنے میں عمر خیام کو بہت کچھ کامیابی حاصل ہوئی ہے مگر ایک مسلمان فلسفی کے نزدیک جب کائنات ہی کوئی ہستی اور کائنات نہیں رکھتی تو پھر اس کی لذت اور پھر وہ بھی محض ذہنی فلسفۂ لذت کیوں کر وقیع نظروں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ یورپ مادہ پرست ہے کیوں کہ اس کا ماحول نظری' سوسائٹی' دل اور دماغ غرض کہ سب کچھ مادی ہے۔ اس لئے اگر فلسفۂ لذتیہ کی قدر کرتے ہوئے رباعیات پر کافی وقت اور توجہ صرف کرنے کی کوشش کرے تو بجا اور بالکل بجا ہے مگر مشرق اور بلند نظر مشرق کو نہ رباعیات کی پرواہ اور نہ یورپ کے اعتقاد سے سروکار، ہاں اگر کچھ سروکار ہے تو اتنا کہ اُس کے اضمحلالِ ذہنی اور نفس انفعالی کی کرشمہ سازیوں پر ایک متاسفانہ نظر ڈالے اور بس۔

مگر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب آج اور کل دونوں کا مشرق ایک ہے تو پھر اس کی کیا وجہ کہ کل جس چیز کو مشرق اچھی نظر سے نہ دیکھتا تھا آج وہی مشرق اس کو سر اور آنکھوں پہ جگہ دینے کے واسطے تیار ہے۔ ہاں! بالکل درست۔ مگر کیوں؟ اس لئے کہ مشرق اپنی فلسفیانہ ذہنیت کو فراموش کرتے ہوئے مغرب کی برق وش ذہنیت سے متاثر ہوتا جاتا ہے اور نہیں سمجھتا کہ میں کون تھا اور کیا ہوتا جا رہا ہوں۔ کاش وہ اپنی اہمیت کو محسوس کرتا مگر نہیں انقلاب کبھی نچلا نہیں بیٹھتا

اس لئے اگر ایک طرف دنیائے عمل میں کارگزاریوں سے قوائے اسلامیہ کو شل کر دیا تو اس کے یہ معنی ہیں کہ کم از کم دنیائے علم و نظر ہی میں اس کو اہل بصیرت کے دوش بدوش کھڑا ہونے دے نہیں بلکہ انقلاب کی مشین کو دانہ کا ہر پہلو میں ڈالنا چاہیئے ورنہ اس کے کل پرزوں میں خرابی محسوس کی جائے گی۔ میرا اس سے ہرگز یہ مقصد نہیں کہ مسلمانوں کو رباعیات عمر خیام کی طرف قطعاً توجہ ہی نہیں کرنا چاہیئے بلکہ مقصد یہ ہے کہ ہر زرسرخ کو اپنے معیار ذہنیت پر پرکھ کر دیکھیں ممکن ہے کہ دوسرے کی کسوٹی فریب نظر ہو اور آپ اس کے دام میں آکر پیتل کو سونا سمجھتے ہوئے خسارہ میں رہ جائیں مگر حقیقت یہ ہے کہ میرا اس قدر کہنا بھی قبل از وقت ہے کیوں کہ ہنوز مشرق اور خصوصاً ہندوستان نے یورپ کے تتبع میں بھی کریائیت دماغی کا صرف نہیں کیا ہے بلکہ حضرت بوزنہ کی طرح بے سمجھے نقالی کی جا رہی ہے چنانچہ عمر خیام کی دو شروح جو آج تک ہماری نظروں کے سامنے پیش کی جا چکی ہیں ان کی حیثیت تراجم اور وہ بھی ناقص تراجم سے زائد نہیں ثابت کی جا سکتی۔ اس لئے میں امید کرتا ہوں کہ ہندوستان کے اہل قلم یا تو رباعیات عمر خیام پر قلم اٹھانے کی تکلیف گوارا ہی نہ کریں گے یا پھر ایسا کچھ لکھیں گے کہ اس کو دیکھ کر اگر انگلستان نہیں (کیوں کہ وہاں کی ذہنیت خالص مادی ہے) تو کم از کم جرمنی کے فلاسفر کو تو ہندوستان کی فلسفیانہ ذہنیت اور نکتہ سنج دماغ کی داد دینا فخر و مباہات محسوس کرنا پڑے۔ دیکھئے یہ امید بر آتی ہے یا نہیں امید تو نہیں ہے مگر ہاں خدا کرے!!!.....

---

(۴) اخیر میں صرف ایک سوال رہ جاتا ہے کہ آج اُس ہی خیام کی کیوں قدر و قیمت تسلیم کی جانے لگی جس کو کل تک قابل اعتنا سمجھنا بھی غلط کاری محسوس کیا جاتا تھا مگر ذرا گہری اور درست انداز نظر ڈالنے پر آپ محسوس کریں گے کہ پچھلے صفحات میں اس سوال کا جواب بھی لپٹا ہوا ہے۔ لیکن اس کی اجمال انگیزی دیکھتے ہوئے مستقل طور پر روشنی ڈالنا زیادہ بہتر تصور کرتا ہوں۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ کائنات کے تمام زر و جواہر بلکہ تمام اشیاء کی قیمت محض اضافی ہے۔ خود اشیاء کی ذات میں کوئی ایسی قوت مضمر نہیں جو اس کی قیمت کو ہر وقت اور ہر زمانہ میں یکساں طور پر قائم رکھ سکے۔ اس لئے ہمیں کسی چیز کی قیمت معلوم کرنے کی غرض سے خود اس چیز کی جواہر تابی، خوش وضعی اور آب و رنگ کو دیکھنے کے بجائے اس بات پر غور کرنا چاہیئے کہ موجودہ ماحولی احتیاجات، گرد و پیش کے حالات اور زمانہ کی ضرورتیں اس شے میں ہمارے لئے کس قدر جذب و کشش پیدا کر رہی ہیں۔ کیوں کہ قیمت طلب سے زیادہ ہوتی ہے نہ کہ طلب قیمت سے پھر آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ

فلاں چیز کی کیا قیمت ہے اور کیوں۔

چوں کہ یہ قانون دنیا کے ہر ذرّہ پر جاری ہے اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ رباعیات خیام کے جواہر پارے یا سنگ ریزے اس عام قانون کے تحت نہ آتے چنانچہ آئینِ فطرت کی کارفرما قوتیں برسرِ عمل آئیں اور ایک زمانہ کی کس مپرسی کے بعد رباعیات کو بیش بہا موتیوں میں شمار کیا جانے لگا۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ پہلے قدر و قیمت تسلیم نہ کرنے کا کیا سبب تھا اور آج کون سی نئی بات پیدا ہوگئی جس نے اس کی وقعت اور حیثیت میں چار چاند لگا دیئے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا ہمیشہ روحانیت و مادیت کی کش مکش میں غلطاں و پیچاں رہی ہے اور شاید جب تک نظام ملکی قائم ہے ایسا ہی ہوتا رہے گا چنانچہ اس ہی قانون کے تحت جب کبھی دنیا پر روحانیت کا زریں دور زرفشاں ہوا تو صرف وہی علوم و مصنفات جو روحانیت کی گہرائیوں سے ایک گونہ مناسبت رکھتی ہیں قبولِ عام کی سند حاصل کرسکیں اور جب کبھی مادیت کی لعنت دنیا پر چھائی تو تمام وہ حقائق نظر انداز کر دیئے گئے جن میں حاسّہ مجردہ روحانیہ یا قوتِ فکریہ انسانیہ کی مضمر طاقتیں صرف کرنا ضروری ہوں اور محض وہی مخترعات و ایجاداتِ سائنس قابلِ قدر ٹھیریں جو مادی تمدّن کو دوبالا اور سیم و زر یا بالفاظ عمومی دولت کا اضافہ کرسکیں۔ چنانچہ اگلے زمانہ میں روحانیت کا چرچا تھا اس بناء پر محض وہی حقیقت قابل لحاظ تصوّر کی جاتی تھی جو پورے غور و فکر کی مرہون ہوتے ہوتے کسی بہترین اور زبردست حقیقت کا پردہ فاش کر رہی ہو اور اس علم یا تصنیف کو قابلِ پزیرائی نہ سمجھا جاتا تھا جس کے حدود حقائق مادیہ سے تجاوز نہ کرسکیں۔ اور چوں کہ رباعیات عمر خیام شراب ارغوانی اڑانے اور رنگ رلیاں منانے ہی کے ضوابط و قوانین کا مرقع یا لطیف مگر موالید ثلاثہ ہی کے رازہائے سربستہ کا مجموعہ تھیں اس لئے ظاہر ہے کہ روحانیت کے اسرار مکنونہ حل کرنے والے محققین و فلاسفر اس طرف نظر بھر کر دیکھنا بھی گوارا نہ کر سکتے تھے اور نہ ان جرعہ ہائے تلخ کو گوارا چاہیئے تھا۔ کیوں کہ اگر روحانیت نواز دماغ مادّہ کی پیچیدگیاں سلجھانے میں مصروف ہو جائیں تو حقیقت رسی کی قوت بہت کچھ کم زور پڑ جائے گی اور پھر روحانیت کے دقائق محسوس کرنا اُن کے قابو کا معاملہ نہ رہے گا۔ جو ایک فلاسفر کے واسطے انتہائی تکلیف وہ اعتراف حقیقت کے معنی رکھتا ہے۔

مگر آج روحانیت کی فضا مکدّر ہو چکی ہے اور اس کو ترقیات مادیہ میں نہ صرف غیر ضروری بلکہ بعض "خوش فہموں" کے نزدیک رکاوٹ تک خیال کیا جاتا ہے۔ مجھے یہاں پر اس سے بحث نہیں کہ "نئی روشنی" کے زائیدہ حضرات کی یہ

خیال آرائیاں کہاں تک بجا یا بے جا ہیں کیوں کہ یہ مسئلہ خود ایک مستقل عنوان کا محتاج ہے اس لئے میں اتنی ہی بات پر اکتفا کرتا ہوں کہ آج مغرب میں مخصوص طور پر اور مشرق میں اس کی غلامی اور زیر اثر و اقتدار ہونے کی بدولت شراب مادیت کا ساغر چھلک رہا ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ کب تک اُس کی نظر افروز گلابی بوندیں سرشار کرتی اور صدائے قلقل جذبات کی لہروں کو متموج اور برقی رَو کی طرح دل ودماغ میں دوڑاتی رہے گی۔ بہرحال ہمارے زمانہ میں بھی رنگ ہے اور یہی عمر خیام کی رباعیات کو شہرت عام کی عزت سے سرفراز کرنے کا ضامن ہے۔

لہذا موجودہ قبولیت عامہ کو دیکھتے ہوئے خیال قائم کر لینا چاہئے کہ یہ پچھلے لوگوں کے قوائے دماغیہ کا اضمحلال تھا کہ وہ رباعیات کے محاسن و دقائق کو محسوس نہ کر سکے۔ غلط راہ روی ہے کیوں کہ ہر شخص اپنی ذہنیت کے معیار پر کسی حسن کو پرکھتا ہے نہ کہ دوسرے کی ذہنیت کے سانچے پر۔ وہ روحانیت پرست تھے اور رباعیات فلسفۂ لذتیہ کا خاکہ لہذا اُن کے دل و دماغ اس سے کس طرح متاثر ہو سکتے تھے۔ ہاں آج ذہنیت تبدیل ہو گئی اور اب دنیا رباعیات کے فلسفۂ لذتیہ جیسے معمولی فلسفہ کو بھی اپنی سنہری گود میں جگہ دے سکتی ہے۔ مگر اس قدر و قیمت سے خود اس فلسفہ کی حقیقت شرف علو سے لذت آشنا نہیں ہو سکتی اس لئے کہ فطرت نے اضافیات کو ماہیت پر اثر اندازی کی قابلیت ہی ودیعت نہیں فرمائی۔ یہی وجہ ہے کہ حقیقی فلاسفہ کبھی دنیا کی تحسین و تفریں پر اعتماد نہیں کرتے بلکہ صرف حقیقت واقعیہ کو پیش نظر رکھتے ہیں۔

لہذا ہم بھی اتباعاً صرف حقیقت پر نظر رکھتے ہوئے یہ فیصلہ دینے کے مجاز ہیں کہ رباعیات عمر خیام مادہ پرستوں کے لئے ایک عجیب اور قابل فخر کتاب ہے مگر ضمیر بینوں یا بتعبیر صحیح تریں روحانیین کے نقطۂ نظر سے کسی خاص وقعت کے لائق نہیں خواہ آج دنیا اس کے متعلق کوئی فیصلہ صادر کرے۔ مگر حقیقت بعینہٖ حقیقت ہی رہے گی۔ کسی رائے کا اُس پر کوئی اثر مرتب نہیں ہو سکتا۔

شاید بعض تصوف پرست حضرات رباعیاتِ عمر خیام کو روحانیت کی "زد آلودگی" سمجھنے کی بنا پر میری توجیہ کو درست خیال کرنے کے لئے تیار نہ ہوں مگر میں ان کو حسن ظن کے عوض غور و تدبر کی دعوت دوں گا۔ کیوں کہ فقط کسی کے چند اشعار سے اس کی اخلاقی اور نفسیاتی کیفیت کا اندازہ کر لینا قابل اعتماد و استناد نہیں ہو سکتا۔ اول تو اُس کی رباعیات نوّے فی صدی مے نوشی، آداب و قوانین مے نوشی اور اس ہی سے متاثرہ امور پر مشتمل ہیں اور پھر اس کی

سوانح حیات متصوفانہ خیالات کی ہم آہنگی نہیں کرتی۔ غالب یا ہمارے زمانہ کے بعض "ممتاز ترین" شعراء کے متصوفانہ رنگ کو دیکھ کر اُن کو صوفی سمجھ لینا اور حالات سے واقفیت رکھتے ہوئے جس قدر نیک نیتی اور خوش اعتقادی کے جزاثیم سے لبریز خیال کیا جانا چاہیئے اتنا ہی خیام کے رندانہ سوانح حیات سے آنکھیں بند کر کے صرف چند رباعیات کے بھروسہ پر "حقیقت پرست صوفی" کہہ دینا بھی ممکن ہے۔ اگرچہ ادیبانہ طرز تحریر اور فلسفیانہ یا متصوفانہ ادائے خیالات کے انداز سے اخلاق و عادات پر بھی ایک گونہ روشنی پڑتی ہے مگر نہ اس قدر صاف و شفاف کہ ہر ذرہ چمک اُٹھے اس میں شک نہیں کہ ہم تصنیف کے تمام حصص و اجزاء پر جداگانہ بغور مطالعہ کرنے سے پتہ چلا سکتے ہیں کہ مصنف کی زندگی نے کیا رخ اختیار کیا، کس چیز کی تلاش کی، کیا پایا اور کیا نہیں اور اگر غور کیا جاتا تو وہی حقیقت بے نقاب ہوتی جو میرے سامنے آچکی ہے۔ چنانچہ میں یہی دعوائے ثابت کرنے کی غرض سے شرح رباعیات کی بنیادوں کو استوار کر رہا ہوں جس کو یا تو بالکل عنوانات تفسیری سے معرا رکھا جائے گا یا خیامی ترتیب و سلسلہ کو ترک کر کے ایک جدید اسلوب کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی تاکہ اس کا ہر رنگ جداگانہ محسوس کیا جا سکے۔ ابھی یہ خیال ابتدائی مراحل طے کرنے کی وجہ سے بہت دھندلا ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ کب تک اس کے خدوخال واضح ہو سکیں گے۔

برہان احمد فاروقی

ٹیپو سلطان

عجائبات زمانہ کے اے تماشائی — رہا ہے سیر و سیاحت کا تو تمنائی
ہوئی محیط زمیں تیری گام فرسائی — کہ کی ہے قطب سے تا قطب دشت پیمائی

نظر میں ہے ترے خورشید کا طلوع و غروب
زمیں کے دیکھ کر آیا ہے تو شمال و جنوب

تماشہ گاہ ہے تیرا زمین کا محور — بہت کیا ہے خطِ استوا پہ تو نے سفر
جو دن کو سایۂ خورشید میں کیا بستر — چلا ہے رات کو تو کہکشاں کے رستہ پر

ہر ایک حال میں چلنے سے کام ہے تجھ کو
نہ لطفِ صبح، نہ کچھ خوف شام ہے تجھ کو

دیارِ ہند میں جب سیر کے لئے آنا — تو اپنے ساتھ دلِ درد آشنا لانا
عجائبات میں یاں کے نہ دل کو الجھانا — دکن میں جا کے سرنگا پٹم چلے جانا

کہ جس کی خاک میں سوتا ہے شیرِ ہندوستاں
وہ نامدارِ دکن، وہ دلیرِ ہندوستاں

زمینِ ہند سے اٹھا نہ کوئی فرزانہ — رہا یہ ملک ہمیشہ سے طبع بیگانہ
بقدرِ ظرف جو ملتا کسی کو پیمانہ — دکھاتا کر کے وہ کچھ ہائے و ہوئے مستانہ

فلک نے زیست تو کی پائمال ٹیپو کی
مگر نہ کر سکا پیدا مثال ٹیپو کی



ٹیپو سلطان والئی میسور

From an Original Painting

خاکسار شمس الدین احمد علوی

نہ ڈھونڈھ لطفِ سحر کا شامِ ماتم میں — ہلالِ عید کو دیکھا کبھی محرم میں؟
دکھائے خاک بہار اپنی باغِ عالم میں — وہ پھول جو کہ کھلا ہو خزاں کے موسم میں
کیے خدا نے مقرر ہر ایک کام کے وقت
سحر کا کام ملا لیکن اس کو شام کے وقت

وہ بادہ جس کا تھا خان شہید سا شیدا — وہ جامِ تلخ جو تغلق نے نوشِ جان کیا
وہ نشہ جس نے کیا خلجیوں کو متوالا — ازل کے روز سے اس شیر دل کا حصہ تھا
بہادرانہ، شجاعانہ، عاشقانہ موت
سپاہی کہتے ہیں جس کو سپاہیانہ موت

سپہرِ ہند کا وہ اک چمکتا اختر تھا — دکن کی خاک کا اک آبدار گوہر تھا
نصیبِ ہند تھا، اقبال تھا، مقدر تھا — نہ کیوں ہو ایسا کہ آخر کو ابنِ حیدر تھا
خیال اس نے کیا کچھ نہ اپنی زحمت کا
قدم قدم پہ رہا دھیان اس وصیت کا

فلک نگین ترا سازگار نام کند — سپہر، بادۂ نوشیں ترا بہ جام کند
خدائے پاک ترا فائز المرام کند — اگر پدر نہ تواند پسر تمام کند
ترا اگر زور بہ بازوئے تیغ زن باقی است
بگیر تیغ کہ آں حسرتِ کہن باقی است

سید منور حسن

اُردو مشاعرے

مشاعرے اور وہ بھی چودھویں صدی کے ہندوستانی مشاعرے دہلی و لکھنؤ کے شاہی مشاعروں کے نامکمل مرقعے مرحوم پہلوانانِ سخن کے سنسان اکھاڑے جن میں روحِ شعر کی وفات کا مرثیہ پڑھا جاتا ہے۔ جہاں مشاعرۂ سلف کا ناقص ڈراما پیش کر کے قومی بد مذاقی کا اعلان عام کیا جاتا ہے۔ کیوں کر کہوں کہ یہ مشاعرے کسی درد کی دوا۔ ایک مفلس و نادار قوم کی بامِ ترقی کا زینہ۔ قومی اخلاق کے پراگندہ اوراق کا شیرازہ یا ایک مفلوج زبان کے غسلِ صحت کا سرچشمہ ہیں۔

آپ نے رسالۂ اُردو میں ۱۲۶۱ھ کا ایک مشاعرہ پڑھا ہوگا۔ اگر نہیں پڑھا ہے تو کسی مشاعرہ میں جا کر عینی مشاہدہ کا لطف اُٹھائیے۔ اگر اصل نہیں تو ایک بگڑی ہوئی نقل سے دیرینہ بزمِ سخن کا دھندلا سا خاکا ضرور پیش نظر ہو جائے گا تقریباً وہی ترتیبِ نشست ہوگی وہی داد کا غلغلہ۔ وہی شمع کی پروانہ وار گردش۔ اگر بھری محفل میں شمع کی بے حجابی ناگوار تو چمنی و گلوب کی چلمنوں سے جھانکتی ہوئی لیمپ کی روشنی ہی رقصاں و گرداں نظر آئے گی۔ فرق اس قدر ہوگا کہ وہاں ایک غالب اور ایک مومن تھے یہاں ہر گوشہ میں ہزاروں غالب و مومن ثانی نظر آئیں گے۔ وہاں استادانِ فنِ شعر کے ایک ایک لفظ پر راتیں صرف کیا کرتے تھے۔ یہاں ایک ایک رات میں دو غزلہ و سہ غزلہ کے ہزاروں ٹھیکہ دار برسرِکار نظر آئیں گے۔ وہاں شمعِ عنبریں بوکسی شاعر سے جدا ہوتے وقت آٹھ آٹھ آنسو روتی اور اپنی بوئے دلاویز کو بطورِ یادگار چھوڑ جاتی تھی۔ یہاں لیمپ کی آہوں کا تاریک دھواں اور روغنِ گِل کا تعفن مشام سوز ہی اس کا صحیح قائم مقام تصور کیجیے۔ وہاں صرف شاعر ہی اپنا کلام سُنا کر محظوظ کرتا تھا۔ یہاں تکرارِ مصرع کے نوبت خانہ میں کان پڑی آواز کا سُننا مشکل نظر آئے گا۔ وہاں ترتیبِ نشست شہرتِ کمال پر موقوف تھی۔ یہاں خوش لباسی و ثروت تقدم کا معیار ہے وہاں صفِ اول شعراء کے لئے مخصوص تھی یہاں شاعر و سامع کا درجہ کُلُّ مُؤمِنٍ اخوۃٌ کے تحت بالکل مساوی ہے۔

افسوس کہ عہد شاہ جہاں و عالمگیر کے مشاعروں کا کچھ حال معلوم نہیں لیکن کہا جا سکتا ہے کہ عہد بہادر شاہ ظفر کا مشاعرہ جو رسالۂ اُردو میں شائع ہوا ہے تقریباً سابقہ بزم ہائے سخن کا مکمل نمونہ تھا جس کی سنگین لیکن تنگ چاردیواری سے نہ صرف ابتدائی عہد میں عدول کو روا رکھا گیا۔ بلکہ اس دورِ ترقی میں بھی سنتِ قدیمۂ شعراء کے کامل اتباع کو مذہب

شاعری کا رکن اعظم قرار دیا گیا۔ یوں تو دنیا کا کوئی ملک اور کوئی قوم شاعری سے خالی نہیں۔ اشعار پڑھنے اور جوہر سخن دکھانے کے طریقے بھی تمام ملکوں میں رائج ہیں۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ہندوستانی شاعروں کی ہیئت کذائی دنیا کے کسی ملک کی رہین اتباع ہے یا اس ایجاد کی خود مالک ہے؟

یورپ کی شاعری اور اس کے اثرات سے دنیا روشناس ہے جہاں سولن کے درخشاں کارناموں سے جزیرہ سسلی کے تاریخی صفحات مزین ہیں۔ لارڈ بائرن کا نام بچہ بچہ کو نوک برزبان ہے۔ پیرس اور مارسیلز کے قصیدے فرانس کی تاریخ حریت کا سنگ بنیاد ہیں۔ ہومر کا سب لوہا مانے ہوئے ہیں۔ لیکن وہاں کے مشاعرے۔ رسائل ڈرامے یا جلسے میں جہاں کسی باموقع نظم سے بجائے زبانی داد کے دلی جذبات کے طوفان بلند ہوتے ہیں۔ مصرع طرح کی بجائے ضرورت کا اقتضا عنوان ہوتا ہے۔ غزل کی بجائے ہر وہ نظم جو کافی ترجمان جذبات ہو۔ بحر از مصرع کی بجائے ملک بھر کی زبانیں دلی جذبات کے ساتھ اُس کے پڑھنے میں رطب اللسان ہوتی ہیں۔

عرب میں دیکھئے تو ظہور اسلام سے قبل مکہ کے بازار عکاظ میں ۱۸ ذی الحجہ کو شعرا اونٹوں پر سوار ہو کر اپنے اپنے قصائد پڑھتے تھے اور سال بھر میں ایک ہی موقع جوہر سخن دکھانے کا ملتا تھا۔ چنانچہ بہترین قصائد دیوار کعبہ پر آویزاں کئے جاتے اور جب تک اُن سے بہتر قصائد پیش نہ ہوتے ان کا سکہ تمام قلوب پر جما رہتا۔ شعراء کے راوی کلام یاد کر کے ترنم سے پڑھا کرتے تھے۔ فردوسی کا راوی ابودلف اسی طریقہ کی یادگار تھا۔ اعشیٰ۔ عبداللہ بن معد یکرب ابونواس۔ ابوتمیم۔ متنبی۔ امراء القیس... وغیرہ کے نام سے کون واقف نہیں۔ شعر کے اثر کا وہ عالم تھا کہ شاعر کے پیدا ہونے پر تمام خاندان کو مبارکباد دی جاتی۔ کلام کو دیکھا جائے تو ہمیشہ غیر طرحی ہوتا تھا۔ مضامین بھی کثیر تھے۔ رزم۔ رجز۔ حمد و نعت۔ اخلاق۔ موعظت۔ ترس خدا۔ ترک دنیا۔ ناپائداری دنیا۔ عشق۔ مناظر قدرت کے مختلف مضامین میں جوہر سخن دکھاتے تھے۔

ایران جو شاعری میں اردو کا استاد اور سرپرست ہے جہاں رودکی۔ فردوسی۔ سعدی و حافظ نے دنیائے شاعری میں ہلچل ڈال دی ہے۔ جہاں ایک ایک شعر پر سزائے موت کے احکام منسوخ ہوئے ہیں۔ نقرئی اور طلائی سکوں سے شعرا کے جسم وزن ہوئے ہیں۔ جواہرات سے منہ بھرے گئے ہیں۔ نادری قتل عام کے خلاف سوز شعلے ایک ہی فارسی شعر کے چھینٹوں سے بجھے ہیں وہاں اس قسم کے مشاعروں کا کہیں پتہ نہیں۔ البتہ شاہی دربار مشاعرہ گاہ

کیے جا سکتے ہیں۔ جہاں قصائد کا زور تھا اور قافیہ و ردیف، بحر و وزن کی کوئی قید نہ تھی۔ اگر اتفاقاً یہ قید لگائی بھی جاتی تو محض شاعر کی جانچ کی بدولت جیسا کہ فردوسی نے عنصری۔ فرخی و عسجدی کے مصرعوں پر اپنا مصرع "مانند غدنگ گیو در جنگ پشن" لگایا ہے لیکن اصلی جانچ مختلف کلاموں کے سُننے سے ہوتی تھی۔ داد دینے کے بھی یہ طریقے نہ پہلے تھے نہ اب ہیں۔ وہاں کلام کے خاتمہ پر مناسب الفاظ میں تعریف کر دی جاتی ہے۔

غرض بعد غور یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ طریقہ محض ہندوستان کی ایجاد ہے اور وہ اپنے وقت پر ابتدائی عہد ہونے کی وجہ سے نہایت ضروری و مناسب تھا۔ زبان کے کم زور بچہ کو ایک طاقتور نوجوان بنانے کی یہی تدابیر ہو سکتی تھیں کہ فنِ شعر کی مشق و ترویج کے لئے عام دعوت سخن دی جائے اور بزم سخن قائم کر کے عوام کو رغبت اور شعرا کو طبع آزمائی کا موقع دیا جائے لیکن قابلِ بحث آج کل کے مشاعرے ہیں کیوں کہ دور اول میں جو کچھ کیا گیا وہ بجائے خود درست اور مناسب تھا۔ یہ دورِ حال کے شعرا کا فرض تھا کہ ان تنگ میدانوں کو وسیع کرتے اساس قدیم پر ایسے بلند اور مستحکم قصر تیار کرتے جن کے زریں و تاب دار کلس دنیا کی آنکھوں میں چکاچوندھ پیدا کر دیتے۔ جدت اختراع سے کام لے کر متمدن ترین ممالک کے نقشوں کو دیکھتے اور موجودہ ضروریات کا لحاظ کر کے ایک بلند و دل کشا قدیم و جدید صنائعوں کا جامع ایسا قلعہ تیار کرتے جس کی صدائے بازگشت سے دنیا کا گوشہ گوشہ گونج اٹھتا۔

لیکن افسوس! کہ بجائے ترقی کے تنزل اور بجائے وسعت کے تنگیوں کی طرف پیش قدمی جاری ہے اور جلسہ کی تہذیب یہاں تک گر گئی ہے کہ اگر کسی غیر ملک کا اجنبی شخص مشاعرہ میں قدم رکھے تو داد کی چیخ پکار پر بے ساختہ کہہ اُٹھے گا کہ ان سب دار فتگان جو اس کو کسی اچانک بیماری کا دورہ پڑا ہے جس نے جلسہ کی تہذیب و متانت کے احساس تک کو اُن کے دل و دماغ سے زائل کر دیا ہے۔

اگر آپ مشاعرہ کی شرکت کے متمنی ہیں تو بسم اللہ ایک فینسی کارڈ یا مطبوعہ پرچہ وصول کیجئے۔ اس میں تاریخ و وقت افتتاح مصرع طرح اور قافیہ وغیرہ لکھا ہوگا۔ آپ کارڈ وصول کرتے ہی دل میں خلش اور دماغ میں سودے کا تخم بو دیجئے اور دھن میں محو ہو جائیے۔ اگر آپ کہنہ مشق نہوں تو دیوانوں سے دل بہلائیے۔ قافیہ و ردیف ٹٹو لئے مضمون کو الٹ پلٹ کر، یا ۹ شعر کی غزل کا تیار کر لینا کوئی بڑی بات نہیں اور اگر کسی استاد سے اصلاح لے کر پڑھنے کی ریہرسل بھی کر لی تب تو سونے پر سہاگہ ہو گیا۔ بالآخر مفت کی واہ واہ کی چاٹ آپ کو بھی گرتا پڑتا مشاعرہ تک پہونچا ہی دے گی۔ وہاں جا کر

آپ اسی طرح بہت سے شایق شعراء کو غزل کا پرچہ دل سے لگائے مرض اختلاج میں مبتلا پائیں گے۔ مسند صدارت پر کوئی مشہور بزرگ گاؤ تکیہ لگائے، منہ میں پیچوان کی نے لیئے نیم دراز نظر آئیں گے۔ پانوں سے بھرا ہوا خاصدان پاس ہوگا۔ کبھی کبھی واہ واہ اور خوب کے پھول بھی منہ سے جھڑتے دکھائی دیں گے۔ آپ سمجھ لیں کہ جناب صدر یہی بزرگ ہیں۔ مشاعرہ ۹ یا ۱۰ بجے شب کے شروع ہو کر طلوع آفتاب تک ضرور جاری رہے گا اور اگر صبح تک ختم نہ ہو سکا تو پھر ایک یا دو راتیں اور بھی صرف کرنا پڑیں گی۔ آپ کو جمائی پر جمائی آئے۔ آنکھیں جاگنے سے۔ کان سننے سے۔ بدن کا جوڑ جوڑ ایک وضع پر بیٹھنے سے کتنی ہی فریاد کریں لیکن آپ ایک نہ مانیں اور بغیر غزل سنائے کسی طرح بے نیل مرام واپس نہ آئیں ہمتِ مرداں مددِ خدا مشہور ہے۔ اگر آپ جلد سنانے کے متمنی ہوں تو یہ بھی ممکن ہے وہاں نہ زیادہ روک ٹوک نہ صدر کی اجازت کی ضرورت۔ آپ جب ایک مصرع پڑھ دیں گے تو دس بیس شاعر آپ کا مصرع اٹھانے میں اخلاقی مدد سے کسی طرح دریغ نہ کریں گے۔ اس وقت آپ کو تھیٹر کے کورس کا لطف نہ آجائے تو ہمارا ذمہ۔ جب آپ دوسرا مصرع ختم کریں گے تو معمولی شعر پر "کیا خوب" "خوب" اور اچھے شعر پر "مکرر فرمائیے" کی آوازوں کا ایسا شور و غوغا برپا ہوگا کہ آپ کو گھنٹے ٹیک ہر شاعر سے بامید داد آنکھیں لڑا لڑا کر تسلیم کے لیئے داہنے ہاتھ کو علت رعشہ میں مبتلا ہی کرنا پڑے گا آخر میں جناب صدر غیر طرحی کلام سے بھی ضرور محظوظ فرمائیں گے اور بعد اختتام بشرط استطاعت تمام غزلیں ایک مجموعہ میں شایع ہو جائیں گی۔

ناظرین نے شاعروں کی کیفیت تو ملاحظہ فرما ہی لی اب ارکان و شرائط مشاعرہ سے نمبروار بحث مناسب ہے جس کی تعداد آٹھ تک پہونچتی ہے۔ یعنی مصرع طرح و پابندی غزل۔ شعرا کی ترتیب نشست۔ طرز شعر خوانی۔ تکرار مصرع۔ داد۔ گردشِ شمع۔ تعیین وقت۔ فرائض صدر۔

(۱) مصرع طرح و پابندی غزل

سب سے پہلے غزل کی تعیین قابل غور ہے۔ تذکرے شاہد ہیں کہ اردو شاعری کا سنگ بنیاد ولی کے مبارک ہاتھوں سے قائم ہوا جنھوں نے ایرانی خشت کا سانچہ ایک دیوان کی صورت میں پیش کیا۔ پھر زمانہ کے رنگ اور سوسائٹی کے مذاق نے غزل کے علاوہ قصائد او ہجو و ہزل کو فروغ دیا لیکن ان کا وجود تابع سلطنت تھا اس کے مٹتے ہی قصائد و ہجو

بھی رخصت ہوئے اور شاعری پر صرف غزل ہی حاکم رہی۔ وجہ یہ کہ ایران میں عشقیہ وصوفیانہ مضامین نے غزل ہی میں
جنم لیا تھا۔ سعدی و حافظ کی غزلوں نے تصوف ہی کی چاشنی سے دنیا کو شیریں کام بنایا تھا عشق کی گرم بازاری تھی
اس لئے شاعری کا وسیع میدان چاروں طرف سے سمٹ کر دیوان ہی کے تنگ گوشہ میں سما گیا۔ ہندوستان نے بھی
حق نقل ادا کیا اور غزل کو آسان اور رواج عام کو آلۂ تحسین سمجھ کر حسن و عشق کی نظم کو اپنا دائمی دستور العمل بنا لیا۔ فرق
اس قدر رہا کہ متقدمین نے غزل کو اپنے صحیح واردات کا آلہ بنایا تھا۔ ان کی غزل بھی نیچرل تھی۔ متاخرین میں نہ وہ حال رہا
نہ اشعار اور واقعات میں اصلیت کی جھلک۔ اس لئے تمام امور فرضیت اور تصنع سے پُر ہو گئے۔ مضامین کثرت طبع آزمائی
سے اس قدر مستعمل ہوئے کہ مقررہ باتوں میں لفظوں کے پس و پیش کے سوائے کچھ کامیابی نہ ہوئی آخر چبائے ہوئے
نوالے کب تک لطف دیتے کسی استاد کو اتفاقیہ کوئی مضمون ہاتھ لگ گیا تو مزے دے گیا۔ ورنہ لطف کی بھی کوئی انتہا ہے
آخر تا کے۔ شعرائے حال کے واسطے سب سے بڑی آسانی یہ ہوئی کہ سلف نے استعارات و تشبیہات کا اس قدر کافی
ذخیرہ چھوڑا تھا کہ ہر کس و ناکس کو فکر کر لینا چنداں دشوار معلوم نہ ہوا۔ دوسری نظموں کی دشواریوں نے خوف زدہ کرکے
اسی دائرہ میں چکر لگانے پر مجبور کیا۔ چنانچہ عمر ختم ہو گئی لیکن مقصود شاعری و ضرورت زمانہ کی فضا کی طرف کبھی بھول کر بھی
رُخ نہ کیا۔ اور بالآخر وہی نتیجہ ہوا جس کی قدرت سے امید تھی کہ آج کل باستثنائے چند غزل گو شعرا کی تعداد حشرات الارض
سے بھی کہیں زیادہ ہے۔ ایک شہر میں ایک تخلص کے متعدد شاعر موجود ہیں اور ہر ایک کو دعویٰ استادیت ہے لیکن نہ ان سے
زبان ہی کو فائدہ پہونچ رہا ہے نہ کوئی مفید اخلاقی نتیجہ ہی نکل رہا ہے۔ اگر غزل کے شیدائی اپنی اصل یعنی فارسی شاعری کو
وسیع النظری سے دیکھتے تو عشقیہ غزل کے علاوہ نہ صرف تاریخ۔ فلسفہ۔ تصوف۔ عشق۔ اخلاق۔ مہمان نوازی۔ شجاعت
و جاں بازی۔ حریت و آزادی۔ پند و موعظت اور مناظر قدرت وغیرہ کے دوسرے مضامین بھی بکثرت پاتے بلکہ
غزل کے تنگ دائرہ میں بھی فلسفہ و تصوف کے وسیع مضامین کا نظارہ کرتے جس کا نمونہ غالب کی غزلوں میں موجود ہے
انیس و دبیر نے مرثیہ ہی میں اخلاق و موعظت حریت و شجاعت۔ فلسفہ و مناظر قدرت وغیرہ کے تمام مضامین میں جوہر سخن
دکھائے ہیں۔ اکبر مرحوم نے موعظت و اخلاق قومی کو ضرورت کے مطابق ایک انداز خاص کے ساتھ بیان کرکے
قطعات و رباعیات وغیرہ میں قابلِ رشک کامیابی حاصل کی ہے۔ مولانا حالی نے قومی شاعری اور علامہ اقبال نے
خودداری و تعلیم نفس۔ قومی احساسات اور فطری جذبات کا کماحقہٗ حق ادا کر دیا ہے۔ ان نمونوں کا وجود غزل گو شعرا کے

واسطے ایک شاہراہ ہدایت ہے جس نے شاعری کے اصل مقصد کو نمایاں کر کے خدمت ملک و قوم کا بیڑا اُٹھایا ہے
قوم کی بدحالی کا مرثیہ حالی ہی کی زبانی سن کر غور فرمائیے کہ ہماری حالت کیسی شاعری کی محتاج ہے۔ دیباچہ مسدس میں لکھتے ہیں

" شاعری کی بدولت چند روز جھوٹا عاشق بننا پڑا۔ ایک خیالی معشوق کی چاہ میں برسوں دشت جنوں کی خاک اُڑائی کہ قیس و فرہاد کو گرد کر دیا۔ چشم دریا بار سے تمام عالم کو ڈبو دیا۔ شکایتوں کی بوچھار سے زمانہ چیخ اُٹھا۔ طعنوں کی بھرمار سے آسمان چھلنی ہو گیا۔ کفر سے مانوس رہے۔ ایمان سے بیزار رہے۔ برہمنوں کے چیلے بنے۔ بت پوجے۔ زنار باندھا۔ قشقہ لگایا۔ زاہدوں پر پھبتیاں کسیں۔ غزل کہی تو پاک شہدوں کی بولیاں بولیں۔ قصیدہ لکھا تو بھاٹ اور بادخوانوں کے منہ پھیر دیئے جس کے مداح بنے اس کو ایسا بانس پر چڑھایا کہ خود ممدوح کو اپنی تعریف میں مزہ نہ آیا۔ غرض نامۂ اعمال ایسا سیاہ کیا کہ کہیں سفیدی باقی نہ چھوڑی۔ اور بیس برس کی عمر سے چالیسویں سال تک تیلی کے بیل کی طرح اسی ایک چکر میں پھرتے رہے اور اپنے نزدیک سارا جہاں طے کر چکے جب آنکھیں کھلیں تو معلوم ہوا کہ جہاں سے چلے تھے اب تک وہیں ہیں۔ .... زمانہ کا نیا ٹھاٹھ دیکھ کر پرانی شاعری سے جی سیر ہو گیا۔ اور جھوٹے ڈھکوسلے باندھنے سے شرم آنے لگی .... قوم کی حالت تباہ ہے۔ عزیز ذلیل ہو گئے شریف خاک میں مل گئے۔ علم کا خاتمہ ہو چکا۔ دین کا صرف نام باقی ہے۔ افلاس کی گھر گھر پکار ہے۔ پیٹ کی چاروں طرف دہائی ہے۔ اخلاق بگڑ گئے۔ امرا غافل۔ علماء ضرورت زمانہ سے ناواقف اس لئے جو کچھ ہو سکے وہ بہتر ہے"

حالی کے کلام میں کس کو کلام ہے۔ پھر کیا قوم کی ایسی حالت نہیں جس کی طرف ادنیٰ توجہ بھی روا رکھی جائے۔ میرا مقصود یہ نہیں ہے کہ تمام شعرا قومی نظمیں لکھنا شروع کر دیں بلکہ غزل اور حسن و عشق کی سخت پابندیوں کے مقابلہ میں ضروریات زمانہ کی شاعری پر بھی توجہ کریں۔ کیوں کہ شاعری صرف غزل میں چند محاورات و روزمرہ کے استعمال کا نام نہیں ہے بلکہ عالم شعر اس سے بہت بلند ہے۔

بدقسمتی یہ کہ اس زمانہ میں شعرا کے تین گروہ ہیں جن میں کا ایک غزل کے تخیل بلند پروازی اور اشکال معانی پر جان دیتا ہے۔ خواہ زبان کتنی ہی بھدی کیوں نہ ہو۔ یہ غالبی کہلاتا ہے۔ دوسرا روزمرہ و محاورات کی نظم ہی کو خلاصہ شاعری سمجھتا ہے۔ خواہ معانی کتنے ہی مبتذل و رکیک کیوں نہ ہوں۔ یہ داغی ہے۔ تیسرا گروہ غزل کے شکنجہ سے نجات پاکر ہر قسم کے جذبات و احساسات کی تصویر کا شیدا ہے جس میں زبان معانی گے اور محاسن بھی ہاتھ سے نہ چھوٹیں۔

اس کے راہ بر حالی و اکبر و اقبال ہیں۔ اس لئے اس کو اقبالی کہا جائے تو مناسب ہے۔

میرے نزدیک غزل کی کثرت اور حسن و عشق کی تحدید نے واقعی مضامین کو اس قدر کمیاب کر دیا ہے کہ مشہور استاد بھی اپنی عمر بھر کے سرمایہ میں بمشکل چند شعر ایسے پیش کر سکتے ہیں جو سننے والے کو بے ساختہ تڑپا سکیں اور کوئی شبہ نہیں کہ آج کل کے مشاعرے صرف مشق غزل کی بدولت ناکامیاب مشاعروں سے یاد کئے جانے کے قابل ہیں اول تو شاعری سائنس کی ٹکر سے خود پاش پاش ہو رہی ہے۔ تجارب و مشاہدۂ علوم تیقنات کے مقابلہ میں ظنیات و توہمات کی کیوں کر قدر ہو سکتی ہے۔ جو شاعری اس زمانہ میں کامیاب ہو سکتی ہے۔ متمدن ممالک کی شاعری کا مقابلہ کر سکتی ہے نئی روشنی والے حضرات کے دل میں دقیانوسی خیالات کی وقعت کو قائم کر کے ان کی زبان کی لاج رکھ سکتی ہے قومی و ملکی فوائد سے لبریز ہو کر مصائب کی سپر ہو سکتی ہے وہ بدون شک موخرالذکر طبقہ کا مذاق سخن ہے۔ اس کے یہ معنی قطعاً نہیں ہیں کہ لطیف تخیل یا اعلیٰ مضامین نہ پیدا کئے جائیں یا زبان کی طرف سے آنکھیں بند کر لی جائیں جس کے بغیر فصاحت و بلاغت کا وجود ہی معدوم ہو جائے گا بلکہ ان دونوں خوبیوں کو اعتدال اور اصلیت پر رکھا جائے۔ مضامین کو وسیع کر کے نظم کو ہر قسم کے خیالات کا ارگن بنایا جائے۔ غزل کو بھی دل چاہے تو اس میں بھی وسعت اور تنوع پیدا کیا جائے تاکہ نام کی شاعری در اصل شاعری کہلائے ورنہ شعر کی اُس قوت اصلی سے ہاتھ دھونا پڑے گا جو قوموں کو زیر و زبر کر سکتی، جو ملک میں ہلچل ڈال سکتی، قبائل میں آگ لگا سکتی، نوحہ سے در و دیوار کو رُلا سکتی اور ایک شعر سے روح کو بیدار اور جسم کے رونگٹے رونگٹے کو لبریز جذبات و حیات کر سکتی ہے۔

غزل گو شعراء کے عذرات

غزل گو شعراء کہہ سکتے ہیں کہ اب نہ شاعری کا کوئی سرپرست، نہ فکر معاش سے فارغ البالی۔ نہ کسی قسم کی مالی منفعت کی امید، نہ قدر و اعزاز کی چاٹ۔ پھر قوم کے مذاق قدیم کے مطابق ایک آسان نظم (غزل) کو چھوڑ کر دوسرے مضامین کی الجھنوں میں کیوں پھنسیں جس سے نہ دوسرے خوش ہوں نہ داد ہی کا صلہ ملے جو موجودہ شاعر نوازی کا منتہائے نظر ہے۔ اس کے علاوہ جمہوری حکومتوں کے شعراء کا نقطۂ نظر بھی شخصی حکومتوں کے شعرا سے متبائن ہوتا ہے۔ وہاں جو کچھ کیا جاتا ہے قوم کو فائدہ پہونچانے یا اپنا کمال منوانے کے واسطے بدوں طمع کیا جاتا ہے۔ یہاں جو کچھ کیا جاتا ہے وہ محض ایک ممدوح کو خوش کرنے اور ذاتی منفعت کے واسطے ان سب کے قطع نظر زبان اُردو کی کم مائگی بھی غزل کے سوائے دوسرے مضامین کے لئے

کافی الفاظ کا ذخیرہ پیش کرنے سے مجبور ہے۔ روزمرہ و محاورات کا استعمال بھی غزل ہی میں خوب نبھ سکتا ہے۔ مجالس نغمہ کے گرمانے کے واسطے بھی غزل ہی مناسب ہے جس سے ادبی و معاشرتی خدمت بخوبی ادا ہوسکتی ہے۔ متقدمین نے بھی غزل ہی کے ذریعہ سے دنیائے ادب کو مسحور کر رکھا ہے۔ اس لئے ان کی شاہراہ سے علٰحدہ ہو کر دوسرے راستہ کا عازن ہونا قدما کی نسبت سوء ادبی و بدگمانی کا مرادف ہے۔

مندرجۂ بالا وجوہ شعراء کو غزل کی ریر کھینچنے پر ثابت قدم کئے ہوئے ہیں جو کھینچتے کھینچتے اکثر جگہ سے ٹوٹ ٹوٹ کر پارہ پارہ ہو چکی ہے۔ لیکن مختلف گروہ ابھی زور آزمائی پر تلے ہوئے ہیں اور وہ دن قریب آپہونچا ہے کہ وہ بالکل فرسودہ اور ریزہ ریزہ ہو کر اس قابل بھی نہ رہے گی کہ کوئی شخص اٹھا کر دیکھ سکے۔

جواب حضرات! ذرا غور فرمایئے کہ یہ معذوریاں کہاں تک درست ہیں۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ بادشاہ نے تمام شعرا کی سرپرستی کی یا کسی شاعر نے بغیر حمایت بادشاہ کے ترقی نہیں پائی۔ سلاطین نے معدودے چند شعرا کو اپنا آلۂ تفریح پاکر نوازا لیکن نتائج اکثر و بیشتر افسوسناک رہے۔ انشا کا حشر معلوم ہے۔ فردوسی کی شاعری محمود غزنوی کی سرپرستی کی رہین منت نہیں۔ غالب و میر فارغ البالی کو ترس ترس کر رخصت ہوگئے۔ بندگان انعام ممدوح کے ہاتھ اپنے جوہر حریت طبع کو فروخت کر کے زبان کی کیوں کر خدمت کر سکتے ہیں اور نہ سال کے چند مقررہ مدحیہ قصائد ہی سے شاعری فروغ پا سکتی ہے۔ عرب و یورپ میں تو ملازمت سلاطین کا سلسلہ ہی نہ تھا وہاں تو قوم کی پسند ہی بہترین صلہ تھی۔ تاریخ شاہد ہے کہ دنیا کے شعرا نے بادشاہوں کے دربار سے زندگی جاوید نہیں پائی بلکہ قوم کی پسند عام اس کے لئے چشمۂ حیات ثابت ہوئی۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ شاعری کے واسطے طمع سے زیادہ کوئی شے بیخ کن ثابت نہیں ہوئی۔ سعدی و حافظ کی شاعری کسی بادشاہ کی سرپرستی سے داغدار نہیں ہے۔ اصلی شاعر وہی ہے جو ہر طرح آزاد ہو اور اگر بغیر طمع کے شاعری ناممکن ہے تو ثابت کرنا پڑے گا کہ آپ کے ملک میں حالی اکبر و اقبال کن بادشاہوں کے ظل حمایت کے پروردہ ہیں جنھوں نے اپنے ممتاز دماغ سے بچہ بچہ کو مسحور کر رکھا ہے۔ پھر اگر قوم کا بگڑا ہوا مذاق غزل ہی تک محدود ہوگیا ہے تو اس میں زیادہ تر عادت کو دخل ہے۔ آپ ہی حضرات نے خوگر تغزل بنا دیا ہے۔ ورنہ جس قسم کی نظم کو فروغ دیا جائے گا پبلک بہت جلد اس سے مستفید و خوگر ہو جائے گی۔ اور چوں کہ جدت مطابق زمانہ ہوگی اس لئے داد کا نمبر بھی غزل کی داد سے کہیں زیادہ ہو جائے گا۔ کس قدر قابل افسوس ہے کہ آپ محض داد کی خاطر شاعری کی جانکاہ تکالیف برداشت کریں اور

ایک رکیک خود غرضانہ جذبہ پر اپنی دماغ سوزی و حریت کو بھینٹ چڑھا دیں۔ واہ واہ کے الفاظ سے آپ کی کیا عقدہ کشائی ہو سکتی ہے جب کہ قوم و زبان دونوں تشنہ کامی سے دم توڑ رہی ہوں۔

جمہوری سلطنت کا سوال بھی بے جا ہے کیوں کہ ہندوستان میں اس قسم کی کامل آزادی حاصل ہے۔ سعدی و حافظ نے تو شخصی حکومتوں میں رہ کر آزادی کا اس طرح ڈنکا بجایا کہ جمہوری حکومتوں کے شعرا بھی آج تک ناز کرتے ہیں آپ اپنی شاعری کا مطمح نظر کسی ایک ممدوح کو بنانا کیوں ضروری خیال کرتے ہیں۔ کیا قوم آپ کے تخاطب کے شایاں نہیں ہے؟

اُردو کی کم مائگی کا سوال بھی بے جا ہے۔ اب تو خیر البلاد حیدرآباد میں بفضلہ تعالےٰ **فخر ملک و ملت تاجدار اسلام ملجائے انام حضور نظام خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ** کے عہد برکت مہد میں اُردو کی یونیورسٹی کے قیام اور گراں پایہ دارالتراجم و تصانیف کے اہتمام نے زبان میں وہ قوت لازوال پیدا کر دی ہے کہ اس قسم کا وہم و گمان بھی حماقت سے کم نہیں۔ لغات کی ایجاد تازہ نے مغربی معدن سے ایسے جسم زیب زیورات تیار کئے ہیں کہ عروس شاعری غزل کے تنگ و تاریک گوشہ میں اب کم مائگی کے دوامی خوف سے آزاد ہو کر کسی طرح روپوش نہیں رہ سکتی۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ آپ کے قدیمی اصول اور سابقہ محاورات کی سخت پابندی سے زبان روز بروز بجائے ترقی کے ایک تنگ ترین غار میں گرتی چلی جا رہی ہے۔ اور یہ عجیب تر ہے کہ اس وقت اُردو نثر نہایت تیز رفتاری سے منازل ترقی کو طے کر رہی ہے ایسی حالت میں کہ روح ادب یعنی شاعری رجعت القہقری کے مرض مہلک میں مبتلا ہے جس سے شعرا کی غفلت و لاپرواہی کا دردناک منظر ایک ناظر کے دل کو بغیر تڑپائے نہیں چھوڑ سکتا۔

لہٰذا اگر آپ کو قوم اور زبان کی خدمت کا سچا ذوق ہے تو ضرورت کے مطابق مختلف اصناف سخن کی طرف توجہ کیجئے۔ کبھی کبھی غزل لکھئے تو اس میں بھی وسعت پیدا کیجئے۔ صنائع بدائع بے تکلف ہوں۔ قافیہ و ردیف کی قیود میں آسانی ہو۔ بحر مطابق نظم اور محاورات کا سلیقہ سے استعمال ہو۔ استعارات ہوں تو قریب کے نیچرل شاعری کی بنیاد ڈالئے۔ مبالغوں کی بجائے سادہ اور پُر جذبات نظم کا رواج دیجئے۔ عشق کا دائرہ وسیع کیجئے اور شاہد بازی کی بجائے جائز اور وسیع محبت کا اعلان کیجئے کیوں کہ اگر جذبات اصلی اور پُر جوش ہوں اور نظر میں سرمایۂ عبرت ہو تو ذرہ ذرہ میں سوز و گداز کا مصالحہ مل سکتا ہے۔ مے خواری اور زاہدوں پر تاڑ کا زمانہ نہیں ہے وہ صوفیا کے ساتھ مخصوص

تھا۔ آپ کو اہلِ شرع سے کیا عداوت ہے جس کا انتقام لینا ضروری ہو۔ غرض حسبِ تحریر بالا مناسب ترمیم کی سخت ضرورت ہے۔

مصرعِ طرح غزل کے بعد مصرعِ طرح کا تعین بھی قابلِ غور ہے جس سے قافیہ و ردیف بحر و وزن کی قید سخت دقت پیدا کرتی ہے۔ میرے نزدیک کسی قدرتی منظر کا فوٹو یا واقعات تاریخی و اسلامی اور مختلف جذبات و احساسات کے عنوانات دیئے جائیں اور شاعر کو قافیہ و ردیف و بحر کا کامل اختیار دیا جائے کہ اپنی پسند کے مطابق انتخاب کرے۔

حضرات! میری یہ آواز نئی نہیں ہے بلکہ ۱۸۷۴ء میں کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن پنجاب کے ایما سے مولوی محمد حسین صاحب آزاد نے اس ارادہ کی اشاعت کے خیال سے ایک مفید ترین مشاعرہ کی بنیاد ڈالی تھی جو ہندوستان میں اپنی نوعیت کا پہلا مشاعرہ تھا۔ اس مشاعرہ میں کسی مضمون کا عنوان شعراء کو دیا جاتا تھا اور یہ اختیار رہتا تھا کہ جس نظم میں چاہیں لکھیں لیکن افسوس کہ اس تحریک کو موصوف کی علالت و انتقال نے ایسا ناقابلِ تلافی نقصان پہونچایا کہ طوفانِ غزل میں مخالفت شعرا کے سیلاب سے یہ نوتعمیر کشتی بغیر ڈگمگائے نہ رہ سکی۔ تاہم جن شعراء نے زمانہ کی ہوا کا رُخ دیکھ کر اپنی سلامتی کے لئے اس حقیر کشتی کو کشتیٔ نوح سمجھا زمانہ دیکھ رہا ہے کہ اب وہ بادبانی کشتی دخانی جہاز کی صورت میں کس طرح منتقل ہو کر موجودہ ترقیٔ ادب کی عالمگیر دوڑ میں سب سے پیش پیش ہے جس کے ممتاز ناخدا علامہ سر اقبال اور اُن کے کشتیہ پیرو ہیں۔

(۲) ترتیبِ نشست و قراءت

ترتیب کی شکایت بھی مشاعروں میں بہت عام ہو چکی ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بعض معمولی شعرا ذاتی اثر اول وقت جگہ پر قابض ہونے کی وجہ سے صدر کی قربت پر کامیابی حاصل کرتے ہیں اور آخر میں غزل پڑھ کر استادوں کی صف میں شمار ہوتے ہیں بعض اعلیٰ درجہ کے شعرا افلاس یا کمیٔ اثر کی بدولت مبتدیوں کی صف میں بھی بمشکل باریاب ہو سکتے ہیں۔ پڑھنے کا کوئی نمبر نہیں ہوتا اس لئے اکثر شعرا صفِ اول کے پیچھے سامعین کی غیر مرتب صفوف میں منسلک ہو کر شمع سامنے آتے ہی افتاں و خیزاں پروانہ وار ٹوٹ پڑتے ہیں مصیبت یہ کہ شمع کی پیش قدمی کا خوف ہر شاعر کو سبقت قرأت پر مجبور کرتا ہے۔ اور ایسی حالت میں "جس کی لاٹھی اُس کی بھینس" کا مقولہ صادق آکر اس تنازع للقرآت کو خود بخود فیصل کر دیتا ہے۔

میرے نزدیک ہر شاعر کی شہرت سخن اور مختلف کلاموں سے قابلیت کا اندازہ لگا کر منجانب صدر نمبر قائم ہونا ضروری ہے تاکہ ہر شخص باجازت صدر نمبروار پڑھ کر دوسروں کو شکایت کا موقع نہ دے۔ نمبر قایم کرنے کے واسطے مشاعرہ سے قبل صدر کو کامل جانچ کے بعد ہر شاعر کا نمبر ایک فہرست میں درج کر لینا چاہیئے تاکہ وقت پر سہولت ہو اور باری باری سے صدر یا نائب صدر شاعر کا نام لے کر پڑھنے کی اجازت دے۔ کوئی غیر مشہور نیا شاعر کسی ایک نظم کے عمدہ ہونے کی وجہ سے اعلیٰ نمبر ترتیب حاصل نہیں کر سکتا جب تک کہ دوسری نظموں سے اُس کا تفوق ثابت نہ ہو کیوں کہ اس صورت میں اکثر ایسے مبتدی بھی قابل ترجیح ثابت ہوں گے جو اتفاقاً احباب کی امداد سے نظم کی تیاری میں کامیاب ہو کر اپنی مستعار قابلیت سے شہرت کا مستقل فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ نشست کی ترتیب بھی نمبر قرات کے ساتھ ہو تاکہ شمع کی گردش بخط مستقیم صحیح رفتار پر جاری رہے اور تمام تنازعات کا سد باب ہو جائے۔ چنانچہ شاہی مشاعروں میں ترتیب نشست و قرارت کا برابر انتظام تھا۔ تمام شعرا صف اول میں بالترتیب جگہ پاتے اور صدر کی اجازت پر نمبروار کلام سناتے تھے۔

(۳) طرزِ شعر خوانی

بالعموم مشاعروں میں شعر پڑھنے کی طرز تحت اللفظ کی تسلیم کر لی گئی ہے جو خیالات پر اس قدر حاوی ہے کہ ترنم کی اچانک ترقی بھی مورد لعن و طعن بننے سے باز نہ رہ سکی۔ میرے نزدیک ادنیٰ غور سے فریقین کا تنازع رفع ہو سکتا ہے کیونکہ دونوں فریق اپنے اپنے کلاموں کو پُر تاثیر بنانے کے واسطے اپنی حسب پسند آلۂ اظہار سے کام لیتے ہیں۔ جن میں کوئی حرج نہیں البتہ ترنم تحت اللفظ سے شعر کے لئے زیادہ موزوں ہے کیوں کہ شعر کو موسیقی اور موسیقی کو شعر سے ایک رابطۂ خاص اور نسبت تامہ ہے۔ حتیٰ کہ بعض محققین نے موسیقی کو بھی تعریف شعر میں داخل کر دیا ہے۔ اور کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ تحت اللفظ کے ساتھ ہاتھ نچائیں۔ رانیں پیٹیں۔ ڈاڑھی نوچیں۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کبھی غرائیں کبھی گنگنائیں۔ کہیں آواز تحت الثریٰ میں غائب کہیں چیخوں سے آسمان سر پر اُٹھائیں اور فن خطابت کا کمال ہی نہیں بلکہ اعلیٰ درجہ کے ایکٹ موشن کے جوہر دکھائے جائیں اور محض تاثر کی خاطر یہ سب جائز و مستحسن ہوں لیکن اگر کوئی شخص ترنم یا زمزمہ سے سامعین کو متاثر کرے اور ان تمام لغو حرکات سے کنارہ کشی کرے۔ تکرار مصرع کی مصیبت سے دوسروں

کو نجات دے تو ایک جدید شے ہونے کے الزام سے ناجائز قرار پائے۔ میرے نزدیک شعر کا اثر موسیقی سے بدرجہا زیادہ ہو جاتا ہے۔ تحت اللفظ پڑھنے والوں کا یہ اعتراض کسی طرح قابل التفات نہیں کہ ترنم کی وجہ سے معمولی اشعار کی داد بھی بخوبی مل جاتی ہے جو انھیں باوجود ایڑی چوٹی کے زور کے میسر نہیں ہوتی۔ حالاں کہ شعر کے موثر بنانے میں یہ حضرات ان سے بھی چار قدم آگے ہیں۔ یہ اپنی کڑک سے زمین و آسمان کو ہلائیں۔ ایکٹ موشن سے پوری غت ان کریں لیکن کسی کو موقع دم زدن نہیں۔ حالاں کہ جب شعر کو محض سادہ طریقہ سے نہ پڑھا گیا تو موثر بنانے میں دونوں کی حالت یکساں ہے۔ قیاس کہتا ہے کہ انیس و دبیر کے مرثیوں کا ورثہ قارئین نظم کے واسطے دو صورتوں میں منقسم ہوا۔ پردرد اور مختصر نظموں کا تعلق ترنم سے رکھا اور طویل نظموں کے واسطے تحت اللفظ کی طرز اختیار کی کیوں کہ طویل اور شجاعت آمیز نظموں کے واسطے یہی زیادہ مناسب تھی چوں کہ شاعری بھی چاروں طرف سے سمٹ کر لکھنؤ کی چار دیواری میں محدود ہوئی اس لئے شعرائے لکھنؤ نے تحت اللفظ کو آسان سمجھ کر رواج عام دے دیا۔ یہ امر بھی تعجب سے خالی نہیں کہ ترنم جدید طبقہ کی ایجاد ہے۔ دنیا کے ہر ملک میں اشعار پڑھنے کی طرز ایک مخصوص لحن سے خالی نہیں ہے خواہ یورپ ہو یا ایران عرب ہو یا افغانستان۔ ابوالآباء شاعری رودکی جو موجد غزل ہے ہمیشہ ترنم سے سامعین کو مسحور کرتا تھا۔ فردوسی کا راوی ابو دلف ترنم ہی کے واسطے مخصوص تھا۔ شعرائے عرب کے راوی اور خود شعرا ترنم ہی کے دل دادہ تھے حضرت امیر خسرو کی شاعری کا سکہ موسیقی ہی کے ہاتھوں جما تھا۔ بہادر شاہ کی غزل ۱۲۶۱ھ کے مشاعرہ میں خواص سے گا کر پڑھی تھی۔

اس تقریر سے میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ سب ترنم ہی سے پڑھیں بلکہ اعتراضات باہمی سے محترز رہ کر اپنی حسب پسند کسی ایک طریقہ کو اختیار کرلیں ورنہ اہل ترنم کہہ سکیں گے کہ اگر ہمارا طبقہ گا کر لبھاتا ہے تو یقیناً دوسرا طائفہ ناچ کر گرویدہ کرتا ہے۔

اس موقع پر میں اپنی ناچیز رائے بھی بغیر پیش کئے نہیں رہ سکتا کہ درد و سوز۔ رنج و فراق، مسرت و عیش۔ نوحہ و ماتم امید و یاس۔ شوق و انتظار وغیرہ کی نظموں میں ترنم زیادہ کارگر ہو سکتا ہے اور رزم۔ شجاعت و قصائد کے پڑھنے میں تحت اللفظ زیادہ موثر ہے۔ اس لئے میں ان دونوں صورتوں کو اپنی اپنی جگہ پر مندرجہ تقسیم کے موافق مستحسن سمجھتا ہوں۔

(۴) تکرارِ مصرع

عام رواج ہے کہ مشاعرہ کے ابتدائی دو تین گھنٹوں میں گرمیٔ بزم کی خاطر با آواز بلند تیس چالیس شاعر یک زبان مصرعِ اولیٰ کی تکرار کرتے ہیں جس کو باصطلاح مشاعرہ "مصرع کا اُٹھانا" کہا جاتا ہے۔ وجہ یہ کہ ہر شخص باسانی سن کر مصرع کے وزن اور صحت و سقم کا بخوبی اندازہ کرے اور پڑھنے والے کو بھی قدرے وقفہ مل جائے۔ لیکن یہ صورت دو تین گھنٹے جاری رہ کر تکان سے تمام جوش و خروش کو ٹھنڈا کر دیتی ہے حتیٰ کہ آخر میں استادوں کے مصرعے بھی اُٹھائے سے نہیں اُٹھتے۔ تکرارِ مصرع کا رواج نہ ایران میں ہے نہ شاہی وقت کے کسی قدیمی مشاعرہ میں اس کا پتہ چلتا ہے اس لئے کوئی شک نہیں کہ آخر زمانہ کے ترقی شعر کی اصلاحی جدت ہے اور لطف یہ کہ غرض ایجاد بعد غور بھی سمجھ میں نہیں آتی کیوں کہ تکرار میں معتدبہ وقت کے فضول ضائع ہونے کے علاوہ تمام حاضرین کے سنانے کا اصول بھی غلط ہے۔ صرف ایک مصرع کے سُنانے سے کیا فائدہ متصور ہو سکتا ہے جب کہ دوسرا مصرع خود شاعر ہی پر چھوڑ کر تکرارِ مصرع کا وزن دُ اُ کی چیخوں سے پورا کیا جاتا ہے اور نہ پڑھنے والے کو چند منٹ میں ایسی تکان ہی ہو جاتی ہے جس سے قدم قدم پر وقفہ کی ضرورت محسوس ہو بلکہ پڑھنے والا خود اپنے ذوق کو اس دخل و معقولات سے کھو بیٹھتا ہے۔ اس کے ترک سے وقت بھی کم صرف ہوگا جلسہ کی تہذیب اور شان بھی قائم رہے گی۔ کلام کا لطف بھی دوبالا ہوگا اور فعل عبث سے بھی نجات ملے گی رہی اسقام کی جانچ، اس کا حق صدر مشاعرہ کو حاصل ہے عوام کو زیادہ گلا پھاڑنے کی ضرورت نہیں۔

(۵) دادِ کلام

داد سے مراد کسی شعر کی جائز تعریف کا اظہار ہے تاکہ شعر کی خوبیوں کے اظہار سے دوسرے بھی مطلع ہو جائیں اور شاعر کی جاں کاہی کا اعتراف ہو تاکہ ہمت افزائی کوشش مزید کا موقع دے۔ داد میں نہ صرف نعرہ ہائے تحسین بلند کئے جائیں بلکہ اس کے جوہرِ حسن کر ان خاص اوصاف کی طرف اشارہ کریں جو عوام کی نظروں سے مخفی ہوں اس کے ساتھ ہی یہ لحاظ بھی رہے کہ غیر مستحقین کی بے جا تعریف نہ کی جائے تاکہ مستحقین کی دل شکنی اور کسرِ شان نہ ہو۔ اب مشاعروں کی مروجہ داد پر بھی نظر ڈال لیجئے جس سے عجیب و غریب مناظر پیش نظر ہوں گے۔ یہاں حصول داد کی خاطر بسا اوقات کثیر

زحمتیں برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ بعض حلقۂ احباب کی وسعت اور بعض منصب و ثروت کے اثر سے کامیاب ہوتے ہیں۔ بعض ووٹ دہندوں کی طرح داد دہندوں کے توڑنے میں بہت سا وقت برباد کر دیتے ہیں کہیں ایک استاد کا اکھاڑا دوسرے اکھاڑے کے مقابلہ میں اپنے ہر سورما کی واہ واہ کرتا ہے۔ بعض شعرا "من تراحاجی بگویم تو مرا حاجی بگو" پر عمل کر کے ہر شخص کے کلام کی داد دیتے ہیں اور اپنا کلام سنانے کے بعد ہر طرف نظر پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہیں تاکہ "ہل جزاء الاحسان الا الاحسان" کے مطابق خراج تحسین وصول کریں۔ غرض داد کا چسکا بھی عجیب ہوتا ہے جو نئے نئے طریقۂ وصول پر مجبور کرتا ہے

داد کے الفاظ خوب! بہت خوب! کیا خوب! واہ واہ۔ واہ واہ۔ بہت اچھا شعر ہے! کیا شعر ہے! قلم توڑ دیا! بس ایک ہی شعر ہے! قافیہ ختم ہو گیا! کیا بات ہے! سبحان اللہ! پھر فرمائیے۔ مکرر فرمائیے (once more) کیا کلام ہے! غضب کر دیا! وغیرہ ہیں۔ خواہ ان کو کلمات تحسین سمجھ لیجئے یا الفاظ داد۔ داد سے مراد تو محاسن کی تشریح تھی جو ہر ایک کا حصہ نہیں لیکن اس دور انحطاط میں اسی کو داد سمجھ لیجئے کیوں کہ سخن فہمی سخن گوئی سے زیادہ مشکل ہے بعض موقعوں پہ داد کا وہ ہڑبونگ ہوتا ہے کہ بزم سخن مرغ کی پالی یا گزری سے کم نہیں ہوتی۔ جب کوئی شعر اچھا پڑھا جاتا ہے تو چاروں طرف کی چیخ پکار سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ لطف یہ کہ کم سخن حضرات بھی منہ سے روئی نکال کر ایسی چیخیں لگاتے ہیں کہ یقیناً دیوانگی کا شبہ ہو کر اکثر مہذب حضرات کو خندۂ زیر لبی پر مجبور کر دیتا ہے بالخصوص کالجوں میں تو اس ہنگامۂ بے تمیزی کے شور کی رہی سہی کمی کو سیٹیاں پورا کر دیتی ہیں۔ پڑھنے والا بھی خوشی سے پھولا نہیں سماتا اور بیچارہ بدحواسی میں گھٹنے ٹیک کر کھڑا ہو جاتا ہے اور چاروں طرف نگاہیں اٹھا اٹھا کر طوفان تسلیم کے مد و جزر میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ بعض شعرا کو داد کی ایسی چاٹ ہوتی ہے کہ بیچارے اپنے مال کی خود تعریف کر کے شعر کی طرف متوجہ کرا دیتے ہیں اور یہ تو لازمی ہے کہ ہر معمولی شعر کے ختم کرنے کے بعد بھی بامید داد ہر شخص کو للچائی نظروں سے دیکھ دیکھ کر ملتجئ داد ہوتے ہیں۔ آخر کسی غریب کو رحم آ ہی جاتا ہے اور "کیا خوب" کی آواز بھی زیر لب ہوتی ہے کہ احسان کا بدلہ جنبش لب سے پہلے ہی دو تین تسلیموں سے پیش کر دیا جاتا ہے۔ بعض طرحی کلام سے اگر کامیاب داد نہیں ہوتے تو اپنی عمر بھر کے منتخب کلام کو غیر طرحی صورت میں پڑھ کر داد کی کمی کو پوری کرا لیتے ہیں۔

میرے نزدیک اصلی داد ایک قابل صد ہی کی ہو سکتی ہے جو ہر نظم کے آخر میں مختصراً مناسب ہو اور مفصل ریمارک

مطبوعہ رسالہ میں ہر غزل کے بعد کافی ہو سکتا ہے۔ نعرہ ہائے تحسین کا انسداد اگرچہ ناممکن ہے لیکن اگر سامعین جلسہ کی تہذیب کو قائم رکھنا چاہیں تو تناسب پر عمل ضروری ہے۔

(۶) گردشِ شمع

یہ مبارک شمع بھی قدامت کی قابلِ قدر یادگار ہے حتیٰ کہ اگر برقی روشنی کی افراط شمع کی روشنی کو ماند کر دے تب بھی شمع ضرور ہوگی۔ اور زمانہ کا تمدّن شمع کی جگہ لیمپ کو دیدے تب بھی نام شمع ہی رہے گا۔ تتبع سلف کے علاوہ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ پڑھنے والے کا تعین ہو جاتا ہے لیکن یہ بھی دو زحمتوں سے خالی نہیں۔ ایک یہ کہ شمع اُٹھانے اور رکھنے کے واسطے ایک آدمی کو خاص کرنا پڑتا ہے دوسرے ایک ہی صف میں جہاں سامعین و قارئین پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں وہاں سامعین کے سامنے شمع آکر اُن کو عرق خجالت میں غرق کر دیتی ہے۔

میرے نزدیک اگر وسط میں صدر کے بالمقابل ایک خاص جگہ پڑھنے والے کے واسطے معین ہو جائے خواہ کرسی پر یا چھوٹے سے پلیٹ فارم پر جس پر روشنی بھی کافی ہو تو تمام دقتیں رفع ہو سکتی ہیں۔ نہ عدم سماعت کی شکایت ہوگی نہ ترتیب نشست کا نزاع باقی رہے گا نہ شمع کو گردش میں مبتلا ہونا پڑے گا۔ نہ سامعین کی خفت کا موقع رہیگا اور صدر کی قربت کا نزاعی مسئلہ بھی خودبخود طے ہو جائے گا۔

(۷) وقتِ مشاعرہ

عموماً مشاعرہ کا افتتاحی وقت ۹ یا ۱۰ بجے شب ہے۔ انتہا تمام شب یا ایک دو شبانہ روز مزید۔ یہ ظاہر ہے کہ تمام رات آنکھوں میں کاٹنا اور شور و غوغا سے کانوں کا آزردہ ہونا سب کے لئے شاق ہے۔ اگر مشاعرہ اتفاق سے ایک ہی شب میں ختم ہو جائے تب بھی آخر شب میں ضرور بے لطفی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لئے اول شب میں ۸ بجے سے شروع ہو کر زیادہ سے زیادہ ۱۲ بجے تک ختم ہو جانا چاہئے۔ جس قدر کلام باقی رہے سلسلہ وار شب کے ان ہی مقررہ اوقات یا دن کے فرصت کے حصوں میں جاری رہے تو مناسب ہے۔ مقامی شعرا روزانہ شرکت کر سکتے ہیں۔ غیر مقامی حضرات کو اگر بارِ صرف کا اندیشہ ہو یا قیام سے معذور ہوں تو اول شب میں موقع دینا چاہئے کیوں کہ مشاہیر

کا کلام ابتدا میں ناجائز نہیں ہے بلکہ شاہی مشاعروں میں تو صدر اور بہترین شعرا کا نمبر اول ہی رہا کرتا تھا۔ عوام کی دلچسپی کے لئے مقامی شعرا اور صدر کا کلام کافی ہو سکتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ غیر مقامی شعرا کو ان کا نمبر مقرر کرنے کے بعد اسی دن مدعو کرنا چاہیے جس میں ان کے کلام کی باری ہو۔ میرے نزدیک اس تحدید وقت میں حاضرین بھی تکلیف مالا یطاق سے نجات پا سکتے ہیں اور بزم سخن بھی سرگرمی سے خالی نہیں رہ سکتی۔

(۸) فرائضِ صدر

بالعموم جناب صدر کوئی مشہور شاعر ہوتے ہیں اور بعض موقعوں پر شاعری کی تیلیی اڑجاتی ہے صرف کوئی اضافی شہرت اس خانہ پُری کے لئے بہت کافی خیال کرلی جاتی ہے۔ صدر صاحب مسندِ صدارت پر قدم رکھتے ہی کہنی تکیہ پر رکھ، ہاتھوں کو ستونِ زنخ بنا کر نیم دراز ہو جاتے ہیں۔ پانوں کی گلوریاں چبانے اور توسے کے خوشبودار حقے کے شیریں کش لگانے کے واسطے مہیا رہتی ہیں۔ کسی شعر پر زیادہ ہڑ مچا تو اُنھوں نے بھی کیفیت استغراقی سے آنکھیں کھول کر واہ واہ کردی۔ کلام سنانے کا موقع آیا تو کبھی طرحی کلام پڑھ دیا اور داد کی کمی رہی تو غیر طرحی کلام جو تمام شاعری کا جوہر ہوا پڑھ کر سُنا دیا اور اس حکمت عملی سے فرائض صدارت کی لاج رکھ لی۔ جلسہ کا انتظام مہتمم کے سپرد ہوتا ہے اس لئے صدر مشاعرہ کو عضو معطل کی طرح رکھنا معنی صدارت کو شرمندہ کرنا ہے۔ اگر صدر اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کا احساس کرے تو مسندِ صدارت کی رونق افروزی ہر کس و ناکس کو دشوار ہو جائے۔ میرے نزدیک صدر کے فرائض حسب ذیل ہو سکتے ہیں:۔

فرائض صدر سے پہلے میں مسئلہ انتخاب پر بھی قدرے روشنی ڈالنا مناسب سمجھتا ہوں۔ چوں کہ اس بارہ میں مہتمم جلسہ کی رائے کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اس لئے اس کا انتخاب چند مشہور شعرا کی علحدہ انجمن میں مشاعرہ سے قبل طے کرلیا جائے اور انتخاب میں اس کا لحاظ رہے کہ وہ شخص صدر ہو باعتبار شاعری تمام حاضرین سے بہتر ہو۔ عروض سے کامل طور پر واقف ہو۔ ہر شخص کے کلام کے آخر میں ذاتیات سے برکنارہ ہو کر ایسی مناسب اور مفید تنقید کرے جس کی واقعیت سے ہر منصف مزاج کو مخالفت کا موقع نہ ملے۔ اصلی داد اور تنقید بعد غور و خوض تحریری ہو سکتی ہے جس کا انطباع رسالہ میں ہر شخص کے کلام کے تحت میں ہو۔ افتتاح مشاعرہ سے قبل کلام دیکھ کر بربنائے شہرت کلام نمبر قایم کرے اور بالترتیب ہر شاعر کو پڑھنے کی اجازت دے۔ وقت انطباع رسالہ ہر شخص کے کلام کو جانچ کر نمبروار کلام درج کرے اس ترتیب سے کہ جو شخص اوّل آئے

اس کا کلام نمبر اول پر دیا کرے۔ اسی طرح آخر تک لحاظ مرعی رہے۔ اگر کسی معمولی شعر پر کافی نعرہ ہائے تحسین بلند ہوئے ہوں تو اپنی رائے کے ساتھ دیا کرے۔ مشاعرہ میں غیر مناسب اور ذاتی حملوں کے کلام کو روک دے۔ اور ہر طرح نظم کو قائم رکھے۔ جس کام میں امداد کی ضرورت ہو اپنے نائب سے لے نشست میں شعرا کی صف کو ممتاز رکھنا چاہئے۔ جس کا نمبر اول ہے اعلیٰ درجہ کی نظم پر حسب استطاعت انعام مقرر کرے اور چند شعرا کی کمیٹی سے کلام منتخب کر کے انعامات کا اعلان کرے تاکہ عوام کو رغبت، انجمن میں حرکت، زبان میں وسعت اور بدنظمی میں قدرے ترتیب پیدا ہو۔

سب سے آخر میں اپنے بزرگوں سے با ادب معافی چاہتے ہوئے ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ میرا مقصود مشاعرہ کی مخالفت نہیں ہے۔ میں شعرا کی کثرت اور مشاعروں کے مفید ہونے کا معتقد ہوں لیکن اس قدر استدعا ضرور کروں گا کہ مشاعروں کی بدعنوانیوں پر نظر غور فرما کر بجائے مخالفت کے کام کی اہمیت پر توجہ فرمائیں اور ان کو ہر طرح مفید بنا کر زمانہ کی رفتار کے ساتھ تدریجی ترمیم کی ضرورت پر غور فرما کر مصروف عمل ہوں۔ اب دیکھنا ہے کہ میری حقیر آواز قابل توجہ ثابت ہوتی ہے یا نہیں۔

آج ہم اپنی پریشانیٔ خاطر اُن سے
کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں

محمد علی خاں اثر

مقولات

(۱) خدا اپنے داہنے ہاتھ میں سچائی، اور بائیں ہاتھ میں ہمیشہ سچائی کی طرف بڑھنے والا دل لے کر لوگوں میں غلطی کا پتلا ہوں لیکن وہ اگر مجھ سے کہے مانگ لے، میں عاجزانہ اس کے بائیں ہاتھ کی طرف جھک کر کہوں "اے مالک مجھے یہ دیدے۔ سچائی صرف تیری ذات کے لئے ہے۔" (جی ای لینگ)

(۲) وہ انسان عقلمند نہیں جو اپنی قابلیت سے زیادہ کام کرنے کی ہمت نہ کرے۔ (سر ہمفری ڈیوی)

عبدالواحد شاہ

باقیاتِ فانی

دل وقفِ تپش ہے، ہائے مگر وجہِ تپشِ دل کوئی نہیں
بسمل ہوں، مگر کیوں بسمل ہوں، فریاد کہ قاتل کوئی نہیں

کس زعم میں ہیں اے رہبرِ غم دھوکے میں نہ آنا منزل کے
یہ راہ بہت کچھ چھانی ہے، اس راہ میں منزل کوئی نہیں

یہ واہمہ تھا یا مشکل تھی کیوں میں نے کہا کیا نادم ہوں
وہ پوچھتے ہیں کیا مشکل ہے، کیا کہئے کہ مشکل کوئی نہیں

بس اُن پہ نہ اُن کی یاد پہ ہے، تقدیر کے کیا کیا پہلو ہیں
تدبیر سے حاصل کچھ بھی نہیں، تدبیر سے غافل کوئی نہیں

دریائے محبت بے ساحل اور ساحل بے دریا بھی ہو
جو موج ڈبو دے ساحل ہے، یوں نام کا ساحل کوئی نہیں

کر شیشہ و ساغر، بادہ و ساقی، گل اور شمع سے قطعِ نظر
محفل میں یہ رونق کس کی ہے، جب صاحبِ محفل کوئی نہیں

خود حسن کمالِ حسن سے ہے، یعنی حسنِ جہاں ہے کامل ہے
اور عشق کمالِ عشق سے ہے، یعنی عشق میں کامل کوئی نہیں

جلوۂ غیب شہود سے ہے، پھر بھی غیب کے جلوے غیب میں ہیں
نظارہ نظر میں شامل ہے، نظارہ میں شامل کوئی نہیں

ہستی ہی نہیں جو باطل ہو، پھر فرقِ مجاز و حقیقت کیا
یہ عرضِ حقیقت ہے وہ حقیقت، ہستیِ باطل کوئی نہیں

فانیؔ ہی وہ اک دیوانہ تھا جو موت سے پہلے مر جائے
کیا ہوش کسی کا فردِ دنیا میں اس موت کے قابل کوئی نہیں

فانی

جذبات

ترے جلوے نے بے خود کر دیا ہے روبرو ہو کر
پھریں میرے لئے اب ہوش گرمِ جستجو ہو کر

وہ نازک بات جو حامل نہ تھی بارِ تکلم کی
تری آنکھوں نے کہہ دی بے نیازِ گفتگو ہو کر

مرا خونِ تمنّا رنگ لایا بھی تو کیا لایا
رُخِ قاتل میں جھلکا ہے خجالت کا لہو ہو کر

مری مردہ تمنّاؤں میں محشر کر گیا برپا
وہ ناوک جو جگر سے پار نکلا سُرخ رو ہو کر

کبھی مانندِ موج اک جزوِ دریائے حقیقت تھا
میں ڈوبا خود، اسیرِ امتیازِ ما و تو ہو کر

پسِ مردن بھی میں نے تجھ کو کس کس رنگ میں ڈھونڈا
کسی جا رنگ و بو ہو کر کہیں جام و سبو ہو کر

مرے قاتل ترے ہاتھوں کے صدقے، چھوڑ دے قبضہ
کہ شعلہ بن گیا خنجر ہم آغوشِ گلو ہو کر

مرا خونِ تمنّا حاصلِ کشتِ تمنّا ہے
یہ وہ حاصل ہے جو حاصل ہوا دل کا لہو ہو کر

وفورِ ناتوانی سے یہ اپنا حال ہے غازی
کہ رہ جاتی ہے عرضِ آرزو بھی آرزو ہو کر

شفیق احمد غازی

حسیّات

جذبۂ غم اور اس کی عدم معنویت

نپولین نے اپنی قوت عزم و ارادہ یا کامرانیوں کے تحت "ناممکن" کے لفظ کو "لغات" سے خارج کر دینے کا مشورہ دیا تھا مگر چونکہ قوت ارادیہ اور تجربات زندگی کے نتائج ناقابل تغیر نہیں ہوا کرتے اس لئے خود نپولین جیسے شخص کو بھی دنیائے عمل کے سامنے اپنے الفاظ واپس لینے پڑے۔ اسی طرح آج میں بھی ایک لفظ کو "بے معنی" کہنے کی جرأت کرتا ہوں۔ مگر چوں کہ وہ ذہنی کاوشوں کا زائیدہ ہے اس لئے جب تک ذہنی احساسات کی اہمیت اور واقفیت دنیا کی نظروں سے فنا نہیں ہوتی میرے نظریہ سے بھی گریز نہیں کیا جا سکتا۔

جذبۂ حزن و ملال کی گہرائیوں میں کیا کوئی فلسفیانہ واقعیت، صداقت اور حقیقت مضمر ہے؟ میرے نزدیک اس کا جواب نفی کے سوا کبھی اثبات میں نہیں دیا جا سکتا۔ کیوں کہ غم محض اضمحلال ذہنی کا نتیجہ ہے۔ اگر آپ کی ذہنیت علویت پذیر، آپ کے قوائے عمل جوش و ولولہ سے معمور اور آپ کی پاک روح تنویرات سماویہ سے جگمگا رہی ہے تو تمام مؤثرات کونیہ آپ کے اندر کوئی معمولی تاثر بھی پیدا کرنے سے قاصر رہیں گے۔ انسانی فطرت غم کے نام سے بھی آشنا نہیں ورنہ مذہبی ذہنیت کے تحت ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ "امانت سرمدیہ" کو دیوانہ وار نہیں اٹھایا جا سکتا تھا۔

غم ہماری کمزوریوں کا دوسرا نام ہے اور اس کو بعض نظریات کے زیر اثر نشو و نما دینا دنیائے انسانیت کو موت کے دروازہ پر ایستادہ کر دینا ہے۔

مگر باوجود اس کے شاید یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ غم کو دور کر سکنے کی قابلیت بھی غم ہی سے پیدا ہو سکتی ہے ہم اپنے اضمحلالات کا اس وقت تک صحیح احساس جذب نہیں کر سکتے جب تک کہ اُن کی تاریکیاں دل و دماغ کو ظلمت شب سے دوچار نہ کر دیں۔ کیوں کہ یہ نہ صرف انسانی فطرت بلکہ قانون قدرت ہے کہ اثبات نفی سے وجود پذیر ہو

اور زندگی موت سے۔ نظریۂ تقدیر کی غرض وغایت ان ہی تاریکیوں اور ظلمات کو نورانی کیفیت میں تبدیل کرسکتا تھا تاکہ انسانی ترقیات کو غیر محدود فضا میں پرواز کرنے کا موقع مل سکے۔ مگر افسوس ہے کہ دنیا کی ناپاک ذہنیت تصویر کا رنگین رخ دیکھنے کی "زحمت" گوارا نہ کرسکی۔

منفیت کی تعلیم ہی "نفیٔ غم" یا بالفاظ دیگر اُن تمام موثراتِ مادیہ سے منفعل نہ ہوسکنے کے لئے جاری کی گئی تھی جو ہماری روح کو غم کی آلودگیوں سے ملوث کرنے کی استعداد رکھتے ہوں۔ تاکہ پھر ہم اپنے قوائے روحانیہ کے اہتزازات کو باختیار خود حسِ مسرّت اور فردوسی مسرت کے نقطہ پر جاہیں مرتکز کرسکیں۔ لیکن علامہ اقبال کی پرجوش طبیعت اور پُرشور ذہنیت اس نکتہ تک نہ پہونچ سکی اور متصوفانہ منفیت کو "افیون خوردگی" سے منسوب کردیا۔ الحذر ثم الحذر

غالب کے دو شعر

(۱)

تنگیٔ دل کا گلہ کیا؟ یہ وہ کافر دل ہے
کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا

میرے نزدیک اس شعر کی نفسیاتی تحلیل بھی کی جاسکتی ہے اور فلسفیانہ بھی۔ جن میں سے ہر ایک اپنی جگہ پر درست ہے۔

(۱) محبت انبساطی اور انقباضی دونوں قسم کی کیفیات رکھتی ہے۔ کیوں کہ اس کا "امتیاز جامعیت" اس ہی لمحہ تک قائم رہ سکتا ہے کہ تمام صفات خواہ وہ باہم دیگر تضاد ہی کی نسبت کیوں نہ رکھتی ہوں اس کے اندر موجود رہیں۔ لیکن کسی شاعر کے لئے یہ ضروری نہیں کہ حقائق کی ترجمانی کرتے ہوئے ہر پہلو کو روشنی میں لائے اس کے لئے صرف کسی ایک ہی رُخ کی مصوّری کافی ہے۔ چنانچہ غالب مرحوم نے اس ہی "انداز شعریت" کو اختیار کرتے ہوئے "جذبۂ لطیف" کی محض انقباضی کیفیت یا بالفاظ دیگر "تنگیٔ دل" پر نقد کرتے ہوئے یہ حقیقت واشگاف کی ہے۔ کہ اگر انقباض جو محبت کا اٹل قانون ہے نافذ نہ بھی رہے اور "مشقِ ستم" کا "خوگر" ہونے کے بعد غیر محسوس بھی ہوسکے تو آخر اس سے کیا فائدہ؟ کیوں کہ یہ کم بخت تو وہ "کافر" ہے کہ اگر ایک پہلو سے اس کو طمانیت وسکون بھی نصیب ہوجائے تو دوسرے پہلو سے ضرور مضطرب اور بےچین رہیگا۔ اگر اس کی ایک کروٹ میں

فردوس بریں ہی رکھ دی جائے تو دوسری کروٹ سے دوزخ کے آتشیں شرارے بھڑک اُٹھیں گے۔ محبت کے انقباضات جو انبساطات ہی کی دوسری شکل ہیں اگر مٹ بھی جائیں تو ناپاک دنیا کی "ظلمت بدوش" پریشانی اُبھر آئے گی۔ اس بنا پر تنگیٔ دل کا گلہ نہیں کرنا چاہیئے کہ یہ محبت یا حسنِ دل نواز کا کرشمہ نہیں بلکہ خود انسانی فطرت کا قصور ہے۔ لہٰذا جذبۂ محبت کا شکوہ کرنا کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔ یہ قسمت کا فیصلہ ہے محبت کا نتیجہ نہیں۔

(۲) اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے روزمرہ اور زبان زد محاورات سے صرف نظر کر سکیں تو لازم و ملزوم ہونے کی حیثیت سے تنگی اور محدودیت کو مترادف تسلیم کرنا ہوگا اس ہی معنی کے اعتبار سے غالب انسان کی تنگ نظری یا بہ تعبیر دیگر تحدید وجدانیت یا عازمانہ احساسات کی قلت کو اچھی نظر سے دیکھتے ہوئے کہتا ہے کہ تنگیٔ دل یا حقائق کونیہ سے عدم واقفیت اور انسانی ذمہ داریوں کا احساس کم ہونے پر ہمیں ماتم نہیں کرنا چاہیئے۔ اس واسطے کہ اگر ہم دنیا اور خود اپنے گرد و پیش، ماضی و مستقبل، ترقی و تنزل، موت و حیات کا اجتماعی اور انفرادی طور پر زیادہ سے زیادہ اور صحیح سے صحیح علم رکھتے تو زندگی موت سے بدتر ہو جاتی۔ انسان کی لاعلمی ہی تو زندگی کی ضامن ہے۔ جو لوگ جس قدر کم علم اور احساس رکھتے ہیں اتنے ہی وہ خوش ہیں اور جن لوگوں کو جتنا زیادہ علم اور احساس ہے اتنا ہی آپ اُن کی زندگی کو غم آشنا پائیں گے۔

بچہ موت سے واقف نہیں ہوتا اس لئے موت اس کے لئے کوئی ہیبت ناک یا الم ناک حقیقت نہیں۔ جو جاہل جنت اور دوزخ کا نام بھی نہیں جانتے ان کو عذاب جہنم کا کیا خوف؟ جو شخص عالم اسلامی کی مشکلات ہندوستان میں مسلمانوں کی اندوہناک پوزیشن سے آگاہ نہ ہو وہ حیات اسلامی کے مراحل کی خطرناکیاں محسوس نہیں کر سکتا۔ میں نے چند سال پیشتر اس ہی نظریہ پر بحث کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ

"انسانی اضمحلال تصور ہی اس کی ترقیات اور افعال حیاتیہ کا ضامن ہے"

بس یہی مفہوم ہے جسے غالب نے شعر کے سانچے میں ڈھال دیا۔ یہ حقیقت اُس وقت زیادہ روشن ہو جاتی ہے جب کہ تصورات ذہنی اور تاثرات وجدانی کی یگانگت کو پیش نظر رکھا جائے۔ کیوں کہ کوئی کیفیت ایسی نہیں ہوتی کہ اُس سے دل و دماغ یکساں طور پر اثر پذیر نہ ہوتے ہوں چنانچہ نفسیات عضویاتی کے جدید نظریہ نے اس مسئلہ کو حقیقت ثابتہ کے درجہ تک پہونچا دیا ہے۔

یہاں پر اتنا اور عرض کر دینا مناسب ہوگا کہ "تنگی" دل کو افلاس کی دل تنگی سے بھی منسوب کیا جا سکتا ہے یعنی اگر میں فقر و حاجت کی ناہمواریوں سے دو چار نہ بھی ہوتا تو زر اندوزی کی تمام وہ خوبصورت بلائیں مجھے چمٹ جاتیں جو پہلی مشکلات سے زیادہ تباہ کن اور خطرناک ہیں۔ بنا بریں قانون قدرت کا ہمیں رہینِ منت ہونا چاہیے کہ جس حالت میں اُس نے ہمیں رکھا ہے وہی بہتر اور کہیں بہتر تھا۔

(۲)

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

غالبؔ کے نزدیک قیدِ حیات اور بندِ غم دونوں حقیقت میں ایک ہیں اور یوں ہی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔ لیکن اگر عملی دنیا یا بالفاظِ دیگر سطحیت کو نظر انداز کیا جا سکے تو فلسفیانہ نقطۂ نگاہ سے کبھی دونوں کی اصل اور ماہیت کو متحد خیال نہیں کیا جا سکتا۔ حیات حقیقت وجودیہ ہے اور غم حقیقتِ عدمیہ، حیات ارتقا و تربیت کی ضامن ہے اور غم فنائیت و اعدام کا باعث۔ حیات اور اس کے مظاہر کائنات کی دلکشی اور نظر فریبی کے اجارہ دار ہیں اور غم اضافت کی پذیرائی کا دوسرا نام ہونے کی بنا پر احساس ذہنی اور حقیقتِ تصوریہ کے سوا کچھ نہیں بدیں غرض اصل میں دونوں ہم معنی ہونے کی حیثیت سے کبھی ایک سطح پر نہیں لائے جا سکتے۔ حیات کی فطرت میں ایک ایسی لطیف اور پاکیزہ ترین لذت و شیرینی مضمر ہے جسے کوئی طاقت اور کوئی کوشش حرفِ غلط کی مانند نہیں مٹا سکتی۔ حالاں کہ غم مُؤثراتِ خارجیہ کی اضافت کا نتیجہ ہوتے ہوئے اپنے انداز فنائیت و تعدیم کا امکان رکھتا ہے۔ اگر ہمارے تصورات، اور احساسات غم کی موہوم نسبت کا تاثر لینے سے انکار کر دیں تو غم ایک لمحہ بھی زندہ نہیں رہ سکتا اور دنیا غم کے ناپاک وجود اور اس کی تاریکیوں سے یکسر خالی ہو جائے گی۔ جن فلاسفہ نے رہبانیت اور ترک دنیا کا سبق دیا اس کی غرض و غایت بھی افنائے غم اور ابدی سکون و طمانیت تھی اور میں سمجھتا ہوں کہ اس تعلیم کے فلسفیانہ ہونے میں شک کرنا دنیائے علم و ادراک پر بدترین ظلم ہوگا۔ اسلام "رہبانیت" کے خلاف ہے اور قطعاً خلاف لیکن کیا اس بنا پر کہ "ترک ماسوٰی کا" نظریہ حیات اور اس کی نورانی شعاعوں کو سلب کر دیتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ وہ اس نظریہ کی صداقت سے انکار نہ کرتے ہوئے دنیائے انسانیت کو ایک ایسی علویت اور

خلفت سے دوچار کرانا چاہتا تھا جو بغیر رہبانیت کو ٹھکرائے حاصل نہیں ہوسکتی۔ موثرات کی زد سے محفوظ ہو کر یقیناً مسرت و ابتہاج کی جنت تیار کر لینا ممکن ہے مگر یہ اعتراف شکست اور ذلیل انفعال انسانیت کے شرف و علو کو ہمیشہ کے لئے خاک میں ملا دیتا جسے اسلامی تعلیمات کی سماویت گوارا نہیں کرسکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے کائنات کی ہر مختلف طاقت کے جواب دینے کے لئے "صبر جمیل" کا سبق پڑھایا۔ صبر جیسا کہ عام لوگوں کا اعتقاد ہے۔ مجبوری کا نام نہیں نہ عجز و پسپائی کا اعلان۔ بلکہ موثرات خارجیہ کی بے پناہ تلواروں کو زنگ آلود اور کند کر دینے والی سپر کا نام ہے اور ایسی سپر کا جو زہر آلود خنجر سے بھی زیادہ خوفناک ہو۔ دنیائے آب و خاک کی کوئی قوت صبر کا جواب نہ آج تک پیدا کرسکی نہ قیامت تک ممکن۔ صبر ہمارے جوش مبارزت کو بجائے کم کرنے کے "جمع قوت" اور شعلہ آشامی کی دعوت دیتا ہے۔ تاکہ کائنات مادی کے ہر قوی ترین دشمن اور حریف کا بہتر سے بہتر طریقہ پر مقابلہ کیا جاسکے۔

کیوں کہ صبر اور کسی تکلیف کو سہنے کے یہ معنی ہیں کہ آپ نے مخالف اثر نہ قبول کرنے کے لئے اپنے تمام قوائے نفسیہ اور روحانیہ کی بہترین استعانت حاصل کر لی ہے۔ جس کے بعد اذیت خواہ کسی نوعیت کے ساتھ کیوں نہ ہو آپ کے قوائے عمل کو مضمحل اور آلات کارکردگی کو بیکار نہیں کرسکتی۔ اور جب آپ کی قوتیں شل نہ ہوسکنے کے مرتبہ تک فائز ہوگئیں تو کیا قید حیات سے بند غم کے سلاسل قطع نہیں کئے جاسکتے؟ غلط اور کس قدر غلط۔ لہٰذا غالب کے نظریہ کو فلسفہ کے حدود میں داخل ہوسکنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

حقیقت یہ ہے کہ غم کے فطری، اہم اور حقیقت ثابتہ ہونے کے مغالطہ نے دنیا کی منفعل ذہنیت کو بالکل تباہ کر دیا۔ ورنہ اگر دنیا اس کا احساس پیدا کرسکتی کہ غم نہ فطری خاصہ ہے نہ سماوی طاقت اور نہ ہی اس میں کائنات کے دیگر حقائق و مکونات پر اثر انداز ہونے کی قابلیت تو شاید آج غالب مرحوم کو یہ نظریہ پیش کر کے عام ذہنیات کی غیر فلسفیانہ روش کا راز فاش نہ کرنا پڑتا۔ مگر نہیں دنیائے عمل ہمیشہ غالب کے نظریہ کی پرستش کرتی رہے گی چاہے کتنا ہی غلط اور کتنا ہی معنویت سے بیگانہ کیوں نہ ہو۔ یہاں اتنا اشارہ کر دینا ضروری ہوگا کہ جذبۂ غم سے میرا مقصد وہ غم نہیں جو حیات نو جذب کرنے کی استعداد اور اہلیت رکھتا ہو کیوں کہ وہ وجودی حقیقت ہونے کی بنا پر حیات اور اس کی حلاوتوں سے قریبی نسبت رکھتے ہوئے "بند غم" کی

ترکیب سے ادا نہیں ہو سکتا۔

متصوفین اسلام نے جس منفیت کی تعلیم دنیا میں پھیلائی وہ یہی ایجابی غم تھا۔ نہ کہ وہ سلبی غم جسے ڈاکٹر اقبال جیسا "شاعر فلسفی" ٹھکرانے اور پائمال کرنے کی جرأت کر سکے' یا جسے میں بھی غیر فطری اور انسانی عظمت و برتری کے منافی خیال کر رہا ہوں۔

ابو النظر رضوی

محسوسات

مضراب آرزو سے ذرا دل کو اور چھیڑ
کیوں مطرب اس رباب کو خاموش کر دیا
رگ ہائے ماہتاب نے ٹپکا کے خون ناب
آسودہ موجِ بادہ کو سر جوش کر دیا
آیا جو نیم ہوش میں مخمور چشم مست
پھر جرعۂ نگاہ سے مدہوش کر دیا
وابستہ میری یاد سے کچھ تلخیاں بھی تھیں
اچھا کیا جو مجھ کو فراموش کر دیا

لطیفی

وہ !!

دریائے حسن کا ہر قطرہ خود حسن کی شعاعوں کے ذریعہ قطرہ سے دریا اور دریا سے قطرہ بن کر حسن کی تمام رنگینیوں کو پیدا اور پنہاں کرتا ہے .... اگر شاعر کے دل پر حسن کی کیفیات لطیفہ طاری ہو کر ترجمان تنوعاتِ حسن ہو سکتی ہیں تو ایک صبح چمن کے چھوٹے سے ٹکڑے میں گلگشت کرتے ہوئے جو کچھ میں نے کہا ہے وہ بھی شاید کرشمہ آفرینی پر "ہائے" کے ساتھ نکلے ہوئے چند بول ہوں گے۔

(کیف مرادآبادی)

شرابِ ذوق خود بینی سے مخمور — سرِ محفل کبھی جلوہ نما ہیں
کبھی سو سو حجابوں میں ہیں مستور — خدا جانے وہ ان پردوں میں کیا ہیں

کبھی رونق دہِ بزمِ محبت — بہارِ انجمن ہیں انجمن میں
کبھی عشرت فزائے بزمِ عشرت — کہ جیسے پھول ہو کوئی چمن میں

وہ حسن جلوہ گستر کے کرشمے — فضا میں تھرتھرا اٹھتی ہیں جن سے
وہ جلوے آہ وہ رنگین جلوے — نگاہیں جگمگا اٹھتی ہیں جن سے

رخِ پرنور ہے مہرِ درخشاں — جبین ناز اک ٹکڑا ہے جس کا
وہ رخ پر اُن کے گیسوئے پریشاں — غضب کی مستیاں جن سے ہویدا

وہ نازِ حسن سے مخمور آنکھیں — فضا میں بجلیاں کوندا رہی ہیں

وہ کیفِ دلبری میں چُور آنکھیں — شرابِ بیخودی برسا رہی ہیں

تبسم ہے کہ ہے اک برقِ تمثال — لبِ لعلیں پہ موجیں نور کی ہیں

تکلم ہے کہ ہے اک سحرِ لرزاں — فضا میں مستیاں چھائی ہوئی ہیں

کبھی سو ناز سے جانوں کی جاں ہیں — کبھی خود ناز سے اپنے ہیں برہم

کبھی وہ بے نیازِ دو جہاں ہیں — عجب ہے اُن کی سرمستی کا عالم

جہاں چاہا وہاں پردہ اٹھا کر — جدھر چاہا اُدھر بجلی گرا دی

جسے چاہا اُسے جلوہ دکھا کر — مئے ذوقِ غمِ الفت پلا دی

انھیں جلوہ طرازی کی قسم ہے — مجھے اس خوابِ غفلت سے جگا دیں

اُنھیں اپنی تجلی کی قسم ہے — مرے دل پر بھی اک بجلی گرا دیں

(کیفؔ مرادآبادی)

شاعری

شاعری تمام فنون لطیفہ میں علویت اور روحانی کیف و سرور کے اعتبار سے بہترین اور لطیف ترین فن ہے اور حقیقی شاعری کا معیار صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ شعر کے پڑھنے سے طبیعت پر ایک چوٹ لگے اور جذبات برانگیختہ ہوں۔ جو شعر اس اصول پر موزوں نہیں کیا گیا وہ واقعتاً شعر نہیں صنائع لفظیہ ہیں جن کو نظم کر دیا گیا ہے۔ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر ہم شعر کو موسیقیا نہ تخیّل سے تعبیر کریں تو کسی طرح ناروا نہیں اس میں شک نہیں کہ صحیح ترین معنی کے تحت موسیقی کا اطلاق نہایت خوش گوار تناسب کے ساتھ آواز کے زیروبم کی اس ترتیب و ترکیب پر ہو سکتا ہے جس سے جذبات میں کبھی پستی اور کبھی بلندی کبھی سکون اور کبھی تلاطم، کبھی مسرّت اور کبھی الم کے جذبات رونما ہوتے ہیں۔ شعر چونکہ ایک تخیل ہے جو کسی تاثر، جذبہ یا کیف کی ترجمانی کرنے کے لئے اس کے ختم ہو چکنے کے بعد مناسب اور موزوں الفاظ میں ادا کیا گیا ہو اور چونکہ یہ تخیل جذبات کو موسیقی ہی کی طرح متلاطم کرنے کے قابل ہوتا ہے اس لئے ہم تخیل کو موسیقیت کے مفہوم سے ہم آہنگ دیکھنے کے لئے اپنے آپ کو قطعاً مجبور اور بالکل بجا طور پر مجبور پاتے ہیں۔

جو تعریف ہم شعر کی کر چکے ہیں اس کے لحاظ سے شعر کی علاوہ دیگر اقسام کے دو قسمیں ہو سکتی ہیں۔

(۱) جذبات

(۲) نازک خیالی

(۱) جذبات کی دو قسمیں ہیں۔

أ۔ جذبات نفسیہ یا ذاتیہ

ب۔ جذبات فطریہ یا کونیہ

أ۔ جذبات فطریہ یا کونیہ وہ جذبات ہیں جو مناظر قدرت یا نیچر کی گل کاریوں کے دیکھنے سے پیدا

ہوتے ہیں۔ حیات اجتماعی سے کوئی تعلق نہیں بلکہ فضا کی ترنم ریزی انھیں پیدا کرتی ہے۔

ایک حسین اور دلکش پھول جو فضائے صحرائی میں اپنی شیرینیت پراگندہ کر دینے کے لئے کھلتا اور کمھلا جاتا ہے ایک عامی کے لئے ممکن ہے چند لمحات کی اس نمائش سے زیادہ باوقعت نہ ہو جو اس شم و بصر کو محظوظ کرتی ہے لیکن شاعر کے لئے وہی پھول اس کی نفسی دنیا کو اسرار محبت اور حقائق معرفت میں گم کر دینے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ رنگین بدلیاں، روشن اور تاریک راتیں، چاند اور سورج، صبح شام گن گناتے چشمے، آسمان کے جھلملاتے تارے، نسیم سحر، خاموشی کا سناٹا، اور سمندر کا طوفان خیز شور اور اس ہی قسم کے دوسرے مناظر فطرت کے دیکھنے سے شاعر کے دل پر مختلف تاثرات جذبات اور کیفیات طاری ہو کر اس کی روح کو محظوظ کر دیتے ہیں۔ کبھی وہ ان مناظر سے اسباق حاصل کرتا ہے اور کبھی اُن سے پیدا ہونے والے تاثرات و جذبات کو الفاظ میں ادا کرتا ہے جو وہ جذبات انسانی کو برانگیختہ کرتے ہیں۔

چنانچہ جوش ستاروں کے کانپنے اور شعلہ کے تھرتھرانے سے یہ نتیجہ نکالتے ہوئے کہ باطن کے منوّر ہو جانے کا راز بیتابی اور اضطراب میں مضمر ہے یوں کہتا ہے ؎

تڑپ اے دل تڑپنے ہی سے باطن جگمگاتا ہے
ستارے کانپتے رہتے ہیں شعلہ تھرتھراتا ہے

ایک اور جگہ گل و خار کی بہم روئیدگی اور پھولوں کی نرمی سے سبق حاصل کرنے کے لئے کہتا ہے ؎

سبق نرمی کا اے گلشن سے کیا تو نے نہیں دیکھا
حکومت کر رہا ہے پھول کس عزّت سے خاروں پر

بعض اوقات ان ہی مناظر سے ایسے اثرات مرتب ہوتے ہیں جن کو الفاظ میں ادا نہیں کیا جا سکتا جن کے تحت جوش ایک اور جگہ یہ کہہ اٹھتا ہے ؎

نہیں معلوم کیا کیا دل میں نقشے کھینچ دیتا ہے
چمکنا سادگی سے چاند کا شفاف راتوں میں

دوسری جگہ بہار میں قوت نامیہ کی گلکاریوں کو دیکھ کر اپنی حیرت اور کوتاہئ ادراک کا یوں اعتراف

کرتا ہے ؎

تری قوت پہ ئے جوش نمو ادراک حیراں ہے
کہ ہر کانٹے پہ تونے روح دوڑادی گلستاں کی

یہی منقلب مناظر چاند اور ستارے اس کے ذہن کی رہنمائی صانعِ عالم کی طرف کرتے ہیں۔ اور اس کا یقین ہو جاتا ہے کہ یہ چیزیں تو منکرین کو بھی ایقان توحید پر مجبور کر دیں گی اور ایسی حالت میں اپنے خیالات کو وہ ان الفاظ کا جامہ پہناتا ہے: ؎

یہ نور یہ دھندلکا یہ چاند یہ ستارے
کافر بھی ہو جو کوئی ' اللہ کو پکارے

مسرت اور مناظر فطرت کی مسرت انگیزی ایک اضافی چیز ہے جب کبھی انسان کی طبیعت افسردہ اور غمگین ہوتی ہے تو وہ چیز جو اس کے لئے دل کشی رکھتی اور سامان مسرت بہم پہونچاتی تھی بھیانک بے رونق اور بجائے مسرت کے غم میں ڈوبی ہوئی نظر آتی ہے اس حقیقت کو واشگاف کرتے ہوئے کہتا ہے :۔

ہر چیز کائنات کی لبریز یاس ہے
دل کیا اداس ہے کہ زمانہ اداس ہے

شام کے آنے سے جو دن کی چہل پہل اور دنیا کے چرچے سکون میں تبدیل ہو کر ہماری توجہات کو اپنی طرف کھینچے اور مختلف قسم کے احساسات کو بیدار کرنے سے باز آکر سکون سے لطف اندوز ہونے کا موقعہ دیتے ہیں تو ایک طرف تو کائنات کے تمام تو ار عملیہ دن بھر کی مصروفیتوں کے بعد سکون کا مل چاہتے ہیں جسے شام مہیا کرتی ہے اور ادھر ہم دیکھتے ہیں کہ اس سکون کے ساتھ ہمارے جذبات پر بھی غم کی حلاوت سے ملا ہوا ایک سکون طاری ہوتا ہے لیکن اس سے پہلے کہ پوری طرح رات ہو پرند شام کے انتظار میں چیخ چیخ کر اس کی آمد کے انتظار میں اپنی بیتابی کا اظہار کر کے شور قیامت برپا کر دیتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز سکون حاصل کرنے کے لئے تیار ہے۔

تیری آمد دشت میں اے شام راحت خیز ہے تیرے سناٹے میں اک تسکین غم آمیز ہے

ذرہ ذرہ سے نمایاں ہے تمنائے سکون　　پتہ پتہ تشنگیٔ خواب سے لبریز ہے

گورِ غریباں کی رات کے بے شمع و گل بسر ہونے کے باعث قبروں پر جو یاس و حسرت برستی ہے اس سے متاثر ہو کر نسیم صبح کے ٹھنڈے خوش گوار جھونکوں کو اس ہی روشنی میں دیکھ کر اس اداسی پر سرد آہیں بھرنے سے تعبیر کرتے ہوئے کہتا ہے :-

نسیم صبح ٹھنڈی سانس بھرتی ہے مزاروں پر
اندھیرے منہ اداسی دیکھئے گورِ غریباں کی

زمانہ کی بے ثباتی اور دنیا میں رونما ہونے والے انقلابات ہماری زندگی پر نہ مٹنے والے نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔ آبادی اور رونق، بربادی، ویرانی اور بے رونقی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور بعض اوقات اتنے جلد دیکھتے دیکھتے نظارے بدل جاتے ہیں اور سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ تبدیلیاں کیوں کر واقع ہوئی ہیں اور جو چیزیں ابھی ہماری نظروں کے سامنے پھرتی تھیں انھیں زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا ایسے ایسے انقلابات دنیائے سبزہ و گل میں بھی بہت پیش آتے ہیں جو دنیا کی بے ثباتی کا نتیجہ اخذ کرنے کے لئے کافی ہیں جیسے :-

صبح کو جن پر رشک تھا سب کو جن کے ساتھ اک عالم تھا
شام کو جا کر دیکھتے کیا ہیں اُن کے گھر میں ماتم تھا

سبزہ پہ سحر کو شبنم تھی مصروف تھی بلبل نالوں میں
پھولوں پہ غضب کی نرمی تھی غنچوں پہ عجب اک عالم تھا

دنیا میں ہر پھول مرجھانے کے لئے کھلتا ہے اور ہر چاند ہلال ہو جانے کے لئے بدر ہوتا ہے ہر کمال زوال پذیر ہونے کے لئے بلند ہوتا ہے اور ہر پیدائش فنا کا پیش خیمہ ہے۔ ہر زندگی موت در کنار اور غور سے دیکھا جائے تو ہر مسرت غم در آغوش ہے جو اس ہی غم کے ہاتھوں تاراج کی جائے گی۔ ہر وہ سر جو سہرۂ عروسی سے آج مزین نظر آتا ہے ایک دن ضرور موت کے طفیل قبر میں پہنچ کر زمین کی شہوریت سے کاسۂ استخواں اور پھر ذرات میں تبدیل ہو کر رہیگا۔ دنیا کی خوشیوں میں بجائے جانے والے شادیانے یہ پتا دیتے ہیں کہ یہی مسرت سے لبریز نغمات سے گونجنے والی فضا ایک دن ضرور شور آہ و بکا سے منسوخ نظر آئے گی ان ہی محسوسات کو جوش

یوں ادا کرتا ہے ؎

سازِ شادی سُن کے ہوتی ہے پریشانی مجھے
ان سے آتی ہے صدائے مرثیہ خوانی مجھے

مناظرِ فطرت کے دیکھنے سے پیدا ہونے والے سرور کو تنہا جذب کرنا کچھ لطف نہیں دیتا۔ انسان تمنا کرتا ہے کہ جس سے میں بہت زیادہ محبت کرتا ہوں وہ بھی اس لطف میں آکر شامل ہوجاتا تو کیا اچھا ہوتا کہ یہ لطف میرے لئے اور بھی زیادہ شیریں ہوجاتا۔ محبوب کے وہاں موجود ہونے کی تمنا کو یوں ظاہر کرتا ہے۔

جنگل میں چاندنی ہے ہر پھول ہنس رہا ہے
اس وقت تم بھی ہوتے کیوں کر تمھیں بلائیں

ایک دوسرے موقعہ پر اس ہی تمنا کو ان الفاظ میں ادا کرتا ہے۔

چاندنی رات ہے سمندر ہے
ہائے اس وقت آپ بھی ہوتے

دنیا کی یہ بے ثباتی کہ وہ حسین جن کا کل ایک عالم دل دادہ تھا اور چاند سی صورت رکھتے تھے اپنی تمام رعنائی اور دل کشی کے باوجود موت کی خوں خواری سے نہ بچ سکے ان کا حسن بھی ان کو فنا کی بے روک مشین سے پس کر ریزہ ریزہ ہونے سے نہ بچا سکا۔ آج ان کے ذرات اس درجہ منتشر ہیں کہ ان کا خاک سے علیحدہ تصور تک نہیں کیا جاسکتا گویا جزو زمین ہوگئے ہیں لیکن یہ تمام باتیں انسان کو اُس بے نیاز خالقِ موت وحیات کا پتہ دینے کے لئے ناکافی ہیں۔ جس کی قدرت کے کرشموں سے یہ تمام باتیں عمل میں آرہی ہیں نہیں نہیں یہ غفلت ہے جو ہمیں اس طرف متوجہ نہیں ہونے دیتی۔ جس کو جوشؔ اس طرح ادا کرتا ہے ؎

چاند کے ٹکڑے جنھیں کہتے تھے لوگ
خاک کے پیوند ہیں وہ مہ لقا
پھر بھی میں تجھ کو نہیں پہچانتا

کوئی اور شاعر گورستان کی بیکسی کا نقشہ کچھ ایسے انداز سے کھینچتا ہے کہ واقعی آنکھوں کے سامنے

تصویر پھر جاتی ہے ؎

خشک گُل پژمردہ سبزہ شمع چپ بالیں اداس
دل بھر آیا حالتِ گورِ غریباں دیکھ کر

مست صفی پوری کا یہ شعر جس میں دل دردناک کی تصویر کھینچ گئی ہے یہ بتاتا ہے کہ کیوں کر بعض مناسبات کے تسلسلِ خیال کی بنا پر ایک چیز کے دیکھنے سے کسی واقعہ یا چیز کی یاد تازہ ہوتی ہے ؎

وہ دل صد پارہ جو تھا مدفنِ صد آرزو
آج پھر یاد آگیا گورِ غریباں دیکھ کر

(ب) جذبات نفسیہ یا ذاتیہ وہ جذبات رنج والم اور مسرت وبہجت ہیں جو روزانہ زندگی میں پیش آتے ہیں اور حیات اجتماعی انھیں بیدار کرتی ہے۔

قومی یا سیاسی شاعری بھی جذبات نفسیہ کی شاعری کے تحت آجاتی ہے کیوں کہ یہ بھی اُن ہی جذبات کو اُبھارتی ہے جو حیات اجتماعیہ انسانیہ کی بنا پر لوگوں کے دلوں میں پیدا کر دیتے ہیں اس کی مثال پیش کرنے کے لئے ہم اپنی یاد سے اقبال کے دو تین شعر لکھتے ہیں۔

جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں
غلامی ہے اسیر امتیاز ما و تو رہنا

نہ رہ اپنوں سے بے پروا اسی میں خیر ہے تیری
اگر منظور ہے دنیا میں او بیگانہ خو رہنا

شراب روح پرور ہے محبت نوع انساں کی
سکھایا اس نے مجھ کو مست بے جام وسبو رہنا

ایک انسان کی ہم نشینی سے پیدا ہونے والی مسرت تو کیا غم بھی بزم فطرت سے عمر بھر جذب کی جانے والی مسرتوں کو ان کے ہزار گنے سرور کے باوجود بلا تامل قربان کیا جا سکتا ہے کیوں کہ وہ جذبات جو انسان کی محبت سے نتیجتاً پیدا ہوتے ہیں مناظر فطرت سے پیدا ہونے والے جذبات کی صد ہزار گنی شیرینیت کے مقابلہ میں بھی زیادہ مائل علویت اور جاذب فطرت انسانیہ ہوتے ہیں ۔ اس حقیقت کو جوش کا یہ شعر واشگاف کرتا ہے :۔

رخ مہر درخشاں میں نہ مہ میں مسکراتی ہے
خوشی بہتے ہوئے اشکوں کی تہ میں مسکراتی ہے

محبت فطرت انسانی میں ازل سے ودیعت کی گئی ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اس حسن کو جو اُس کے لئے جاذب نظر ہو سکے اپنے جذبات کا مرکز قرار دے کر تمام زندگی اس کی پرستش میں بسر کر دینے کو مقصد حیات جانے جس کے بغیر اگر مادیت نے جذبات کی پاکیزگی اور لطافت کو کثافت میں تبدیل نہ کر دیا ہو تو کوئی انسان زندہ نہیں رہ سکتا ۔ اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے محبت ہی انسان کا مقصد حیات ہے جس کے حاصل ہو جانے سے محسوس ہوتا ہے کہ انسانی زندگی کے مختلف پہلو جو اس قدر دل کش اور پرکیف ہیں اس کی وجہ محبت ہی ہے گویا محبت کرنے کا نام زندگی ہے ۔ امیں رضوی کا یہ شعر ان ہی محسوسات کا حامل ہے

زندگی نام ہے محبت کا
اپنے مقصد میں کامیاب ہوں میں

جب محبت میں شغف پیدا ہو جاتا ہے تو ہر وقت محبوب ہی کے خیال میں محو رہنے کو دل چاہتا ہے اور اگر خیال کسی مرکز پر قائم ہو جائے پھر محبوب کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے ۔ چاند میں ایک دل کشی ہے اور تسلسل خیال کے نفسیاتی اصول کے تحت چاند کے دیکھنے سے محبوب کے حسین چہرہ کا عکس پیش نظر ہو جاتا ہے چوں کہ عاشق کی تمام رات محبوب کے نام کی تسبیح کرتے بسر ہو جاتی ہے اس ہی روشنی میں وہ آسمان کے ستاروں کے جھلملانے کو دیکھ کر اس بات سے تعبیر کرتا ہے کہ یہ ستارے بھی اس کے ساتھ اس کے محبوب کا نام ساری رات لیتے رہے

سحر تک چاند میرے سامنے رکھتا ہے عکس ان کا
ستارے شب کو میرے ساتھ اُن کا نام لیتے ہیں

یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جب انسان بہت زیادہ مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے تو اکثر خاموش رہتا ہے لیکن جب کوئی ہمدردی سے اس کا حال دریافت کرتا ہے تو اس کی ہمدردی کو دیکھ کر اس کا دل بھر آتا ہے اور بے اختیار ہو کر رونے کو جی چاہتا ہے اس جذبہ کو جوش نے اس طرح ادا کیا ہے

آتا ہے مجھ کو کیا کیا بے اختیار رونا
جب کوئی پوچھتا ہے کیا تجھ کو ہو گیا ہے

محبت میں محبوب کی ذات سے وابستہ تمنائیں پوری نہ ہونے پر انتہائی تکلیف کو اس وجہ سے پہلے پہلے مقصود ضمنی کی حیثیت دی جاتی ہے کہ ممکن ہے اس احساسی تکلیف سے محبوب کے دل پر اثر ہو جائے اور وہ گوشۂ چشمِ التفات مبذول کرے لیکن کچھ عرصہ گذرنے پر یہ فریب آرزو بھی آشکارا ہو جاتا ہے اور محبت کی اس خو دہر سہم خلش میں لطف آنے لگتا ہے اور یہ احساسی تکلیف مقصود اصلی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور عاشق اس کے اثر یا بے اثری سے بے نیاز ہو جاتا ہے گویا محبت اور محبت سے پیدا ہونے والی احساسی تکلیف سے محبت ہو جاتی ہے۔ اس کو جگرؔ ان الفاظ میں ادا کرتا ہے سہ

مسرور ہوں کیفیت دردِ جگری سے
اب کام اثر سے ہے نہ اب بے اثری سے

جذباتی اشعار کے بعد اُن اشعار کو بھی جگہ دی جا سکتی ہے جن میں کوئی نازک خیالی ہو کیوں کہ اس سے بھی طبیعت پر اثرات مرتب ہوتے ہیں مثلاً سہ

بہ میزانِ نظر حسن ترا با ماہ سنجیدم — میان این و آن فرق از زمیں تا آسماں دیدم

لیکن چوں کہ نازک خیالی کے اشعار خاص طور پر نتائج خیز ثابت نہیں ہوتے اس لئے اُن کو نظر انداز کرتے ہیں۔

سید مختار

ٹوٹا ہوا دل

ستارے ڈھونڈھتے پھرتے ہیں جلوے میری عظمت کے
جبیں کہکشاں کرتی ہے سجدے میری عظمت کے
فرشتے عرش پہ گاتے ہیں نغمے میری عظمت کے
وفاداری کی موجیں جس کو بوسے دیں وہ ساحل ہوں
میں اک ٹوٹا ہوا دل ہوں

(۲)

حقیقت — اور محبت کی حقیقت ہیں مرے نغمے
بشارت — اور محبت کی بشارت ہیں مرے نغمے
محبت — اور تقدیس محبت ہیں مرے نغمے
زبورِ حق ہوں پیغامِ شکستِ سازِ باطل ہوں
میں اک ٹوٹا ہوا دل ہوں

(۳)

مری تمکین میں ہیں عشق کی گہرائیاں — پنہاں
مری تخئیل میں ہیں حسن کی شادابیاں — پنہاں
مرے ہر خواب میں ہیں خلد کی رنگینیاں — پنہاں
ہے جس کی لیلیٔ فطرت بھی سودائی وہ محمل ہوں
میں اک ٹوٹا ہوا دل ہوں

(۴)

بہارستاں — مرے اک قطرۂ خونی کے بھوکے ہیں
سرودستاں — مرے اک نغمۂ رنگیں کے بھوکے ہیں

یہ نظارے مرے اک جلوۂ زریں کے بھوکے ہیں!
حبیبِ رنگ و بوئے گل ہوں محبوبِ عنادل ہوں
میں اک ٹوٹا ہوا دل ہوں

(۵)

یہ مستِ جلوہ فطرت ——— ایک رنگیں ساقیہ میری!
ستارے زمزمے ہیں کہکشاں ہے مطربہ میری!
یہ بزمِ نور اک جلوہ گر آراستہ ——— میری!
یہ سب آرائشیں میری ہیں میں خود اہلِ محفل ہوں
میں اک ٹوٹا ہوا دل ہوں

(۶)

مری بیتابیاں ——— ہیں انتشارِ محفلِ ہستی
مری تسکین ——— پیغامِ بہارِ محفلِ ہستی
مرا ہر ذرّہ ہے آئینہ دارِ محفلِ ہستی
میں ہر پردے میں پنہاں ہوں میں ہر منظر میں شامل ہوں
میں اک ٹوٹا ہوا دل ہوں

(۷)

میں وہ چشمہ ہوں جس سے "پریت" کی نہریں ہوئیں پیدا
میں وہ شعلہ ہوں جس سے "پریم" کی لپٹیں ہوئیں پیدا
میں وہ دنیا ہوں جس سے حُسن کی کرنیں ہوئیں پیدا
کہیں آغازِ منزل ہوں کہیں انجامِ منزل ہوں
میں اک ٹوٹا ہوا دل ہوں

روشؔ صدیقی (فطرت نگار)

علی گڈھ سے شاندار پسپائی

واپسی کی بے شمار اقسام سے ایک قسم "پسپائی" بھی ہے پھر پسپائی کی بھی بے اندازہ قسمیں ہیں۔ ایک قسم "شاندار پسپائی" ہے اور اسی کو "انگریزی پسپائی" بھی کہتے ہیں۔ اور کہتے ہی نہیں۔ بلکہ جنگ یورپ میں لوگوں نے اس پسپائی کو اخبارات میں بھی دیکھا ہے اور سمجھ بھی لیا ہے" اپنے یہاں کے لوگ اس پسپائی کو "واپسی" "پشت دکھانا" "منہ پھیرجانا" "بھاگ جانا" "بھاگ کھڑا ہونا" "چلدینا" "چمپت ہونا" اور "فرار" بھی کہتے ہیں۔

اب ملاحظہ فرمائیے کہ علی گڑھ سے گھر تک واپس آنے میں ہمارے اندر کونسی قسم پائی جاتی ہے؟۔

۸ دسمبر ۱۹۴۲ء کو علی گڑھ کالج کے سالانہ مشاعرہ میں شرکت کو گئے تھے کل شب کو کالج میں وہ مشاعرہ ہے جس میں ہندوستان کے نامور شعرا و ادبار جمع ہونے والے ہیں۔ ہمیں بھی "لکچر تیار کرنا ہے"۔ علی گڈھ کی کوتوالی تک یہ اطلاع پہنچ چکی ہے کہ "ملا رموزی صاحب کا لکچر بھی ہوگا" اس لیے پولیس بھی تیاری میں مصروف ہے۔ دہلی سے توپخانہ بلائے جانے اور "مارشل لا" کی اجازت بھی طلب ہوگئی ہے۔ کارخانوں کے مزدور بھی "ہڑتال" پر آمادہ ہو چکے ہیں۔ شعرا ہیں کہ اپنی اپنی غزلیں اصلاح و مشورہ کے لیے لیے پھر رہے ہیں۔ شعرا کی حجامت بھی بن رہی ہے۔ لیونڈر اور تیل سے سر کے بال سنوارے جا رہے ہیں۔ آنکھوں کے چشمے صاف ہو رہے ہیں۔ پروفیسر لوگ ایک سوٹ اٹھاتے ہیں ایک رکھتے ہیں۔ "مشاعرہ گاہ" اور نہیں تو "یونین جیک" ہی سے سجائی جا رہی ہے۔ غرض پورا علی گڑھ تیار ہو رہا ہے اس لیے ہم بھی دوستوں کے بیچ میں بیٹھ کر "لیکچر لکھنے میں مصروف ہوگئے"۔ دوست تو "سو سا گئے"۔ مگر ہم نے کوئی نصف لیکچر تیار کر لیا جس میں رات کا کوئی ایک بج گیا۔ تو نواب زادہ کپتان محمد رشید الظفر خاں صاحب (بھوپال) کا خادم آیا اور کہا "کیا کھانا بالکل ہی نہ کھائیےگا" ہم نے کہا "ہاں احتیاطاً آج ناغہ کریں گے۔ اگر دودھ ہو تو پلا دو" غریب نے ایک گلاس دودھ دیا۔ پیا۔ اور سو گئے کوئی ایک ہی گھنٹہ گذرا تھا کہ پیٹ میں درد محسوس ہوا اس کی اذیت سے خدا دشمن کو بھی محفوظ

رکھے ۔ یہ جب تک رہتا ہے "ارے ہائے رے مار ڈالا" کے نعرے لگانا پڑتے ہیں ۔ اور اچھا ہو جانے کے بعد آٹھ دن تک فاقے کرائے جاتے ہیں ۔ گویا ہمارے لئے ڈاکٹروں اور طب یونانی نے بس اسی قدر ترقی کی ہے کہ یہ مرض نہیں جا سکا ۔ اُٹھے اور صندوق سے دوائیں نکال کر کھائیں مگر کچھ نہ ہوا ۔ لگے ٹہلنے پھر نصف گھنٹے کے بعد دوا کھائی مگر کچھ نہوا ۔ تو پھر نصف گھنٹے تک ٹہلتے رہے ۔ مگر کچھ نہ ہوا تو اب دوا سے بھی مایوس ہو گئے ۔ گھڑی بھی پاس نہ تھی کہ وقت معلوم کرتے پاس ہی نواب زادے صاحب کے بھائی میاں منصور علی خاں صاحب سو رہے تھے اس لیے اُن کی گراں خوابی کے ڈر سے "ارے ہائے رے" کا نعرہ بھی نہ لگا سکے ۔ اس لیے دو بجے شب سے صبح کے سات بجے تک جس طرح ضبط و خموشی سے کام لیا خدا ہی جانتا ہے یا ہم ۔ بس ہر لحظہ وہ یاد آ رہی تھیں ۔ اب جو صبح ہوئی تو احباب بیدار ہوئے اور علاج سے پہلے سوالات شروع ہوئے جن میں سے ہر ایک کا تفصیلی جواب دینا درد کی حالت میں بھی ہمارا فرض قرار دیا گیا ۔ "ایک بولے"

ارے کیوں ملا صاحب ؟

دوسرے بولے ۔ افوہ تو کب سے شروع ہوا ؟

تیسرے بولے ۔ تو کیا اس سے پہلے بھی ہوا تھا ؟

چوتھے بولے ۔ اماں تم بھی اتنے سے درد سے مرے جا رہے ہو !

پانچویں بولے ۔ تو کیا ہوا ۔ اب حضور نواب زادے کے لیے ڈاکٹر آئے گا تو تمہیں بھی دکھا دیں گے ۔

گویا براہ راست ہمارے لیے ڈاکٹر کا بلانا تو ضروری تھا ہی نہیں ۔

چھٹے بولے ۔ کیوں کیا ہوا ؟

ساتویں بولے ۔ ارے لاحول ولا تو تم نے مجھے کیوں نہیں اُٹھا دیا ۔

آٹھویں بولے ۔ تو کیا دوا لائیں ؟

نویں بولے ۔ تو کس طرف ہے دیکھوں ؟

اشارہ سے بتانے پر انھیں تسکین نہوئی تو تمام لحاف اٹھا کر انھیں درد کا موقع دکھایا گیا ۔ علاج صرف یہ کیا کہ "افسوس" کہکر خموش بیٹھ گئے ۔

دسویں بولے۔ لاؤ بھائی ہاتھ پاؤں دبا دوں!

دل تو یہی چاہتا تھا مگر غیروں پر حکومت کرنے سے فطرت روکتی ہے۔ اس لیے کہدیا بدجی نہیں آپ کی مہربانی ہے بس دعا کیجئے"

اس کے بعد سخت لرزہ شروع ہوا تو عزیزم حامد صاحب نے بکمال ہمدردی اور شفقت ہمیں دبائے رکھا۔ اور بیچارے پاؤں دبانے لگے۔ مگر انھیں بھی شکریہ کے ساتھ روکنا پڑا۔ اب پورے جسم کو درد ہی نے کیا ہزاروں دردوں نے جکڑ لیا لرزہ کی وہ شدت تھی کہ "موٹر سائیکل کا انجن چل رہا تھا" جس سے جسم کا ہر حصہ کانپ رہا تھا۔ برادر گرامی میاں منصور علی خاں کی شفقت کے قربان جائیے۔ آپ پر ہماری تکلیف کا سب سے زیادہ اثر تھا۔ ہر فکر اور ہر تدبیر کے لیئے تیار اور بے چین سے ہو رہے تھے۔ مگر یہی وہ موقع تھا جب "خدائے رحیم و رحمان اور انسان ضعیف" کی قوتوں کا امتحان ہو رہا تھا۔ اور انسانی تدبیر کی ہر بلند سے بلند قوت خدائی قوت سے شکست کھا رہی تھی۔ اور ہمیں ایک پل کو چین نہ آتا تھا۔ اس وقت ہمارے اوپر دو قسم کی تکلیف تھی۔ ایک درد کی دوسرے اُس تصور کی کہ "یہ سب کچھ نتیجہ ہے خدا سے سرتابی اور سرکشی اور اُس کے احکام و فرائض سے بے خبری و بے اعتنائی کا" اس لیئے کس قدر مبارک و مسعود ہیں وہ جو خدائے عرش و فرش کی غلامی کی ہر شرط بجا لانے میں تیار و مستعد رہتے ہیں۔ اور ایسے ہی ہوا کرتے ہیں جن کا دل و دماغ گناہ کی ملامت آفریں اذیت سے محفوظ رہتا ہے اور اسی اندیشہ سے اس وقت ہم "بڑی فرمانبرداری"، سے "ارے اللہ"، "ارے اللہ" کے سوا کچھ منہ سے نہیں کہہ رہے تھے۔ کہ

گیارھویں بولے۔ اماں تم تو دم ہی چھوڑے دیتے ہو آخر ڈاکٹر صاحب آتو رہے ہیں۔

بارہویں بولے۔ لاؤ لاؤ ہم سر دبائے دیتے ہیں۔

تیرہویں بولے۔ اچھا کچھ کھاتے ہو؟ چائے تو پی لو۔

چودھویں بولے۔ یہ درد تو میرے بھی ہوا تھا واقعی بڑا موذی درد ہوتا ہے سنو تو ملا تم تو ایک پیٹی بنوا لو اُسے ہر وقت کمر سے باندھے رہا کرو۔ یہ درد اکثر پاؤں کے اونچا نیچا پڑ جانے سے ہوتا ہے۔

پندرھویں بولے۔ کیوں بھائی کیا ہوا؟ اچھا درد ہے۔ اماں نہیں یار کیوں جھوٹ بول رہے ہو واللہ درد ہی۔ ارے

توبہ واللہ میں تو سمجھا مذاق کررہے ہو اسی لیے تو میں نہ آیا اچھا اچھا بھیا تو بیٹھے رہو۔

سولھویں بولے۔ افسوس بیچارے ملا پر اور مصیبتیں کیا کم ہیں جو یہ درد بھی کمبخت پیدا ہوگیا۔

سترھویں بولے (اور بڑی مہربانی سے بولے) لو یہ گرم پانی کی تھیلی ہے اس سے سینک لو ابھی درد جاتا رہے گا۔

اٹھارھویں بولے۔ آگ لاؤں۔

انیسویں بولے۔ اچھا۔ اچھا رات کو جو دودھ پیا تھا اُسی سے ہوا ہے۔

بیسویں بولے۔ یار آج تو تمہارا لیکچر تھا۔ تو کیا اب لیکچر نہ دو گے۔

اکیسویں بولے۔ ماشاء اللہ کیا اندھے ہوگئے ہو۔ وہ تو غریب جان سے جارہا ہے آپ کو لیکچر ہی کی فکر ہے۔

بائیسویں بولے۔ بھائی ملا تم تو دس بارہ ڈنڈ کرلو ابھی جاتا رہے گا۔

تیئیسویں بولے۔ گھبراتے کیوں ہو۔ ایسا تو ہو ہی جاتا ہے۔

تو گویا آدمی کسی تندرستی کی حالت میں گھبراتا ہے۔

غرض احباب تو تھے کل دس بارہ مگر بولنے میں یہ سب کے سب کوئی سوا سو آدمیوں کا کام دے رہے تھے۔ مگر ان تمام ہمدردیوں پر ہمیں اگر کوئی یاد آتا تھا۔ تو وہ قبلۂ دو جہاں والدۂ محترمہ مدظلہا اور پھر اپنے "ننھے میاں کی والدہ" کہ ایسے اوقات میں یہی دو ہستیاں قلبی اطمینان اور روحانی تسکین کا سبب ہوتی ہیں اس لیے ہم جب بولتے تھے تو صرف یہ کہ

"وطن جانے دو"

مگر ہمارا یہی مطالبہ احباب کو بیحد و بے نہایت ناگوار تھا۔ اس پر ہزاروں ڈاکٹری مشورے دیئے جاتے تھے کوئی راستہ کی تکالیف سے ڈراتا تھا، کوئی سردی کے جلنے سے۔ کوئی نمونیہ سے تو کوئی فالج سے کوئی بخار میں ہوا لگ جانے سے تو کوئی درد میں اضافے سے۔ خدا خدا کرکے کوئی سوا آٹھ بجے حضور نواب زادہ بہادر کے ڈاکٹر صاحب تشریف لائے اور موصوف نے ازراہ نوازش اُنھیں پہلے ہمارے ہی پاس بھیجا۔ ڈاکٹروں کے عام خصائص کے خلاف ڈاکٹر صاحب نے بڑی مہربانی اور توجہ سے ہمارے درد کو ٹٹولا۔ کیونکہ درد نظر نہیں آتا ہے پھر نسخہ تجویز فرمایا۔ اور اپنی دوا کے اطمینان پر یا محض "ڈاکٹری ضابطے سے" فرمایا ابھی ابھی جاتا ہے۔ اور دیر تک تشفی فرماتے رہے۔

ڈاکٹر صاحب کی دوا آنے سے پہلے ہی الحمد للہ درد تو چلا گیا مگر بخار رہ گیا جس نے دن بھر چارپائی سے اترنے کی اجازت نہیں دی۔ بس یوں پڑے رہے۔ گویا کسی لاوارث کا صندوق کسی ریلوے پلیٹ فارم پر ڈال دیا گیا ہو۔ کبھی آواز دیتے تو حضور نواب زادے بہادر کے ایک چھوٹا سا رخادم خصوصاً میاں سعادت جلد حاضر ہو جاتے اور کبھی آواز دیتے تو کوئی پاس بھی نہ پھٹکتا اس عرصہ میں ہم برابر کوشش کرتے رہے کہ ہمیں وطن جانے کی اجازت ہوئے۔ مگر احباب یہ سنکر فوراً اپنی "ڈاکٹری" شروع کر دیتے تھے اور ہمیں چار و ناچار خوش ہونا پڑتا تھا۔ اس لئے مناسب یہی سمجھا کہ چپ رہو اور جب موقع پاؤ تو چلدو۔ شام ہی سے مشاعرہ کی تیاریاں شروع ہونے لگیں کوئی سوٹ بدلتا تھا۔ تو کوئی غسل فرماتا۔ کوئی شیو کرتا تو کوئی جسٹر پہنتا۔ موٹر پر موٹر آنے لگا۔ تو ہم نے بھی آہستہ سے کہا کہ ہم بھی مشاعرہ میں چلیں گے۔ الحمد للہ طبیعت اچھی ہے۔ سب کے سب ہی تو بول پڑے کہ "ضرور ضرور"

یہ ضرور ضرور اس توقع پر تھا کہ ملا صاحب کا لیکچر سننے میں آئے گا۔

میاں منصور علی خاں نے فرمایا۔ ملا صاحب آپ تو میری موٹر میں چلئے۔ میں بہت آہستہ آہستہ چلوں گا، ہم حضور نواب زادہ بہادر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مع سحاف کے حاضر ہوئے تو ممدوح نے ازراہ غایت ہمدردی فرمایا

"آپ مشاعرہ میں نہ جائیے گا کیونکہ آپ کی طبیعت اچھی نہیں اور سردی بہت ہے"

مگر ہم نے فائدہ اسی میں دیکھا تھا۔ کہ مشاعرہ سے فرار آسان ہے۔ اس لئے مشاعرہ میں گئے۔ یہاں سے مشاعرہ کی روداد معلوم کرنا ہو تو یونیورسٹی پریس علی گڑھ سے ۱۹۲۳ء کے مشاعرہ کی روداد یوں طلب فرمائیے کہ "بخدمت شریف مولینا باہتمام محمد مقتدیٰ خاں شروانی علی گڑھ"

مشاعرہ میں کوئی دو گھنٹہ بیٹھکر ہم اس بہانے سے اٹھے۔ جس بہانے سے بڑے بڑے مہذب لوگ جلسہ سے اٹھکر باہر جا کر چائیاں لے آتے ہیں یا سگریٹ پی آتے ہیں۔ باہر آتے ہی دیکھا تو موٹر کا ڈرائیور خود "مشاعرہ" بنا ہوا تھا۔ اس کی غیر حاضری کو غنیمت ہی جانا اور فوراً تانگہ والے کو آواز دی اور تانگہ آگیا۔

اب یہاں سے علی گڑھ کے تانگے کی "کارگزاریاں" معلوم کیجیے۔ صوبجات متحدہ میں جو تانگے چلتے ہیں اُن کی دو قسمیں ہیں۔ قسم اول وہ تانگہ جس میں "خاصی انسانیت" سے تین آدمی یوں سوار ہوتے ہیں کہ ایک آگے اور دو پیچھے۔ قسم دوم وہ تانگہ جسے عرف عام میں "اکا" کہتے ہیں۔ یہ اکا کسی غریب آدمی کے اُس "محرمی تعزیہ" کی شکل کا ہوتا ہے جو افلاس کے باعث بڑے تعزیوں کے مقابل بنایا جاتا ہے۔ آپ یوں سمجھ لیجیے گویا دو پہیوں کے اوپر چھوٹا سا گنبد اُٹھا کر رکھ دیا گیا ہو۔ اور بس۔ اس گنبد نما اکے سے اصل میں صوبجات متحدہ کے باشندوں کی "پست ذہنیت" اور۔ ان کی "کسی قدر جہالت" کا یوں اندازہ ہو سکتا ہے کہ گو اُن کے بے شمار تعلیم یافتہ اور بے قیاس وہ افراد جو ایم۔ اے، او۔ پی، ایچ۔ ڈی، ہو کر صوبجات متحدہ کی "میونسپلیٹوں" میں داخل ہو چکے ہیں مگر اُن میں سے کسی ایک کو اب تک ان "اکوں" کی ہیئت ترکیبی بدلوانے کا احساس نہیں۔ اور یہ غدر سنہ ۵۷ء والے اکے برابر زندہ ہیں۔ اور یوں زندہ ہیں کہ بیشمار بھلے مانسوں کو آئے دن ذلیل کرتے ہیں۔ مگر کوئی نہیں جو اُن کی طرف متوجہ ہو۔ مثلاً اس اکے پر سوار ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ بجائے کسی "زینہ" کے اس کے پہیے پر پاؤں رکھ کر سوار ہوتے ہیں اگر پہیے پہ پاؤں رکھتے ہی گھوڑا کوئی خفیف سی حرکت بھی کر گذرے تو پہیہ فوراً گھوم جاتا ہے۔ اور پاؤں رکھنے والا سوار یا دھڑام سے سڑک پر گرتا ہے۔ یا گرتا نہیں تو اُس کا پاؤں زور سے جھٹکا کھاتا ہے۔ اور اس جھٹکے سے اُس کا سر اکے کی لکڑی سے لگ کر دو یا چار یا آٹھ ٹکڑے ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اب جو سوار ہو جائیے تو نشست کی ترکیب یوں ہوتی ہے گویا کسی کو بہت سخت جاڑا محسوس ہو رہا ہے۔ اور وہ اپنے گھٹنوں کو سر سے لگائے گول مول بیٹھا ہوا ہے۔ یا پھر یہ ہوتا ہے کہ اپنے دونوں پاؤں کو اکے سے اس طرح باہر رکھا جاتا ہے کہ اُن کے جمانے کے لیے کوئی زینہ یا روک نہیں ہوتی۔ بلکہ پاؤں پہیے کے اوپر معلق رہتے ہیں جن سے نہ فقط سخت درد پیدا ہوتا ہے بلکہ مزا اُس وقت آتا ہے جب کسی تنگ راستہ سے ایک اکا یا تانگہ مقابل سے گزرتا ہے تو دونوں اکوں کے سوار اپنی اپنی ٹانگیں آسمان کی طرف بلند کر کے ایک دوسرے کی ٹکر یا رگڑ سے محفوظ ہوتے ہیں۔ یہ "ٹانگ اُٹھا" منظر نہایت پر لطف ہوتا ہے جس میں مہذب سے مہذب اور اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم یافتہ اشخاص نہایت بے تکلفی سے اس حرکت کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ان کے بعد اس اکے میں چونکہ کمانیں نہیں ہوتیں اس لیے اس میں سوار ہو جانے کے بعد جسمانی نظام کا ایک ایک پرزہ یوں ہل جاتا ہے کہ آدمی اکے سے اتر کر چارپائی کے قابل

ہوجاتا ہے اگر اس اکے کا گھوڑا "برق رفتار" ہو، تب تو اعضا جسمانی کا خاصہ مسہل ہوجاتا ہے اس اکے کے وہ ڈنڈے جو اس کی گنبد نما چھت کو قایم رکھتے ہیں سوار کے منہ اور پیٹ کی وہ تواضع کرتے ہیں کہ پھر اسے ہاتھ پاؤں دبانے کے لیے کسی خادم کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ لیکن ان اعضا شکن اکوں کی اس لغو و نقصان رساں ترکیب اور ساخت سے اس وقت تک باشندوں کا بیزار ہونا اور صوبجات متحدہ کی میونسپل جماعتوں کا متوجہ ہونا اصل میں باشندگان صوبجات متحدہ کی ذہنی پستی، بے حسی، قدامت پسندی، اور بد ذوقی کا نہایت صاف اور ناقابل رد ثبوت ہے۔ کہا یوں جاتا ہے کہ اکے غریبوں کے لیے ہیں اور تانگے امیروں کے لیے، مگر یہاں سوال غربت اور ثروت کا نہیں۔ بلکہ سوال "آرام" کا ہے مانا کہ اکے کم دام لیتے ہیں مگر ان کم داموں کا ۹۵ فیصدی یہ نفع بھی تو ہے کہ سوار "شفاخانہ پہنچانے کے قابل ہوجاتا ہے" پھر وہ "کم دام بہتر یا زندگی؟" اسی طرح یہ دلیل بے شمار لغویوں سے لبریز ہے مثلاً کیا صرف ایک گنبد نما اکے ہی پر ساری کفایت شعاری منحصر ہوچکی ہے؟ اگر ایسا ہی تھا تو پھر ہندوستانیوں میں۔ موٹر، سائیکل، بگھی، تانگے، ٹراموے، کا اضافہ بھی فضول خرچی ہے مگر ان کا کوئی انسداد نہیں۔ اور پھر وہ کتنے ہیں جو ان اکوں میں محض کفایت شعاری کے خیال سے سوار ہوتے ہیں؟ اور اگر کفایت ہی ہے تو "سوال تو اس کی ساخت اور خطرناک وضع کا ہے" اس ترکیب کو اگر تانگوں کی شکل میں بدل دیا جائے تو کہاں کا اسراف ہوگا۔ بس اصل یہ ہے کہ ہندوستانیوں میں ابھی مکمل بیداری اور خوش ذوقی نہیں۔ اس لیے وہ تانگوں اور اکوں میں کوئی فرق محض اس لئے محسوس نہیں کرتے کہ آباؤ اجداد ہی کی گود سے ان رسوم و عادات سے مانوس ہیں۔ مگر ہم "سائمن کمیشن" سے کہے دیتے ہیں کہ وہ ان اکوں میں خوشی خوشی سوار ہونے والوں کی پست ذہنیت پر انھیں ہرگز ہرگز سوراج دینے کی سفارش نہ کریں۔ بارے اس قسم کا اکا ہمارے بلانے پر آگیا تو ہم چاروناچار شب کے دس بجے اس میں میرس ہال سے سوار ہوئے اور نواب ادے بہادر کی کوٹھی کو روانہ ہوئے۔ اس وقت ہمیں دہرہ دون کے فاقے اور بخار کا بے حد ضعف تھا۔ اور ایک طویل سفر سامنے۔ اس لئے ضرورت تھی کہ یہ اکا "برق رفتار ہوجائے"، مگر ہمارے اس "اڑن کھٹولے" کا یہ حال تھا جیسے کوئی سوا سو برس کا بوڑھا کسی دیوار کے سہارے بیٹھا کھانس رہا ہو۔ اور جو لچک ایک بوڑھے کی کھانسی میں پائی جاتی ہے۔ وہ اس اکے کی ہر حرکت سے پیدا ہو رہی تھی "مشاعرہ گھر" سے کوئی فاصلہ بس اس قدر طویل تھا کہ یہ

اکا چالیس منٹ میں پہنچا۔ راستہ میں تنہائی اور ضعف سے جو وحشت پیدا ہوئی۔ تو اکے والے سے گفتگو کا سلسلہ شروع کرتے مگر سردی کی شدت سے اُس کا یہ حال کہ ایک جواب بھی صحیح نہیں دیتا۔ لطیفہ یہ کہ اس اکے میں روشنی بھی نہ تھی۔ راستہ میں ہندوستانی پولیس سارجنٹ ملے تو پورے غصہ سے اکے کو روکا تو سرچ لائٹ ڈالی تو انھیں "قفس اندر قفس" نظر آیا یعنی اس پنجرے کے اندر ہم لحاف اوڑھے یوں بیٹھے تھے گویا ہم خود ایک مستقل اکا ہیں۔ اس اکے والے کے لباس سے صاف ظاہر تھا۔ کہ علی گڑھ میں افلاس خاصا ہے۔ اور حضرت مولوی طفیل احمد صاحب کی موجودگی سے بھی یہ دور نہیں ہوتا۔ علی گڈھ کی سردی اور اس اکے والے کی صرف ایک عدد کھدری چادر کو دیکھ کر ضبط نہ ہوا تو اُس سے کہدیا کہ

> "اگر افلاس دور کرنا چاہتے ہو تو کبھی کالج اور یونیورسٹی کی طرف اکا نہ لیجانا۔ کیونکہ اہل افلاس یہ طلبہ ہیں جنھوں نے غیر ملکیوں کی دو وقتہ چائے، ہاکی، فٹ بال، ٹینس، کرکٹ، ٹورنامنٹ اور غیر ملکی لباس کو اختیار کرکے ہماری آمدنی اور دولت کے مصارف کو دادا جان کے زمانہ سے آٹھ گونہ زیادہ کر دیا ہے۔"

بڑی خموشی سے کوٹھی میں داخل ہوئے۔ اور بستر لیکر اسٹیشن اس تہذیب سے چلدیئے جس طرح اپنے "دسائن کمیشن صاحب" ہڑتالیوں اور "گو بیک" کی وجہ سے کسی طرف سے نکال دیئے جاتے ہیں۔ ایک جلیل القدر نواب زادے کی مہمانی سے بھاگے تھے اس لیے الحمدللہ روپیہ تھا کافی اس لئے خیال آیا کہ آج تو "تھرڈ کلاس" ہی میں سفر کریں۔ اس لیے ٹکٹ بابو سے آگرہ تک کا ٹکٹ طلب کیا تو اُس نے غلطی سے "سیکنڈ کلاس" کا ٹکٹ دیدیا تھا ضدی اس لیے ٹکٹ کے نرخ میں کوئی کمی نہیں کی بلکہ آگرہ تک کا جو کرایہ پہلے اُس نے بتایا۔ اُسی پر جما رہا۔ ایک روپیہ بھی کم نہ کیا۔ حالانکہ اپنے ہندوستانی سوداسلف کا عام قاعدہ یہ ہے کہ چیز کے دام جو پہلے بتلاتے ہیں گاہک کے اصرار پر پھر وہی چیز آدھے داموں پر دیدی جاتی ہے۔ اُمید ہے کہ سوراج کے ملجانے پر ریلوے ٹکٹ اور ڈاکخانوں کے لفافوں اور کارڈوں کی قیمت بھی گھٹتی بڑھتی رہا کرے گی۔ آج کل ایسی "انگریزی" تو نہو گی کہ جو دام مانگے جائیں وہی دو۔ ورنہ "جانیئے نہیں دیتے" کی دھمکی موجود ملتی ہے۔

اسٹیشن پر بمقدار ٹکٹ قلی نے ایک ایسی کوٹھری میں بستر رکھدیا جسے "ویٹنگ روم" کہکر عزت بڑھا دی جاتی

ہے۔ یہ کوٹھری انگریزوں کی ہوتی ہے اور سُنا ہے انگریز بڑے باوقار، بڑے دولتمند اور بڑے فاتحانہ ٹھاٹ کے لوگ ہوتے ہیں لیکن یہ بالکل غلط ہے۔ اس لیئے کہ یہ لوگ ریلوے اسٹیشنوں کے ہر ویٹنگ روم میں اُس کی حیثیت کے موافق چراغ جلاتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے سیکنڈ کلاس ویٹنگ روم میں "کانس لیٹ" کا وہی دیا جل رہا تھا جو عام ہندوستانیوں کے جھونپڑوں میں جلتا رہتا ہے۔ لیکن فرسٹ کلاس ویٹنگ روم میں بجلی کی روشنی تھی۔ اب بتایئے اگر انگریز دولتمند اور فاتحانہ ٹھاٹ کے لوگ ہوتے تو یہ کنجوس۔ یہ بخیل اور یہ گداگرانہ دیا کیوں جلاتے۔ انہیں ہر جگہ اپنی شان دکھانا چاہیئے تھی! ورکوئی ہندوستانی راجہ مہاراجہ اگر ریلوے کا مالک ہوتا تو وہ ہر اسٹیشن پر گھی کے چراغ ہی جلوا کر چھوڑتا۔ چاہے رعایا بھوکی مرجاتی مگر وہ اپنی شان دکھانے میں کمی نہ کرتا۔ یہاں علی گڑھ کی طرف سے مشاعرہ کی "استقبالیہ" کمیٹی کے ارکان مہمانوں کے استقبال کو موجود تھے۔ ہمیں خیال بھی نہ تھا مگر ان معزز بھائیوں نے ہمیں پہچان لیا۔ اور فوراً ہی ہمارے پاس آکر دریافت کیا کہ "کیا آپ مشاعرہ میں تشریف لائے ہیں"

ہم نے اپنی بیماری اور مشاعرہ سے واپسی کا ذکر کیا تو بیچارے ہماری امداد کے لیے وقف ہو گئے۔ ہمیں گلاس لاکر دوا پلائی پاس بیٹھ گئے، ہاتھ پاؤں دبانے کو کہا۔ غرض ان عزیز طلبہ نے علی گڑھ کالج کے اُن قابل صد عظمت اخلاق کی یاد تازہ کر دی جن کا دعویٰ کبھی سر سید علیہ الرحمتہ نے کیا تھا۔ اور جواب اسلامیہ کالج لاہور اور پشاور کے طلبہ میں کیا خود علی گڑھ کالج کے جملہ طلبہ میں موجود نہیں۔ ممکن ہے یہ اثر ہو نواب سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب بہادر کی مصروفیت کا اِن عزیز طلبہ میں برادرم عزیز الرحمٰن خاں اور برادرم لطافت علی خاں گاڑی کے روانہ ہونے تک ہمارے ہمراہ رہے۔ ریل آنے پر ہمارے لیے جگہ تلاش کی۔ بستر لگایا۔ اور چلتے وقت الٹی ہم سے معافی چاہی کہ خدمت نہ کر سکے۔ ان میں برادر عزیز عبدالحبیب خاں صاحب بریلوی سب سے پیش پیش تھے اور مزاج اور اخلاق سے وہ پیارا اسلامی اخلاق ٹپک رہا تھا جو دلوں کو مسخر کرکے بغیر "گھوڑا پولیس،، کے حکومت کرتا ہے۔ خدا ان پیارے اسلامی بھائیوں کو خیریت سے ایم اے، پی ایچ ڈی، کرے آمین۔

اب یہاں سے ہم ریلوے کی اُس لنکا میں داخل ہو گئے جہاں کا ہر ہندوستانی ملازم باون گز ہی کا ہوا کرتا ہے۔ ریلوے ملازمین میں اخلاق، قومی ہمدردی، ملکی جانب داری، رحم و عفو، اور خوش خلقی کا جو کوسوں پتہ نہیں چلتا اُس کا سبب یہ نہیں کہ اس طبقہ میں تمام ملازمین قوم و خاندان کے جلاہے، دھوبی، حجام، یا کونجڑے ہوا کرتے ہیں۔ بلکہ اُن کی بد اخلاقی بدتہذیبی اور فرعونیت کا اصل سبب یہ ہے کہ یہ سب کے سب اسکولوں کی پانچویں اور چھٹی جماعت کے بھاگے ہوئے طلبہ ہوتے ہیں۔ پھر اُن سے "قوم یا قومیت" یا خوش اخلاقی ہمدردی اور تواضع کی امید ایسی ہی ہے جیسی انگلستان کے مزدوروں سے ہندوستانی سوراج کی

توقع اس لیے ہم ریلوی ملازم کے لیے اپنی آبائی عرف افغانی عادات سے کام لیتے ہیں۔ تو آرام سے سفر پورا ہو جاتا ہے۔

آگرہ کے اسٹیشن پر شب کے ساڑھے چار بجے اترے یہاں سے گھر تک کا ٹکٹ بدلوانا تھا۔ دروازہ پر دیکھا تو ایک قحط زدہ صورت کے ہندوستانی ٹکٹ کلکٹر آگرہ کے محلہ "نائی کی منڈی سے خریدا ہوا ٹوپ" یوں اوڑھے ہوئے تھے جیسے کوئی ایکٹر کسی تھیٹر میں مردے کا پاٹ کر رہا ہو۔ ہم نے خدمت اقدس میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ ٹکٹ گھر کدھر ہے؟ تو بزگھنڈی لہجہ میں بولے

"پہلے اپنے آنے کا ٹکٹ دکھاؤ"

اس فقرہ پر ہماری تمام بھولی ہوئی منطق اُبھر آئی۔ اور ہم نے انھیں جرحی اور منطقی سوالات پر دھر لیا تو مزاج سُرخ و سفید قارورہ ہوگیا مگر کرتے کیا ایک پولیس ہیڈ کانسٹبل نے جب دیکھا کہ ٹکٹ کلکٹر صاحب کی کلکٹری قبا کے تمام بخیے اُدھیڑے جارہے ہیں تو درمیان میں پڑ کر معاملہ یوں طے کر دیا کہ ہمیں لیجا کر ویٹنگ روم میں آرام سے بٹھا دیا۔ قلی سے بستر کرا دیا اور بیچارہ خود ٹکٹ لینے چلا گیا۔ دیر جو ہوئی تو ہم سمجھے کہ اس کانسٹبل نے اپنے ٹکٹ کلکٹر کی شکست کا ہم سے یوں بدلہ لیا ہے کہ ہمارے ٹکٹ کے دام لیکر آگرہ میں "گم شدہ عزیز" کی تلاش بنکر رہ گیا۔ اس لیے خود ٹکٹ گھر کی طرف گئے تو ہمارے وطن کے ایک حافظ جی نظر آئے جو علی گڑھ جارہے تھے۔ اور ریل کے انتظار میں یہاں مارے جاڑے کے "استغفراللہ" بنے کھڑے تھے اُن سے ملاقات ہوئی۔ اور انھیں کو پولیس والے کے پیچھے لگا دیا۔ بارے ٹکٹ آگیا ادھر ریل آگئی۔ یہاں سے ضعف اس درجہ بڑھا کہ ہم ریل میں سوار ہوتے ہی بیہوش ہوگئے اور پتہ بھی نہ چلا کہ ہم کون ہیں اور کہاں ہیں۔ کہیں کہیں آنکھ کھل جاتی تھی مگر ہم کچھ کہہ نہیں سکتے تھے کیونکہ اس وقت پانچواں علاجی فاقہ تھا۔ اور قدرے بخار اس وقت خیال آیا کہ اگر ہم آج کوئی یورپ کی زندہ قوموں کے "اتنے بڑے ادیب ہوتے تو اس حالت میں ہمارے لیے علی گڑھ سے گھر تک پہنچانے کے لیے ایک اسپشل ترین چھوڑی جاتی اور ہر اسٹیشن پر ڈاکٹر اور خدام اور عوام ہمارے استقبال اور مزاج پرسی کو حاضر رہنے میں اپنی سعادتمندی سمجھتے مگر یہاں یہ حال کہ اب بھی ایسے ایسے موجود ہیں جو کہتے ہیں کہ

"ملارموزی چیز ہی کیا ہیں"

بارے خدائے رحیم و کارساز اور شفیق و مہربان کی رحمتوں کے سہارے گھر پہونچے والدہ محترمہ مدظلہا نے تو بے ساختہ گلے لگا لیا وہ بھی پریشان سی ہوگئیں مگر ذرا سا افاقہ ہوتے ہی بولیں

"اور جاؤ سفر میں"

معلوم نہیں اس فقرہ میں کرایہ کے روپیہ کا غم تھا یا جوش محبت سے ہمارے اوپر طعن؟ اپنے اللہ میاں کا بڑا احسان کہ ہمیں بغیر ٹری سے اُترے ریل میں گھر تک پہونچا دیا اور کسی ٹکٹ کلکٹر نے نہ دیکھا۔ فقط

ملارموزی

وجدانیات

جوانی کو کتاب درد و غم کی ابتدا کہیئے
جو دل آئے کسی پر تو تقاضائے قضا کہیئے

نگاہِ نازِ جاناں کیا ہے اک تیرِ قضا کہیئے
پھر اُس پر سامنا دل کا بلا کا سامنا کہیئے

محبت کو تو کہتے ہو کہ فطرت کا تقاضا ہے
مگر بدنام ہو جائے کوئی اس میں تو کیا کہیئے؟

مرے دل میں بھی جلوے اُدی ایمن کے رہتے ہیں
تجلّیاتِ برقِ حسن کو رنگ آشنا کہیئے

کسی کا قصۂ غم ہو مگر میں سُن کے روتا ہوں
وہ دل پہلو میں رکھتا ہوں حسیبِ غم آشنا کہیئے

نگاہِ گرم بھی ہے مجھ پہ اور اندازِ الفت بھی
کسے اب آشنا کہیئے کسے ناآشنا کہیئے

اگر تم میرے ہو جاؤ تو دنیا میری ہو جائے
تمہارے ہر اشارے کو زمانے کی ہوا کہیئے

فنا ہو جائے ہستی وسعت آبادِ تمنا میں
یہ دنیا ہے اسی کو زندگی کا مُدعا کہیئے

یہی دو چار تنکے یادگارِ عیشِ رفتہ ہیں
قفس میں ان کو اپنی زندگی کا آسرا کہیئے

نگاہِ مہر و الفت اور مجھ برگشتہ قسمت پر
یہ کب تم سے توقع تھی مگر شانِ خدا کہیئے

کبھی محوِ عبادت ہوں کبھی مشغولِ مینوشی
اِسے جوہرؔ دو رنگیٔ زمانہ کی ہوا کہیئے

جوہرؔ عظیم آبادی

تجلّیات

سیماب بھر دیا ہے دلِ بیقرار میں — کیا سحر ہے تری نگہِ فتنہ کار میں

وہ رشکِ صد بہار ہے میرے کنار میں — اللہ کیا بہار ہے اب کی بہار میں

ذرّے چمک اُٹھے ہیں تری رہگذار کے — جلوے ہیں بیقرار تری رہگذار میں

حیراں ہوں میں، خموش ہوں میں، دم بخود ہوں میں — کھویا گیا ہوں آ کے ترے جلوہ زار میں

مانا کہ صبر چارۂ اندوہِ عشق ہے — لیکن نہیں ہے صبر مرے اختیار میں

اللہ بچائے دل کو بلاؤں سے عشق کی — دامن اُلجھ گیا ہے مرا خارزار میں

دل بے نیازِ گردشِ لیل و نہار ہو — یا فرق آئے گردشِ لیل و نہار میں

روتا ہوں دیکھ دیکھ کے دیوار و در کو میں — دیوانہ ہو گیا ہوں ترے انتظار میں

اکبر وہ دورِ عشق و محبت گذر گیا
باقی ہے یاد سی دلِ حسرت شعار میں

جلال الدین اکبر

شخصیت کا اثر

یہ فسانہ بلغاریہ کے ایک مشہور مصنف کے فسانہ کا ترجمہ ہے۔ اس میں نہایت خوبی سے دکھایا گیا ہے کہ ایک نیک شخصیت کے اثر سے کس طرح قلب ماہیت ہو جاتی ہے۔ بلغاریہ کی زندگی اور ہماری ہندوستانی زندگی میں بہت کچھ مشابہت ہے۔ اس لئے مجھے امید ہے کہ ناظرین اس فسانہ کو دلچسپی کے ساتھ ملاحظہ کریں گے۔

اڈیٹر

میرے مکان سے تھوڑے فاصلہ پر متھیس کا مکان ہے۔ اس کے دروازہ کے سامنے برانڈی سے بھری ہوئی ایک صراحی ہر وقت لٹکی رہتی ہے۔ متھیس کو یہ بات بہت پسند ہے۔ اگر کبھی تم اس طرف سے گزرو تو اس کا تمام خاندان تمھیں اپنے گھر بلائے گا اور تمھاری اتنی ہی خاطر کرے گا جتنی کہ ایک لارڈ کی کی جاسکتی ہے۔ اگر رات کا وقت ہے تو ایک لڑکی اپنے ہاتھ میں مشعل لئے ہوگی۔ ورنہ ایک لڑکی تمھارے استقبال کے لئے دروازہ پر ہوگی۔ ایک باغ میں تمھارا انتظار کرتی ہوگی۔ ایک لڑکی تمھیں اصطبل میں ملے گی اور ایک لڑکی باورچی خانہ میں تمھاری منتظر ہوگی۔ اور جب تم یہ تمام منازل طے کرلوگے تو ایک لڑکی تمھیں بیٹھنے والے کمرہ میں لے جائے گی جہاں تمھیں باقاعدہ دعوت دی جائے گی۔ تمھارا استقبال کیا ہوگا شادی کی دھوم ہوگی۔ اس کے خاندان کے تمام لوگ بامذاق اور معقول ہیں۔ یہ لوگ سپاہی بھی ہیں۔ خدا کرے تم کسی سے لڑ بیٹھو پھر دیکھنا وہ کیسے جوہر دکھاتے ہیں۔ یہ لوگ سب کام اپنے ہاتھ سے کرتے ہیں۔ خود ہی بوتے ہیں خود ہی کاٹتے ہیں۔ سور بہت پالتے ہیں۔ اس خاندان میں کل اَسّی افراد ہیں جن میں مرد۔ عورتیں۔ بچے اور بوڑھے سب شامل ہیں۔ خاندان کے تین ممبر بطور سردار خاندان کے تصور ہوتے ہیں۔ سب سے بڑا سردار خود متھیس ہے۔ دوسرا سردار اُس کی بھاوج راڈو کا ہے اُمور خانہ داری کے شعبے اس کے سپرد ہیں۔ تیسرا سردار متھیس کا پوتا ارسن ہے جو اس قصہ کا ہیرو ہے۔

متھیس کے مکان کے قریب ایک شخص برماس رہتا تھا۔ اس کے کئی ایک بچے تھے۔ لیکن سب طاعون میں ضائع ہو گئے صرف ایک لڑکی انوکا نامی باقی بچی۔ برماس اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ خوبصورتی میں یہ لڑکی اپنا مثل نہ رکھتی تھی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اگر وہ کسی شہر کی طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھ لے تو وہ فوراً جل کر خاک ہو جاوے گا۔ باپ کے ناز و نعمت نے انوکا کو نہایت بدمزاج اور ضدی بنا دیا تھا۔ فضول خرچی اس کا معمولی شیوہ تھا۔ اَرسن اس کی خوبصورتی کو دیکھ کر اس پر عاشق ہو گیا۔ وہ اکثر اس کے مکان کے سامنے بیٹھ کر بانسری بجایا کرتا تھا۔ ایک روز جب انوکا اپنے دروازہ پر کھڑی تھی، ارسن اس کے پاس گیا۔ اور کہنے لگا۔

ارسن ۔ انوکا! تمھیں معلوم ہے کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں؟ اگر مجھے اپنے باپ یا دادا کا خوف نہ ہوتا تو میں تم سے شادی کرنے کی درخواست کرتا۔ اور اگر تم میرے ساتھ شادی کرنے کا پورا یقین دلا دو تو میں اُس کی بھی کوئی پرواہ نہیں کرتا۔

انوکا ۔ (نہایت شوخ نگاہوں سے ارسن کی طرف دیکھ کر) ارسن! تم اس جنجال میں نہ پڑو۔ میں تمھارے ساتھ شادی کیوں کرنے لگی۔ مجھے تو فلپ ہی بہت پسند ہے۔ میں تو اُس کے ساتھ شادی کرونگی۔

ارسن ۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ میں تمھیں فلپ کے ساتھ شادی کرنے کی بخوشی اجازت دیدوں گا۔ بھلا کوئی تمھیں ہاتھ تو لگا دیکھے پھر دیکھنا یا تو میں نہیں یا وہ نہیں۔

انوکا ۔ (غصہ کے لہجہ میں) تو کیا تمھارا یہ منشا ہے کہ میں کبھی شادی ہی نہ کروں۔ بس اب تم اس معاملہ میں مجھ سے گفتگو ہی نہ کرو۔

ارسن نے ان الفاظ کی مطلق پرواہ نہ کرتے ہوئے انوکا کا ہاتھ پکڑ لیا اور اپنے پاس گھسیٹ کر اپنے دونوں ہاتھ انوکا کی گردن میں ڈالدئے۔ انوکا ڈری اور ٹھٹکی اس کے بدن میں حس و حرکت بالکل نہ تھی۔ تھوڑی دیر خاموش رہکر اس نے ارسن سے گھر جانے کی اجازت مانگی۔ ارسن نے کچھ تو بہ مصلحتِ وقت اور کچھ اس کی درخواست پر اُسے چھوڑ دیا۔

گھر پہنچکر ارسن کو انوکا کی یاد نے آگھیرا۔ وہ کچھ تو انوکا کے شادی نہ کرنے سے ملول تھا اور کچھ اس کی اتنی جلد مفارقت کا اثر اس کے قلب پر زیادہ تھا۔ اس نے ان تکالیف کو دور کرنے اور تھوڑی دیر انوکا کی یاد کو

بھلا دینے کے لئے شراب کا ایک جام پیا اور صحن میں ایک تختہ پر آکر بیٹھ گیا۔ رات آگئی۔ چاروں طرف تاریکی بڑھنے لگی۔ ارسن کے سینہ میں طپش محسوس ہوئی بجائے اس کے کہ اُسے انوکا کی یاد تھوڑی دیر کی لئے بھول جاتی وہ اور بھی راسخ ہوگئی۔ جب نشہ زیادہ ہوا اس وقت اُس کی حالت اور بھی خراب ہوگئی۔ مختلف شکلیں اُسے نظر آنے لگیں۔ اُس نے دیکھا کہ کتے صحن سے گزر رہے ہیں۔ مویشی چراگاہوں سے واپس آرہے ہیں۔ گھوڑے اصطبل میں ہنہنا رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اُس نے دیکھا کہ ایک مُرغی درخت سے کودی اور روز دیدہ نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ کر پھر درخت پر جا بیٹھی۔ اسے سستی محسوس ہوئی۔ اس کا دل غیر معمولی طور پر دھڑک رہا تھا۔ وہ پہلے ڈرا۔ ٹھٹھرا اور پھر ہنسنے لگا۔ اُسے محسوس ہوا کہ انوکا اس کے سامنے کھڑی ہے۔ پھر یہ سمجھ کر کہ وہ قریب المرگ ہے۔ ایک تختہ پر لیٹ گیا۔ اُس نے دیکھا کہ انوکا اس کے پہلو میں بیٹھی ہے۔ اور وہ خود ایک گھوڑے پر سوار ہے۔ وغیرہ وغیرہ یہ تمام باتیں صرف اس لئے تھیں کہ اس نے پہلی مرتبہ شراب پی تھی اور بہت کثرت سے پی تھی۔

رات زیادہ جا چکی تھی۔ ولنکا کو کسی چیز کی تلاش میں باہر آنا پڑا۔ اُس نے دیکھا کہ اَرسن شراب کی صُراحی ہاتھ میں لئے لت پت پڑے ہیں۔ اسے بہت حیرت ہوئی وہ اَرسن کے قریب آگئی اور شانہ ہلا کر کہنے لگی۔

ولنکا ۔ ارسن! ارسن! (ارسن نے اپنی مخمور آنکھیں کھول دیں) تم نے شراب پی ہے؟۔

ارسن ۔ ہاں۔

ولنکا ۔ کیوں؟

ارسن ۔ صرف اس لئے کہ میں فلپ کو قتل کردوں۔

ولنکا ۔ پیارے ارسن! فلپ نے تمھارا کیا قصور کیا؟

ارسن ۔ وہ انوکا کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔

ولنکا ۔ تو پھر تمھیں کیا، کرلینے دو۔

ارسن ۔ لیکن میں تو نہ کرنے دوں گا۔

ولنکا نے بڑی زور سے قہقہہ لگایا اور پوچھا

کیا تم انوکا کے ساتھ شادی کروگے ؟

ارسن - ہاں۔ (یہ کہکر وہ زار زار رونے لگا) بھائی نے .... کیوں شادی..... کی ..... میں..... ایں..... ایں ..... ایں..... ایں..... میں بھی شادی کروں گا۔

ولنکا نے پھر ایک فرمائشی قہقہہ لگایا۔ اور کہا۔

ولنکا - میرے بچے ! تم گھبراؤ مت۔ میں اس کا وعدہ کرتی ہوں کہ تمہارے باپ یا دادا سے کہکر اس کا کوئی بندوبست کرا دوں گی۔ اب آؤ۔ چلو آرام سے سو رہو ورنہ اگر تمھارے دادا جان کو کچھ خبر ہو گئی تو وہ تم پر بہت ناراض ہوں گے۔

ارسن - خدا کی قسم مجھے تو اسی کی فکر ہے۔ یہ کہکر وہ ولنکا کے ساتھ ہولیا۔

ولنکا نے اسے ایک کمرہ میں لیجا کر لٹا دیا۔ اور چادر اُڑھا دی۔ اور پھر باورچی خانہ میں دوڑی گئی کہ سب عورتوں سے یہ قصہ بیان کرے۔ عورتیں یہ سُن کر بہت رنجیدہ ہوئیں اور اُنھوں نے کہا کہ اگر انوکا ہمارے گھر آگئی تو بہت بُرا ہو گا۔

اُن میں ایک عورت - ہاں وہ بڑی نخرے باز ہے۔

دوسری - محض یہی نہیں بلکہ وہ آوارہ بھی ہے۔

تیسری - ارے وہ بڑی مکارہ ہے۔ خدا ہماری مدد کرے۔

تھوڑی دیر یہ گفتگو جاری رہی اس کے بعد سب سو گئے۔

صبح کے وقت بلوگی (ارسن کا باپ) راڈوکا کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ میں نے سُنا ہے کہ ارسن انوکا پر عاشق ہوا ہے۔ ولنکا کا بیان ہے کہ رات کو اُس کی حالت بہت خراب تھی۔

راڈوکا - کیوں اُس نے کیا کیا ؟

بلوگی - اس نے رات کو خوب شراب پی اور کہتا تھا کہ میں توفلپ کو مار ڈالوں گا۔

راڈوکا - دیکھو میں تمھیں سے جا کر کہتی ہوں۔ جو کچھ ہو گا دیکھا جائے گا۔

بلوگی - مگر شراب پینے کا تذکرہ نہ کرنا۔

راڈوکا - (ٹھنڈی سانس بھر کر) خدا انہیں معاف کرے۔

راڈوکا نے متھیس سے تمام قصہ بیان کر دیا۔ اسے پہلے تو بہت حیرت ہوئی لیکن اُس نے تھوڑی دیر کے سکوت کے بعد اس واقعہ کے انجام پر غور کرتے ہوئے راڈوکا سے کہا کہ اگر ارسن کی یہی خواہش ہے تو اُسے بیاہ دینا چاہئے کیونکہ بزرگوں کا قول ہے کہ نوجوانوں کی خواہشات کو کبھی نہ مارنا چاہئے اس لئے کہ یہ ان کے لئے بہت مضر ہے۔

راڈوکا - خدا تمہیں سلامت رکھے تم نے خوب بات کہی۔

انوکا کی شادی ارسن کے ساتھ ہو گئی۔ اُس نے اپنی فطرت کے مطابق گھر والوں کو پریشان کرنا شروع کیا۔ چھ ماہ بھی نہ گزرے تھے کہ وہ گھر دوزخ سے بدتر ہو گیا۔ وہ اچھے اچھے کپڑے پہنتی، اور نہایت بناؤ سنگار کے ساتھ رہا کرتی۔ اس کی فضول خرچی پر ارسن نے اُسے ایک دن بہت سمجھایا لیکن اُس نے اس کی کچھ پرواہ نہ کی اور یہ کہکر ٹال دیا کہ اگر تم مجھے اس طرح خرچ نہ کرنے دو گے تو میں اپنے باپ سے کہکر تمام سامان مہیا کر لوں گی۔ غرض ارسن کا تو اُس نے ناک میں دم کر رکھا تھا۔

ایک دن وہ کہیں باہر گئی ہوئی تھی کہ تمام لڑکیوں نے ایک کمیٹی کی اور یہ طے پایا کہ متھیس سے یہ واقعات بیان کئے جاویں، ممکن ہے کہ وہ کوئی تدارک کر دے۔ متھیس سے انوکا کی تمام شرارتیں اور بیہودگیاں بیان کر دی گئیں ارسن نے بھی بہت برا بھلا کہا کہ جس پر متھیس بہت ناراض ہوا اور کہنے لگا کہ یہ سب مصیبتیں آج تمہاری ہی بدولت پیش آئیں۔ تمہیں نے میرے گھر کا ستیاناس کیا، اور تم ہی نے میری آزادی میں خلل ڈالا۔ ارسن دل میں تو بہت پچھتایا کہ میں نے کیوں اس وقت اس کا تذکرہ کیا لیکن بعد میں کچھ سوچا اور کہنے لگا۔ دادا جان! مجھ سے خطا ہوئی۔ میں معافی چاہتا ہوں۔ متھیس نے اُسے سمجھا بجھا کر واپس کر دیا اور جب انوکا واپس ہوئی تو اُسے اپنے پاس بلا کر اس طرح مخاطب ہوا۔

متھیس - بیٹی! میں نے سُنا ہے کہ تم نے گھر والوں کو بہت پریشان کر رکھا ہے۔ دیکھو یہ باتیں اچھی نہیں ہوتیں۔ اب تک تو جو کچھ تم نے کیا وہ معاف ہے مگر خبردار اب میرے گھر میں اس طرح کے قصے نہ ہوں

میں یہ روز روز کے جھگڑے نہیں پسند کرتا۔ ہاں اگر تمھیں کوئی شکایت ہے تو میں اس کا تدارک کرنے کو تیار ہوں۔

یہ کہہ کر اُس نے گھر کی تمام عورتوں کو جمع کیا اور اس طرح مخاطب ہوا۔

متھیس ۔ دیکھو میں آج سے تم لوگوں پر اس فرض کو واجب گردانتا ہوں کہ تم میں سے ہر عورت انوکا کے ہر حکم کی تعمیل کرے۔ اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو یاد رکھنا کہ مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔ سب عورتوں نے اس کا اقرار کیا لیکن ان کی سمجھ میں یہ نہ آیا کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے۔ چاہتے تھے کچھ اور ہوگیا کچھ۔ مگر کس کی مجال تھی کہ اب متھیس کی منشا کے خلاف کرے۔ انوکا تو دل ہی دل میں خوش تھی۔ وہ ایک مرتبہ باورچی خانہ میں دوڑی گئی اور ہر عورت پر مختلف احکام صادر کرنا شروع کر دیئے۔ دیکھو فلاں! تم جاؤ اُس درخت کے نیچے میرا پلنگ بچھاؤ۔ اور فلاں! تم راڈوکا کا چھوٹا تکیہ میرے سرہانے رکھ دینا۔ اور پٹریا جب میں سو جاؤں تو تم ایک چھڑی لے کر چڑیوں کو ہنکاتی رہنا تاکہ میری نیند میں کوئی خلل نہ پڑے۔ جاؤ اور سب کچھ ابھی کرو تمام عورتیں دوڑی گئیں کسی نے پلنگ لیا۔ کسی نے تکیہ اور کسی نے گدا غرض بات کی بات میں تمام سامان لیس تھا۔

رات آگئی اور انوکا اپنے بستر پر جا لیٹی۔ پٹریا بیچاری چھڑی لے کر اس کے سرہانے کھڑی ہوگئی تاکہ چڑیوں کو ہنکاتی رہے۔ انوکا تھوڑی دیر سوئی ہوگی کہ پٹریا کی آنکھ بھی لگ گئی چڑیوں کی چاؤں چاؤں سے انوکا جاگ اُٹھی اُس نے دیکھا کہ پٹریا سو رہی ہے۔ اُسے بہت غصہ آیا۔ اُس نے ایک لات مار کر اُسے اُٹھایا اور کہا کہ خبردار! اگر اب سوئی تو تجھے مار ہی ڈالوں گی۔ پٹریا مصیبت کی ماری اُٹھی اور پھر چڑیاں ہنکانے لگی۔ انوکا پھر سوگئی۔

وہ تھوڑی دیر سوئی ہوگی کہ اُس کی آنکھ پھر کھل گئی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ اور چہرہ پر پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ اُس نے دیکھا کہ پٹریا اس کے سرہانے کھڑی ہے۔ وہ اپنے پلنگ پر سے اُٹھی اور دوڑ کر پٹریا سے لپٹ گئی اور خوشامد کے لہجہ میں کہنے لگی۔

انوکا ۔ پیاری پٹریا اب تم جا کر سو رہو۔

پٹریا نے اسے عین خدا کی رحمت تصور کیا اور اپنے دل میں اُسے بُرا کہتی ہوئی چلدی۔ وہ تھوڑی

دور گئی تھی کہ انوکا نے آواز دی پٹریا! پٹریا!

پٹریا ڈر گئی کہ دیکھئے اب کیا آفت نازل ہوتی ہے۔ وہ کانپتی ہوئی انوکا کے قریب آئی اور کہنے لگی اب کیا حکم ہے؟

انوکا - پیاری پٹریا تم مجھے معاف کر دو۔

پٹریا - پیاری انوکا۔ خدا تمھیں معاف کرے۔

انوکا - پٹریا۔ میری پیاری بہن .... یہ کہ کر وہ پٹریا سے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

پٹریا انوکا کو اس طرح روتا دیکھ کر تمام رنجشیں بھول گئی اور دونوں بچوں کی طرح زار و قطار رونے لگے

انوکا - پٹریا۔ میری پیاری پٹریا۔ اب میں تم سے ہمیشہ کے واسطے رخصت ہوتی ہوں۔ اب میں اس دنیا میں زیادہ رہنا پسند نہیں کرتی۔ میں تم سے ایک دو وصیتیں کرتی ہوں جب میں مرجاؤں تو تم مجھے غسل دینا۔ کفن پہنانا۔ اور میرے کفن میں ایک سیب کاٹ کر رکھ دینا۔ یہ سب میں تم سے اس لئے کہتی ہوں کہ تمام عورتوں میں تم ہی مجھ سے دلی محبت رکھتی ہو۔

پٹریا - میری پیاری! تم سے ہر شخص محبت کرتا ہے۔

انوکا - نہیں! مجھے معلوم ہے۔

پٹریا - تم نے یہ کیونکر جان لیا کہ کوئی تم سے محبت نہیں کرتا۔ تم نے تو آج تک کسی سے بات بھی نہیں کی۔

انوکا - اچھا پٹریا اب میں دادا جان سے رخصت ہونے جاتی ہوں۔ خدا حافظ!

پٹریا نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے مُنھ پر رکھ لئے۔ انوکا نے دونوں ہاتھ ہٹا کر اپنی گردن میں ڈال دیئے اور کہنے لگی۔

انوکا - دیکھو پٹریا۔ اگر میں مرجاؤں تو تم میری برائی نہ کرنا۔ لو جاؤ خدا حافظ! بس مجھے یہی کہنا تھا۔

پٹریا - انوکا۔ تم خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کرو۔

انوکا۔ میں تم سے اتنی محبت کرتی ہوں جتنی کہ کیجا سکتی ہے۔

پٹریا۔ اب تم کہاں جاتی ہو۔

انوکا۔ خدا کے واسطے اب تم میرے پاس سے چلی جاؤ۔ مجھے پریشان نہ کرو۔

پٹریا انوکا سے رخصت ہو کر مکان کے کسی گوشہ میں چھپ کر بیٹھ گئی اور سوچنے لگی کہ انوکا اب کیا کرے گی۔ تمام گفتگو اس کے دماغ میں گونج رہی تھی لیکن وہ کسی صحیح نتیجہ پر نہ پہونچ سکی۔ اُس نے دیکھا کہ انوکا متھیس کے دروازہ پر جا کر بیٹھ گئی۔

متھیس کو آج تمام رات نیند نہ آئی تھی۔ گزشتہ واقعات اس کے دماغ کو پریشان کئے ہوئے تھے وہ سوچ رہا تھا کہ انوکا کے بارہ میں اُسے کیا روش اختیار کرنی چاہیئے۔ کہ اتنے میں مرغوں کے اذان کی آواز اس کے کان میں پہونچی۔ وہ اپنے بستر سے اُٹھا اور غسل کی نیت سے کوئیں کو جانا چاہا۔ دروازہ پر پہنچ کر اس نے دیکھا کہ عورت بیٹھی ہوئی ہے چونکہ اندھیرا ابھی موجود تھا اس لئے وہ نہ پہچان سکا کہ کون ہے۔ اُس نے آواز دی۔ تم کون ہو؟۔

انوکا۔ دادا جان میں ہوں انوکا۔ میں تم سے ہمیشہ کے واسطے رخصت ہونے آئی ہوں۔ خدا کیلئے تم مجھے معاف کر دو۔

متھیس۔ میری پیاری تو نے کیا کہا۔ یہ تو بہت بڑا گناہ ہے۔

انوکا بڑھی۔ اس نے متھیس کے دامن کو اُٹھا کر بوسہ دیا اور کہنے لگی۔

انوکا۔ دادا جان۔ میں نے تمہارے بڑے قصور کئے ہیں۔ میں نے تمہارے گھر کو تباہ کیا اور تمہاری راحت میں خلل ڈالا۔

متھیس رونے لگا۔ اس نے انوکا کو اپنے سے لپٹا لیا اور پیار کر کے کہنے لگا۔

متھیس۔ آؤ چلو اندر ل کر بیٹھیں۔ دونوں کمرہ میں داخل ہوئے۔

تھوڑی دیر کے بعد متھیس نے انوکا سے کہا۔ آؤ میرے ساتھ۔ دونوں اُٹھے۔ متھیس انوکا کو کنوئیں پر لے گیا اور کہنے لگا۔ انوکا اس میں سے تھوڑا سا پانی کھینچو۔ انوکا نے حکم کی تعمیل کی۔

متھیس۔ تھوڑا سا پانی پھینک دو۔ انوکا نے پانی کم کر دیا۔ متھیس نے اس سے غسل کیا اور انوکا سے کہا کہ میرے بال خشک کر دو۔

انوکا تولیہ سے اس کے بال خشک کرنے لگی۔ متھیس زار و قطار رو رہا تھا۔ چونکہ دن چڑھ آیا تھا اس لئے تمام لوگ جاگ اُٹھے تھے۔ اُنھوں نے جب دیکھا کہ متھیس رو رہا ہے اور انوکا اس کے بال خشک کر رہی ہے تو اُنہیں بڑی حیرت ہوئی۔ اُن کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ آخر اس کا مطلب کیا ہے۔ وہ لوگ صحن میں خاموش کھڑے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے متھیس نے ان سب کو اپنے پاس بُلایا۔ اور کہنے لگا۔ دیکھو انوکا اس وقت میرے ہر حکم کی بخوشی تعمیل کر رہی ہے تم لوگ اس سے خواہ مخواہ بدظن ہو۔ وہ تم سب کو اس وقت نہلائے گی۔

سب کنوئیں پر جمع ہوئے اور انوکا نے باری باری سب کو پانی پہونچایا۔ جب سب فارغ ہو چکے تو انھوں نے انوکا کا نہایت زوروں کے ساتھ شکریہ ادا کیا۔

متھیس اس وقت بہت خوش تھا وہ دوڑا ہوا اپنے کمرہ میں گیا۔ ایک صندوق کھولا اور اس میں سے موتیوں کی ایک مالا نکال کر رومال میں بحفاظت رکھ دی۔ وہ اس رومال کو کرتے کے ایک دامن میں چھپا کر کنوئیں واپس آیا دیکھا کہ سب غسل سے فارغ ہو چکے تھے۔ اُس نے سب کو مخاطب کیا اور کہا کہ انوکا نے سب کو اس وقت نہلایا ہے دیکھیں اُسے کون نہلاتا ہے۔ سب عورتیں دوڑیں لیکن اُس نے انھیں روک دیا اور کہا کہ پیاری انوکا کو میں خود نہلاؤں گا۔ یہ کہہ کر وہ انوکا کی طرف مُڑا اور کہنے لگا۔ آ۔ میری پیاری بچی۔ آ میں تجھے خود نہلاؤں گا۔ انوکا کنوئیں کی جگت پر بیٹھ گئی۔ متھیس پانی ڈالتا رہا۔ جب وہ نہانے سے فارغ ہوئی تو متھیس نے اُس کے سر کے بال خشک کئے اور موتیوں کی مالا اس کی گردن میں ڈال دی۔ اُس نے تمام لوگوں کو مخاطب کر کے کہا کہ میں پھر تم لوگوں کو تنبیہ کرتا ہوں۔ جو شخص اس کی عدول حکمی کرے گا خدا اُس سے بدلا لے گا۔ سب نے اُس کے حکم بجا لانے کا اقرار کیا اور ہنسی خوشی واپس گئے۔

سیّد مہدی علی خاں

ترانۂ دل

میرے جوہر کا اضطراب ہے زیست　　میرے گوہر کی آب وتاب ہے زیست
میرے احساس کی نمود ہے جان　　میرے جذبات کا شباب ہے زیست

۲

یونہی مسحور ہست وبود کا ہے　　تو کرشمہ مری نمود کا ہے
میری بالیدگی کی پوجا کر　　تیرا مقصد اگر صعود کا ہے

۳

دہر بھی میں ہوں اور زمانہ بھی　　میں حقیقت بھی ہوں فسانہ بھی
تو ہے گلشن نمود سے میری　　میں شجر بھی ہوں اور دانہ بھی

۴

چاند سورج مرے غلاموں میں　　مئے انجم ہے میرے جاموں میں
سُن انھیں اور گوشِ ہوش سے سُن　　زندگی ہے مرے پیاموں میں

امینِ حزیں

خوابگاہ فطرت

عروسِ فطرت کی خوابگہ میں یہ کون ہر سمت چھا رہی ہے   لطیف نغمے سنا سنا کر نظر کو بے خود بنا رہی ہے
جبیں میں شوخی چمک رہی ہے نظر میں سرخی جھلک رہی ہے   سیاہ زلفوں کی تیرگی میں شگفتگی مسکرا رہی ہے
رگوں میں شعلے دہک دہک کر دلوں کو بیتاب کر رہے ہیں   نظر میں بجلی تڑپ تڑپ کر جہاں کو خیرہ بنا رہی ہے
وہ پیکرِ حسن و بیخودی ہے وہ مرکزِ ناز و بے خودی ہے   نگاہ میں میکدے بھرے ہیں ہر اک کو جن سے پلا رہی ہے
فضائیں خاموش ہو رہی ہیں ہوائیں بے ہوش ہو رہی ہیں   نگاہ بجلی بنی ہوئی ہے جو ہر طرف جگمگا رہی ہے
یہی تو وہ نیند کی پری ہے ہوا ہے ہر اک پہ جس کا سایہ   ہر اک سے آنکھیں لڑا لڑا کر جہاں کو بیخود بنا رہی ہے
عجیب منظر نگاہ میں ہیں عجیب نقشے خیال میں ہیں   یہ اس کی فطری لطافتیں ہیں کہ ہر نظر میں سما رہی ہے
کسی کی آنکھوں میں اس کی آمد سکون و فرحت کی ایک ساعت   کسی کو کرتی ہے مست راحت کسی کو غمگیں بنا رہی ہے
ہر ایک شے پر غنودگی ہے ہر ایک مے نوش بے خودی ہے   مجھے بھی مدہوشِ خواب کر کے عجیب منظر دکھا رہی ہے
کوئی ہے مصروف سیرِ گلشن کوئی ہے فردوسِ آرزو میں   کسی کو محروم خواب کر کے کسی کے غم میں رلا رہی ہے
کہیں نسیم سحر کے جھونکے کسی کو جا جا کے چھیڑتے ہیں   کہیں ادائے نظر فریبی کسی پہ بجلی گرا رہی ہے
کہیں کوئی وقفِ ناز ہو کر نوازشِ آرزو کا خواہاں   کہیں کوئی بے نیاز ہو کر دلوں کی دنیا ہلا رہی ہے
کہیں فضائیں ہیں وقفِ نغمہ ہر ایک نغمہ ہے سازِ الفت   کہیں تو لائے خموشِ فطرت جہاں کی مستی بڑھا رہی ہے
ہر ایک سرشارِ بے خودی ہے تمام عالم ہے مست راحت   جہاں کو مدہوش خواب کر کے تمام دنیا پہ چھا رہی ہے
کسی کی نظروں میں رنج و حسرت کسی کی آنکھوں میں خوابِ راحت   کسی کو نیرنگیٔ جہاں کے حسین منظر دکھا رہی ہے
کسی کو مست شباب کرتی کسی کو وقفِ حجاب کرتی   کسی کو مدہوش خواب کرتی ہر اک نظر میں سما رہی ہے

خلیلؔ یہ نیند کی پری ہے جہانِ افکار سے بری ہے
"جوانیوں کو امنگ دینے جوان بن بن کے آ رہی ہے"

خلیلؔ شاہجہانپوری

دیوانہ

تم کہتے ہو میں دیوانہ ہوں، فرطِ غم نے میرے دماغ کو مختل کر دیا ہے، میں پاگل ہو گیا ہوں۔

دیوانہ .... اُف اِس قدر خوفناک لفظ ہے، کتنا تکلیف دہ۔ جب تم کہتے ہو "دیوانہ ہے" تمہارے منہ سے آگ نکلنے لگتی ہے، تمہاری آواز ایک زہریلے سانپ کے پھنکاروں سے کہیں زیادہ دہشت ناک ہو جاتی ہے اور ایک زہر، ایک مہلک زہر میرے دل و دماغ، حتّٰی کہ رگ رگ میں سرایت کر جاتا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرے کانوں میں سیسہ پگھلا کر ڈالا جا رہا ہے جس کی تکلیف کی تاب نہ لا کر میں کانوں میں اُنگلیاں دے لیتا ہوں، اور بھاگنے کی کوشش کرتا ہوں۔ بچے میری طرف پتھر پھینکتے ہیں، ہنستے ہیں اور مسرور نظر آتے ہیں۔ میں اُن کی طرف مڑ کر دیکھتا ہوں اور مسکرا دیتا ہوں، کیونکہ میں دنیا کی معصوم ترین ہستیوں کے لیے باعثِ تفریح بن جاتا ہوں۔ بیشک وہ معصوم ہستیاں ہیں، مقدس روحیں ہیں، جن کا پروازِ تخیل مسرت کی فضا سے زیادہ بلند نہیں ہوتا، اور جن کی رسائی عقل انبساط کی اُس حد تک پہنچ کر رک جاتی ہے جس سے آگے رنج و تکلیف، کلفت و آلام کا گہرا اور تاریک غار ہے، وہ اُس غار سے ناآشنا ہوتے ہیں، قطعاً بے خبر۔ لیکن جب تم میری حرکات پر ہنستے ہو تو مجھکو تمہاری کج فہمی پر ہنسی آ جاتی ہے اور میں بے ساختہ قہقہہ لگا بیٹھتا ہوں۔ تم پھر مسکراتے ہو، تمہارے ہونٹوں کو جنبش ہوتی ہے اور تم ہنس پڑتے ہو۔ شاید تم کہتے ہو "دیوانہ ہے"۔ میں کانوں میں انگلیاں دے بھاگا چلا جاتا ہوں۔ بچے میرا تعاقب کرتے ہیں اور پتھر بھی پھینکتے جاتے ہیں، حتّٰی کہ میں اُن حدود میں داخل ہو جاتا ہوں۔ جن سے آگے بڑھنے میں بچے کوئی دلچسپی محسوس نہیں کرتے وہ مایوس ہو کر کہتے ہیں "بس۔ اب وہ قبرستان میں جا گھسا"

مگر یہ غلط ہے، سرا سر غلط۔ میں دیوانہ نہیں ہوں، میرا دماغ صحیح ہے، میرے حواس بجا ہیں۔ مجھے اپنے گرد و پیش، اپنے ماحول کا احساس ہے، وہ احساس جس سے دیوانہ بالکل بے نیاز ہوتا ہے۔ کیونکہ اُس کی قوت تمیز سلب ہو جاتی ہے،

اس کے قوائے ذہنی میں فتور آجاتا ہے۔ اُس کے دماغ میں غیر مسلسل خیالات کا سلسلہ بندھا رہتا ہے، وہ بغیر کسی کوشش کے عالمِ تصور میں زلزلے اور غیر متعلق مناظر دیکھتا ہے، جن سے متاثر ہو کر عجیب و غریب حرکات کرنے لگتا ہے۔ کبھی روتے روتے اچانک ہنس پڑتا ہے کبھی ہنستے ہنستے فوراً خاموش ہو جاتا ہے اور نہایت سنجیدہ اور متین نظر آنے لگتا ہے۔ کبھی بے معنی جملوں اور مہمل الفاظ کا تار باندھ دیتا ہے جنھیں وہ خود بھی نہیں سمجھتا۔ بلا شبہ وہ کوشش کے باوجود بھی ایک آسان بات سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔ لیکن میں...... میں دیوانہ نہیں ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں کہاں ہوں۔ یہ وہ آبادی ہے جہاں ہر سمت کلی سکوت ہے، موت کا سا سناٹا یہ خطہ شور و غل سے ناآشنا ہے اور ہنگامہ سے قطعاً پاک جو لوگ ہنگامۂ ہستی سے اُکتا جاتے ہیں وہ اسی آبادی میں آکر بنا دیتے ہیں اور مادی آنکھوں سے ہمیشہ کے لیئے روپوش ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ یہاں پہنچکر اُن کو وہ سکون حاصل ہوتا ہے، جس کے لیے وہ اس سے قبل بے چین تھے۔ وہ یہاں سے لوٹنا نہیں چاہتے، شاید وہ ایسا کر بھی نہ سکتے ہوں، یہاں کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ آبادی رسومات سے یکسر معرا ہے مگر ایک رسم۔ مساوات، اس پر کاربند ہونا ضروری ہے جس سے کوئی فرد مستثنیٰ نہیں۔

ہر طرف نگاہ اُٹھاتا ہوں، سکوت ہی سکوت نظر آتا ہے۔ مجھے اس جگہ ایک گونہ اطمینان حاصل ہے کیونکہ یہاں دیوانہ، سا آتشیں لفظ سننے میں نہیں آتا، جو مجھ پر بجلی گرا دیتا ہے۔ وہ بجلی جو میری روح تک کو خاکستر کر جاتی ہے، شاید یہ لوگ غلط بیانی سے پرہیز کرتے ہیں۔ میں اپنے چاروں طرف مٹی کے ڈھیر دیکھتا ہوں جو قریباً یکساں جگہ گھیرے ہیں، ان کی نوعیت میں بھی چنداں تفاوت نہیں، کیونکہ یہ مساوات کے اصول پر بنائے ہوئے مکانات ہیں جن میں لوگ نہایت راحت و سکون سے بسر کرتے ہیں۔ ہر ڈھیر کے سرہانے ایک پتھر کھڑا ہے۔ جن پر مختلف تحریریں کندہ ہیں........... یہ قبرستان ہے۔

جس قبر کے نزدیک میں بیٹھا ہوں اس کے پتھر پر جلی حروف میں تحریر ہے...... ہاں میں بخوبی پڑھ سکتا ہوں۔

معصوم ارمانوں کا مدفن

کتنا مناسب جملہ ہے اور اہل قبر کی تاریخ حیات کا کس قدر صحیح اور مختصر مرقع ہے۔ لیکن یہ نامکمل تھا اور محض ایک رخ پر روشنی ڈالتا تھا۔ میں نے اس کے نیچے دوسرا جملہ بڑھا کر مکمل کر دیا ہے۔

ظہیر کی کائنات کا دفینہ

یہ جھوٹ ہے، بالکل جھوٹ۔ مجھے جھوٹ سے سخت نفرت ہے۔ میں اُس ایک حرف تک کے سننے کا متحمل نہیں ہوسکتا جو جھوٹ ہو۔ کیا یہ جھوٹ نہیں کہ میں دیوانہ ہوں، جبکہ میں صحیح الدماغ انسانوں کی طرح سوچ سکتا ہوں سمجھ سکتا ہوں، تصور کرسکتا ہوں۔ عام انسانوں کی طرح میرا حافظہ صحیح و سالم ہے۔ مجھے بچپن سے اب تک کے سب واقعات معمولی سے معمولی واقعات حرف بحرف یاد ہیں۔ میں عالم تصور میں اُن کا مکمل نقشہ کھینچ سکتا ہوں، ایسا نقشہ جس سے معلوم ہونے لگے کہ تمام واقعات میرے روبرو ظہور پذیر ہو رہے ہیں۔ کیا ایک دیوانہ ایسا کرسکتا ہے۔ ہرگز نہیں مجھے اپنی زندگی کا وہ زمانہ یاد ہے جو صحیح معنیٰ میں حاصلِ زندگی کہا جا سکتا ہے یہ وہ زمانہ تھا جب میں اطمینان وسکون کے گہواروں میں جھولتا تھا، راحت و مسرت میری تابع فرمان تھیں، اس لئے تمام کائنات پر میری حکومت تھی۔ لیکن میں اس حکومت کا تنہا مالک نہ تھا، اس میں میری شریک ایک اور ہستی تھی، ایک مقدس روح۔ یہ زہرہ تھی، میری خالہ زاد بہن زہرہ۔ کیا وہ زمانہ، وہ عہد طفلی جو اُس کی معیت میں بسر ہوا، فراموش ہوسکتا ہے۔ کیا اُس زمانہ کا ایک ایک لمحہ میرے حافظہ میں محفوظ نہیں ہے، بے شک مجھے اپنے حافظہ پر ناز ہے، یہی ایک چیز ہے جو میرے لئے باعث سکون ہے، یہی ایک میری زندگی کا سہارا ہے۔ میں وہ وقت نہیں بھول سکتا، کوشش کے باوجود بھی نہیں، جب میں اور زہرہ اُس خوبصورت اور مختصر باغیچہ میں، جو اُن کے مکان سے ملحق تھا، اپنے فرصت کے لمحات گذارا کرتے تھے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ زمانہ تمامتر فرصت تھا، سوائے اُس مختصر وقت کے جو پڑھنے لکھنے میں صرف ہوتا تھا۔ اُس کی طبیعت میں سادگی تھی، سنجیدگی تھی اور جدت بھی۔ اُس کو مجھ سے محبت تھی، ایک بے لوث محبت۔ مجھکو اُس سے الفت تھی، ایک بے غرضانہ الفت۔ جب ہم باغیچہ کی روشوں پر ٹہلا کرتے، تو باغیچہ کی دنیا تقدیس محبت کے نشہ میں سرشار ہوجاتی، ہر شجر، ہر پتہ، ہر پھول مستانہ وار جھومنے لگتا، بلبل مسرور ہوکر راگ الاپ اٹھتی، طیور نغمہ ریزیاں کرتے اور تمام فضا ہماری محکوم نظر آتی۔ ہم شاہانہ وار خرام کرتے رہتے، حتیٰ کہ تھک کر کسی سایہ دار شجر کے نیچے بیٹھ جاتے اور زہرہ اپنے نرالے اور معصوم مشاغل میں مصروف ہو جاتی۔ وہ گلاب کا پھول توڑ کر چنبیلی کی ٹہنی میں اٹکا دیتی اور دور ہٹ کر اُس کی خوبصورتی کا جائزہ لیتی۔ کبھی چنبیلی کی کلیاں سبزہ پر بکھیر دیتی اور کہتی۔

"ظہیرا دیکھو کیسی بھلی معلوم ہوتی ہیں، جیسے اندھیری رات میں ستارے۔"

میں مسکرا دیتا، وہ خوش ہو جاتی اور باغیچہ کی مخلوق معلوم ہونے لگتی .... ایک کھلا ہوا پھول۔ ایک متبسم غنچہ جس کی تخلیق، حسن، سادگی، معصومیت اور محبت کے عناصر سے ہوئی ہو کبھی تتلی کو پکڑنے کی کوشش میں اُس کا تعاقب کرتی اور خود بھی ایک حسین و سادہ تتلی بن جاتی جو پرواز میں مصروف ہو۔ میں اُس واقعہ کو کبھی نہیں بھول سکتا جب زہرہ نے مجھے گلاب کا خوبصورت بڑا پھول توڑنے کے لیے کہا جو پیڑ کی سب سے اونچی شاخ پر لگا ہوا تھا اور اُس کی دسترس سے باہر تھا۔ اس پھول کے توڑنے میں مجھے بھی کوشش کرنا پڑی اور میرے ہاتھ پر کانٹے سے ایک معمولی خراش آگئی، جس کی وجہ سے ایک لہو کا قطرہ جلد پر نمایاں ہو گیا۔ وہ میرے نزدیک کھڑی تھی اور اُس نے خراش کو دیکھ لیا تھا۔ میں نے پھول اُس کی طرف بڑھا دیا، اُس نے ہاتھ میں لے لیا۔ مگر اُس کے چہرہ پر سرخی جھلک رہی تھی، غصہ کی سرخی۔ اُس نے پھول کو مسل کر پتی پتی کر دیا اور سبزہ پر بکھیر دیا۔ میں نے حیرت سے زہرہ کی جانب دیکھا۔ وہ نہایت بھولے پن سے بولی "یہ تو کچھ اچھا نہ تھا"............... اُف! انتقام لینے کا کس قدر معصوم اور سادہ طریقہ تھا۔

کون جان سکتا ہے کہ میں اُس زمانہ کے تصور میں کس قدر فرحت و سکون پاتا ہوں۔ میں خود کو ہلکا محسوس ہونے لگتا ہوں، ایک پھول سے زیادہ ہلکا۔ میری رگ رگ میں وہ گرم اور پاک خون دوڑنے لگتا ہے، میرا دل انھیں معصوم اور مقدس جذبات سے مملو ہو جاتا ہے، مجھے وہی اطمینانِ قلب نصیب ہو جاتا ہے جو بزرگوں کی شفقت اور زہرہ کی صحبت میں نصیب تھا اور میں ایک بار پھر اُسی عہدِ طفلی میں پہنچ جاتا ہوں۔ زہرہ، حسن، سادگی اور محبت کی پتلی تھی۔ میں اُس کی صحبت میں کس قدر مسرور نظر آتا تھا۔ اور اُس کی محبت سے علیحدہ ہو کر کتنی تکلیف ہوتی تھی۔ میری عدم موجودگی میں وہ ہر کام میں پوری سرگرمی دکھانے سے معذور رہتی اور میری شرکت کے بغیر کسی کھیل یا تفریح میں حصہ لینے کو تیار نہ ہوتی۔ میں بھی اُس سے الگ ہو کر مضمحل ہو جاتا، سخت مضطرب۔ ہم اکٹھا رہنا چاہتے تھے اور ہمیں ایک لمحہ کی جدائی بھی گوارا نہ تھی۔ مجھے وہ راتیں پوری طرح یاد ہیں، میں اُن کا ہو بہو تصور کر سکتا ہوں جب میں اسکول کا کام کیا کرتا تھا اور زہرہ میرے پاس بیٹھی ہوئی اپنا سبق یاد کیا کرتی تھی۔ اُس کی ننھی ننھی معصوم آنکھوں میں نیند کا خمار بھر جاتا، خالہ کہتیں "زہرہ! تمھاری آنکھیں نیند کی وجہ سے بند ہوئی جا رہی ہیں۔ بس، اب

سو رہو۔۔۔ وہ جواب دیتی "امی جان! تھوڑا سا سبق اور رہ گیا ہے" لیکن وہ سبق اُس وقت تک ختم نہ ہوتا جب تک میں اپنے کام سے فارغ ہو کر اُٹھ نہ جاتا۔

زہرہ میری تقلید کرنے میں فرحت محسوس کرتی اور اُس پر فخر کیا کرتی۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ میں بیمار ہو گیا اور اُس چارپائی پر لیٹا ہوا تھا جو ہمارے مطالعہ کے کمرہ سے ملحق ایک کمرہ میں بچھی ہوئی تھی۔ زہرہ کے پڑھنے لکھنے کا وقت تھا مجھے شدت کا تپ چڑھا ہوا تھا۔ زہرہ بار بار آ کر پوچھ رہی تھی "ظہیر! تم اب کیسے ہو؟" میں ہر بار کہہ دیتا "اچھا ہوں" لیکن اُس کو اطمینان نہ ہوتا تھا۔ اُس کی خوبصورت آنکھوں سے پریشانی برس رہی تھی۔ خالہ نے جبکہ مجھے دوا پلانے کے لیے آئی تھیں کہا "زہرہ! تم کیوں وقت ضائع کر رہی ہو، جا کر سبق یاد کرو"

زہرہ نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا "امی جان! ہمارے سر میں درد ہو رہا ہے ہمیں بھی دوا پلا دو"

وہ بے ساختہ ہنس پڑیں اور زہرہ کو محبت بھری نظروں سے دیکھ کر کہا۔

"میری بچی! تم کس قدر بھولی ہو"

فی الحقیقت اُس نے نرالے انداز میں اظہار ہمدردی کیا تھا۔

مسرت وشادمانی کا زمانہ کتنی جلد ختم ہو جاتا ہے۔ اس عہد کے سال بھی لمحات بن کر گذر جاتے ہیں اور انسان کے لوحِ دل پر نقوش چھوڑ جاتے ہیں، وہ دل آویز نقوش جو مصیبت کے زمانہ میں بھی اس کا دل بہلاتے رہتے ہیں۔ وہ اُس زمانہ کے تصور میں اپنی مصیبت کو بھول جاتا ہے اور کچھ عرصے کے لئے مطمئن ومسرور ہو جاتا ہے۔ لیکن اس تصور سے وہی لطف اندوز ہو سکتا ہے جو سلیم الطبع ہو، جس کے قوائے ذہنی سالم ہوں نہ کہ ایک دیوانہ جس کی قوت تخیل مسلوب ہوتی ہے اور جس کے دماغ سے ماضی کی یاد یکسر محو۔

اب ہم اُس زمانہ کو خیرباد کہنے والے تھے جو سرور وانبساط کے زریں خزانوں کی وجہ سے شاہی زمانہ کہلاتا ہے اور اُس عہد سے ہم آغوش ہونے کو تھے جو صدہا نیرنگیوں کا حامل ہوتا ہے۔ اب ہماری عقل میں پختگی آ چلی تھی ہماری قوتِ تمیز روبہ ترقی تھی، ہم میں آغاز وانجام کے تعلق کو سمجھنے کی قابلیت پیدا ہو چلی تھی، غرضیکہ ہمارے جملہ قوائے ذہنی تکمیل کی طرف مائل تھے۔ ہماری عادات واطوار، نشست وبرخاست، گفت وشنید، الغرض تمام حرکات وسکنات

میں ایک نمایاں تبدیلی واقع ہوگئی تھی۔ لیکن میں زہرہ کو اپنے سے زیادہ متغیر پاتا تھا۔ اب وہ سنجیدگی خاموشی اور حیا کا حسین مجسمہ تھی۔ اس غیر معمولی انقلاب نے زہرہ کو میرے لیے پراسرار بنا دیا تھا۔ وہ محبت کے جراثیم جو بچپن سے ہمارے سینوں میں پرورش پا رہے تھے اب اُس میں بالکل مفقود معلوم ہوتے تھے اور اُس کا ساغرِ دل اُس مئے مقدس سے بالکل خالی نظر آتا تھا جو اکثر چھلک کر اُس کی خوبصورت آنکھوں میں آ جایا کرتی تھی۔

اب میری رہائش ہمارے اپنے مکان میں تھی جو اُس مکان سے قریباً نصف میل پر شہر کے دوسرے حصہ میں واقع تھا۔ وہ سایۂ رحمت جس کو والدہ کے مقدس نام سے موسوم کرتے ہیں، میرے سر سے اُس وقت ہی اُٹھ گیا تھا جبکہ میری عمر صرف ۲ سال تھی۔ میں خالہ سے بہت مانوس تھا اور یہی وجہ تھی کہ میری پرورش کا بار انہوں نے اپنے ذمہ لے لیا تھا۔ یہ نقلِ مکان کسی نامعلوم مصالح کی بنا پر ہوا تھا، جن کو سمجھنے سے میں آج تک قاصر رہا۔ لیکن کیا میں اُس جگہ کو جہاں میں نے اپنی عمر کا بہترین حصہ گذارا تھا یک قلم فراموش کر سکتا تھا؟ مجھے ہر روز آنے کی سخت تاکید کی گئی تھی اور فی الحقیقت میں فرصت کا بیشتر وقت وہیں گذارا کرتا تھا۔ لیکن کیا یہ اس لئے تھا کہ مجھے اپنی محسنہ خالہ کے ارشاد کی تعمیل مدِنظر تھی۔ شاید مجھے اس کا خیال ہی نہ آتا ہوگا۔ بلکہ یہ اُسی جذبہ کی کارفرمائیاں تھیں جو مجھے بچپن میں ہمیشہ زہرہ کے قریب رہنے پر مجبور کرتا تھا۔ مجھے اب بھی اس سے علیحدہ ہو کر اتنی ہی، بلکہ اُس سے کہیں زیادہ تکلیف پہنچتی تھی جتنی کہ اُس وقت۔ لیکن کیا زہرہ کے دل و دماغ سے پرانے اثرات بالکل محو ہو گئے تھے، کیا اُس کو عہدِ طفلی کی بھول کر بھی یاد نہ آتی تھی، کیا اب اُس کو مجھ سے قطعاً محبت نہ تھی؟ یہ تھا وہ عقدہ جس نے مجھ کو سخت الجھن میں ڈال رکھا تھا۔

وقت گذرتا جا رہا تھا۔ میرے قلب میں شرارِ محبت بھڑک رہا تھا اور شعلہ کی شکل اختیار کر رہا تھا۔ یہ شعلہ میرے دل و دماغ حتیٰ کہ روح تک پر مسلط ہو چلا تھا جس کی حرارت سے میں پھنکا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ زہرہ اب زیادہ پراسرار تھی۔ وہ میرے سامنے بہت کم آتی تھی اور میں اب اُس نگاہِ غلط انداز سے بھی محروم کر دیا گیا تھا جو اس سے قبل کبھی کبھی مجھ پر پڑ جاتی تھی۔ جس قدر یہ معمہ زیادہ دشوار و لاینحل ہوتا جاتا تھا اتنا ہی میں اس کے حل کے لیے زیادہ سرگرم و بے تاب نظر آتا تھا۔ قطع نظر اس کے کہ وہ میرے روبرو ہوتی یا نہیں میں اِس مکان میں ایک گونہ اطمینان محسوس کرتا تھا، کیونکہ میں حتیٰ المقدور زہرہ کے قریب ہوتا تھا۔ تاہم مجھے تنہائی کی تلاش تھی، صرف

دو لمحہ کی تنہائی۔ میں اُس سے ایک سوال کرنا چاہتا تھا جس کا جواب آسانی سے اس معمہ کو حل کر دیتا۔

"کیا تم وہی زہرہ ہو؟"

لیکن اُس نے کبھی اتنا موقعہ نہ دیا۔ حتیٰ کہ مشیتِ ایزدی نے میری مدد کی اور میں نے وہ گوہر مقصود اتفاقیہ پا لیا جس کے لیے میں ایک طویل مدت سے مضطرب تھا۔

مجھے بخوبی یاد ہے کہ قمری مہینہ کا آغاز تھا۔ چاندنی ہر سمت چھٹکی ہوئی تھی، اور میں اُس باغیچہ میں سے گذر رہا تھا جو اُن کے مکان سے ملحق ہے۔ میں شاید اُس روز بے حد مصروف رہا تھا، اس لئے خلافِ معمول، دن میں پہنچنے سے قاصر رہا۔ ایک سرو کی آڑ میں روش سے اُس طرف زہرہ بیٹھی تھی۔ میں اُس کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ میں نے اُس کو پہچان لیا تھا میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور امید و بیم کے جذبات سے لبریز ہو گیا۔ قدرت نے قسمت آزمائی کے لیے نہایت مناسب موقع دیا تھا جس کے لئے میں ایک مدت سے پریشان تھا۔ لیکن اب میں خود میں زہرہ کے قریب پہنچنے کی ہمت نہ پاتا تھا۔ میرا دماغ مختلف و متضاد خیالات کا آماجگاہ بن گیا تھا۔ میں نہیں سمجھ سکتا تھا کہ اگر اُس کا جواب مایوس کن ہوا جس کا ایسے حالات کی موجودگی میں زیادہ امکان تھا تو میرا کیا انجام ہوگا۔ لیکن فوراً ہی امید سے میری رگ رگ میں مسرت کی لہر دوڑ جاتی تھی۔ یہ کیفیت تذبذب مجھ پر زیادہ دیر تک مسلط نہ رہ سکی۔ اب میں نے فیصلہ کر لیا تھا اور ہمت کر کے اُس سرو کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا جس کی دوسری جانب زہرہ بیٹھی تھی۔ چاندنی نے اُس کے حسن میں چار چاند لگا دیئے تھے۔ اور وہ نور کا مرمریں مجسمہ معلوم ہوتی تھی۔ میں سرو کے پاس جا کر رک گیا کیونکہ میں نے زہرہ کو عجیب کام میں مشغول پایا۔ اُس کے ہاتھ میں گلاب کی پتیاں تھیں جن کو وہ سبزہ پر ترتیب دے رہی تھی۔ میں کچھ اور آگے بڑھا تاکہ پوری طرح دیکھ سکوں کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ اف! میں نے ایک نرالا نقشہ دیکھا ایک ناقابل اعتبار منظر مجھے اپنی آنکھوں، اپنے دماغ حتیٰ کہ موجودگی تک کا اعتبار نہ رہا۔ میں اُس کو ایک خواب، ایک دل خوش کن خواب سمجھنے لگا۔ لیکن یہ خواب نہ تھا بلکہ حقیقت میں سبزہ پر گلاب کی پتیوں سے

"ظہیر"

لکھا ہوا تھا۔ یہ نقش میری لوحِ دماغ پر آج تک ایسے ہی کندہ ہے جیسے قبر کے سرہانے پتھر پر تحریر ——— میں

دیوانہ وار زہرہ کی جانب بڑھا، وہ میری آہٹ پاکر چونک پڑی مڑ کر سہمی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا اور تمام پتیوں کو سبزہ پر منتشر کرکے کھڑی ہوگئی۔ میں چاہتا تھا کہ اُس کے معصوم قدموں پر گر کر اتنے اشک ندامت بہاؤں کہ میرا بدگمان قلب پانی ہوکر بہ نکلے اور زہرہ میری اس غلطی، اس خطرناک تقصیر کو معاف کردے۔ لیکن میری مایوسی اور افسوس کی کوئی انتہا نہ تھی جب میں نے دیکھا کہ وہ مکان میں داخل ہوچکی ہے۔

اف! میں نے اُس کو سمجھنے میں کس قدر دھوکا کھایا تھا، کتنا زبردست فریب۔ میں حیرت وندامت کی تصویر بنا کھڑا تھا۔ میرے دماغ میں سینکڑوں خیالات آتے تھے اور شرمندگی وپشیمانی کا احساس چھوڑ جاتے تھے میں نے زہرہ کے بارے میں کتنی غلط رائے قایم کی تھی۔ کاش مجھے اس سے قبل معلوم ہوتا کہ :-

عورت کی فطرت سمندر سے زیادہ عمیق، پہاڑ سے زیادہ مستقل اور صحرا سے زیادہ خاموش ہوتی ہے۔

حصولِ تعلیم کے بعد مجھکو ملازمت مل گئی۔ اس لیے میرٹھ آنا پڑا۔ یہ ساری عمر میں پہلا موقع تھا کہ میں وطن سے باہر نکلا۔ اُن شفیق ہستیوں کا جنھوں نے اپنے بچوں کی طرح میری پرورش کی تھی یہ حکم تھا کہ میں ہفتہ میں کم از کم دو بار اپنی خیر وعافیت کی اطلاع بھیجا کروں، تاکہ وہ مطمئن رہیں۔ اور انھوں نے بھی ایسا کرنے کا وعدہ کیا تھا

کون کہہ سکتا ہے کہ میں یہاں کس قدر تکلیف میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ میری زندگی بعینہ اُس طائر کی سی تھی جو اُس کے آشیانے ہمصفیروں اور آزاد فضا سے جُدا کرکے ابھی مقید کیا گیا ہو اور قفس میں تنہا بھی ہو اور جو دفورِ غم کی وجہ سے، گانے، کھانے پینے، غرضیکہ اپنی زندگی تک میں کوئی دلچسپی نہ پاتا ہو اس مایوسی کے زمانہ میں میرے دو رفیق تھے، ایک مہربان خالو صاحب کا خط، جس میں بالتفصیل سب کی خیریت مذکور ہوتی تھی اور دوسرے زہرہ کا تصور۔ یہی ایک حد تک میری تسلی اور اطمینان کا باعث تھے اور ایسی حالت میں مجھے زندہ رکھنے کے ذمہ دار۔

یہ بے بنیاد وہم کہ زہرہ میں فقدانِ جذبات ہے کبھی کا مٹ چکا تھا۔ اب مجھے اس کا خیال بھی تکلیف دیتا تھا وہ تکلیف جو پشیمانی سے پہنچتی ہے۔ یہ اعتقاد ہی نہیں بلکہ میرا ایمان تھا کہ زہرہ کی خلقت میں محبت کا عنصر بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اور وہ اس لئے پیدا ہوئی ہے کہ محبت کی جائے اور کرے۔ لیکن چونکہ وہ فطرت سے مجبور تھی، اس لیے

اظہارِ محبت سے معذور۔ برخلاف اس کے میں چاہتا تھا کہ میرے جذبات کی پذیرائی ظاہرا طور پر کی جائے۔ مجھے اس خیال میں ایک لذت، ایک دلکش کیفیت محسوس ہوتی تھی اور میں ہر اُس کوشش میں ایک لطف حاصل کرتا تھا جو اس مقصد کے حصول کے لیے کی جا سکتی۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے مسلسل دو ہفتہ تک کوئی خط نہ بھیجا۔ اس سے مجھ کو بجز اس کے اور کچھ منظور نہ تھا کہ میں اپنی محبت کا عملی جواب چاہتا تھا..... شاید میں بھی فطرت سے مجبور تھا۔

آخر کار اس کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا۔ مجھے خط ملا جو مختصر ہونے کے باوجود مرسل کے جذبات کی پوری آئینہ داری کر رہا تھا۔ لکھا تھا:-

"ظہیر! کیا تم نہیں سمجھتے کہ تمہاری خیر و عافیت کی خبر نہ پا کر وہ لوگ کس قدر پریشان ہو جاتے ہونگے جو تم سے اس قدر محبت کرتے ہیں۔

زہرہ"

ضمیر مجھکو ملامت کر رہا تھا۔ میں افسوس اور ندامت سے زمین میں گڑا جا رہا تھا۔ خود پر اور اُس طفلانہ جذبہ پر جس کے زیرِ اثر میں نے ایسا کیا تھا ناراض ہو رہا تھا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں اپنی فطرت، اپنی ہستی تک کے خلاف ہو جاؤں گا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ زہرہ کو میری اس خاموشی سے تکلیف پہنچی ہے۔ ایسی تکلیف جس نے اس کے پیمانۂ صبر کو چھلکا دیا اور وہ پُر اسرار آواز تھی جو بار بار میرے کانوں میں آ رہی تھی۔

وہ جو دوسروں کے جذبات کی قدر نہیں کرتے، ہرگز مستحق نہیں کہ اُن کے جذبات کی قدر کی جائے۔

مجھ میں پچھلے دنوں کی نسبت اب نمایاں تبدیلی نظر آتی تھی۔ میں ہر کام میں، ہر شغل میں، ہر تفریح میں سرگرمی سے حصہ لیتا تھا۔ وہ دفتر کا کام جو کبھی بار معلوم ہوتا تھا، اب نہایت دلچسپی اور عمدگی سے انجام پا رہا تھا۔ میں ایک فرحت محسوس کرتا تھا، وہ فرحت جو آنے والی مکمل مسرت کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ اب مجھے تنہائی خوش آتی تھی اور میں دلکش تصورات کے بے پایاں سمندر میں غرق ہو جاتا تھا، جس میں مستقبل کے دلچسپ اور فرحت بخش مناظر پیش نظر آتے اور میں ہر شب خواب میں آنے والی مسرتوں کا بیش بہا خزانہ پا لیتا تھا۔

کیا یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ میں اس طرز زندگی کا عادی ہو گیا تھا۔ شاید یہ بھی ہو لیکن اس کی سب

سے بڑی اور حقیقی علت یہ تھی کہ ـــــــ اب زہرہ میری منسوبہ تھی۔

زمانہ بہت گراں فروش ہے، اس کے ایک لمحۂ مسرت کی قیمت مصیبت و آلام کا وہ طویل زمانہ ہے، جس کی تاب نہ لاکر انسان خودکشی پر آمادہ ہو جاتا ہے اور یہ خوشی کے ایک تبسم کی عوض وہ بے شمار خونناب آنسو وصول کرتا ہے جو اصل میں قلب گداختہ ہوتے ہیں جس کو آتشِ غم نے پگھلا کر آنکھوں سے بہا دیا ہو۔ اُس نے مجھ سے بھی رعایت نہ کی اور اُس مختصر و مسرور زمانہ کی اس قدر قیمت ٹھہرائی جس کو میں اس وقت تک ادا نہ کر سکا۔

میں اُس واقعہ کو نہیں بھول سکتا جس نے میری زندگی میں ایک عظیم تغیر پیدا کر دیا اور جو مجھے دیوانہ کہہ دینے کا اصلی ذمہ دار ہے جب کہ میں حقیقت میں دیوانہ نہیں ہوں۔

مجھے یاد ہے کہ میں دفتر میں تھا اور اپنے کارِ منصبی میں نہایت سرگرمی سے مشغول تھا۔ میرا دل مسرت آمیز امید سے مملو تھا۔ میں ہر معمولی سے معمولی بات، ہر ادنےٰ سے ادنےٰ چیز میں دلچسپی اور دل لگی کا سامان پاتا تھا اور خواہ مخواہ مسکرا دیتا تھا گویا میں ایک ساغر تھا جو مے گلگوں سے اس قدر لبریز کر دیا گیا ہو کہ ذرا سی حرکت سے چھلک پڑے۔ اُسی وقت مجھے ایک خط ملا۔ میں نے لفافہ کی تحریر سے پہچان لیا کہ یہ زہرہ کا خط ہے۔ خلاف معمول زہرہ کا خط پا کر میں وفورِ شادمانی سے نیم دیوانہ سا ہو گیا اور میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لفافہ چاک کیا، لیکن . . . . اُس کے اندر برق تھی، وہ برق سوزاں جس نے میرے خرمنِ مسرت کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا۔

خط کا مضمون تھا:۔

"ظہیر! خدا حافظ

تمھاری زہرہ" ~~تمھاری~~، قلم زدہ

میرا دماغ چند لمحوں کے لئے معطل ہو گیا۔ میرے ہاتھ سے خط چھوٹ گیا اور میں دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر میز پر جھک گیا۔

اب میں اس مبہم اور غیر واضح مضمون کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرے دماغ میں سینکڑوں خیالات پیدا ہوتے تھے اور مٹ جاتے تھے جس طرح سطح آب پر حباب بن بن کر ٹوٹ جاتے ہیں۔ اور میں کوئی مستقل رائے قائم نہ کر سکا۔ لیکن وہ لکیر جو 'تمھاری' کے اوپر کھینچ دی گئی تھی ایک تیر کی طرح میرے قلب میں پیوست ہو گئی تھی جس نے سینہ میں

محشر برپا کر دیا تھا، وہ ایک آہنی سلاخ معلوم ہوتی تھی جو میرے دل پر داغ دینے کے لیے گرم کی گئی ہو۔ میں اس لکیر سے خوف کھا رہا تھا۔ اور اُس کی طرف دیکھنے کی تاب نہ لا سکتا تھا۔ گویا وہ ایک سانپ تھی، ایسا خوفناک زہریلا سانپ جس کی طرف دیکھنے ہی سے میرے تمام جسم میں زہر دوڑ جائے گا۔

آخر کار میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ ضرور کوئی حادثہ پیش آیا ہے، ایسا جانکاہ حادثہ جس کے خیال سے میں کانپ اٹھتا تھا ورنہ زہرہ کی سی سنجیدہ اور خاموش ہستی کبھی خط لکھنے کی جسارت نہ کرتی اور خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ ایسا کرنا رسمؔ ممنوع بھی سمجھا جاتا ہو۔ اب مجھکو نامعلوم واقعہ کی اہمیت کا پورا یقین تھا بلکہ میں ایک حد تک واقعہ کی نوعیت بھی سمجھ گیا تھا، جس کی صراحت خط کا مختصر مضمون کنایۃً کر رہا تھا خصوصاً قلم کشیدہ "تمہاری"۔ تاہم میں کلّی وقوف حاصل کرنے کے لیئے بے تاب تھا۔

بڑی مشکل سے مجھکو دو دن کی رخصت ملی اور میں فوراً وطن روانہ ہو گیا۔ مجھے یہاں پہنچکر وہی واقعہ پوری طرح معلوم ہو گیا جس کو بڑی حد تک میں نے خط کے مضمون سے سمجھ لیا تھا۔ اور اُس چراغ اُمید کو جو ابھی تک ٹمٹما رہا تھا اس اندوہناک خبر نے بالکل گل کر دیا۔ اُف! کس قدر تکلیف دہ حادثہ تھا، کتنا روح فرسا۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ چند خانگی مناقشات کی بنا پر نسبت منسوخ ہو گئی ہے اور مصالحت کی ظاہرا کوئی امید نہیں۔

اس جانکاہ حادثہ سے مجھکو کتنا صدمہ پہنچا، اس کو وہی سمجھ سکتا ہے جس کی تمام امیدیں منقطع ہو گئی ہوں، جس کو آسمانوں کے نیچے مایوسی ہی مایوسی نظر آتی ہو اور ایک اجنبی کی طرح تمام انسان ناآشنا اور بیگانہ معلوم ہوتے ہوں، جو کثرتِ ہجوم سے گھبرا گیا ہو اور اس بے کیف زندگی سے تنگ آکر موت کا آرزومند ہو۔ میں یاس و حرماں کے جاں گسل بھنور میں گھر گیا تھا۔ مجھے زندگی میں کوئی دلچسپی نظر نہ آتی تھی اور میں دنیا کے اس غیر مستقل ہنگامہ سے جو سراب کی طرح نظر فریب ہے الگ رہنا چاہتا تھا۔ قسمت نے میرے اور زہرہ کے درمیان ایک خلیج حائل کر دی تھی جس کا عبور کرنا دشوار نظر آتا تھا ...... مگر کاش میں کوشش کر دیکھتا۔

میں نے بڑی جد و جہد کے بعد مدراس کی تبدیلی کرالی۔ میرا خیال تھا کہ یہاں کے قدرتی مناظر میرا غم غلط کرنے میں معین ثابت ہونگے، اور حقیقت یہ ہے کہ میں اس حادثہ کی جائے وقوع سے حتی المقدور دور رہنا چاہتا تھا لیکن

میرا خیال خام ثابت ہوا اور یہاں میری حالت زیادہ خراب ہو گئی۔

شروع میں آفس کے بعد کا وقت میں محض اس لئے سیر میں گذار دیتا تھا کہ ساحل کی فرحت بخش ہوا، پانی کی نظر فریب وسعت، بحر و بر کے اتصال کا دل آویز منظر شاید میرے مجروح دل کے لیے باعثِ راحت و سکون ہو سکیں مگر میں ناکام رہا۔ آخر میں نے اس رویہ کو بھی ترک کر دیا اور اب میں تھا اور وہی تنہائی۔ اب میرے لیے میرٹھ و مدراس یکساں تھے بلکہ مجھکو یہاں زیادہ تکلیف پہنچ رہی تھی کیونکہ جس اُمید پر میں یہاں آیا تھا وہ نقش بر آب ثابت ہوئی اور یہ خیال کہ دوری باعث تسکین ہو سکے گی موہوم نکلا۔

میرے پاس وطن سے کبھی کبھی خطوط آتے رہتے تھے اور کسی کسی میں کنایتہً اُس گھر کا تذکرہ بھی ہوتا تھا جس کو میں ابھی تک اپنا گھر سمجھتا تھا۔ لیکن ایک خبر نے میری مایوسی کو مکمل کر دیا۔ وہ خلیج جو میرے اور زہرہ کے درمیان حائل ہو گئی تھی اور جس کو پار کرنا صرف دشوار تھا، بڑھکر ایک ناپیدا کنار سمندر ہو گئی جس کو عبور کرنا میرے امکان سے قطعاً باہر تھا۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ زہرہ کا نکاح اُس کے پھوپھی زاد بھائی سے ہو گیا ہے اور رخصتی آغاز سرما میں ہو گی جس میں ابھی چھ ماہ باقی تھے۔ یہ قسمت نے ایک اور ضرب لگائی تھی لیکن وہ شخص جو زندگی سے بیزار ہو گیا ہو سخت سے سخت صدمہ بھی آسانی سے برداشت کر لیتا ہے۔

مجھ کو زہرہ سے اب وہ محبت تھی جو صحیح معنیٰ میں حقیقی محبت کہلا سکتی ہے۔ میں اُس کی مادی ہستی سے بالکل بے نیاز تھا۔ مجھے اُس کی روح سے محبت تھی اور میں محبت کے لیے محبت کرتا تھا۔

اب میں اُس شخص کی سی زندگی بسر کر رہا تھا جو دنیاوی تعلقات کے باوجود بھی تارک الدنیا ہو——ذہنی تارک الدنیا۔

مجھکو زہرہ کی علالت کی خبریں برابر پہنچ رہی تھیں اور میں ہر بار پریشان ہو جاتا تھا۔ لیکن اب میں بالکل بدل گیا تھا اور سیماب کے مانند نہ رہا تھا جو ذرا سی حرارت سے تڑپ اُٹھتا ہے۔ میں ہر صدمہ کو نہایت صبر سے برداشت کرنے کا عادی ہو گیا تھا اور ہر سخت سے سخت تکلیف کا آسانی سے متحمل ہو سکتا تھا۔

مجھکو یہاں آئے ہوئے پانچ ماہ ہوئے تھے، موسم گرما اختتام پر تھا کہ خلاف توقع زہرہ کا آخری خط پہنچا۔ میں فرطِ حیرت سے مبہوت سا ہو گیا۔ آخر ایسی کیا وجہ ہو سکتی تھی جس نے زہرہ کو ان حالات کی موجودگی میں خط لکھنے پر مجبور کیا۔ لیکن مضمون نے میری حیرت دور کر دی۔ وہ مضمون مجھے لفظ بہ لفظ یاد ہے۔ میں اُس کو ہرگز نہیں

بھول سکتا اور شاید وہ میرے حافظہ سے مر کر بھی محو نہ ہو سکے گا۔ اُس نے لکھا تھا:۔

ظہیر! خلاف توقع میرا خط پا کر تم حیران ہو گے واقعی میں بہت جرأت کر رہی ہوں، انتہائی دلیری۔ لیکن حیران نہ ہو۔ میں نے جب کہ چند روز کی مہمان ہوں یہ مناسب سمجھا کہ تم کو اُن واقعات سے آگاہ کر دوں جن کی بنا پر تم میرے بارے میں صحیح رائے قائم کر سکو، تمھیں معلوم ہو جائے کہ میں اس سخت امتحان میں کس حد تک کامیاب رہی اور تم میری مغفرت کے لئے خلوص دل سے دعا کر سکو۔

"شاید تم نہیں جانتے کہ عورت کے جذبات میں کس قدر استقلال ہوتا ہے۔ اس کا انتخاب کتنا سنجیدہ ہوتا ہے اور اُس کا فیصلہ کس قدر قطعی۔ وہ جو فیصلہ کر لیتی ہے، اس پر مستقل مزاجی سے قائم رہتی ہے اور کوئی ناکامی یا مصیبت اُس کے قدموں کو ڈگمگا نہیں سکتی عورت کی فطرت کی نمایاں خصوصیت محبت ہے جس کے لئے وہ ایک کو منتخب کر لیتی ہے اور دنیا کی کوئی طاقت اس انتخاب کو باطل نہیں کر سکتی وہ ایک کی ہو کر کسی حالت میں بھی دوسرے کی نہیں ہو سکتی۔ وہ محبت میں شرکت کو گناہ سمجھتی ہے۔ عورت مایوسی کی حالت میں ضبط تحمل اور خاموشی شعار بنا لیتی ہے اور اکثر اوقات یہ ضبط غم اس کو گھلا گھلا کر نابود کر دیتا ہے۔ برخلاف اس کے تم ذرا سی ناکامی سے اس قدر مایوس ہو جاتے ہو کہ حصولِ مقصد کے لئے دوبارہ کوشش کرنا تحصیل حاصل سمجھتے ہو۔ تم اُس ہستی کو جسے تم محبوبہ کے مقدس نام سے یاد کرتے ہو، جو تمھاری آرزوؤں کا مرکز ہوتی ہے، دوسرے کی شریک حیات دیکھنا ٹھنڈے دل سے گوارا کر لیتے ہو اور غم مایوسی کو مختلف مشاغل میں محو کرنے کی کوشش کرتے ہو۔ کاش وہ صنف قوی جو خود کو عقلِ کل کا حامل سمجھتی ہے عورت کی حقیقت کو سمجھتی تا کہ سینکڑوں معصوم ہستیوں کا خون اپنی گردن پر لینے سے محفوظ رہ سکتی۔

"ظہیر! میں نے یہ خط مجبور ہو کر لکھا ہے، اور یہ میری پہلی اور آخری بے باکی ہے، جس کو امید ہے کہ تم معاف کر دو گے۔ میں اب لکھنے کے لئے مجبور تھی تا کہ تم اصلیت سے آگاہ ہو کر مجھ کو اپنی محبت کے نااہل ہونے کا الزام نہ دو اور میری روح کو پسِ مرگ اطمینان و سکون

نصیب ہو سکے میری آخری تمنا ہے کہ تم کو ایک بار ....

"میں یہ خط ناتوانی کی وجہ سے تین دن میں پورا کر رہی ہوں مجھے تمھارا پتہ صرف اس قدر معلوم ہے کہ تم مدراس میں اسی ڈیپارٹمنٹ میں ملازم ہو جس میں کہ پہلے تھے۔ خدا کرے کہ یہ خط تم کو وقت پر مل جائے۔

"ز"

وہ لائحۂ زندگی جو میں نے ایک کوشش کے بعد مرتب کیا تھا۔ اس مضمون سے منتشر ہو گیا۔ اور وہ ضبط جواب میری زندگی کی نمایاں خصوصیت تھا، مفقود ہو گیا۔ میں چاہتا تھا کہ مجھ میں تخیل کی سی تیز پروازی آجائے اور میں جلد سے جلد وطن پہنچ سکوں تاکہ زہرہ کی آخری آرزو جو حقیقت میں میری اپنی آرزو تھی پوری ہو سکے۔ لیکن وطن پہنچ کر جب مجھے معلوم ہوا کہ زہرہ کا دیدار اس دنیا میں ناممکن ہے تو......

سورج غروب ہو چکا ہے۔ ہر سمت تاریکی چھا رہی ہے۔ ہر شے ماتمی لباس میں ملبوس نظر آتی ہے۔ قبروں پر سیاہ غلاف چڑھ گئے ہیں، کتبے دھندلے دھندلے نظر آتے ہیں۔ سکوت زیادہ خوفناک ہو گیا ہے۔

اب تم مجھے دیوانہ نہ کہو گے۔ بے شک تم دروغ بیانی سے پرہیز کرتے ہو۔ تم نے میری تاریخ حیات کا ایک ایک لفظ سن لیا ہے۔ دیکھا؟ میں کس قدر صراحت سے بیان کر سکتا ہوں۔ دیکھو تم پھر مسکرا رہے ہو۔ للہ مذاق نہ کرو کیا تم کو مجھ سے ہمدردی نہیں ہے۔ مگر تم...... تم کون ہو؟ اف یہ تو قبر کا کتبہ ہے میں کس سے باتیں کر رہا ہوں۔ کس سے باتیں کر رہا ہوں۔ کیا پتھر سن سکتا ہے سمجھ سکتا ہے۔ لیکن..... یہ تو قبر کو جنبش ہو رہی ہے...... ...
اف! سارا قبرستان گھوم رہا ہے......وہ......آسمان نیچے آ رہا ہے...... یا خدا! یہ کیا ہو رہا ہے ....
......آہ......کیا میں واقعی.........د........یو......ا......نہ......ہوں؟

شفیق احمد غازی
بی اے (علیگ)

افکارِ پریشان

دیوانہ کر دیا ہے غمِ انتظار نے — اب تک خبر نہ لی مری غفلت شعار نے

اوروں کی کیا خود اپنی بھی سُدھ بُدھ نہیں رہی — دنیا سے کھو دیا ہمیں ظالم کے پیار نے

پھولوں سے ہیں لدی ہوئی سرسبز ڈالیاں — کیا چھاؤنی سی چھائی ہے فصلِ بہار نے

دنیا کے فکر، دین کی باتیں، خدا کی یاد — سب کچھ بھلا دیا تیرے دو دن کے پیار نے

توبہ بھلائے دیتی تھی پیرِ مغاں کا گھر — اُٹھ کر بتا دیا ہمیں ابرِ بہار نے!

بیمارِ شامِ ہجر کے آنسو نکل پڑے — کیا کہہ دیا ستارۂ شب زندہ دار نے

دنیا تمام نشّے سے لبریز ہو گئی — برسائی ہے شراب سی ابرِ بہار نے

نور و سرور و نکہت و مستی سے بھر دیا — گلشن کو اُن کی لغزشِ مستانہ وار نے

لو! دیکھو! وہ نقاب کسی کا اُلٹ گیا — کیا چھیڑ کی ہے موجِ نسیمِ بہار نے

مخمورِ خواب، بسترِ گُل سے اُٹھے ہیں وہ — انگڑائی لی ہے باغ میں صبحِ بہار نے!

مسحور کر لیے ہیں بتانِ حرم کے دل
اختر ہمارے خامۂ رنگیں نگار نے!

اختر شیرانی

بعض ادب دوست خواتین نے دادِ کلام دی تھی۔ مقطع میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

سیکری

گلستانِ سیکری میں کل ہوا میرا گذر
جس کا ہر پتہ ہے صدیوں سے خزاں کا نوحہ گر

دل تڑپ اُٹھا وہ حسرت خیز منظر دیکھ کر
نقشِ حیرت بن گیا دیوار اور در دیکھ کر

کچھ کھنڈر پائے قضا کے ہاتھ سے ٹوٹے ہوئے
جیسے صحرا میں پڑے ہوں کارواں لوٹے ہوئے

سیکری تو بھی کبھی فخرِ بلادِ ہند تھی
تیری شہرت بھی کبھی بنگال سے تا سندھ تھی

اکبرِ ذی جاہ کی آنکھوں کا گویا تارا تھی
اور جہانگیر ابنِ اکبر کا تو ہی گہوارا تھی

اکبرِ اعظم کہا کرتا تھا تجھکو فتح پور
آج قسمت کی شکستوں سے ہوئی تو چور چور

گردشِ افلاک نے کیوں زیر تجھکو کر دیا
زندگانی سے بتا کیوں سیر تجھکو کر دیا ؟

آہ تجھ میں بادشاہوں کے تھے وہ عالی محل
جن کی رفعت ہر طرف دنیا میں تھی ضرب المثل

سرنگوں شاہانِ عالم تھے اسی دربار میں
تھا زحل اک پاسبان ادنیٰ سا اس سرکار میں

اب نہ وہ میخانۂ عشرت نہ مے کا دور ہے
محفلِ دوشینہ ہی برہم کچھ نرالا طور ہے

تاجداروں کو جہاں دشوار کل تک بار تھا
آج واں جا کر جو دیکھا خاک کا انبار تھا

ہر فضا میں کس بلا کی خامشی چھائی ہوئی
کیسی نابود آہ اگلی محفل آرائی ہوئی

اللہ اللہ کیا تھا اور کیا ہو گیا اس دور میں
منقلب عالم کا نقشہ ہو گیا اس دور میں

کانپتی تھی جن سے خلقت اب نشاں ان کا نہیں
جس پہ جھکتا تھا فلک وہ آستاں ان کا نہیں

ہو گئے معدوم کچھ ایسے پتا ملتا نہیں
گم ہوئے ایسے سراغِ نقشِ پا ملتا نہیں

تھی جہاں گردن کشوں کو سر ہٹانے کی نہ تاب
اب وحوش و طیر واں پھرتے ہیں بے حد و حساب

رکھتے تھے جس خاک پر شاہانِ عالم اپنے سر
وارد و صادر وہاں رکھتے ہیں جوتے بے خطر

دیکھ کر غمناک منظر محفلِ برباد کا
حسب موقع شعر آیا لب پہ اک استاد کا

"پردہ داری میکند بر قصرِ کسریٰ عنکبوت
چغد نوبت می زند بر گنبد افراسیاب"

دوسری جانب نگہ اُٹھی تو یہ آیا نظر
خاک میں آسودہ ہے مقبولِ حق کوئی بشر

صولتِ شاہانہ اس تربت کی پہرہ دار ہے
آسماں سے تا زمیں اک بارشِ انوار ہے

اس فقیری میں بھی ہے وہ دبدبہ درگاہ میں
جیسے درباروں کی کیفیت حضورِ شاہ میں

بادشاہوں کی عز و شوکت تھی کبھی کی چل بسی
حکمرانی ہے دلوں پر آج تک درویش کی

دل پکارا نشۂ حیرت میں کیوں سرشار ہے
باادب ہو حضرتِ چشتی کی یہ سرکار ہے

کھول آنکھیں دیکھ اے غافل یہی ہے وہ حریم
جس پہ آنکھیں فرش کر دیتے تھے اکبر اور سلیم

یہ تفاوت دیکھ کر گورِ فقیر و شاہ کا
پھر گیا آنکھوں میں منظر قدرت اللہ کا

ناگہاں گونجی مرے کانوں میں یہ غیبی ندا
ہم بتاتے ہیں تجھے مختار سارا ماجرا

مل گئی سب مادّی رفعت بسیطِ خاک میں
گونجتی ہے روح کی عظمت ابھی افلاک میں

مختار جمیل

غزل

صد فتنہ خوش خرامیِ دلبر لئے ہوئے
یک حشر آرزو و دلِ مضطر لئے ہوئے

عالم ہے جس سے مست کہاں ہے وہ مے فروش
پھرتی ہے تشنگی مجھے گھر گھر لئے ہوئے

مصروف پردہ داریِ رازِ نہاں ہوں میں
کل اپنی کائنات کو اندر لئے ہوئے

سرگرمِ جستجو ہیں کسی بے نشاں کے ہم
پائے شکستہ و دلِ مضطر لئے ہوئے

دل اک عجب طلسم ہے ذات و صفات کا
کوزہ میں کوزہ گر ہے سمندر لئے ہوئے

قدرت کی شانِ حسن کا جلوہ نظر میں ہے
آئینہ دیکھتا ہوں میں پتھر لئے ہوئے

اے مست مے کشی کو دلِ تشنہ چاہیئے
یوں تو ہزار بیٹھے ہیں ساغر لئے ہوئے

مست صفی پوری

فریبِ قسمت

(روسی معجز نگار الگزنڈر کوپرین کے ایک شاہکار کا آزاد ترجمہ)

اگر کوئی خاص واقعہ پیش آجاتا ہے تو آپ اکثر کہہ اٹھتے ہیں کہ "اتفاق تھا محض اتفاق" لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر حقیر سے حقیر معاملہ پر بھی اس سے زیادہ سنجیدگی کے ساتھ غور کیا جاسکتا ہے۔

میری عمر اس وقت ساٹھ سال کے قریب ہے اور یہ وہ عمر ہے جب ہر شخص اپنی تمام سرگردانیاں، جذبات اور قضیات سے منہ موڑ کر اپنے مستقبل کے لئے صرف تین راستے پاتا ہے ——— لالچ، اولوالعزمی اور فلسفہ ——— یا صرف دو سمجھ لیجئے، کیوں کہ غور کرنے کے بعد معلوم ہوگا کہ اولوالعزمی بھی دینی اور دنیاوی ترقیات کو حاصل کرنے کی لالچ کا نام ہے۔

حقیقتاً میں خود کو فلسفی کہنے کی جرأت تو نہیں کرسکتا، شاید یہ دعوی میرے لئے وبال ثابت ہو اور بہر نوع کسی طرح زیبا بھی نہیں۔ علاوہ بریں آپ ہمیشہ مجھ سے اس کا مطالبہ کرسکتے ہیں کہ اپنے دلائل اور سندات پیش کرو۔ لیکن میں کیا کرسکتا ہوں؟ تاہم اتنا ضرور عرض کروں گا کہ اپنی عمر میں زندگی کے تمام مختلف مراحل مختلف اور وسیع مراحل طے کئے ہیں۔ میں مفلسی اور توانگری سے واقف ہوں، صحت اور بیماری کی کیفیات جانتا ہوں، وصل و فراق، صلح و جنگ، قید و آزادی، محبت و نفرت، عروج و پستی، وفا شعاری اور بے وفائی، غرض ان سب سے لذت آشنا رہ چکا ہوں اور ——— خواہ آپ یقین کریں یا نہ کریں ——— میں کہہ سکتا ہوں کہ میں انسان کی حقیقت سے آگاہ رہا ہوں۔ آپ سمجھتے ہونگے کہ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں، لیکن میرے محترم، یہ مزید تعجب کی بات ہے۔ دوسرے شخص کو جاننے اور سمجھنے کے لئے یہ لازمی ہے کہ سب سے پہلے آپ اپنی شخصیت کو بالکل فراموش کرنے کے قابل ہوجائیں، اپنے گرد و پیش جو سراب آسا اثر آپ نے قائم کرلیا ہے اسے بھول جائیں اور قدرت کی وسیع سرزمین پر آپ کی جو بلند

حیثیت ہے اسے دل و دماغ سے محو کر دیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ بہت کم لوگ اس کو سرانجام دے سکتے ہیں۔

اور اب اپنی عمر کے آخری ایام میں، میں ایک غریب گنہگار "زندگی" پر غور کرنا چاہتا ہوں۔ میں تنہا ہوں، لب گور۔ میری راتیں ——— آہ! آپ کو کیا خبر کہ ایک بوڑھے آدمی کی راتیں کتنی طویل ہوا کرتی ہیں؟ میرے دل و دماغ میں میری گزشتہ زندگی کے اور دوسروں کی زندگی کے، ہزارہا واقعات بالکل محفوظ ہیں۔ ان واقعات کو یونہی سرسری طور پر دُہرا دینا گائے بھینس کے جگالی کرنے کے مترادف ہوگا، لیکن ان پر سوچ سمجھ کر خیال آرائی کرنا دوسری بات ہے اور اسی کو میں فلسفہ کے نام سے موسوم کرتا ہوں۔

ہم نے اتفاق اور قسمت کے سوال کو اٹھایا ہے۔ میں آپ کے ساتھ اس امر کو تسلیم کرنے کے لئے بالکل تیار ہوں کہ اتفاق مہمل، تغیر پذیر، بے نتیجہ اور بالکل بے معنی ہے۔ لیکن مجھے اس کا بھی پورا یقین ہے کہ اس کے اندر ایک قانون ایک ناقابلِ تغیر قانون مضمر ہے، جو حیاتِ انسانی کو محصور کئے ہوئے ہے ——— میری مراد ان کروروں واقعات سے ہے جو ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں۔ ہر شے اپنے وقت پر گزر جاتی ہے اور پھر نمودار ہوتی ہے۔ وہ عدم سے پیدا ہوتی ہے، سراپا آتش زار بنتی ہے، دوسروں کو جلاتی ہے، خود مسرور ہوتی ہے، اپنا انتہائی زور حاصل کر لیتی ہے، پھر غائب ہو جاتی ہے اور وقت کی پرواز کے گرد کسی پیچ کش کے چکروں کی طرح پھر نمودار ہوتی ہے، دوسری مرتبہ، پھر تیسری مرتبہ۔ یہ پیچ خم لاتعداد برسوں کے بعد اپنا دورہ پورا کر کے پھر واپس آتے ہیں، اسی مقام سے گزرتے ہیں اور پیچ در پیچ چکر بناتے رہتے ہیں اور اسی طرح بغیر ختم ہوئے چلتے رہتے ہیں، ہمیشہ چلتے رہتے ہیں۔

اس کے جواب میں آپ فرمائیں گے کہ اگر واقعی ایسا کوئی قانون موجود ہوتا، تو مدتوں پیشتر ہی لوگ اس کو دریافت کر چکے ہوتے اور اسی نقشے کے مطابق اپنے مستقبل کے صفحات کو پڑھ لیا کرتے۔ لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہم اس دنیا کے باشندے، جولاہوں کی طرح ہیں، جو بے انتہا طویل و عریض کارگہ کے قریب بیٹھے ہوں۔ مختلف رنگ ہمارے سامنے ہیں ——— گلابی، آسمانی، کاسنی، سبز ——— لیکن یہ کارگہ بھاگتا جاتا ہے، بھاگتا جاتا ہے اور غائب ہوتا جاتا ہے اور انتہائی قربت کی وجہ سے ہم تانے بانے کی تمیز نہیں کر سکتے۔ صرف وہ لوگ جو انسانی زندگی سے بالاتر، ہمارے سروں سے اوپر، ایستادہ ہیں یعنی پیغمبر، اولیاء، مجذوب، معصومین، سائنس داں اور شعراء، صرف انھیں کی تیز اور دور رس نگاہوں میں قدرت نے یہ طاقت ودیعت کر دی ہے کہ حیاتِ انسانی کے شور و شغب کے

درمیان سے اس یک رنگ تانے کے آغاز کی جھلک دیکھ کر اُس کے انجام کے متعلق پیشین گوئیاں کر دیا کریں۔

آپ خیال کرتے ہونگے کہ میں نے صرف موٹے موٹے جملے استعمال کئے ہیں، کیا نہیں؟ ذرا توقف فرمائیے آگے چل کر یہ معاملہ اور بھی پیچیدہ ہو جائے گا۔ بشرطیکہ آپ پریشان نہ ہو جائیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن ایک شخص ریل کے سفر میں سوائے باتیں کرنے کے اور کیا کر سکتا ہے؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

میں ان قوانین کو ماننے کے لئے بالکل تیار ہوں، جو مساویانہ عقل و تمیز سے ایک طرف تو ستاروں کی گردش کو منظّم کرتے ہیں اور دوسری طرف قوائے حیاتیہ کو۔ میں ان پر اعتقاد رکھتا ہوں اور انھیں دعا دیتا ہوں لیکن انہیں کے اندر "کوئی ہستی" یا "کوئی شے" ایسی ضرور ہے، جو قسمت اور کائنات سے بھی زیادہ طاقت ور ہے۔ اگر وہ "کوئی شے" ہے تو میں اس کو منطقیانہ لغویت کا قانون یا لغو منطق، جو آپ پسند کریں، اس کے نام سے موسوم کروں گا۔ میں نہیں جانتا کہ اُسے کیا کہنا چاہیئے۔ لیکن اگر وہ "کوئی ہستی" ہے، تو ایک ایسی زبردست روح ہوگی، جس کے سامنے صحفِ سماوی کا شیطان اور ہمارے فسانوں کے بھوت پریت حقیر مسخروں اور بے عقل دغابازوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔

ایک ایسی طاقت کا خیال کیجئے جو کائنات پر حکمراں ہے ــــــ ایک الٰہی طاقت اور اس کے علاوہ ایک طفلانہ، ناعاقبت اندیش، شریر، تغافل پسند نیکی اور بدی کی قوت، جو ہمیشہ بے رحم، ظالم، چالاک، لیکن (اس کو شیطان کا حوالہ) بہر نوع حیرت انگیز طریقے سے انصاف پسند واقع ہوئی ہے۔ شاید آپ پورے طور سے میرا مطلب نہیں سمجھے لہٰذا اجازت دیجئے کہ چند مثالیں دے کر اس کو اور واضح کر دوں۔

نپولین کو لیجئے ــــــ ایک قابلِ رشک زندگی، ایک ناقابلِ یقین بڑی ہستی، ایک ختم نہ ہونے والی طاقت۔ ــــــ لیکن انجام پر نظر ڈالئے: ایک چھوٹا سا جزیرہ، ایک مہلک مرض، غذا اور معالج کی بابت شکایات کا ایک دفتر، تنہائی اور بے کسی میں ایک بوڑھے آدمی کی ہذیان آمیز گفتگو۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ حسرت ناک انجام صرف میرے پُراسرار "کوئی" کا ایک خندۂ استہزا، ایک مضحکہ آمیز تبسم تھا۔ تاہم اگر آپ ٹھیک طریقے سے اس کی پُر درد سوانح حیات پر نظر ڈالیں اور علماء کی توضیحات کو نظر انداز کرتے جائیں (کیوں کہ وہ ہر چیز کی نہایت سادہ طور پر اور ایک کلیہ کے تحت تشریح کرتے ہیں) ــــــ میں نہیں کہہ سکتا کہ آپ کس نتیجے پر پہنچیں گے، لیکن مجھے تو اس میں لغویت اور منطق کی

سازش صاف نظر آتی ہے، گو میں اس کی صراحت نہیں کرسکتا۔

اس کے بعد جنرل اسکوبیلاف کو لیجئے ـــــــ ایک دلیر اور خوب صورت پیکر، مآل کار کی نسبت مبالغہ آمیز عقیدہ ہلاکت آفریں آتش باری میں جرأت مردانہ، موت کے منہ میں گھسنے کی نہ بجھنے والی پیاس ـــــــ لیکن انجام: موت، وہ بھی معمولی بستر پر، ہوٹل کے ایک گندے کمرے میں، ایک زنِ بازاری کے سامنے۔ میں پھر کہتا ہوں کہ یہ لغویت ہے، سراسر ظلم ہے، لیکن یا للعجب! کہ منطقیانہ ضرور ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں حسرت ناک موتیں ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو چکر لگاتی آئیں اپنا انعکاس ڈالا اور ان دو عظیم المرتبت ہستیوں کی تصاویر کو مکمل کرگئیں۔

قدیم زمانہ کے لوگ اس پُراسرار "کوئی" سے واقف تھے اور اس سے خوف کھاتے تھے، لیکن غلطی کی بنا پر اس کے مذاق اور تفریحات کو قسمت کے رشک و حسد سے تعبیر کرتے رہے۔

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں ـــــــ میرا مطلب یہ ہے کہ میں آپ کو یقین نہیں دلاتا، بلکہ خود اسی خیال پر پختگی سے قائم ہوں ـــــــ کہ کسی آئندہ زمانہ میں، شاید تیس ہزار برس کے بعد، اس دنیا میں زندگی نہایت ہی دل خوش کن ہوجائے گی جا بجا عالی شان محل ہوں گے، خوب صورت باغ ہوں گے، فوارے چھوٹ رہے ہوں گے ۔ ۔ ۔ ۔ قید و بند، مال و دولت دروغ بیانی اور جبر و تشدد، نوعِ انسانی پر مصائب و آلام کے پہاڑ نہ توڑا کریں گے ۔ ۔ ۔ ۔ بیماری، بدصورتی اور موت کا خاتمہ ہوجائے گا ۔ ۔ ۔ ۔ رشک و حسد نہ ہوگا، برائیاں نہ ہوں گی، قرب و بُعد کا امتیاز مٹ جائے گا ـــــــ سب بھائی بھائی ہوں گے اور اس وقت وہ "کوئی" (خیال فرمائیے کہ میں ہر موقعے پر اس کو واوین کے درمیان استعمال کرتا ہوں) ایک دن فضائے کائنات میں پرواز کرے گا، ایک عیارانہ اور تمسخرانہ نگاہ زمین پر ڈالے گا، مسکرائے گا اور رسا تڑے گا ـــــــ اور پھر یہ قدیم اور حسین خطۂ ارض تباہ ہوجائے گا۔ کیا اس حسین کرہ کے لئے یہ افسوس کی بات نہ ہوگی؟۔ فرمائیے۔ ذرا خیال تو کیجئے کہ یہ عام حسن و خوبی بالآخر کن مہیب، خونیں اور تباہ کن اثرات کا مصدر ہوگی، جس وقت کہ عامۃ الناس اس زندگی کے عادی ہوجائیں گے۔

لیکن زین یا نپولین یا ایسی ہی بڑی ہستیوں کی مثالیں کیوں پیش کی جائیں؟ خود میں نے کئی مرتبہ اس خوف ناک اور ناقابلِ علم قانون کے مشاہدات بالکل معمولی معاملات میں دیکھے ہیں۔ اگر آپ فرمائیں تو میں ایک واقعہ عرض کروں جس میں اس "کوئی" کے استہزایانہ تنفس کو میں نے صاف طور پر محسوس کیا۔

واقعہ یہ ہے کہ میں ایک مرتبہ ٹومسک سے ریل میں سفر کر رہا تھا۔ میرے درجہ میں اور مسافروں کے علاوہ ایک نوجوان ریلوے انجینیر بھی تھا، جو نوعمر، خوب صورت، تندرست اور خوش اخلاق شخص تھا۔ اس کا چہرہ عام روسیوں کی طرح گول اور صاف تھا، سر پر چھوٹے چھوٹے ملائم بال تھے، جن کے درمیان سر کی گلابی جلد صاف نظر آتی تھی۔ وہ اصول کا پابند، مہربان اور نیک اطوار تھا اور اس کی آنکھیں گہرے نیلے رنگ کی تھیں۔

اس نے خود کو ایک اچھا اور قابلِ قدر ہم سفر ثابت کیا میں نے آج تک ایسا منکسر المزاج اور متواضع شخص نہیں دیکھا۔ جب میں درجہ میں داخل ہوا تو اس نے فوراً نیچے کی سیٹ میرے لئے خالی کر دی، خود ہی اٹھا کر میرا صندوق اوپر رکھدیا اور اس قدر عاجزی اور انکساری کا اظہار کیا کہ میں گھبرانے لگا۔ ہر بڑے اسٹیشن پر وہ کچھ کھانے پینے کی چیز خرید لیتا اور نہایت خوش اخلاقی کے ساتھ تمام مسافروں کی تواضع کرتا۔

میں نے دیکھتے ہی یہ محسوس کیا تھا کہ اس کے دل میں کوئی اندرونی مسرت جوش مار رہی ہے، سطح سے نکل پڑنے کی جدوجہد کر رہی ہے اور وہ اپنے گرد و پیش ہر شخص کو اپنی ہی طرح متبسم و مسرور دیکھنا چاہتا ہے۔

ایسا ہی ہوا بھی۔ کوئی دس منٹ کے بعد وہ میرے پاس آیا اور اپنی سرگزشت بیان کر کے اپنی روح کو ہلکا کرنا شروع کر دیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے شروع کرتے ہی آس پاس کے مسافر کسمسانے لگے اور کھڑکی سے سر باہر نکال کر اپنی تمام تر توجہ اس سرزمین کی طرف منعطف کر دی، جس پر سے ہم گزر رہے تھے۔ بعد کو مجھے معلوم ہوا کہ ان میں سے ہر ایک اس قصہ کو کم از کم دس مرتبہ سن چکا تھا، پھر میں اس قسمت سے کس طرح محروم رہ سکتا تھا؟۔

یہ انجینیر اپنے وطن جانے کے لئے مشرقِ بعید سے واپس آ رہا تھا، جہاں اس نے پانچ سال بسر کئے تھے اور اس عرصہ میں اپنے گھر والوں سے بالکل جدا رہا، جو پیٹرو گراڈ ہی میں رہتے تھے۔ مشرقِ بعید میں دراصل اس کا صرف ایک سال قیام کرنے کا ارادہ تھا، لیکن اول تو سرکاری کام نے، جس کے لئے وہ بھیجا گیا تھا اس کو زیادہ عرصہ تک روک رکھا اور پھر ایک نفع بخش ذاتی کام مل گیا۔ اس کے بعد اسے معلوم ہوا کہ وہ کام کو ختم کئے بغیر چھوڑ کر نہیں جا سکتا، کیوں کہ طویل ہو جانے کے باوجود بھی اس میں بے انتہا نفع کی امید تھی۔ اب پانچ سال کے بعد اس کو نپٹا کر وہ اپنے وطن کو واپس ہو رہا تھا۔ پھر ایسی حالت میں اس کو بات نہ ہونے کا الزام کس طرح دیا جا سکتا تھا؟ وہ پانچ برس تک اپنے عزیز وطن سے دور رہا اور اب نوجوانی، تندرستی اور کامرانی کی امنگوں کے ساتھ، پیار و محبت کے خرچ

نہ ہونے والے خزانے لئے ہوئے گھر واپس جا رہا تھا۔ کون ہو سکتا ہے جو اس حالت میں خاموش رہ سکے، اضطراب و بیتابی کی اس خطرناک خارش کو دبا سکے، جو ہر گھنٹے کے ساتھ، ہر میل کا سواں حصہ گزرنے کے ساتھ تیز تر ہوتی جاتی ہے۔

تھوڑی ہی دیر میں اس کے تمام خاندانی رازوں سے میں واقف ہو گیا۔ اس کی بیوی کا نام سوسن تھا تو ن یا سنو چکہ تھا اور اس کی لڑکی یوروچکہ کے عجیب نام سے موسوم تھی جس وقت انجینیر گھر سے روانہ ہوا تھا تو یوروچکہ صرف تین برس کی بچی تھی۔ "میں سوچتا ہوں" وہ چلا کر کہنے لگا "میں سوچتا ہوں کہ اب تو وہ اچھی خاصی نوجوان لڑکی ہو گی، تقریباً شادی کے قابل"۔ مجھے اس کی بیوی کا شادی سے قبل کا نام بھی معلوم ہو گیا، یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جب ان کی شادی ہوئی تھی اور انجینیر اس وقت تک اپنی تعلیم میں مشغول تھا، تو کس قدر مشکلات کا سامنا ہوا تھا، یہاں تک کہ اس غریب کے پاس دو دیا جانے تک نہ تھے۔ لیکن اس وقت صرف اس کی بیوی ہی ایک غمخوار ساتھی ہونے کے علاوہ دایہ، ماں اور بہن سب کی قائم مقامی کر رہی تھی، سب کے فرائض انجام دے رہی تھی۔

اس نے مفتخرانہ انداز میں اپنا ہاتھ اپنے سینہ پر مارا، فخر و ناز کی سرخی نے اس کے چہرہ کو گلرنگ بنا دیا، آنکھیں چمکنے لگیں اور چلا کر کہنے لگا۔

"کاش، آپ اس سے واقف ہوتے! حسنِ مجسم ہے! اگر آپ پٹرو گراڈ تشریف لائیں، تو میں تعارف کراؤنگا آپ کو تشریف لانا پڑے گا۔ ضرور بالضرور۔ تکلف کی کوئی ضرورت نہیں دیکھئے انکار نہ کیجئے۔ نمبر ۱۷ اکروچنایہ۔ میں آپ سے ملاقات کراؤں گا، تب آپ میری بیوی سے واقف ہونگے۔ ملکہ ہے! ہماری یعنی ریلوے انجینیروں کی بزمِ ہائے نشاط میں وہی رونقِ محفل ہوتی ہے۔ اس کے بغیر محفل پھیکی معلوم ہوتی ہے۔ اچھا! اگر آپ واقعی تشریف نہ لائے میرے دل کو سخت صدمہ پہنچائیں گے"۔

اس نے ہم سب کو اپنا ملاقاتی کارڈ دیا، جس پر اس نے منچوریہ کا پتا چھیل کر پنسل سے پٹرو گراڈ کا پتا تحریر کر دیا تھا۔ اسی کے ساتھ اس نے یہ بھی کہا کہ پٹرا گراڈ کا یہ عالیشان مکان اس کی ہدایات کے مطابق سنو چکہ نے گزشتہ سال ہی کرایہ پر لیا تھا، جب اس کے کام میں معتدبہ نفع ہو رہا تھا۔

دن بھر میں تین چار مرتبہ ہر بڑے اسٹیشن سے وہ اپنی بیوی کو جوابی تار دیتا، تاکہ اس کا جواب اگلے بڑے اسٹیشن پر مل جائے یا صرف ٹرین نمبر فلاں میں پہلے درجہ کے فلاں مسافر کو ملے۔ اس وقت آپ اس کی

حالت دیکھتے جب گارڈ کوئی تار لے کر آتا اور کہتا کہ فرسٹ کلاس کے فلاں مسافر کے نام ایک تار ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس کے چہرہ پر ایسی روشنی نمودار ہوتی جیسی کہ عموماً اولیاء کے چہروں پر ضوفگن ہوتی ہے۔ وہ شاہانہ طریقے سے گارڈ کو انعام دیتا اور نہ صرف گارڈ کو، بلکہ اس کے دل میں یہ ناقابل تسخیر خواہش پیدا ہو جاتی کہ ہر شخص کو مطمئن کر دے، ہر کسی کو مسرور بنا دے اور ہر ایک کو تحائف پیش کرے۔

اس نے ہمیں بھی سائبیریا اور یورال کے پتھروں کی بنی ہوئی چھوٹی چھوٹی چیزیں، مثلاً جڑاؤ چھلے، کانٹے، چین کی انگوٹھیاں، آلپین، مورتیں اور مختلف چھوٹے چھوٹے کھلونے، اپنی یادگار کے طور پر زبردستی پیش کر دیں، جن میں بعض تو اپنی نایابی اور نفیس صنعت کا نمونہ ہونے کی وجہ سے نہایت بیش قیمت تھیں۔ حالانکہ ایسے موقع پر تحائف کا قبول کرنا سراسر ناموزوں تھا، لیکن خیال فرمائیے کہ وہ اتنی خوشامدوں سے اس قدر اصرار کے ساتھ ان کو پیش کرتا تھا کہ اس سے انکار کر دینا محال ہو جاتا تھا۔ ایک بچہ اگر اصرار کے ساتھ اپنی مٹھائی آپ کے سامنے پیش کرے، تو زیادہ آسانی سے انکار کر سکتے ہیں، لیکن اس کے تحائف سے گریز کرنا امکان سے باہر تھا۔

اس کے ساتھ اسباب کے درجہ میں بھی اور خود اسی گاڑی میں بھی، اسی قسم کی بے شمار اشیاء تھیں، جو سینچکہ اور یوروچکہ کے تحفہ کے طور پر تھیں۔ خوب صورت کھلونے، ریشم کی کڑھی ہوئی بے بہا ساڑھیاں ہاتھی دانت اور سونے کی چھوٹی چھوٹی تصویریں، جو سیپ کی تختیوں پر بنی ہوئی تھیں، سمور کے کوٹ، رنگین پنکھے، روغنی صندوقچے، تصویروں کے البم اور ایسی ہی دیگر اشیاء کا ایک غیر محدود ذخیرہ تھا جس وقت وہ ان تمام چیزوں کو ہمیں دکھلا رہا تھا، تو آپ اس کی حالت دیکھتے اور اس کی باتیں سنتے، کہ کس محبت اور جوش کے نشہ میں جھوم جھوم کر وہ اپنے پیاروں کا تذکرہ کرتا تھا میں مانتا ہوں کہ اس کی محبت اندھی تھی، بہت زیادہ پر جوش تھی اور بے حد انانیت پسند تھی؛ میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ وہ بہت کچھ جنون کی حد تک پہنچی ہوئی تھی، تاہم میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس فرسودہ اور معمولی پردے کے اندر اس کی پاکیزہ صادق محبت، اس کی گہری اور مشتعل محبت، جھلکیاں مارتی ہوئی مجھے صاف نظر آ رہی تھی۔

مجھے یہ بھی یاد ہے کہ ایک اسٹیشن پر، جہاں چند ڈبے لگائے جا رہے تھے، ایک خلاصی کا پاؤں کٹ گیا۔ تمام مسافر —— جو میرے نزدیک دنیا بھر میں سب سے زیادہ کاہل، وحشی اور ظالم مخلوق ہے —— خون کا تماشا دیکھنے کے لئے گاڑی سے نیچے آ اتر پڑے۔ انجینئر اس ہجوم کے ساتھ نہ رہا، بلکہ سب کی نظر بچا کر اسٹیشن ماسٹر کے پاس پہنچا، اس سے چند

الفاظ کہے اور اپنی پاکٹ بک میں سے نکال کر کچھ روپیہ اس کے ہاتھ میں دیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ کوئی حقیر رقم نہ تھی کیونکہ اسٹیشن ماسٹر نے تعظیم کے ساتھ اپنی سرخ ٹوپی اُتار کر سلام کیا۔ انجینئر نے یہ کام اتنی سرعت سے انجام دیا کہ شاید میرے سوا اس کو کوئی اور نہ دیکھ سکا، لیکن ایسے معاملات کے لئے میری نگاہ بہت تیز ہے۔ بہرحال میں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ ٹرین کے دیر تک رُکے رہنے سے فائدہ اُٹھا کر وہ سیدھا ٹیلی گراف آفس میں جا پہنچا۔

مجھے اس طرح یاد ہے جیسے کل کی ہی بات ہو کہ کس انداز سے وہ پلیٹ فارم پر ادھر سے اُدھر گھوم رہا تھا، اس کی سفید ٹوپی سر کے پیچھے کو جھکی ہوئی تھی، بدن پر ایک ڈھیلا ڈھالا لمبا کرتا تھا، جس کے بٹن بازو کی طرف لگے ہوئے تھے، چشمہ کالر کے ساتھ ایک دھاگے سے اٹکا ہوا اس کے کندھے پر جھول رہا تھا اور ایک چھوٹا سامنی بیگ دوسرے کندھے سے سینہ کو عبور کرتا ہوا کمر کے پاس لٹک رہا تھا۔ اس انداز میں وہ ٹیلیگراف آفس سے باہر نکلا اور اپنے گرد و پیش دنیا کو اس طرح دیکھنے لگا، جیسے کہ ایک موٹا تازہ، خوبصورت اور سیدھا سادہ دہقانی لڑکا دیکھتا ہے۔

ہر بڑے اسٹیشن پر اس کے نام ایک نہ ایک تار ضرور ہوتا۔ اس نے گارڈوں کی عادت اس قدر بگاڑ دی تھی کہ وہ خود بخود ٹیلیگراف آفس پہنچ جاتے اور دریافت کر لیتے کہ اس کے نام کوئی تار تو نہیں۔ بیچارہ لڑکا! وہ اپنی دلی مسرت کو چھپانے سے قاصر تھا اور ہر تار ہم سب کو زور سے پڑھ کر سناتا، گویا کہ ہمیں اس کے خاندان کی خوشی کے سوا اور کوئی فکریں ہی نہ تھیں۔

"خوش رہو، ہم اپنے پیار و محبت بھیجتے ہیں اور سخت بیتاب ہیں"۔

سنوچکہ، یوردچکہ۔

"گھڑی ہاتھ میں ہے اور ٹائم ٹیبل کے ذریعے سے تمہارے سفر کا اندازہ کر رہی ہیں۔ ایک اسٹیشن سے دوسرے تک جذبات و تخیلات میں تمہارے ساتھ ساتھ ہیں"۔

اور تقریباً تمام تار اسی انداز میں تھے لیکن ایک کا مضمون شاید یہ تھا:۔

"اپنی گھڑی کو پیٹروگراڈ کے وقت کے مطابق ٹھیک گیارہ بجے کر لو، دب الاکبر کے پہلے ستارے کو دیکھو میں بھی ایسا ہی کر رہی ہوں"۔

ہماری گاڑی میں ایک اور مسافر تھا، جو شاید کسی سونے کی کان کا مالک، محاسب یا منتظم تھا۔ خاص سائبیریا کا

رہنے والا تھا۔ خشک لمبا چہرہ، گھنی سیاہ اور خوف ناک بھویں، ایک بہت گھنی لمبی اور اُلجھی ہوئی داڑھی یہ اس کے چہرہ کی خصوصیات تھیں۔ اگر آپ اسے دیکھتے تو شاید اندازہ کر لیتے کہ زندگی کے تلخ تجربات نے اسے بہت کچھ پریشان رکھا ہوگا۔ اس نے بہت نرمی کے لہجہ میں انجینیر سے کہا :

"میاں صاحبزادے ! آپ اس محکمۂ تار سے اس قدر ناجائز فائدہ نہ اٹھائیے۔"

"کیا مطلب ؟ میں ناجائز فائدہ کیا اٹھاتا ہوں ؟"

"کیوں ! یہی جو آپ کا طریقہ ہے۔ آپ کو چاہیئے کہ اپنی نوجوان بیوی کو اس قدر مشتعل اور انتہائی اضطرابی حالت میں نہ رکھیں۔ آپ کو دوسروں کے جذبات کا بھی احترام کرنا چاہیئے۔"

لیکن وہ صرف ہنسنے لگا اور اس عقل مند شخص کے گھٹنے پر ہاتھ مار کر کہا :

"ہاں، بڑے میاں ! میں آپ جیسے قدیم الخیال لوگوں سے بھی واقف ہوں۔ آپ حضرات کسی سفر پر روانہ ہوتے ہیں تو چپکے سے، اور یہ چاہتے ہیں کہ خلافِ توقع ایک دم پہنچ جائیں اور دل میں سوچتے جاتے ہیں کہ ہمارے مکان میں سب کام مرضی کے موافق ہو رہے ہیں یا نہیں۔ ایں ؟"

لیکن اس شخص نے صرف اپنی بھویں اوپر کو اٹھائیں اور مسکرانے لگا :

"اچھا ! اچھا !! تو پھر بات کیا ہوئی ؟ اس میں بھی تو کوئی برائی نہیں، کوئی غلطی نہیں۔"

نشنی سے کچھ اور مسافر ہمارے درجہ میں سوار ہوئے اور ماسکو سے اور۔ میرے انجینیر کی آتشِ شوق تیز سے تیز تر ہوتی جاتی تھی ــــــ افسوس ! اس کا کیا علاج تھا ؟ وہ ہر شخص سے بہت جلد بے تکلف ہو جاتا تھا۔ شادی شدہ آدمیوں سے وہ ازدواجی زندگی کے تقدس اور پاکیزگی پر گفتگو کرتا، غیر شادی شدوں کو تجرد کی تنہائی اور بیکسی پر ملامت کرتا، کمسن لڑکیوں سے آخری اور ابدی محبت کا تذکرہ کرتا، اور شادی شدہ عورتوں سے بچوں کی بابت بات چیت کرتا۔ بہرحال خواہ کسی موضوع پر بحث ہوتی سنو چکہ اور یو رو چکہ کا ذکر اس میں ضرور آ جاتا۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ اس نے اپنی لڑکی کی کس طرح نقل اُتاری تھی۔ "ہمائے پاٹ جلد جوتے ہیں"۔ (ہمارے پاس زرد جوتے ہیں) "ہمائے نامنے ڈاٹسل ٹی ڈوتان ہی" (ہمارے سامنے ڈاکٹر کی دوکان ہے)۔ ایک مرتبہ وہ بلی کو بھینچ کر پیار کر رہی تھی اور بلی تکلیف میں میاؤں میاؤں کر رہی تھی کہ اس کی ماں نے کہا : "یورو چکہ، چھوڑ دو بلی کو، اسے تکلیف ہو رہی ہے۔"

لیکن اس نے جواب دیا۔ "نہیں، امی جان، اُسے خوشی ہوئی ہے"۔ (اسے خوشی ہو رہی ہے) ایک مرتبہ اس نے سڑک پر کچھ زرد رنگ کے غبارے دیکھ کر اپنی ماں سے کہا تھا: "امّی یہ کتنے باؤلے ہیں"۔ (یہ کتنے باؤلے ہیں) یہ تمام باتیں پُرمحبت اور موثر ضرور تھیں، لیکن میں اس کا بھی اقرار کرتا ہوں کہ کسی حد تک پریشان کن تھیں۔

جب ہم پیرد گراڈ کے قریب پہنچے ہیں، تو صبح ہو رہی تھی۔ دن ابر آلود ہونے کی وجہ سے خراب اور بے کیف تھا، چاروں طرف بلوطا کے گھنے اور تناور درختوں پر اور گردوپیش کی نم آلود پہاڑیوں پر کُہرا اُمڈ چھایا ہوا تھا، جسے کُہر کی بہ نسبت ایک کثیف دھند کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ اس دھندلی فضا میں پہاڑیاں، جو ریلوے لائن کے دونوں طرف دور تک پھیلی چلی گئی تھیں، ایسی معلوم ہوتی تھیں گویا کہ زمین کے چہرہ پر ناہموار مہاسے اُبھر آئے ہیں میں ذرا سویرے ہی اُٹھ بیٹھا، تاکہ غسل کرنے کے لئے کافی وقت مل جائے، راستہ میں انجینیر سے ملاقات ہوگئی۔ وہ کھڑکی کے پاس کھڑا ہوا تھا، کبھی باہر گردن نکال کر دیکھنے لگتا، اور کبھی گھڑی پر نظر ڈال لیتا تھا

"آداب عرض ہے" میں نے کہا۔ "آپ یہاں کھڑے ہوئے کیا کر رہے ہیں؟"

"ہا! تسلیمات! مزاج شریف! میں صرف ٹرین کی رفتار کا اندازہ کر رہا ہوں۔ اس وقت ہم ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جا رہے ہیں"۔

"کیا اس کا اندازہ آپ اپنی گھڑی کے ذریعے سے کر رہے ہیں؟"

"جی ہاں۔ بہت آسان قاعدہ ہے ایک کھمبے سے دوسرے کھمبے تک ۸۸ گز کا فاصلہ ہے، یعنی ایک میل کا بیسواں حصہ۔ لہٰذا اگر ہم ان ۸۸ گزوں کو ۴ سکنڈ میں طے کر لیں، تو رفتار ۴۵ میل فی گھنٹہ ہوگی، اگر ۳ سکنڈ میں، تو ۶۰ میل اور اگر دو سکنڈ میں تو ۹۰ میل اور بغیر گھڑی کے بھی آپ رفتار معلوم کر سکتے ہیں، صرف اتنا معلوم ہونا چاہیئے کہ سکنڈ کس طرح گنے جاتے ہیں۔ اس کے لئے آپ جس قدر جلد لیکن صاف صاف، چھ تک گن سکتے ہوں گنئے۔ اس طرح: ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ —— ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ —— یہ سلطنت آسٹریا کے جنرل اسٹاف کا قاعدہ ہے"۔

وہ اسی انداز سے اُکھڑی اُکھڑی باتیں کرتا رہا، گھبرا گھبرا کر چاروں طرف دیکھ رہا تھا اور برابر اپنی جگہ بدلتا جاتا تھا لیکن میں خوب سمجھتا تھا کہ آسٹرین جنرل اسٹاف کے یہ تمام طریقے صرف ایک پردہ کے طور پر تھے،

جس کے پیچھے انجنیر اپنی بیتابی اور بے صبری کو فریب دینے کی بے سود کوشش کر رہا تھا۔

جب ہم لیوبان پہنچے تو اس کی حالت قابلِ رحم ہوگئی۔ وہ میرے دیکھتے ہی دیکھتے زرد رو، منحنی اور بوڑھا معلوم ہونے لگا۔ اس نے بات چیت کرنا بھی چھوڑ دی اور اخبار پڑھنے کا بہانہ کرنے لگا لیکن صاف ظاہر تھا کہ یہ شغل بھی اس کو ناپسند اور ناگوار معلوم ہو رہا تھا کیونکہ کبھی کبھی اُکتا کر وہ اخبار کو اُلٹا ہی دیکھنے لگتا تھا۔ اس کی تمام حرکات دلی بے چینی اور اشتیاق کا پتا دے رہی تھیں۔ وہ بہ مشکل پانچ منٹ تک خاموش بیٹھا رہتا، پھر اٹھ کر دروازہ کی کھڑکی کے پاس آ کھڑا ہوتا پھر جاکر بیٹھ جاتا اور اضطراری کیفیت میں پہلو بدلتا رہتا گویا کہ ٹرین کو اور زیادہ تیز چلنے کے لئے ڈھکیلنا چاہتا ہو، پھر دروازہ کی کھڑکی کے پاس پہنچتا، گھڑی کے ذریعے سے رفتار کا اندازہ کرتا اور سر ہلاتا رہتا۔ آہ! میں خوب جانتا ہوں — اور کون نہیں جانتا؟ — کہ انتظار کے دن اور ہفتے بھی ان آخری گھنٹوں کے، اس آخری یا دو گھنٹہ کے مقابلہ میں کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔

بالآخر ہم سنگل تک پہنچ گئے، پھر قینچیوں اور ریلوں کے جال کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوا، اس کے بعد اسٹیشن کا لمبا چوڑا پلیٹ فارم اور زرد زرد وردیاں پہنے ہوئے قلی نظر آئے ...... انجنیر نے یونیفارم کا کوٹ پہنا، ہینڈ بیگ ہاتھ میں لیا اور دروازہ کھول کر تختہ پر کھڑا ہوگیا۔ میں بھی ایک کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا، تاکہ گاڑی کے ٹھیرتے ہی قلی کو آواز دے سکوں۔ میں نے انجنیر کو دیکھا، وہ دروازہ میں کھڑا ہوا ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اس نے بھی مجھے دیکھا، اپنا سر ہلایا اور مسکرانے لگا لیکن میں نے حیرت و استعجاب کے ساتھ یہ دیکھا کہ وہ اس وقت غیر معمولی طور پر بے انتہا زرد معلوم ہو رہا تھا۔

ایک لمبے قد کی خاتون، نقرئی رنگ کی جاکٹ پہنے، سر پر مخمل کی بڑی سی ٹوپی رکھے اور چہرہ پر نیلے رنگ کا برقعہ ڈالے ہوئے، ہماری گاڑی کے سامنے گزر گئی۔ اس کے ہمراہ ایک چھوٹی لڑکی تھی جو اونچا کوٹ اور سفید پاجامہ پہنے ہوئے تھی۔ دونوں کی نگاہیں ٹرین کا تعاقب کر رہی تھیں اور ہر کھڑکی کو نہایت اضطراب کے ساتھ دیکھتی جاتی تھیں۔ لیکن ان کی نظریں چوک گئیں۔ اس کے بعد میں نے انجنیر کو ایک عجیب میٹھی ہوئی اور لرزتی ہوئی آواز میں پکارتے سنا "سنو چکہ" میرا خیال ہے کہ ان دونوں نے مڑ کر دیکھا ...... اس کے بعد یکایک درد و تکلیف کی ایک مختصر، خوف ناک چیخ سنائی دی ..... میں اس کو نہیں بھول سکتا، عمر بھر نہیں بھول سکتا .... وہ دوسری تمام چیخوں سے مختلف ایک ایسی چیخ تھی جس میں پریشانی، خوف، تکلیف اور مایوسی شامل تھیں۔

ایک لمحہ کے لئے، صرف ایک لمحہ کے لئے، مجھے انجنیر کا سر نظر آیا، کہیں پلیٹ فارم اور گاڑی کے پہیوں کے

درمیان ۔۔۔۔ ٹوپی ندارد ہو چکی ۔۔۔ اس کا چہرہ میں بالکل نہ دیکھ سکا، صرف سر کی گلابی جلد نظر آئی، جس پر چھوٹے چھوٹے بال کھڑے تھے۔ سر بھی بس ایک لمحہ کے لئے نمودار ہوا ۔۔۔ اور پھر میں کچھ نہ دیکھ سکا۔

اس کے بعد مجھ سے بطور گواہ کے سوالات کئے گئے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے اس کی بیوی کو تسلی اور تشفی دینی چاہی لیکن ان حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے کوئی کیا کہہ سکتا ہے؟ میں نے انجنیئر کو بھی دیکھا، کچلے ہوئے اور کٹے ہوئے گوشت کا ایک لوتھڑا معلوم ہوتا تھا۔ جب اسے گاڑی کے نیچے سے نکالا گیا ہے، تو وہ دم توڑ چکا تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ پہلے صرف اس کی ٹانگ کٹی تھی، لیکن فطرتی طور پر اس نے سنبھلنے کی کوشش کی، اور مڑا۔ مڑنے کے ساتھ ہی پہیہ اس کے سینہ اور پیٹ پر سے اتر گیا۔

اب میں اس سرگزشت کے سب سے زیادہ دردناک حصہ پر آتا ہوں۔ ان مہیب اور ناقابلِ فراموش لمحات میں ایک عجیب خیال متواتر میرے دماغ میں چکر لگاتا رہا۔ میں نے دل میں کہا۔ "احمقانہ موت، بیہودہ موت، ظالم، غیر منصفانہ موت"۔ لیکن بہرنوع اس کی چیخ کے بعد پہلے ہی لمحہ میں مجھے صاف نظر آنے لگا تھا کہ انجام کار لازمی طور پر یہی ہونا تھا، اور یہ لغویت منطقیانہ اور قدرتی تھی لیکن ایسا کیوں تھا؟ تشریح کیجئے؟ ۔۔۔۔ کیا یہ میرے "کوئی" کا وہی خندۂ تغافل نہیں تھا، جسے اس حد تک محسوس کیا گیا؟

بعد کو میں انجنیئر کی بیوہ سے ملنے گیا۔ وہ اس کے متعلق مجھ سے سوالات دریافت کرتی رہی اور آخر میں صاف اقرار کر لیا کہ ہم دونوں نے اپنی محبت کی بیتابی، ملاقات کے تیقن، اور خوش آئند مستقبل کے یقین سے قسمت کو فریب دینا چاہا تھا ۔۔۔ لیکن پھر اس کے بعد کیا؟ ممکن ہے کچھ ہو، مگر میں کسی بات پر یقین نہیں کر سکتا ۔۔۔۔ مشرق میں (اور وہیں ہم قدیم عقل و دانائی کے پاک و صاف چشمہ کو لہریں مارتے دیکھتے ہیں) کوئی شخص اپنا ارادہ "انشاء اللہ" کا جملہ کہے بغیر ظاہر نہیں کرتا، جس کا مفہوم یہ ہے کہ "اگر خدا نے چاہا" یا "اگر اس کو منظور ہوا"

بہرحال میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اس معاملہ میں قسمت کے فریب کو دخل نہ تھا، بلکہ یہ صرف میرے پُراسرار "کوئی" کی وہی لغو منطق تھی حقیقتاً اس سے زیادہ خوشی، اس سے بڑھکر مسرت، انھیں عمر بھر حاصل نہ ہو سکتی، جب وہ بعد و فصل کی درازیوں کو طے کرنے کے بعد ایک دوسرے سے ملتے۔ لیکن خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس آزمائش میں کامیاب اترنے کے بعد ان کی قسمتوں میں آیندہ کیا لکھا ہوتا، ان کی مشتعل محبت کا کیا انجام ہوتا۔ بدمزگی؟ دل سیری؟ تغافل؟ اور ممکن ہے کہ نفرت؟

انیس الدین احمد رضوی

عزتِ نفس

غیر کے اعتماد پر زعمِ حیات تا کجا　　وہمِ تسلیات پر سعیِ حیات تا کجا
قوتِ ماسوا پہ یہ بارِ نجات تا کجا　　مطلعِ فکر پر محیط جہل کی رات تا کجا
اپنی ہی روشنی بنا خود ہی زمانہ تاب بن
ذرۂ عافیت گزیں پیکرِ آفتاب بن

خاص ہیں تیری قوتیں اور تجھے خبر نہیں　　تجھ پہ ہیں حق کی رحمتیں اور تجھے خبر نہیں
تجھ میں نہاں ہیں عظمتیں اور تجھے خبر نہیں　　ہیں ترے دل میں ہمتیں اور تجھے خبر نہیں
غیر کے اعتماد پر کس قدر اعتبار ہے
عزتِ نفس کے لئے غیر کا انتظار ہے

غیر کریں ترا وقار تجھ کو یہی ہوس رہی　　غیر کی تھی وہ آرزو جو تری ہم نفس رہی
دوسروں کی گراں سری تیری نظر میں بس رہی　　طوطیِ روح دائماً قیدیٔ صد قفس رہی
کچھ بھی نیاز کے سوا اور نہ تجھ سے ہو سکا
اپنی حقیقتوں پہ کیوں غور نہ تجھ سے ہو سکا

گلشنِ کائنات میں طائرِ خوش نوا ہی تو　　باغِ تجلیات میں بلبلِ نغمہ زا ہی تو
مہرِ کمال ہے مگر جہل میں گھر گیا ہی تو　　ذات کے اعتراف سے دور چمک رہا ہی تو
مرکزِ فطرتی پہ آ، جلووں کو اذنِ تاب دے
طبعِ فسردہ رنگ کو فطرتِ آفتاب دے

خود ہی بہارِ تازہ بن سیرِ بہار خود ہی کر　　اپنے ہی ذوق کو سنوار، اپنا سنگھار خود ہی کر
اپنے کمالِ ذات پر دل کو نثار خود ہی کر　　عزتِ نفس کو سمجھ، اپنا وقار خود ہی کر
نور ہے فطرت آشنا، عظمتِ نفس ہے یہی
اپنی ہو معرفت تجھے عزتِ نفس ہے یہی

ابوالحسن حسن بدایونی
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اقوالِ زرّیں

(۱) کسی مسئلہ کو لاینحل کہنے کے یہ معنی ہیں کہ آپ اُسے سمجھے نہیں۔ (لارڈ کیلون)

(۲) علم کو ناز ہے کہ میرے معمول نے اس قدر حاصل کر لیا، عقل معترف ہے کہ وہ کچھ نہیں جانتا۔ (کوپر)

(۳) جہالت کے علاوہ کوئی تاریکی نہیں۔ (شیکسپیر)

(۴) سچائی چھوٹے چھوٹے کاموں میں بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی بڑے بڑے معاملات میں وہ نتائج بدجو جھوٹ سے مترتب ہوتے ہیں زیادہ اہم نہیں۔ بڑی بات تو یہ ہے کہ تمھارا دل جھوٹ سے آلودہ نہ ہو" (ٹالسٹائی)

(۵) بہترین مشروب وہ ہے جسے انسان اس وقت منہ میں لے جب وہ کوئی خراب بات کہنے والا ہو کیوں کہ وہ چیز اُسے اس کلمۂ بد کے تلفظ سے روک دے گی اور اس کے فرد کرنے میں معاون ہوگی۔ (ٹالسٹائی)

"حُسن"

اک آپ ہی نہیں ہیں فقط تاجدارِ حُسن
ہر پیکرِ حیات ہے صد جلوہ زارِ حُسن

آخر سکون اس کی فنا کا سبب ہوا
رہتا ہمیشہ کاش یہ دل بے قرارِ حُسن

سُرمہ تھا طور، عشق میں جنابِ کلیم تھو
چمکا کچھ اس طرح سرِ سینا شرارِ حُسن

دونوں کے نام لوحِ ابد پر رہیں گے نقش
میں یادگارِ عشق ہوں وہ یادگارِ حُسن

کچھ بے سبب نہیں مری مخموریاں مجید
آنکھوں سے پی رہا ہوں مئے خوش گوارِ حُسن

مہدی اجنالوی

تنقید و تبصرہ

از

ایڈیٹر

---

(۱) کتب

تاریخِ اخلاقِ یورپ، جلد اوّل لیکی کی مشہور کتاب "ہسٹری آف یورپین مارلس" کا ملخص ترجمہ، از مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی، بی اے۔ کتابت و طباعت بہترین، ضخامت ۲۹۲ صفحات قیمت درج نہیں۔ ملنے کا پتہ (۱) دارالاشاعت انجمن ترقیٔ اردو، اورنگ آباد دکن، یا (۲) مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ

زیر تنقید کتاب مطبوعات انجمن ترقیٔ اُردو کے سلسلہ کی انیسویں کتاب ہے اور آج سے پیشتر اُردو دنیا میں کافی مقبول ہو چکی ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ہمارے مکرم مولانا محمد مقتدیٰ خاں صاحب شروانی کے اہتمام سے مسلم یونیورسٹی پریس میں طبع ہوا ہے۔ اور یہی نام کتاب کی ظاہری خوبیوں کے لئے کافی سے زیادہ ضمانت ہے۔

کتاب کے باطنی محاسن پر تبصرہ یا رائے زنی کرنا تحصیل حاصل بھی ہے اور بعد از وقت بھی۔ مولانا عبدالماجد صاحب اس صنعت کی تالیفات کے سلسلہ میں تمام تعریف و توصیف سے بالاتر ہو چکے ہیں، اور اسی طرح "تاریخ اخلاق یورپ" علمی طبقہ میں کافی نام پیدا کر چکی ہے۔ جو علم دوست حضرات تاریخ اور فلسفہ سے شغف رکھتے ہوں، اُنھیں اس کتاب کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیئے۔

بقائے دوام | مصنفہ جناب میاں محمد اسلم صاحب، کاغذ کتابت اور طباعت بہترین، سرورق نہایت خوبصورت
ضخامت ۷۲ صفحات، قیمت مجلد عیہ/ بلا جلد عمر۔ ملنے کا پتہ: نسیم بک ڈپو، بازار اردو خانہ، لاہور

ہمارے محترم دوست اور "نادیدہ کرم فرما" جناب میاں محمد اسلم صاحب، ادبیات اردو کی جس قدر گراں بہا خدمات انجام دے رہے ہیں وہ غریب اردو کے لئے ایک احسانِ عظیم سے کم نہیں۔ حال ہی میں آپ نے اپنی تصانیف میں ایک اور کتاب کا اضافہ فرمایا ہے، جس کی بابت بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں اپنی طرز کی پہلی کتاب ہے، اور میاں صاحب نے اس طرف قدم اٹھا کر ملک کے دماغوں کے لئے ایک نیا راستہ کھول دیا ہے۔

"روح" کی ماہیت اور حقیقت کے متعلق مغربی زبانوں میں بیسیوں تصانیف نظر آتی ہیں۔ یورپ کے مشاہیر اہل قلم نے اپنے اپنے تجربوں کو الفاظ کا جامہ پہنا کر دادِ تحقیق دی ہے۔ سر آرتھر کانن ڈائل اور سر الیور لاج ماہیت روح کے متعلق مختلف تجربات کر چکے ہیں، اور آج یورپ میں یہ عقیدہ انہیں تجربات و تحقیقات کا مرہونِ منت ہے کہ روح انسان کے جسم سے علیحدہ ہو کر ہمیشہ کے لئے مادی نظروں سے پوشیدہ نہیں ہو جاتی۔

میاں صاحب نے یورپ کی اس تمام تحقیقات کا خلاصہ "بقائے دوام" میں پیش کیا ہے اور مختلف مثالیں دے کر اس نظریہ کو واضح کرنے کی ایک بڑی حد تک کامیاب کوشش کی ہے۔ "بقائے دوام" کا کچھ حصہ علی گڑھ میگزین کے تعطیلات نمبر میں شائع ہو چکا ہے، اور اسی سے اس مضمون کی ندرت اور دلچسپی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ کتاب اس قدر دلچسپ ہے کہ شروع کرنے کے بعد ختم کئے بغیر چھوڑنے کو دل گوارا نہیں کرتا، اور اس کے باوجود بھی مفصل تحقیقات کے حالات معلوم کرنے کے لئے پھر کتارہ جاتا ہے۔

اس تصنیف کی اصل محرک، میاں صاحب کی خورد سال بچی اصغری کی موت ہوئی اور اس معصوم کے نام سے یہ کتاب معنون کی گئی ہے۔ کتاب کی ظاہری خوبیوں کے متعلق کچھ لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ کیوں کہ میاں صاحب کی کتابیں کاغذ، کتابت اور طباعت کے لئے مشہور ہو چکی ہیں۔ شروع میں میاں صاحب کا ایک فوٹو بھی کتاب کی زینت ہے۔ اسی سلسلہ میں ان پرخلوص اور پرمحبت الفاظ کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے جو میاں صاحب موصوف نے کتاب کے دیباچہ میں ناچیز مدیر کی بابت تحریر فرمائے ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ میاں صاحب کی یہ تصنیف جس مقبولیت کی مستحق ہے، حاصل کر کے رہے گی اور اُردو داں اصحاب اس نئے موضوع کو انتہائی دلچسپی سے مطالعہ کریں گے۔

انشائے جدید | مرتبۂ جناب محمد علی خاں صاحب اثر رامپوری ایم پی۔ کتابت وطباعت عمدہ۔ قیمت ۲ر مؤلف موصوف سے خسرو باغ روڈ رام پور اسٹیٹ کے پتہ پر مل سکتی ہے۔

یہ ایک چھوٹا سا رسالہ ہے، جس میں فاضل مؤلف نے فارسی جدید کے چند مفید خطوط اور دیگر قسم کے کاغذات کو فراہم کیا ہے۔ اثر صاحب نے فارسی جدید کے پہلو بہ پہلو ہندوستانی فارسی کے نمونے بھی دیئے ہیں اور اس سے طلباء کے لئے یہ کتاب بہت مفید اور کارآمد بن گئی ہے۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ اس کتاب کو مسلم یونیورسٹی نے اپنے انٹرمیڈیٹ کے امتحان کے لئے بھی منظور فرمالیا ہے اور فارسی کے نصاب میں داخل کرلی گئی ہے۔

اثر صاحب نے زمرۂ طلباء پر ایسی کارآمد کتاب لکھ کر بہت بڑا احسان کیا ہے اور ہمیں امید ہے کہ وہ لوگ جو فارسی جدید سے شغف رکھتے ہیں اور اسے حاصل کرنے کے متمنی ہیں، اس رسالہ کا خاص طور سے مطالعہ فرمائیں گے۔

مضامینِ چکبست | یعنی پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی آں جہانی کے چند ادبی اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ۔ کتابت وطباعت بہت خوب ضخامت ۲۴۴ صفحات قیمت صرف عہ، جو کتاب کے محاسن پر نظر ڈالتے ہوئے بہت کم معلوم ہوتی ہے۔ ملنے کا پتہ: انڈین پریس لمیٹڈ الٰہ آباد

جناب چکبست کا نام ادبی دنیا میں آج کسی تعارف کا محتاج نہیں ملک کے اُن چند اہلِ ہنود حضرات میں آپ کی ذات ایک نمایاں حیثیت رکھتی تھی، جنھوں نے اُردو کو بجا طور پر اپنی متفقہ مادری زبان سمجھا، اور آخر عمر تک اس کی خدمت سے کبھی دریغ نہیں کیا۔ اہل زبان ہونے کے علاوہ آپ کا اردو کا مطالعہ بہت وسیع تھا، اور نثر اور نظم دونوں میں ید طولےٰ رکھتے تھے۔ مقام شکر ہے کہ آپ کے مضامین کا یہ مجموعہ انڈین پریس نے شائع کر کے غریب اُردو کو ایک ناقابل تلافی

نقصان سے بچا لیا اور ان نوادرِ ادبی کو محفوظ کر کے اُردو پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔

اس مجموعہ میں تین مضامین کے علاوہ باقی تمام مضامین ایسے ہیں جو ادبیات اردو کے کسی نہ کسی پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اور ان میں بھی کچھ حصہ ایسے تنقیدی مضامین کا ہے، جن میں بعض ہندو شعرا کے کلام پر نظر ڈالی گئی ہے۔ ان کے علاوہ داغ دہلوی، مثنوی گلزارِ نسیم، اودھ پنچ، منشی سجاد حسین اڈیٹر اودھ پنچ، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، نواب سید محمد آزاد، اور دیگر عنوانات پر بھی مضامین ہیں۔

چکبست مرحوم کی تحریر اور طرزِ انشا پردازی میں سلاست اور روانی بہت پائی جاتی ہے اور اکثر مقامات پر عبارت اور الفاظ میں ایسی دلکشی اور رنگینی پیدا ہوگئی ہے کہ بار بار اُسے پڑھنے کو دل چاہتا ہے۔ تنقیدی مضامین لکھنے کا آپ کو خاص ملکہ تھا۔ اور اس مجموعہ میں جس قدر تنقیدی مضامین ہیں، اُن سے پتہ چلتا ہے کہ کلام کے انتخاب میں آپ کی نظر کیا تھی، اور چوں کہ خود بھی اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے۔ لہٰذا شعرا کے عیوب اور محاسن آپ کی نظر سے نہیں چھپ سکتے تھے۔ اکثر مضامین ایسے بھی معلوم ہوتے ہیں جو مولانا شرر مرحوم کے جواب میں کسی ادبی مبحث پر لکھے گئے ہیں۔

بہر حال یہ مجموعہ قابلِ قدر ہے اہلِ ملک کو اس سے سب سے بڑا یہ سبق حاصل کرنا چاہئے کہ اُردو کسی ایک فرقہ، یا ایک جماعت کی زبان نہیں بلکہ ہندوستان کی متفقہ اور مسلّمہ زبان ہے۔ ایسی زبان جس نے ہر قوم و ملت سے اپنے سچے اور حقیقی محسن پائے، اور انھیں محسنوں کے طفیل آج اس شاہراہِ ترقی پر گامزن نظر آتی ہے۔

ارنسٹ آسکر وائیلڈ کے ایک ایک ڈرامہ "دی امپارٹینس آف بینگ ارنسٹ" (The Importance of Being Earnest) کا اردو ترجمہ از مولوی سید تمکین کاظمی صاحب، منشی فاضل، ایم آر اے ایس و مولوی محمد عبد المنعم سعیدی، بی اے (علیگ)، ایم آر اے ایس۔ کتابت و طباعت معمولی، ضخامت ۱۱۰ صفحات، قیمت عمر، ملنے کا پتہ مکتبۂ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدر آباد دکن۔

"دی امپارٹینس آف بینگ ارنسٹ" انگلستان کے شہرۂ آفاق ڈرامانگار آسکر وائیلڈ (Oscar Wilde) کے شاہکاروں میں گنا جاتا ہے، اس کے دیگر ڈراموں کی طرح اس میں ندرتِ تخیل اور اسلوبِ بیان کی لطیف مثالیں ہر جگہ نظر آتی ہیں

ڈرامے کے پلاٹ کا جہاں تک تعلق ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ انتہائی دلچسپ اور شگفتہ ہے لیکن اس کے ساتھ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ترجمہ کی اصل خوبی کو مترجمین قائم نہ رکھ سکے حقیقت میں ترجمہ کی خوبی یہ ہے کہ وہ ترجمہ نہ معلوم ہو سکے بلکہ بذات خود اپنی تصنیف معلوم ہو۔" ارنسٹ میں یہ خوبی تقریباً ہر جگہ مفقود نظر آتی ہے۔ اکثر مقامات پر مغربی انداز بیان کی لفظ بہ لفظ پیروی کرنے کی وجہ سے عبارت بالکل بے ربط ہو گئی ہے اور ادائے خیال میں اس قدر گنجلک پیدا ہو گئی ہے کہ کوئی انگریزی نہ جاننے والا شخص اس کو مشکل سمجھ سکے گا۔

ہم امید کرتے ہیں کہ آئندہ اڈیشن میں مترجمین صاحبان زبان کو عام فہم، سلیس اور شستہ بنانے کی کوشش کریں گے۔ اور اس کے بعد یہ کتاب ادبیات اردو میں ایک قابل قدر اضافہ ثابت ہوگی۔

قوم پرست طالب علم | بچوں کے لئے ایک ڈراما، از جناب محمد عبدالغفار صاحب مدہولوی، مدرس جامعہ ملیہ دہلی کتابت و طباعت اچھی، حجم ۴۸ صفحات قیمت ۴/ ملنے کا پتہ (۱) مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، قرول باغ دہلی۔ (۲) اجمل بک ڈپو پرنس بلڈنگ، بمبئی (۳) قومی کتب خانہ، ریلوے روڈ، لاہور (۴) اورنٹیل بک ڈپو، دکان نمبرہ۔ مکان نمبر ۸۵۔ ۸۶، فریزر اسٹریٹ، رنگون۔ (۵) مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدر آباد دکن۔

یہ ایک چھوٹا سا ڈرامہ ہے جس میں چھوٹے بچوں کو حب وطن، راست بازی اور ایمانداری کی ایک دلچسپ پیرایہ میں تعلیم دی گئی ہے۔ ہمارے نزدیک آج کل ملک کو ایسی تصانیف کی زیادہ ضرورت ہے جو لطیف اور دلکش قصوں کے ذریعہ سے بچوں کے دماغ میں شریفانہ خوبیوں کو اچھی طرح جما دیں، اور شروع ہی سے ان کے عادات و خصائل کی اصلاح کر دیں۔ ہم مولوی عبدالغفار صاحب کی اس کوشش کو تحسین کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور امید کرتے ہیں کہ بے تکی اور لغو کہانیوں کے مقابلہ میں اس قسم کے سبق آموز قصے بچوں کے لئے زیادہ مفید ثابت ہوں گے۔

روحِ رواں | یعنی کلیات جناب جگت موہن لال صاحب رواںؔ ایم اے وکیل اُناؤ۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب حجم ۶۴ + ۲۲۲ صفحات، قیمت درج نہیں۔ مصنف صاحب سے مل سکتی ہے۔

رواں صاحب سے علی گڑھ کی فضا خوب واقف ہو چکی ہے۔ انجمن خیابانِ اُردو انٹرمیڈیٹ کالج کا جو سالانہ مشاعرہ ۸-۹ دسمبر کو منعقد ہوا تھا، اس میں رواں صاحب نے اپنے کلام سے حاضرین کو مسحور کر لیا تھا۔ زیر نظر کتاب کلیات کے طور پر شائع ہوئی ہے جس میں کلام کی تقریباً تمام اصناف، یعنی نظوم، غزلیات، قطعات، رباعیات، وغیرہ کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ شروع میں جناب عزیز لکھنوی کا ایک نہایت فاضلانہ مقدمہ شامل ہے جو تقریباً ۴۰ صفحات پر حاوی ہے۔

رواں صاحب کو شاعری میں جو ید طولیٰ حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں، آپ کے اشعار سلاست بیان ندرت تخیل، اور زور طبع کی صحیح مثالیں ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہر صنفِ کلام پر آپ کو یکساں قدرت حاصل ہے۔ نظموں میں "سرود عشق" جس کا پہلا شعر ہے۔

جب صبح گلابی ہونٹوں سے پیغام نور سناتی ہے — جب شب کی اندھیری، دن کی ضیا سے آکے گلے مل جاتی ہے

اور "لاوارث بچہ" "آنسو" "معجزۂ انتظار" جس کا ایک شعر ہے۔

شب تھی، وہ مستِ بادۂ الفت و جامِ آرزو — اب تھی، فریب خوردۂ سحر پیامِ آرزو

اور "دو آئینے" یعنی "ایک ہندو بیوہ سے پیام شادی اور بیوہ کا جواب" بہترین نظمیں ہیں۔ ان میں رواں صاحب نے انسانی جذبات کی جس طرح ترجمانی کی ہے وہ آپ ہی کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔

اسی طرح "غبارہ" کے عنوان سے جو نظم ہے وہ لطیف استعارات اور تشبیہات سے مملو ہے۔ چند اشعار ہیں۔

حسیں پری کوئی مستِ مئے صبوح چلی — نکل کے قالب خاکی سے جیسے روح چلی

پڑا ہے پاکسی سے کشش کا صبر رندانہ — اُلٹ گیا ہے مئے آتشیں کا پیمانہ

ڈھلک کے دیدۂ سالک سے کوئی اشکِ نیاز — چلا ہے ہونے کو دامانِ عفو پر ممتاز

غزلیات میں کہیں کہیں "آورد" کی کیفیت بھی نظر آجاتی ہے، تاہم اس صنف میں بھی رواں صاحب کی وہی قادر الکلامی صاف جھلکتی ہے۔ جو آپ کا طرۂ امتیاز ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہماری آخری ہچکی پہ وہ ارشاد کرتے ہیں — انھیں کو ضبط کا دعویٰ ہے جو فریاد کرتے ہیں

اداسی ہے ہر اک چہرہ پہ، ہر پہلو میں سناٹا — خدا جانے کوئی کیا اٹھ گیا ہے کے محفل سے

چھینٹیں جو خوں کی دامنِ قاتل میں رہ گئیں — محشر میں میرے قلب کی تفسیر ہو گئیں

میں یک جا ہی کرتا تھا اپنے کو اس　　　کہ اُن سے مرا سامنا ہو گیا

کعبۂ وفا ہے یہ، خانۂ خدا ہے یہ　　　اُف یہ کیا کہا تم نے دل کی کوئی ہستی ہے

گلا فضول ہے طولِ شبِ جدائی کا　　　بہت سی راتیں ہوئیں ایک کی سحر نہ سہی

رواں صاحب کے کلام میں رباعیات کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ اور بالخصوص رباعیات نے ہی آپ کا درجہ مشاہیر شعراء میں اس قدر بلند کر دیا ہے۔ مثالاً صرف چند رباعیات پر اکتفا کی جاتی ہے۔

حرص و ہوسِ حیاتِ فانی نہ گئی　　　اس دل سے ہوائے کامرانی نہ گئی
ہے سنگِ مزار پر ترا نام رواں　　　مر کر بھی امیدِ زندگانی نہ گئی

کیا تم سے بتائیں عمرِ فانی کیا تھی　　　بچپن کیا چیز تھا جوانی کیا تھی
یہ گل کی مہک تھی وہ ہوا کا جھونکا　　　اک موجِ فنا تھی زندگانی کیا تھی

گناہ کے نظریہ کو کس قدر لطیف پیرایہ میں ادا کیا ہے۔

گر پھر کبھی زندگی عنایت کرنا　　　مالک میرے خود ہی عنایت کرنا
کہتے ہیں گناہ وجہِ تکمیلِ حیات　　　پھر ذوقِ گنہ بھی عنایت کرنا

پھر فرماتے ہیں

مدہوش کو لذتِ گنہ کیا معلوم　　　مسرور کو حسرتِ گنہ کیا معلوم
ہے اس سے خودی، خودی ہے بیخِ نشاط　　　ناصح تجھے عظمتِ گنہ کیا معلوم

اس مختصر اور سرسری نظر ڈالنے کے بعد ہم امید کرتے ہیں کہ شعر و سخن سے ذوق رکھنے والے اصحاب رواں صاحب کے کلام کی کما حقہٗ قدر کریں گے۔

واقعاتِ عالم | جناب قادر بادشاہ صاحب مرحوم رئیس وانمباڑی کے چند قطعات تاریخ کا مجموعہ، مرتبہ خطیب محمد عبدالرشید صاحب۔ کتابت و طباعت بہت خوب، حجم ۴۴ صفحات۔ قیمت ۴ ر۔ ملنے کا پتہ خطیب محمد عبدالرشید نمبر ۶۹ گوڈون اسٹریٹ، مدراس۔

زیر نظر کتاب میں چند تاریخی قطعات یک جا کر دیئے گئے ہیں، جو بادشاہ صاحب مرحوم نے مختلف مواقع پر لکھے تھے کتاب کا نام دیکھ کر ہمیں یہ شبہ پیدا ہوا تھا کہ شاید تاریخ عالم کے کسی پہلو پر محققانہ نظر ڈالی گئی ہو لیکن فوراً ہی اس شبہ کا ازالہ ہو گیا تاہم یہ سرگردانی اب تک باقی ہے کہ ایسے تاریخی قطعات کو جن میں سے بعض شاید مقامی حیثیت بھی نہ رکھتے ہوں گے۔ واقعات عالم سے موسوم کرنا کہاں تک مناسب ہے۔ اس پر ستم ظریفی یہ کہ مرتب صاحب دیباچہ میں فرماتے ہیں۔"..... دنیا کا ایک تاریخی مجموعہ بن جائے گا جو کتب تواریخ میں شامل کر دیا جا سکتا ہے۔"

بہر حال یہ قطعات ادبی نقطۂ نگاہ سے خاصے ہیں۔ لیکن ایسی غلطیاں اکثر ہیں جو دکن اور مدراس کی زبان میں عموماً پائی جاتی ہیں۔ مثلاً "کردیا اس کو غلط ربِ قدیر" یا "بیڑہ نہ کسی کا پایا ایسا نقصان، جو کچھ پایا ہے بالکل کا بیڑہ"

اس کے علاوہ فن شعر اور زبان کی بھی غلطیاں کہیں کہیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً ملکۂ وکٹوریہ کی تاریخ وفات کے قطعہ میں جب کا پہلا مصرع ہے" ملکۂ ذی عز و شاں امپرس وکٹوریہ" ظاہر ہے کہ اس میں "امپرس" کا سین گرتا ہے اور یہ کسی طرح جائز نہیں۔ یا "بحری بیڑہ دول یورپ کا گیا" اور" دول اور سلطان میں باہم تصفیہ" ان دونوں مصرعوں میں لفظ "دُوَل" کا تلفظ غلط اور قابل اعتراض ہے۔

بہر کیف ان چند غلطیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے، کہا جا سکتا ہے کہ کتاب من حیث المجموع خاصی ہے اور تاریخی قطعات سے دلچسپی والوں کے لئے اچھا مواد جمع کیا گیا ہے۔

پردہ | آج کل پردہ کی بحث ملک کے طول و عرض میں ہر طرف چھڑی ہوئی ہے چنانچہ مختلف اوقات میں ہمارے پاس حسب ذیل رسالے پردہ کے متعلق موصول ہوئے۔

(الف) مروجہ پردہ کی تائید میں:-

(۱) حقیقت پردہ، از تصنیف مولوی محمد محمود صاحب تھانوی۔ ۴۴ صفحات

(۲) حجاب اسلامی " " " " ۔ ۴۰ "

(۳) ناموسِ ملت، از خادم علی خاں صاحب اختر، ڈلشوڈ روڈ آگرہ۔ ۳۰ صفحات

(۴) مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کے مضمون "پردہ کے حدود" کا مفصل و مدلل جواب،

ایک حق پرست مسلمان کے قلم سے۔ ۲۲ صفحات۔ دو پیسہ کا ٹکٹ بھیج کر ماسٹر محمد اسحاق صاحب، محلہ مروہی ٹولہ، سیتاپور سے مفت مل سکتا ہے۔

مذکورۂ بالا رسائل اس پردہ کی تائید میں تحریر کئے گئے ہیں جو ہندوستان میں آج کل عام طور سے رائج ہے۔ تمام رسالوں میں قرآنِ کریم و احادیث شریف سے پردہ کو "مذہب اسلام کا ایک جزو" ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

(ب) پردہ کی مخالفت میں:۔

(۵) قرآن اور پردہ۔ مصنفہ جناب محمد عظیم بیگ صاحب چغتائی بی اے۔

یہ رسالہ ہی نہیں، بلکہ اچھی خاصی کتاب ہے اور چغتائی صاحب کی اصل کتاب "اسلام اور پردہ" کی پہلی جلد ہے۔ مصنف نے اس میں بدلائل و براہین ثابت کیا ہے کہ اس پردہ کا حکم قرآنِ کریم میں کہیں نہیں ملتا جو آج کل ہندوستان میں رائج ہے۔ پردہ کے مسئلہ پر اپنی رائے محفوظ رکھتے ہوئے اس حقیقت کا اعتراف ہمیں ضرور کرنا ہے کہ چغتائی صاحب نے اپنے نفس مطلب کو بالکل واضح کر دیا ہے، اور قرآنِ کریم سے قرار واقعی طور پر یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ ہندوستانی پردہ اسلام کا شعار نہیں بلکہ قدیم عربی تمدن اور معاشرت کے سراسر منافی ہے۔ ہم چغتائی صاحب کی کوششوں کی داد دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ اس مختلف فیہ مسئلہ پر رائے قایم کرتے وقت چغتائی صاحب کی کتاب "قرآن اور پردہ" کو ضرور نظر کے سامنے رکھا جائیگا۔

---

(۲) رسائل

سفینہ مدراس | اڈیٹر جناب محمد عبد الجبار صاحب بی اے۔ چندہ سالانہ ساڑھے تین روپیہ۔ ملنے کا پتہ: مینیجر سفینہ، گورنمنٹ محمڈن کالج مونٹ روڈ، مدراس

گورنمنٹ محمڈن کالج مدراس کی اردو سوسائٹی کا سہ ماہی علمی و ادبی رسالہ ہے جو جولائی گزشتہ سے عالم وجود میں آیا ہے۔ دو نمبر ہمارے پیش نظر ہیں اور انھیں دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ مدراس کی سرزمین اس معیار کا رسالہ نکال سکتی ہے۔ کالج کے طلبا کی کوششیں واقعی لائق داد ہیں، کہ اس قدر حوصلہ شکن ماحول کے باوجود بھی صحافت اردو کی صف میں اس قدر شاندار

علمی پرچہ کا اضافہ کیا ہے۔ مضامین کا انتخاب، اور اُن کا بلند معیار مرتب کے ذوقِ علمی کا شاہد ہے۔
ہمیں امید ہے کہ سفینہ عنقریب بوقت الشیوع اُردو رسائل میں اچھی حیثیت حاصل کرے گا۔

نورجہاں، گوجرانوالہ، سالگرہ نمبر

زنانہ رسالوں میں "نورجہاں" طبقۂ خواتین کی جس قدر خدمت کر رہا ہے، وہ اظہر من الشمس ہے۔ یہ ہر سال تین یا چار خاص نمبر نکالتا ہے اور اپنے خریداروں کو اسی سالانہ چندہ میں پیش کرتا ہے۔ نورجہاں کا اس قدر زبردست ایثار اور جذبۂ خدمت واقعی قابلِ داد ہے، اور ملک کو ایسے رسالوں کی کماحقہٗ قدر کرنی چاہیئے۔

زیرِ نظر نمبر اس کا سالگرہ نمبر ہے، اور دو سو صفحات سے زائد پر پھیلا ہوا ہے۔ مضامین کا تنوع اس بات کا ضامن ہے کہ نسوانی زندگی کے ہر شعبہ کے لئے یہ خاص نمبر یکساں طور پر مفید ہے۔ تصاویر کی جاذبیت مدیرانِ رسالہ کے ذوقِ نظر کی شاہد ہے۔

زنانہ رسائل میں شاید یہ خصوصیت صرف نورجہاں کو ہی حاصل ہے کہ اس کا عملہ ادارت تمام تر خواتین پر مشتمل ہے، ورنہ ملک میں زیادہ تر زنانہ رسائل صنفِ قوی کی نگرانی میں نکل رہے ہیں۔ اس حیثیت سے نورجہاں کی فاضلہ مدیرہ اپنی اس شاندار کامیابی پر مستحق مبارکباد ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ادبیات نواز اصحاب اور خواتین اس کی قدر افزائی کریں گے۔

چمن، امرتسر، سالگرہ نمبر

ادارۂ تحریر: جناب محمد افضل خاں صاحب، جناب چمن لال سیوک صاحب و جناب عمر نظامی صاحب چندہ سالانہ صرف ؏ قیمت سالگرہ نمبر ۸؍

"شعروادب کا باتصویر ماہوار رسالہ" چمن گزشتہ سال سے جاری ہے اور نئے سال کا پہلا نمبر سالگرہ نمبر کے نام سے شائع ہوا ہے جو سو صفحات سے زائد پر پھیلا ہوا ہے۔ گیارہ بارہ کے قریب رنگین اور سادہ تصاویر ہیں جن میں سے اکثر اس سے قبل دیگر رسائل میں شائع ہو چکی ہیں۔

مضامین میں فسانوں کا عنصر بہت زیادہ غالب ہے۔ اور اکثر فسانے معیار سے گرے ہوئے نظر آتے ہیں، شذرات

کے سلسلہ میں اڈیٹر صاحب نے "پوری سربلندی اور فخر" کے ساتھ اعلان کیا ہے کہ "تمام مضامین غیر مطبوعہ ہیں اور خاص نمبر کے لئے لکھے گئے ہیں" حالاں کہ چند فسانے ایسے بھی ہیں جو اس سے پہلے دیگر رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔

ہم اراکین ادارت سے درخواست کرتے ہیں کہ اگر وہ واقعی ادبیات اُردو کی خدمت کرنا اتنا ہی ضروری خیال کرتے ہیں، اور جن کو اچھے رسائل کی صف میں جگہ دینا چاہتے ہیں تو انھیں اپنا معیار اور زیادہ بلند کرنا چاہئے۔ بہر نہج ان کی کاوشیں ضرور قابل داد ہیں۔

انٹرمیڈیٹ کالج میگزین علی گڑھ

مرتبہ جناب محمد حبیب اللہ خاں صاحب غلزئی چندہ سالانہ معلوم نہیں۔

گزشتہ اشاعت میں ہم نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ انٹرمیڈیٹ کالج میں ایسے طلبا ہیں جن میں علمی اور ادبی ذوق کی صلاحیت موجود ہے، اور جو اچھے طریقہ سے میگزین نکال سکتے ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ انٹرمیڈیٹ کالج میگزین کا پہلا نمبر دیکھ کر ہمارا یہ خیال یقین سے بدل گیا۔

اس نمبر میں مضامین کا معیار کافی بلند ہے اور بعض بعض مضامین مفید کارآمد اور سبق آموز ہیں۔ "ترا سی سوال" بہت دل چسپ مضمون ہے نظمیں اچھی، پاکیزہ اور بلند پایہ ہیں۔ ہم اپنے مکرم دوست اور گزشتہ معاون جناب حبیب اللہ خاں صاحب غلزئی کی خدمت میں افتتاحی نمبر کی اس شان دار کامیابی پر دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

مبصّر لکھنو

مدیر جناب ابو العلاء الناطق، معاون جناب سلیم آشفتہ چندہ سالانہ للعہ ششماہی عاصہ

ادبی رسائل کی صف میں جنوری سے اس نئے رسالہ کا بھی اضافہ ہوا ہے اور اس کا پہلا نمبر ہمارے پیش نظر ہے رسالہ پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہی اس کا پتہ چل جاتا ہے کہ مبصّر کا معیار معمولی رسائل سے بہت کافی بلند ہے۔ اس نمبر میں مشاہیر ادبا اور شعراء کے رشحات قلم نظر آتے ہیں۔ مضامین مفید اور سبق آموز ہیں۔ غزلیں شستہ اور پاکیزہ ہیں۔ جناب مولانا عبد الباری صاحب آسی نے اپنے مضمون "مصرع طرح" میں اردو مشاعروں کے ایک خاص پہلو پر جو اعتراض

کیا ہے ہم اس سے لفظ بلفظ متفق ہیں۔ اسی قسم کا ایک مضمون میگزین کی اس اشاعت میں شائع ہو رہا ہے حقیقتاً اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہے کہ اردو شاعری کی ان لاینعنی اور لغو قیود کو ایک دم اٹھا دیا جائے جنھوں نے ملک کی ذہنیت اور قوت شاعری کو دبا کر بے کار کر رکھا ہے۔

ہم امید کرتے ہیں کہ ادبی دنیا اس جدید رسالہ کا خیر مقدم کرے گی

مونس، گجرانوالہ | زیر ادارت جناب حفیظ اللہ صاحب دانش و حسن عابد صاحب زبیدی قیمت سالانہ سے ر ششماہی عہ۔

اس نام سے حال ہی میں سرزمین پنجاب سے ایک اور رسالہ کا اجرا ہوا ہے جس کے فی الحال دو نمبر ہمارے سامنے ہیں۔ رسالہ کا مقصدِ اصلی فسانوں اور ڈراموں کے ذریعہ سے "ملک و قوم کی ذہنی، اخلاقی و معاشرتی ترقی کے وسائل ہم پہنچانا ہے"

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فسانوں سے افرادِ ملت کے دماغوں اور ذہنیتوں پر زیادہ اثر پڑتا ہے، در آں حالے کہ خشک و اعظانہ مضامین اس کا عشر عشیر بھی نہیں ڈال سکتے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ فسانے بھی تو کسی مقصد کو مد نظر رکھ کر لکھے جانے چاہئیں۔ ان کا کچھ معیار ہونا چاہئے، ملک و قوم کے سامنے ان کے ذریعہ سے کچھ مواد پیش کرنا چاہئے۔

ہمیں رسالہ کے مقاصد اجراء سے حقیقی ہمدردی ہے، اور ہم اسے بلند اور اعلیٰ پایہ پر دیکھنے کے دل سے متمنی ہیں۔ لیکن افتتاحی دو نمبر جس حیثیت اور معیار کو لئے ہوئے منظر عام پر آئے ہیں، اسے دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ افراد کی ذہنیت کو ان غزلوں اور فسانوں سے بجائے فائدہ کے اُلٹا نقصان پہنچ جائے گا۔ زیر نظر دونوں نمبروں میں کئی فسانے اور ڈرامے شائع ہوئے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کوئی فسانہ یا ڈرامہ اس معیار کا حامل نہیں، جو ایک اعلیٰ پایہ کے رسالہ کے لئے انتہائی ضروری ہے۔ اور ایسے رسالوں کو جن کا مقصدِ اجراء اس قدر بلند ہو، لازمی طور پر "اعلیٰ پایہ" کا ہونا چاہئے۔ حصۂ نظم میں بھی یہی کیفیت نظر آتی ہے۔ عام طور پر ایسی غزلیں شائع کر دی جاتی ہیں جو معمولی اور گھسے پٹے خیالات اور اس سے زیادہ معمولی اور گھسے پٹے طرز ادا اور بندش کا نمونہ ہوتی ہیں۔

بہر حال ہمارے نزدیک "مونس" کی سب سے اچھی چیز صرف اس کا ٹائیٹل پیج ہے۔ اس کے علاوہ

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اور کوئی خوبی نظر نہیں آتی۔ البتہ ہماری دلی دعا ہے کہ خدائے تعالیٰ مدیران کو دنیائے صحافت کا تجربہ عطا فرمائے اور وہ اس قابل ہو جائیں کہ کسی ادبی رسالہ کے اعلیٰ معیار کو قائم رکھ سکیں اسی کے ساتھ ہم اس رسالہ کے مقاصد اجرا سے ہمدردی کا ضرور اظہار کریں گے۔

شاعر، امروہہ

مرتبہ مولانا افق امروہوی، چندہ سالانہ صرف ایک روپیہ آٹھ آنہ۔

شاعر گزشتہ سال سے جاری ہوا ہے، اور زیر نظر نمبر دوسرے سال کا پہلا نمبر ہے۔ رسالہ جیسا کہ اس کے نام ہی سے ظاہر ہے، زیادہ تر شعر و شاعری سے تعلق رکھتا ہے۔ نثر کے بھی چند مضامین نظم آتے ہیں۔ لیکن حصۂ نظم غالب ہے۔ مضامین نظم و نثر کا معیار خاصا بلند معلوم ہوتا ہے۔ نثر کے چند ادبی مضامین خوب ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ تحقیق مطلب میں کاوش سے کام لیا گیا ہے۔ نظموں کا زیادہ حصہ بلند پایہ ہے چند غزلیات ایسی بھی ضرور ہیں، جو بہتر تو یہی تھا کہ شائع نہ کی جاتیں اور اگر ان کی اشاعت ضروری تھی تو مدیر صاحب کو اصلاح کر دینی چاہئے تھی۔

اس کے باوجود ایک خرابی کسی حد تک قابلِ اعتنا ضرور ہے اور وہ رسالہ کی ظاہری شکل و صورت ہے طباعت، کتابت اور کاغذ بہت معمولی ہے۔ فی زمانہ اس بات کی بہت سخت ضرورت ہے کہ رسالہ باطنی محاسن کے ساتھ ظاہری خوبیوں سے بھی آراستہ ہونا چاہئے۔ ہمیں امید ہے کہ اس کی طرف توجہ کی جائے گی۔

ہفتہ وار تاج آگرہ

اڈیٹر جناب مولانا سیماب صاحب اکبرآبادی۔ چندہ سالانہ للعہ

مولانا سیماب اکبرآبادی ادبی دنیا میں کافی شہرت حاصل کر چکے، اور اب کسی تعارف کے محتاج نہیں آپ نے شروع سال سے ایک ہفتہ وار اخبار "تاج" آگرہ سے نکالنا شروع کیا ہے۔ جس کے اب تک چند

نمبر ہماری نظر سے گزر چکے ہیں۔ تاج کا ہر چوتھا نمبر ماہوار اڈیشن کے طور پر شائع ہوتا ہے، اور علمی ادبی مضامین کا گنجینہ ہوتا ہے۔ تاج کی ایک خصوصیت "میرا پیغام" کا مستقل عنوان ہے جس کے ذریعہ سے مختلف واقعات پر سیماب صاحب قطعات کی صورت میں اپنا پیغام پہونچاتے ہیں۔

تاج کے ہر نمبر میں ایک فسانہ بھی شایع ہوتا ہے، لیکن اب تک جس قدر فسانے ہماری نظر سے گزرے ان کا کوئی خاص مقصد نہیں معلوم ہوتا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ فسانوں کے ذریعہ سے عام اخلاقی اور معاشرتی امور کا پروپیگنڈا کیا جائے، لیکن تاج کے افسانے زیادہ تر صرف عبارت آرائی کے حامل ہوئے ہیں جن میں افرادِ ملک کے لئے نہ کوئی فائدہ متصور ہوتا ہے نہ دلچسپی۔

بہر حال تاج بہ حیثیت مجموعی ہفتہ وار اخبارات کے زمرہ میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے اور امید ہے کہ سیماب صاحب اسے بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کریں گے۔

بقاءِ دوام

(مصنفۂ ایم اسلم)

"حیاتِ روح" کے متعلق اردو زبان میں یہ پہلی کتاب ہے۔ اس میں مادہ پرست یورپ کا نظریہ پیش کیا گیا ہے اور بتلایا گیا ہے کہ انسان مرنے کے بعد فنا نہیں ہوتا۔ بلکہ صرف حالت بدلتا ہے اور موت جس سے ہم اس قدر خائف ہیں درحقیقت ایک سہانی خواب ہے۔ کتاب اس قدر دلچسپ ہے کہ ختم کئے بغیر ہاتھ سے نہ چھوٹے گی۔ سرورق سنہری۔ **قیمت** ایک روپیہ۔ مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے

پیغامِ سروش

(مصنفۂ ایم اسلم)

دلچسپ افسانوں، دلفریب مضامین اور دلسوز نظموں کا ایک دلآویز مجموعہ سرورق سنہری **قیمت** عہ/ ۱۲

عروسِ غربت

(مصنفۂ ایم اسلم)

یہ ایک نادار بچی کی نہایت سبق آموز داستان ہے۔ ایک خدارسیدہ بزرگ ایک یتیم بچی کی سرپرستی اور پرورش اپنے ذمہ لیتا ہے اور اسے اعلیٰ تعلیم دلوا کر اس کی شادی کر دیتا ہے اور لاکھوں روپئے نقد جہیز میں دیتا ہے۔ بعض مقامات اس قدر رقت انگیز ہیں کہ آنسو نہ رک سکیں گے (باتصویر) سرورق سنہری **قیمت** ایک روپیہ چار آنے (عہ/ ۱۴)

نسیم بک ڈپو۔ بازار بارودخانہ لاہور

انتخاب لاجواب

عروس مصر تیسری صدی ہجری کے مصری اسلامی واقعات، دل گداز مناظر، مذاق سلیم اردو کی محلاتی زبان قبیلوں کا طرز معاشرت، اسلام کا انصاف صفحہ ۲۴۰ قیمت دو روپیہ (عہ)

حجاج بن یوسف جرجی زیدان اڈیٹر الہلال مصر کے ایک معرکۃ الآرا ناول کا ترجمہ جس میں خلیفہ عبدالملک کی پالیسی حجاج بن یوسف کے مظالم - حجاج اور عبداللہ بن زبیر کا معرکہ کعبہ کا محاصرہ عبداللہ بن زبیر کی شہادت خلافت کے مدعی اور ان کے جوڑ توڑ حسن نامی ایک نوجوان کا عرب کی ایک مشہور لڑکی پر عاشق ہونا یہ واقعات دلکش انداز اور سلیس عبارت میں بیان کئے گئے ہیں اس کتاب کے دیکھنے سے اس زمانہ کے طریق جنگ اور رسم و رواج پر کافی روشنی پڑتی ہے ترجمہ کی خوبی کے لئے سید ظہور احمد صاحب ندوی سب اڈیٹر ہمدم کا نام کافی ہے - قیمت عہ

سیلابِ خون غدر ۱۸۵۷ء کی ہولناک داستان کمپنی اور اہل ہند کی کش مکش ارکان کمپنی کے جدید قوانین جن میں سے بعض ہندوستانیوں کے جذبات کے مخالف تھے اور جس کے باعث ہندوستانی فوج میں ہیجان پیدا ہوگیا۔ میکیر نامی فرانسیسی عیار کا انگریز بن کر انگریزی فوج میں داخل ہونا اور موقع پاکر انگریزوں سے برسر جنگ ہونا - دیگر ہندوستانی رؤسا کا ملک کی حمایت میں لڑنا باقر خاں سردار کا خفیہ انسپکٹری پر تقرر اور اس کی حیرت انگیز عیاریاں میکیر کی چالبازیاں۔ اور باغیوں کے جوڑ توڑ فتح و شکست کے کارنامے - باغیوں کا قلع قمع قیمت عہ

عیّار فقیر مکار فقیر کی چالبازیاں ظلم و ستم اور دغا فریب کا پردہ فاش کیا گیا ہے - بدمعاشوں کی چالوں سے محفوظ رہنے کے لئے اس کو ضرور پڑھئے - قیمت ۸ر

اجتماعِ ضدین بہت ہی دلچسپ ادبی افسانہ ہے زن و شو کا انتخاب اور اس معاملہ میں والدین کی لاپروائی اور طرفین کی آرزوؤں کا خون ادبی خوبیوں سے مملو ہے - عورتوں اور مردوں کے لئے یکساں مفید ہے قیمت ۸ر

ملنے کا پتہ

منیجر مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ

ماتما من احیاءما

(طلبہ ابن جمعۃ)

علی گڑھ میگزین

مدیر

زکریا فیاضی ایم اے (علیگ)

جلد (۷)　　　　شمارہ (۱و۲و۳)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

کا

علمی اور ادبی رسالہ

علی گڑھ میگزین

مدیر: زکریا فیاضی ایم اے (علیگ)

طابع وناشر: محمد مقتدیٰ خاں شروانی

مقام طبع ونشر: مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ

فہرست مضامین

مجلس عاملہ علی گڑھ میگزین

سنئیر چیرمین

خواجہ غلام السیّدین صاحب بی اے (علیگ) ایم ای ڈی (لیڈز)

مُدیر

زکریا فیّاضی ایم اے (علیگ)

عالیجناب

دی آنریبل جسٹس ڈاکٹر شاہ محمد سلیمان صاحب ایم اے ایل ایل ڈی

جج ہائی کورٹ الہ آباد

کی خدمت والا میں

ہدیۂ مبارک باد قبول باد

(ممدوح بتقریب جشن سالگرہ ملک معظم قیصر ہند نائٹ بنائے گئے)

سنہ ۱۹۲۹ء

(مدیر)



Prof. Moinuddin Ahmad of Wilson College, Bombay, who has donated sixty thousand rupees to the Muslim University Aligarh for a Picture Gallary and has presented paintings worth over a lakh

Photo by
MOBIN UDDIN AHMAD
Student of Muslim University Aligarh



"PICTURE GALLARY"
Muslim University, Aligarh, built by Prof. Moinuddin Ahmad
of Wilson College, Bombay

Photo by:
MOBIN UDDIN AHMAD
Student of Muslim University, Aligarh

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علی گڑھ میگزین

مرتبہ

زکریا فیاضی، ایم اے (علیگ)

جلد ۷	اشاعت ماہ مارچ۔ اپریل مئی سنہ ۱۹۲۹ء	نمبر ۱ و ۲ و ۳

شذرات

بنامِ آں کہ نامش حرزِ جانہاست
ثنایش جوہرِ تیغِ زبانہاست (جامیؒ)

سنّتِ دیرینہ زمانہ کی نیرنگیاں اپنی گوناگوں دلچسپیوں اور دل فریبیوں سے ایک سحر خاموش انسان کے دل و دماغ پر مسلط کردیتی ہیں۔ اور یہ "ظالم و جاہل" ان کو حقایق عالم متصور کرتا ہوا ایک خیال باطل کی تلاش میں اپنی حیات عزیزہ کے مستعار لمحات کو گم کردیتا ہے۔

سعیِ حصول میں جو وارفتگی و خود فراموشی اُس کے افعال و اعمال سے ظاہر ہوتی ہے وہ اُس کے ابنائے جنس عزیز و اقارب، غیر و اجنبی ہر فرد کو حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ اور یہ خود مغالطہ میں مُبتلا راہِ گم کردہ مُسافر کی طرح ہاتھ پیر مار کر چراغ سحری بن جاتا ہے۔ اُس وقت اُس پر حقائق کا انکشاف ہوتا ہے اور دُنیا کے تجربات اُس کی آنکھوں سے پردہ کو ہٹا کر حقیقت برہنہ کو ظاہر کر دیتے ہیں۔ اور تب اُس کو اس مخفی راز کی تفسیر معلوم ہو جاتی ہے کہ ؎

کس ندانست کہ منزل گہِ مقصود کجاست
ایں قدر ہست کہ بانگِ جرسے می آید

اُفقِ صحافت پر آئے دن ہزاروں قسم کے اخبار و رسائل اپنی پروانہ وش زندگی کو دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں اور کچھ ہی عرصہ کے بعد خس و خاشاک کی طرح ضائع ہو جاتے ہیں۔ اُن کے عزائم، اُن کے دعادی اور اُن کی تعلّی بازیاں لعبتِ چیں کی عشوہ گری سے کم نہیں ہوتیں۔ ہر اخبار نئے اُصول کا حامل اور نئے فن کا دعوے دار ہوتا ہے۔ ان کی اس لفاظی کا صحیح جائزہ لینا ہو تو پنساری یا تمباکو فروش کی دوکان پر ملاحظہ کر لیجئے

اُردو نوازی یا ادبی خدمت تو خدا کے فضل سے صرف معدودے چند رسائل کے حق میں آئی ہے مگر دوسرے ان کا مُنہ چڑانے کی خاطر اس دوڑ میں سرگرداں ہیں۔ اور بلند بانگ دعویِ باطل کو لیکر اُٹھتے ہیں اور گردِ راہ میں گم ہو جاتے ہیں۔ اُن کا مقصد محض دوکانداری ہوتا ہے نہ سخن عیاری۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ علی گڑھ میگزین اس عیب سے بری اور اس نقص سے مبرّا رہا ہے۔ اِس نے جو ادبی خدمت اب تک انجام دی ہے وہ دنیائے ادب کے سامنے آ چکی ہے اور پرکھی جا چکی ہے۔ اس کی داغ بیل مولانا شبلی جیسے زبردست نقادِ سخن کی ڈالی ہوئی ہے۔ بڑے بڑے شاعرانِ خوش سخن پیدا ہوئے جنھوں نے اپنے کلام سے صفحاتِ میگزین کو گلزار بنا دیا۔ نثّار میں بھی ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ہوئے۔ جن کے نام دُنیائے ادب میں ہمیشہ محبت اور عزت سے لیئے جائینگے قاضی جلال الدین

رشید صدیقی، خواجہ منظور، بشیر صدیقی، باسط، محمود اور راضی کے ہاتھوں میں یکے بعد دیگرے اسکی عنان ادارت رہی اور حق تو یہ ہے کہ انھوں نے میگزین کا حقِ خدمت ادا کر دیا۔ یہی نہیں کہ میگزین میں عموم طلبا کی دلچسپیوں کا سامان فراہم کیا گیا بلکہ حسنِ تخیل، رعنائی خیال، مضامین کی سنجیدگی اور نوعیت افکار کے لحاظ سے انھوں نے نئی راہیں تلاش کیں، فلسفہ، ادب، افسانے، مذاق، نظم و نثر کے بیش بہا جواہر پارے قدر دانانِ علم کے سامنے پیش کیے گئے۔ اور شکر ہے کہ ان حضرات کی کوششوں کو سراہا گیا۔

لیکن ع سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں

ہر روز دنیا کہیں سے کہیں جا رہی ہے۔ انقلابات و تغیرات کی کوئی انتہا نہیں۔ مغربی تہذیب و تمدن نے مشرقی دماغ پر وہ اثر مسلط کیا ہے کہ آج ہم "قناعت اور گوشہ نشینی" کے اجیرن خیالات کو فراموش کر کے ہر وقت ترقی کرنے کی کوشش میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔ قوموں کی ترقی و تنزل کی تاریخ ہم کو سبق سکھلا رہی ہے کہ جب تک ہم زمانہ کی روش کا لحاظ نہ کرینگے ہمارا کہیں ٹھکانا نہ ہوگا۔ دوسرے خود ملکی تحریکیں اس امر میں زیادہ پیش پیش ہیں۔ اُردو کی حیات و ممات کا مسئلہ درپیش ہے اور اس لیئے یہ ضروری ہے کہ اس کی حیات کے لیئے ہر امکانی کوشش عمل میں لائی جائے۔ اور یہ اس جوان طبقہ کا کام ہے جو اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم ہے۔

انھیں تغیرات عالم میں زبان کی قسمت بھی شامل ہے۔ اور اس لیئے آج جو زبان کا رنگ ہے وہ کل مقبول نہیں رہ سکتا۔ ہمارا رفیقِ قدیم ایم اے او کالج ارتقائی منازل طے کرتے کرتے ایک جامعہ علوم کے درجہ تک فائز ہو چکا ہے۔ اس کی ابتدا بدقسمتی سے اُس وقت ہوئی جب تمام ملک میں نان کوآپریشن کی تحریک زوروں پر تھی اور تعلیم سے ایک گونہ منافرت کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ نان کوآپریشن کا زیادہ زور اسی مرکز علم و ادب پر صرف کیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے تمام قدیم روایات و منظرات پر ایک مُردنی چھا گئی اور ہم کو اتنا ہوش اور فرصت نہ مل سکی کہ اس سے اپنا پیچھا چھڑا سکتے۔ اس مستقل نظام میں تغیر کا پیدا ہونا تھا کہ ہر چیز تبدیلی کی طرف مائل ہو گئی۔ چنانچہ میگزین کا بھی یہی حال ہوا

ہمارے پیشروؤں نے اپنی ادارت کے ہر پہلے نمبر میں اس امر کی وضاحت کی اور لوگوں کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کی۔ انھوں نے باوازِ بلند اعلان کیا کہ وہ اپنی قدیم روایات کو برقرار رکھیں گے۔ اور میگزین کے معیار کو بلند سے بلند تر کرنے کی کوشش کرینگے۔ میگزین کے پرانے فائل اُٹھا کر دیکھئے تو آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ وہ کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں۔ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے ہمارے پیش رو اس درجہ تک ترقی کر چکے تھے کہ وہاں تک پہونچنا ہمارے لئے غیر ممکن معلوم ہوتا ہے اور اس لئے ہم معیارِ میگزین کو بلند تو کیا اس مقام پر برقرار رکھنا بھی کارِ مشکل خیال کرتے ہیں۔ نہ شبلی جیسی علمی قابلیت نہ دماغی کاوش۔ نہ رشید جیسی فکر و تخئیل۔ مضمون نگاری تو ایک طرف اللہ کے فضل سے صحیح طور سے اُردو ادب سے بھی واقفیت نہیں۔ دوسرے خود جامعہ کی تنظیم اور ملکی تحریک ایسے اثرات ہیں جو اطمینانِ قلب و زورِ طبع سلب کئے ہوئے ہیں

اب رہا قدیم روایات کا حال۔ سو روایات یا ٹریڈیشن محض زبانی جمع خرچ ہیں۔ یہ چیزیں کبھی ضبط تحریر میں نہیں آئیں کہ ہمارے لئے ہدایت کا کام دیتیں۔ جنھوں نے بچشمِ خود ایم اے او کالج کے زمانہ کو دیکھا وہ حضرات بھی موجود نہیں ہیں یا اگر موجود ہیں تو خاموش ہیں۔ ایسی صورت میں قدیم روایات کو قایم و برقرار رکھنا یا ٹریڈیشن ٹریڈیشن کا پیارا راگ گا گا کر دل کو خوش کرنا محض اپنے کو دھوکے میں ڈالنے کے مترادف ہیں۔

ہمارے احباب و ناظرین معاف فرمائینگے اگر ہم اس طرح صاف صاف الفاظ میں اپنی قابلیت اور کمزوریوں کا تذکرہ کریں۔ دراصل یہ سب پیش بندی ہے اس لئے کہ ؎

کہیں اربابِ وفا سے نہ خفا ہو جانا
یہ بھی انسان ہیں ممکن ہے خطا ہو جانا

ہم کو اپنی کوتاہیوں اور کمزوریوں کا خوب احساس ہے اور اس لئے بغیر کسی تملق یا خوشامد کے یہ گوشگزار کرینگے کہ جب آپ حضرات نکتہ چینی یا عیب جوئی کے لئے قلم اُٹھائیں یا زبان کھولیں تو اس بدیہی حقیقت کو ذرا دیر کے لئے فراموش کر دیں کہ دوسروں کے معائب تلاش کرنے میں ہماری نگاہ تیز ہوتی ہے لیکن

اپنی ذات خاص کے لیئے نرمی و ملائمت کا برتاؤ روا رکھا جاتا ہے ؎

کام نہ بخشیدۂ گنہ چہ شماری
غالبِ مسکیں ہالتفات نیرزد

اس لیئے ہم بغیر کسی دعوے کے پیش کیئے اور کسی لائحۂ عمل کو لوگوں کے سامنے لائے میگزین کی خدمت کرنے کے لیئے تیار ہیں۔ ہماری انتہائی کوششیں ہونگی کہ میگزین کو کامیاب بنایا جائے لیکن اس سلسلہ میں ہم کو اپنے احباب سے اُمید ہے کہ وہ اپنے دیرینہ اخلاق و کرم کا ثبوت دینگے اور میگزین کو فراموش نہ کرینگے

ہمارے مکرم پیشرو حضرت انیس ایم اے میگزین کی خدمت سے سبکدوش ہوچکے ہیں۔ ان کا عہد ادارت بہت کامیاب رہا۔ اُنھوں نے اپنی صحت کو معرض خطر میں ڈال کر میگزین کی خدمت سرانجام دی اور ہم کو اُمید ہے کہ عاملانِ جامعہ اُن کی خدمت کا اعتراف کرکے اُن کی ہمت افزائی کرینگے۔

ہم کو کافی یقین تھا کہ انیس صاحب ہماری ابتدائی منازل میں ضرور کچھ مدد کرینگے اور ہم اُن کے وسیع تجربات سے بہرہ اندوز ہوسکیں گے۔ لیکن افسوس ہے کہ انیس صاحب بے وقت بیمار پڑگئے اور صحت کی خاطر اُن کو علی گڑھ چھوڑنا پڑا اور ہم اُن رازہائے خفی و جلی سے جو سینہ بسینہ امانت مقدسہ کی طرح منتقل ہوتے چلے آئے ہیں محروم رہے۔ اور بغیر کسی استعانت و استمداد کے میدانِ کارزار میں کود پڑے ؎

دریں دریائے بے پایاں دریں طوفانِ شور افزا
دل افگندیم بِسْمِ اللهِ مَجْرٖيهَا وَمُرْسٰيهَا

اب علی گڑھ میگزین ہے اور ہماری بے وقت کی راگنی نہ اُس میں سُر ہے اور نہ تال، ہماری دعا ہے اور آپ کی آمین) ۔ خدا ہم کو اس بارِ عظیم سے سرخروئی و کامیابی کے ساتھ سبکدوش کرائے

زکریا فیاضی

و

انیس صاحب اپنا آخری نمبر نکالنے کے بعد تشریف لے گئے۔ اور ہمیں ۹ مئی

کرائٹ دار العلوم کو باقاعدہ طور پر پروانۂ ادارت ملا۔ اس قلیل عرصہ میں میگزین کی ترتیب، طباعت اور اشاعت، دوسرے امتحان کی کش مکش، سخت مشکل کام معلوم ہوتا تھا۔ لیکن ہم متشکر ہیں ان حضرات کے جنھوں نے ہماری صدا پر لبیک کہا اور اپنی عنایتوں کی بارش کرکے ایک ضخیم نمبر کے شائع کرنے پر آمادہ کر دیا۔ اس سلسلہ میں ہمارے سینئر خواجہ غلام السیدین صاحب، مولانا ابرار حسین صاحب فاروقی اور ظہیر الاسلام صاحب فاروقی متعلم یونیورسٹی خصوصیت کے ساتھ شکریہ کے مستحق ہیں جنھوں نے نہ صرف مدد کی بلکہ رشد و ہدایت کے مخفی خزانوں سے مالامال کر دیا۔ بالخصوص ظہیر صاحب نے بہت سا کام خود ہی انجام دیا۔

مارچ، اپریل کا زمانہ کالج میں امتحان کا زمانہ ہوتا ہے۔ طلبا کی تمام قوتیں ایک مقصد کے حصول میں وقف ہو جاتی ہیں۔ اور اس لحاظ سے جامعہ کی زندگی میں یہ زمانہ نہایت خشک و بے رونق ہوتا ہے۔ ہر طالب علم اپنے امتحان کی تیاری میں منہمک نظر آتا ہے۔ اور دوسرے تمام مشاغل طاقِ نسیاں کی زیب و زینت ہو جاتے ہیں اور وہ دُنیا کی تمام لذات سے مقاطعہ کرکے "گاندھی آشرم" میں مقید "سوراج" کی فکر میں غلطاں و پیچاں نظر آتا ہے۔ یونین کے ہنگامے، جلسوں کی رونق، کھیل کود کا جوش سب پر عجب نیند مسلّط ہو جاتی ہے لیکن پھر بھی قدرت ایسے ایسے ہنگامے لا کھڑے کرتی ہے کہ جس سے افسردہ طبائع میں جوش آجاتا ہے اور طلبا اسی ہما ہمی و شغف کے ساتھ حصّہ لینے لگتے ہیں

۲۵ و ۲۶ مارچ کو پھر ارکان یونیورسٹی کورٹ ایک مرتبہ جمع ہوئے۔ فروری کے اجلاس میں جناب راس مسعود صاحب کا انتخاب بہ حیثیت وائس چانسلر کے عمل میں آچکا تھا۔ لیکن بعد میں یہ افواہ اُڑی کہ صاحب موصوف نے حیدرآباد کا پولیٹکل سکرٹری ہونا منظور کر لیا ہے۔ اس خبر سے ایک ہیجان پھیل گیا، اور خیال کیا گیا کہ کسی دوسرے شخص کا انتخاب عمل میں آئے۔ چنانچہ تاریخ مذکورہ پر جلسہ ہوا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ مسعود صاحب کے قطعی فیصلہ و ارادہ کا علم ہو گیا۔ اور اُنھوں نے اکتوبر میں یونیورسٹی کی خدمت کرنے کے لیے آنا منظور کیا۔ اسی جلسہ میں ہمارے کالج کے پُرانے طالب علم فخر الدین صاحب ایم اے لائبریرین ڈھاکہ یونیورسٹی

کا تقرر بہ عہدۂ رجسٹرار قرار پایا۔ ہمیں اُمید ہے کہ یہ دونوں حضرات شروع اکتوبر میں آکر کام شروع کردینگے۔ اور جو جائز توقعات اُن سے وابستہ ہیں اُن کو پورا کرینگے۔ پرو وائس چانسلر کا تقرر ابھی تک زیر غور ہے اور سب لوگوں کو اس غور کے نتیجہ کا انتظار ہے۔

۲۶ر کی شب میں سرسید ہال کا ملتوی شدہ ڈنر عید ہوا جسٹس سلیمان صاحب ایکٹنگ وائس چانسلر صدر تھے۔ کھانے سے فراغت پانے پر تقریریں ہوئیں۔ آخر میں جسٹس موصوف نے جواب دیتے ہوئے طلباء کو نصیحت فرمائی۔ اور سرسید علیہ الرحمۃ کے اُصول پر قدم پیرا ہونے پر زور دیا۔ محسن الملک ہال میں عید کے دن ہی شام کو بہت پُرلطف ڈنر دیا گیا تھا اور ایک کافی تعداد حاضرین کی موجود تھی، تمام میزیں پُر نظر آتی تھیں

۲۸ر مارچ ۱۹۲۹ء کو حسبِ دستور یوم سرسید منایا گیا۔ صبح سویرے ۸ بجے کے قریب تمام اُستاد و طلباء اسٹریچی ہال میں جمع ہوئے۔ قرآن شریف کی تلاوت سے جلسہ کا افتتاح ہوا متعدد حضرات نے بانیٔ کالج کی زندگی کے واقعات حاضرین کو سُنائے۔ اور اُن کی تقلید و پیروی کی نصیحت کی۔ فاتحہ کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔

آنریبل جسٹس شاہ محمد سلیمان صاحب ایم اے ایل ایل ڈی نے جب سے یونیورسٹی کے کاموں کو بہ نفسِ نفیس انجام دینا شروع کیا ہے پچھلے بقایا کام ختم ہوچکے ہیں اور دفتری صحت و درستی کی طرف بھی توجہ مبذول کی گئی ہے درحقیقت اس قلیل عرصہ میں اور وہ بھی ہفتہ میں صرف دو دن کام کرنے پر جسٹس موصوف نے پوری طرح سے یونیورسٹی کے اندرونی حالات کا جائزہ لے لیا ہے اور ہمیں اُمید ہے کہ موصوف کے تجربات سید مسعود صاحب کے لیئے مشعلِ ہدایت کا کام دینگے۔ اور ان کو یونیورسٹی کے معاملات سمجھنے کے لیئے زیادہ دن تک انتظار نہ کرنا پڑے گا

خ

۱۹ اپریل سے یونیورسٹی کے ایم اے، ایم ایس سی، بی اے، بی ایس سی، ایف اے وغیرہ کے امتحانات کا طویل سلسلہ شروع ہوا۔ ایک معقول تعداد طلبار کی شریک امتحان ہوئی اور ہم دست بدعا ہیں کہ خدا اُن کی مرادیں برلائے اور وہ یونیورسٹی کے صحیح نمایندے بن کر دنیا کے سامنے آئیں۔

میٹرک کا امتحان ۴ اپریل سے شروع ہوا۔ اب تک پرائیویٹ طلبار کی ایک کثیر تعداد شامل امتحان ہو کر برکات جامعہ سے مستفید ہوجایا کرتی تھی اور ہمارے "باقاعدہ" تعلیم پانے والے طلبار کی جمودی زندگی میں زندہ دلی کی لہر دوڑ جاتی تھی اور پرائیویٹ طلبار کی خاطر و مدارات سے کافی حظِ نفس حاصل ہوتا تھا۔ لیکن فلک ستمگار کو یہ کھیل ایک نظر نہ بھایا۔ اور پرائیویٹ طلبار کی برات منتشر ہوگئی۔ وہ رونق جاتی رہی۔ امتحان کے خشک ایام اور اس پر علی گڑھ کی گرمی الامان بالحفیظ

لیکن ہاں اگر کچھ جوش و خروش کا نظارہ دیکھنا ہو تو صبح سے لیکر شام تک (Swimming bath) کی سیر کرنی چاہیئے۔ یہی ایک ایسی جگہ ہے جہاں پر موسمِ گرما میں طلبار کا ہر وقت مجمع رہتا ہے

امتحان کے بعد طلبار اپنے اپنے مکان چلے گئے ہیں اور یونیورسٹی کے بورڈنگ ہاؤس خالی نظر آتے ہیں۔ دیکھئے پانچ چھ ماہ کے بعد کیا کیا نئی صورتیں جلوہ گری کرتی ہوئی صحنِ جامعہ میں نظر آئینگی۔

پکچر گیلری (دارالصور) پچھلے سال بن کر تیار ہوچکی تھی۔ لیکن اس میں تصاویر کی عدم موجودگی ناگوار معلوم ہوتی تھی۔ اب جناب معین الدین صاحب پروفیسر ولسن کالج بمبئی خود معہ اپنے نایاب ذخیرۂ تصاویر کے علی گڑھ میں تشریف لائے ہیں۔ اور دارالصور کی تزئین میں مصروف ہیں۔ دارالصور پروفیسر موصوف کے گرانقدر عطیہ سے تعمیر ہوا ہے۔ انھوں نے چین، جاپان اور برما کی سیاحت میں بہت کچھ عمدہ عمدہ نوادر جمع کیئے تھے۔ وہ سب یونیورسٹی کی نذر کردیئے ہیں۔ پروفیسر مذکور شکریہ

کے مستحق ہیں۔ کہ انھوں نے اپنی کریم النفسی کا ثبوت دیکر اپنی علم دوستی کو ظاہر کیا۔ اس نمبر میں دارالعلوم اور پروفیسر موصوف کی تصویر زیب میگزین ہے۔ مسٹر مبین الدین احمد متعلم یونیورسٹی نے یہ تصویر میگزین میں اشاعت کے لیے ارسال کی ہے۔ ہم ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

---

۲۰ اپریل کی شام کو طبیہ کالج کے دارالتشریح کے سنگِ بنیاد کی رسم نواب سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ بہت کافی اجتماع تھا۔ نواب صاحب نے اپنے مخصوص رنگ میں سپاس نامے کا جواب دیا اور حاضرین کو خوب ہنسایا۔

ہماری یونیورسٹی کے شعبۂ طبیعیات کے قابل پروفیسر فیروز الدین مراد صاحب ریڈیو کے ذریعہ بہت کامیابی حاصل کر چکے ہیں۔ وہ یونیورسٹی میں اور نیز اپنے مکان پر اکثر دفعہ طلباء کو دعوت دے چکے ہیں اور حاضرین بہ چشم خود الہ دین کے حیرت انگیز چراغ اور جامِ جمشید کا نظارہ کر چکے ہیں۔

بنارس یونیورسٹی نے حال میں اپنی کورٹ کی میٹنگ میں طے کیا ہے کہ قانون کا آخری امتحان سال میں دو مرتبہ ہوا کریگا۔ اور اس طرح طلباء کے لیئے بہت آسانیاں بہم پہونچادی ہیں۔ ہم کو اُمید واثق ہے کہ مسلم یونیورسٹی بھی اس مسئلہ پر غور کریگی۔ اور جلد تر مفید مطلب اصلاحات کو جاری کرکے طلباء کی مشکلات کو رفع کیا جائیگا۔ ہماری یونیورسٹی میں ابھی ایم اے (اُردو) کمپارٹمینٹل اور عربی، فارسی کے امتحانات کی کمی ہے۔ ہم کو توقع ہے کہ ارباب حل وعقد جامعہ اس پر اپنی توجہ منعطف کرینگے۔

محکمۂ حساب یونیورسٹی (اکاونٹ آفس) کی پیچ در پیچ ژولیدگیاں طلباء کو گراں گزرتی رہتی ہیں اور حساب فہمی کے متعلق اُن کو اکثر شکایات رہتی ہیں جس کے دفعیہ کی ضرورت ایک مدت سے محسوس کی جارہی تھی۔ چنانچہ پرو وائس چانسلر میاں محمد شریف صاحب بی اے (کینٹب) نے ابتدائے سال جامعہ میں

چھوٹی چھوٹی پاس بکیں ہر طالب علم کو دیں تاکہ طلباء اپنے حساب کا دفتر سے اندراج کرالیا کریں۔ ہم سمجھتے تھے کہ اب غلطیوں کا ازالہ ہو جائیگا اور کوئی شکایت باقی نہ رہیگی۔ لیکن افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ پاس بک کے استعمال سے کوئی خاص فائدہ نہ ہوا۔ کلرک صاحبان نے اُس کو معمولی کاغذ سے بھی کم قیمت جانا اور اس پر جو حساب درج کیا گیا وہ غیر یقینی رہا۔ اب سُنا ہے کہ طلباء نے پاس بک کو دھوبی کے حساب کتاب کے استعمال میں وقف کردیا ہے۔ ماشاء اللہ خوب جدت ہے۔ اور وہ پُرانی شکایات پھر عود کر آئی ہیں۔

یونیورسٹی میں دارالاقامہ کی تعمیر جاری ہے۔ ہر سال طلباء کی رہائش کے لیئے نئے بورڈنگ بنتے جارہے ہیں۔ پھر بھی قلت مکان کی شکایت بدستور ہے۔ سید محمود کورٹ "عرف گل منزل" المعروف بہ کچی بارک ارتقائی گردش میں آکر اپنی اصلی ہیئت کو بالکل بدل چکی ہے۔ امسال ابتدا میں نصف کے قریب حصہ اپنی اصلی حالت میں موجود تھا اور اپنی تمام پُرانی خصوصیات کا شاہد۔ لیکن اب اس کا نصف بھی نئے قالب میں ڈھل چکا ہے۔ اور اب صرف مشرق کی طرف کا غریب دیہ حصہ باقی ہے۔ اِس کا قیام چند روزہ اور عارضی ہے۔ لہذا ہم نے طے کیا ہے کہ اس پیارے دارالاقامہ کی یادگار کو قایم و برقرار رکھنے کے لیئے جس میں ہماری تعلیم گاہ کے بہترین افراد اپنی زندگی کے بیش قیمت سال یہاں گذار چکے ہیں مضامین نظم و نثر مع فوٹو تعطیلات نمبر میں ہدیۂ ناظرین کیئے جائیں۔

ماہِ فروری کے نمبر میں جو انیس رضوی صاحب کے زیر اہتمام شائع ہوا ایک نظم ٹیپو سلطان کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ جس پر محض اتفاقیہ غلطی سے صرف سید منور حسن رضوی کا نام لکھا گیا اور اس کے متعلقہ نوٹ کو فراموش کردیا گیا۔ موصوف نے اظہار افسوس کیا ہے کہ وہ نظم ان کی طبعزاد نہیں ہے۔ ان کو اصل مصنف کے نام کا پتہ نہیں تھا۔ یہ نظم اُن کو اپنے گھر ایک بیاض میں ملی جس کو انھوں نے طلباء کے فائدے کی نیت سے میگزین میں اشاعت کے لیئے بھیجا۔ اور یہ فقرہ آخر میں درج کیا۔ "مرسلہ سید منور حسن رضوی"

ٹ

جس کا مفہوم تھا کہ سید موصوف محض اس کے ارسال کرنے والے تھے۔ ان کو تصنیف کا دعویٰ نہ تھا۔ یہ نوٹ حوالۂ قلم ہو چکا تھا کہ ہم کو مخزن کے مئی نمبر میں "ادبی ڈاکہ" کے عنوان سے اس دلچسپ نظم پر ایک طویل مضمون نظر پڑا۔ ہم حفیظ صاحب نیز پروفیسر شیرانی صاحب کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ گو سرقہ کی ہزاروں مثالیں دنیا میں موجود ہیں لیکن سید موصوف کی نیت پر حملہ اس لحاظ سے نہیں کیا جا سکتا۔ اور ہم اُن کو بے گناہ سمجھتے ہیں۔ ہم کو یہ بھی اُمید ہے کہ ناظرین اس غلطی کی تصحیح فرمائیں گے۔

موقر ہم عصر رسالہ علی گڑھ میگزین حصہ انگریزی کی ادارت شروع سال میں سید علی ہادی جعفری صاحب متعلم یونیورسٹی کو سپرد کی گئی تھی۔ انھوں نے نہایت محنت و جاں فشانی سے دو نمبر شائع کیے۔ ان کی مشکلات کا اندازہ کچھ وہی حضرات لگا سکتے ہیں جن کو رسالوں کے ترتیب دینے کا اتفاق ہوا ہے۔ اور بالخصوص انگریزی رسالہ کے۔

ان کی زیرِ ادارت شائع شدہ رسالے ظاہری و باطنی لحاظ سے خوب تھے اور پروفیسر فائر بریس صاحب نے جعفری صاحب کے کام کی تعریف بھی کی۔ لیکن نہایت افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ چند غلط فہمیوں کے باعث جعفری صاحب نے اپنا استعفا پیش کر دیا۔ تحقیق کرنے پر ہم کو معلوم ہوا کہ انھوں نے اپنے مقالۂ افتتاحیہ میں طلبائے یونیورسٹی کی بعض عام شکایات کی طرف ارکانِ یونیورسٹی کو توجہ دلائی تھی جن سے طلبا کو ہر روز واسطہ پڑتا ہے۔ مثلاً انتظام شفاخانہ۔ جعفری صاحب نے طلبا کے نظریہ کو پیش کر کے جائز مطالبہ کیا تھا۔ کہ کیوں ان شکایات کی بیخ کنی نہ کی جائے۔ ہم کو حیرت ہوئی کہ بعض حلقوں میں یہ نیک نیت مشورہ شاق گزرا۔ یہ جعفری صاحب کی حمیت نے گوارا نہ کیا کہ وہ اپنے عقائد و خیالات کی قربانی کریں۔ اس لیئے وہ ایڈیٹری سے کنارہ کش ہو گئے۔ ہمیں ان کے ساتھ دلی ہمدردی ہے۔ اب ان کی بجائے مسٹر حارث عبدالقادر طالب علم آنرز کلاس کا تقرر ہوا ہے اور یہ بھی سُننے میں آیا ہے کہ مسٹر حارث نے کوئی باقاعدہ تحریر دی ہے کہ وہ ان اُمور سے احتراز کریں گے جن کے جعفری صاحب اپنے زمانے میں شاکی تھے۔ اگر یہ حقیقتِ نفس الامری ہے تو ہم کو صدمہ ہے۔ ایڈیٹری کرنا کوئی ذاتی عزو وقار نہیں ہے۔

ایک اہم ذمہ داری کا کام ہے اور بہ حیثیت اڈیٹر کے ہمارا فرض ہے کہ ہم طلبار کے جائز مطالبات کو پیش کریں اور یونیورسٹی کے نقائص کو دور کرنے میں سرگرم رہیں۔

---

۲۰ رمئی ۲۹ء کو عید الضحیٰ کی نماز مسجد یونیورسٹی میں ۸ بجے صبح کے ہوئی۔ شام کو محسن الملک ہال اور سرسید ہال میں خاموش ڈنر ہوئے۔ کیونکہ زیادہ تر طلبار امتحان کے لیئے کوشاں ہیں۔ ڈنر نہایت کامیاب رہے۔

سرسید ہال میں ڈائننگ ہال کی حاضری امتحان دہندگان کے علاوہ باقی سب طلبار کے لیئے لازمی قرار دی گئی ہے۔ اور اب ہمیں معلوم ہوا ہے کہ طلبار کی سہولت اور تفریح کو مدِ نظر رکھتے ہوئے وہاں پنکھے خس کی ٹٹی لگیں اور اخبارات کا انتظام بھی کیا گیا ہے۔

عید کے ڈنر پر پرووسٹ (Provost) صاحب نے اعلان کیا کہ وہ ۷ رجون کو طلبائے قانون کے اعزاز میں رخصتی پارٹی دینگے۔ اور نیز ۸ رسے ۱۰ تاریخ تک بزم موسیقی آراستہ کی جائیگی۔ ہم کو یقین ہے کہ اس سے اجتماعی زندگی میں خوب ترقی ہوگی۔

محسن الملک ہال جو ۲۸ء کی پیدائش ہے کامیابی کے ساتھ کام کر رہا ہے۔ اس ہال کے آقا لفٹنٹ حیدر خاں صاحب ہیں۔ اس ہال میں ممتاز ہاؤس، میکڈانل، ڈیوٹی ہوسٹل کے علاوہ وہ تمام متفرق و منتشر بورڈنگ بھی شامل ہیں جن کو طلبار کی رہائش کے لیئے کرایہ پر لیا جاتا ہے۔ اور چونکہ یونیورسٹی کے گرد وپیش ایسی عمارتوں کا ملنا دشوار ہے اس لیئے عام طور سے طلبار دور فاصلہ پر رہتے ہیں۔ اور اُن کو یونیورسٹی آنے جانے میں تکلیف ہوتی ہے۔ کوشش کی جا رہی ہے کہ جلد نئے بورڈنگ تیار کیئے جائیں تاکہ اس شکایت کا استیصال ہمیشہ کے لیئے ہو جائے۔

محسن الملک ہال میں اب تک بہت سے ڈنر دیئے گئے ہیں اور مانیٹر صاحبان کی کوششوں سے ہر مرتبہ

کچھ نہ کچھ ترقی ہی ہوتی رہی ہے ہم اُن کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ اور اُمید کرتے ہیں کہ سرسید ہال سے وہ کسی طرح پیچھے نہ رہینگے۔

انجمن اصلاح المضافات

جس کا تذکرہ کئی دفعہ پیشتر بھی آچکا ہے نہایت کامیابی کے ساتھ کام کر رہی ہے۔ پنڈت امام بخش صاحب بی اے سرگرم کارکن ہیں۔ سولہ سترہ زنانہ و مردانہ مکاتب قایم ہو چکے ہیں جن میں پرائمری درجہ تک کی تعلیم دی جاتی ہے۔ کوشش کی جارہی ہے کہ انگریزی تعلیم کا بھی اجرا کیا جائے۔ ہر دوسرے تیسرے مہینہ نئے مدرسہ کا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اور لوگوں میں بیداری کے آثار پیدا ہو چلے ہیں۔ دیہات کے طریق زندگی کو زیادہ منظم کرنے کے لیئے سوسائٹیاں مقرر کی گئی ہیں۔ اور پنچایت کے ذریعہ لوگوں کے اخلاق و اطوار کی درستی کا کام لیا جا رہا ہے۔ ورزش کھیل کود کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ ہر جمعرات کو مذہب و حاضرات پر وعظ دیا جاتا ہے۔ تاکہ لوگ اپنے مذہب اور دنیا کے حالات سے با خبر ہو جائیں۔ لیکن انجمن کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ روپیہ کی قلت ہے۔ اگر مسلمانوں نے اپنی ذمہ داری کو محسوس نہ کیا تو یہ شروع کیا ہوا کام معرض خطر میں پڑ جائیگا۔ یونیورسٹی کے نوجوان طلبا تعطیلات گرما میں اپنے بھائیوں کی فلاح و بہبود کی خاطر بہت کچھ کام کر سکتے ہیں۔ وہ چندہ بھی جمع کر سکتے ہیں اور درس و تدریس کا کام بھی سنبھال سکتے ہیں۔ انجمن کے سب سے زبردست مؤید و معاون حاجی محمد صالح خاں۔ پروفیسر حلیم بشیر حسن بدیع۔ خواجہ غلام السیدین۔ ایم۔ ایم شریف۔ عبدالمجید قریشی اور منظور احمد خاں صاحبان ہیں جو دامے درمے قلمے اور سخنے مدد کر رہے ہیں

حوادثِ ارتحال

وحدتني يا سعد عنها فزدتني جنونا۔ فزدني من حديثك يا سعد

مولوی محبوب علی مرحوم۔ ایم اے علی گڑھ کے ہونہار طالب علم تھے۔ ایم اے کا امتحان پاس کیئے اُن کو دس سال سے زائد کا عرصہ ہو چکا تھا۔ اس عرصہ میں وہ عربی کی تکمیل میں مصروف تھے۔ اور بہت سی کتابیں تصنیف کر چکے تھے۔ لیکن ان کی اشاعت کی نوبت نہ آسکی۔ آپ میگزین کے قدیم

کرم فرماتے تھے۔ اور اپنے مضامین نظم و نثر سے قارئین مجلہ کو محظوظ کر چکے تھے۔ مدینہ اخبار کی ادارت بھی کچھ عرصہ تک فائز رہ چکے تھے! اور اب ۱۹۲۷ء سے الہ آباد یونیورسٹی میں عربی ادب میں تحقیق و تفتیش کر رہے تھے۔ آپ کا کام ختم ہو چکا تھا۔ آپ نے تصوف پر ایک لاجواب مقالہ سپرد قلم کیا تھا۔ لیکن افسوس کہ اپنی محنت کا ثمرہ نہ پا سکے اور اس دارِ فانی سے یکایک یکم نومبر کو انتقال فرما گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ پروردگار اُن کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے

میگزین کی کاپیاں طباعت کے لئے پریس کو بھیجی جا رہی تھیں کہ ہم کو محمد منصور علی خاں متعلم بی اے (جونیر) کلاس کے انتقال کی روح فرسا خبر ملی۔ یہ اپنی ہمشیرہ کی علالت کی خبر سن کر بھوپال گئے ہوئے تھے کہ دفعتاً بعارضۂ نمونیہ مبتلا ہو گئے۔ اور بارہ روز علیل رہ کر ۲۲ رمئی ۱۹۲۹ء کو اس دارِ فانی کو خیرباد کہہ گئے مرحوم ہماری یونیورسٹی کے ہونہار اور لائق طلباء میں سے تھے اور ہنوز اپنی عمر کی بیس منزلیں بمشکل ختم کی ہونگی کہ داعئ اجل کا پیغام آگیا۔ ہم اس حسرتناک موت پر ان کے پس ماندگان بالخصوص ان کے والدین سے اظہار ہمدردی کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ خداوند کریم مرحوم کو غریق رحمت فرمائے اور پس ماندگان کو صبر کی توفیق دے ؎

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

نذرِ عقیدت

آپ کے رخ کی اک جھلک قیمتِ حسنِ یوسفی
آپ کے غنچہ ہائے لب رازِ حیاتِ عیسوی

آپ کی جنبشِ نظر گردشِ جامِ بیخودی
مستِ مئے الست تھا جس پہ نگاہ پڑ گئی

جلوۂ حسن آپ کا خواب میں دیکھتے اگر
ہوتی نہ پھر کلیم کو حسرتِ دیدِ ایزدی

آپ پہ خود خدا کو ناز۔ آپ پہ پھر آپکا نیاز
اللہ رے ظرفِ مصطفےٰ اُف رے یہ شانِ بندگی

جس کو قلم نہ لکھ سکا۔ لوح پہ جو نہ آ سکی
وصفِ خدائے پاک ہے مدح و ثنائے احمدی

ہوتی بجائے بوالبشر شکلِ نبی جو جلوہ گر
منکرِ سجدہ کی خراب کاہے کو ہوتی زندگی

ان کا جمال بے مثال۔ ان کا کمال لازوال
اُن کا کلام لاکلام۔ شرحِ کلامِ ایزدی

حق نے رؤف اور رحیم اُن کو منیرؔ خود کہا
فہم سے ہے بلند تر شانِ حضورِ پاک کی

منیرؔ بھوپالی

علوم العرب

(گزشتہ سے پیوستہ)

یہ قصیدہ ابن ام اوفی ہے۔ حارث بن عوف اور ہرم بن سنان کی مدح میں ہے۔ ان سرداروں نے قبیلہ عبس اور ذبیان میں صلح کرائی تھی یہ مشہور جنگ داحس اور غبراء کی گھوڑدوڑ میں فساد ہوجانے پر شروع ہوئی تھی۔ اور مسلسل ۴۰ سال تک قائم رہی۔

ہرم بڑا فیاض سردار تھا، اس نے عام حکم دیدیا تھا کہ جب زہیر دیار میں آئے اور مجھ کو سلام کرے تو اس کو انعام دیا جائے۔ لیکن اس غیور شاعر نے یہ انعام لینا پسند نہیں کیا لہٰذا جب دربار میں جاتا تھا تو کہدیتا تھا کہ باستثناء ہرم اور سب کو سلام ہے۔

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے ہرم کے بیٹے سے وہ اشعار سنے جو زہیر نے اس کی مدح میں لکھے تھے۔ جب سن چکے تو فرمایا ”ذھب ما اعطیتموہ وبقی ما اعطاکم“ یعنی تمہارے بزرگوں نے زہیر کو جو صلے دئے تھے وہ سب جاتے رہے اور زہیر نے تم کو جو کچھ دیا تھا وہ باقی ہے (مدحیہ قصائد) زہیر نے ۸۰ سال کی عمر میں یہ قصیدہ لکھا تھا۔ اسلام سے محروم رہا۔ لیکن اس کے دونوں بیٹے کعب اور بجیرؓ مسلمان ہوئے سنہ ۱۳ قبل ہجری میں یہ مشہور شاعر فوت ہوا۔

۳۔ نابغہ ذُبیانی

سبعہ معلقہ کا یہ تیسرا شاعر ہے۔ لیکن موجود مجموعہ میں اس کا قصیدہ نہیں ہے۔[1]

نابغہ کا نسب نامہ یہ ہے۔ (یہ اپنے ایک مورث کے نام سے ذبیانی مشہور ہوا۔

ابو امامہ (ابو ثمامہ) زیاد (نابغہ) بن معاویہ بن ضباب بن جابر بن یربوع بن غیظ بن مرہ بن عوف بن سعد بن ذبیان بن بغیض بن ریث بن غطفان بن سعد بن قیس عیلان

---

[1] اس مضمون کی ترتیب جمہرۃ الانصاری کے مطابق ہو اور جو مجموعہ داخل درس ہے اس کی ترتیب جداگانہ ہے۔

نابغہ کے قصیدہ میں ۰ ۔ ۱ شعر ہیں جس کا مطلع یہ ہے۔

عوجوا فحیّوا لنعم دمنۃ الدار

ماذا تحیّون من نوی واحجار

شعرائے عرب میں نابغہ کے لقب سے آٹھ شاعر ہوئے ہیں جو نوابغ مشہور ہیں۔ لیکن ان میں نابغہ ذبیانی جعدی (حسان بن قیس مضری) اور شیبانی (عبداللہ بن مخارق نزاری) بہت ممتاز ہیں۔ جن اصحاب نے بہ یک شاعری شروع کی اور اُن کی طبیعت میں شاعری کا جوش اس طرح اٹھا، جیسے قدرتی پانی کا چشمہ ابلتا ہے۔ اُن کا لقب نابغہ (مشتق از نبغ یا نبوغ) ہوا۔

نابغہ، اشعر الشعراء تھا، سوقِ عکاظ میں امتیاز کے لئے اس کا خیمہ سرخ چمڑہ کا ہوتا تھا۔ اور یہی بزم ادب کی صدارت کرتا تھا۔ اور اس کا فیصلہ شعراء کے حق میں ناطق ہوتا تھا۔

نابغہ دربار حیرہ کا ایک مشہور شاعر تھا۔ اور نعمان بن منذر ملقب بہ ابو قابوس کا مصاحب خاص تھا۔ ایک دن نعمان نے حکم دیا کہ "بادشاہ بیگم (متجردہ نعمان کی بیگم جو اس کی سوتیلی ماں تھی) کی مدح میں قصیدہ لکھو"۔ نابغہ نے بیگم کے حسن وجمال اور سراپا کی ایسی تصویر کھینچی کہ گویا اُس نے دیکھا ہے۔ (اس عہد میں بیگمات اور شریف زادیاں پردہ میں رہتی تھیں) نعمان، قصیدہ سنتے ہی نابغہ سے بدگمان ہو گیا۔ اور خیال کیا کہ شاید متجردہ کا نابغہ سے کچھ تعلق ہے۔ یہ نعمان کی محض بدگمانی تھی، شعراء عالم خیال میں جو کچھ لکھ جاتے ہیں وہ عین مشاہدہ ہوتا ہے۔ ہندوستان کی شاعری میں بھی اس کے متعدد نمونے موجود ہیں۔ نابغہ کے اس مشہور قصیدہ کا مطلع یہ ہے۔

اَمِنْ آلِ میّۃ رائح او مغتدی	کیا تو میّہ (نام) کے پاس سے آج یا کل چلا جائیگا ؟ اور وہ بھی اس قدر
عجلان ذا زاد وغیر مزوّد	عجلت میں کہ توشہ بھی لے یا نہ لے۔

جن اشعار پر نعمان کو بدگمانی ہوئی وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ صفراء کالسیراء اکمل خلقھا اُس کا پیٹ حریر کی طرح نرم اور گدگدا ہے۔ اور رنگ کندن جیسا دمکتا

ہے کتاب الشعراء ابن قتیبہ صفحہ ۷۰، ۱۰۹۔

كالغصن فى غلوانه المتأود	ہے جسمانی ساخت مکمل ہے اور اس کا قد گویا ایک ترو تازہ اور لچکتی ہوئی شاخ ہے۔
۲- والبطن ذو عكن لطيف طيه	پیٹ کی سلوٹیں (شکن) لطیف ہیں اور سینہ کو اس کی مقیاس الشباب
والنحر تنفجه بثدى مقعد	(کنایہ) نے اور ابھار دیا ہے
۳- قامت تراءى بين سجفى كلة	جس طرح آفتاب برج حمل میں کامل النور ہوتا ہے۔ ویسی ہی جب وہ کھڑی
كالشمس يوم طلوعها بالاسعد	ہوتی ہے تو اس کا حسن چاک شدہ پردہ سے جھلکتا ہے۔
۴- او دمية من مرمر مرفوعة	متجردہ سنگ مرمر کی ایک موہنی مورت ہے۔ اور وہ ایسی اونچے مکان
بنيت باجر تشاد و قرمد	میں ہے جو گچ اور پتھر سے بنایا گیا ہے
۵- او درة صدفية غواصها	ملکہ حسن وجمال میں اس اچھوتے موتی کی طرح ہے جو سیپ کے اندر
بهج متى يرها يهل ويسجد	ہو اور جس کو دیکھتے ہی غوطہ خور اللہ اکبر کہکر سجدہ میں گر پڑے۔
۶- سقط النصيف ولم ترد اسقاطه	اوڑھنی سر سے گری، اس نے قصداً نہیں گرائی۔ پھر بدحواسی میں اس
فتناولته واتقتنا باليد	نے سنبھالی، اور دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔
۷- نظرت اليك بحاجة لم تقضها	اس نے (تیری طرف) ایک حاجتمندانہ نظر سے دیکھا مگر اُسے وہ پورا نہ کر سکی
نظر السقيم الى وجوه العود	جس طرح کہ ایک بیمار عیادت کرنیوالے کے چہرہ کو تکتا ہے۔
	شاعر کی غرض یہ ہے کہ متجردہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کسی وجہ سے کہہ نہ سکی
	اور صورت دیکھتی رہ گئی۔

شعر نمبر ۶ کی نسبت مشہور[۳] ہے کہ ملکہ متجردہ کا ایک موقع پر یکایک نابغہ کا سامنا ہوگیا۔ اور وہ غیر محرم کو دیکھتے ہی گھبرا گئی اور بدحواسی میں اس کے سر سے ڈوپٹہ سرک گیا۔ اور اس نے ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیا۔

---

[۱] عربوں میں شکم پر شکنوں کا پڑنا کمال حسن سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ ان میں یہ مثل ہے کہ "تقبل باربع وتدبر بثمان" معشوقہ جب سامنے آتی ہے تو چار شکنیں نظر آتی ہیں اور جب پیٹھ پھیرتی ہے تو آٹھ۔ اس سے ظاہر ہے کہ عرب نازک بدن محبوبہ پسند نہیں کرتے ہیں جس کو مصری پر تلاش کرنا پڑے کہ کہاں اور کدھر ہے۔ [۲] اصل و ترجمہ کے لئے دیکھو شرح دیوان نابغہ مصنفہ وزیر ابوبکر بطلیوسی اندلسی مطبوعہ مصر۔ [۳] تاریخ یعقوبی صفحہ ۲۴۲ جلد اول۔

حقیقت میں یہ روایت غلط ہے۔ مضمون شعر سے تذکرہ نویسوں کو دھوکہ ہوا ہے۔ جس کی بڑی دلیل یہ ہے کہ یہ متفرق شعر نہیں ہے بلکہ قصیدہ کا مسلسل شعر ہے جس کو ایک ہی وقت میں نابغہ نے نظم کیا ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ محققین نے صاف الفاظ میں لکھا ہے کہ نابغہ مخنث (ہجڑا) تھا۔ اور یہ گروہ جس قدر نسائیت میں ڈوبا ہوتا ہے وہ ظاہر ہے۔ ابن قتیبہ[1] لکھتے ہیں۔ لا واللہ ماعرف مثل ہذا الاشارۃ الا مخنث (ترجمہ) خدا کی قسم! ایسے اشارے صرف مخنث ہی کر سکتا ہے۔ لیکن وزیر[2] ابوبکر (شارح دیوان نابغہ) نے لکھا ہے کہ نابغہ میں زنانہ اوصاف موجود تھے۔ اس لئے اس کے قلم سے یہ مضمون نکلا۔ اور لوگوں نے سمجھا کہ یہ ملکہ متجردہ کا ایک خاص واقعہ ہے جس کو نابغہ نے نظم کر دیا ہے۔

بعض شارحین نے لکھا ہے کہ نابغہ کے بیٹے کا نام عقرب تھا۔ اس سے یہ غرض ہے کہ اس پر مخنث ہونے کا جو اعتراض ہے وہ اٹھ جائے۔ بہرحال نابغہ مخنث تھا یا اس میں زنانہ اوصاف تھے یہ ایک جداگانہ بحث ہے۔ لیکن پورے قصیدہ کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نابغہ نے اس قصیدہ میں اپنا کمال شاعری دکھایا ہے اور عالم خیال میں ملکہ کی جو تعریف لکھی ہے دوسرا شاعر دیکھ کر بھی نہیں لکھ سکتا ہے۔

ابن قتیبہ نے لکھا ہے کہ نابغہ نے ملکہ کے سراپا میں صرف چہرہ اور سینہ ہی کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ وہ اعضائ بھی ہیں جہاں صرف کنایہ سے کام لیا جاتا ہے[3]۔ نعمت خاں عالی نے حسن کا سراپا لکھا اور جب کمر تک پہونچا تو بے ساختہ کہہ اٹھا ۔

قلم پر زور را چوں زند دم
دو انگشت از ید قدرت شدہ خم

برخلاف اس کے نابغہ دو انگلیاں جھکا کر اشارہ بازی نہیں کرتا ہے بلکہ اس کو جو کہنا ہے وہ صاف صاف کہہ جاتا ہے۔ نابغہ کو امید تھی کہ اس قصیدہ کے صلہ میں دربار سے گراں بہا خلعت پہن کر نکلے گا۔ لیکن نعمان کے دل پر نابغہ کے اشعار نے تیر و نشتر کا کام کیا۔ اور وہ نابغہ کی صورت سے بیزار ہوگیا۔ اور بدگمانی بڑھتی گئی۔ اور

---

[1] کتاب الشعر صفحہ ۵ ، ، ، ، ، ، ، [2] شرح دیوان نابغہ صفحہ ۲۰ [3] وقد ذکر فیہا ملتہا وعکنہا درواد فہا۔ ابن قتیبہ

اسی زمانہ میں مرّہ بن ربیع نے نابغہ کے نام سے ایک ہجو بادشاہ کی لکھ کر شائع کر دی۔ منخل یشکری (ایک ندیم) نے نعمان سے کہا کہ یہ اشعار صرف وہی لکھ سکتا ہے جس نے ملکہ کو اچھی طرح دیکھا ہو۔ یہ بات نعمان کے دل میں اثر کر گئی جب ناراضی حد سے بڑھ گئی اور قتل کے سامان ہونے لگے تو نابغہ خوف زدہ ہو کر عمرو بن حارث اعرج غسانی کے دربار میں چلا گیا اور وہاں سے بادشاہ کے حضور میں ایک قصیدہ لکھ کر بھیجا اور عفو قصور کا طالب ہوا۔ تحقیقات کے بعد نعمان نے نابغہ کا قصور معاف کر دیا۔ اور اس کو ملک شام سے حیرہ میں بلا لیا۔

نابغہ دوسرا شاعر ہے جس نے سلاطین کی مدح لکھی اور صلہ میں بڑی دولت جمع کی۔ لیکن وہ قوم کی نظروں سے گر گیا۔ کیونکہ آزاد عربوں کے نزدیک بادشاہوں کی مدح لکھنا بھی ایک جرم تھا۔ نابغہ بہت بوڑھا ہو کر سنہ ۶۰۴ء یا سنہ ۶۱۵ء میں فوت ہوا۔ یہ نہایت خلیق اور شریف طینت تھا حیرہ کے راہبوں نے عیسائی کرنا چاہا تھا۔ لیکن مرتے دم تک بت پرست رہا۔ نابغہ نے اعرج غسانی کی مدح میں جو قصیدہ لکھا ہے اس کا یہ ایک شعر بہت مشہور ہے۔

ولا عیب فیہم غیر انّ سیوفہم — اس خاندان میں کوئی عیب نہیں ہے بجز اس کے کہ ان کی تلواریں

بھن فلول من قراع الکتائب — (جدال و قتال سے) دندانہ دار ہو گئی ہیں۔

نعمان کی مدح میں بھی متعدد قصائد ہیں چنانچہ ایک قصیدہ کا یہ شعر مشہور ہے۔

فانک شمس والملوک کواکب — ممدوح آفتاب ہے اور سب ستارے۔ اور جب آفتاب نکلتا ہے تو

اذا طلعت لم یبد منھن کوکب — اس کے سامنے پھر کوئی ستارہ نہیں نکلتا۔

اس کے صلہ میں نعمان نے نابغہ کو سو اونٹ دیئے تھے جو سب سیاہ رنگ کے تھے (یہ نہایت قیمتی ہوتے ہیں) نابغہ کا دیوان ۱۸۶۹ء میں پروفیسر ہارتونگ ڈیرن برگ (H. Derenbourg) نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔

۴۔ اعشیٰ وائلی

یہ سبعہ معلقہ کا چوتھا رکن ہے۔ اس کا نسب نامہ یہ ہے،

ابو بصیر میمون بن قیس بن جندل ۔ ۔ ۔ ۔ بن بکر بن وائل

یمامہ میں پیدا ہوا، بصارت سے محروم تھا اس لئے ابو بصیر کنیت مشہور ہوئی۔ اپنی حبشن لونڈی ہریرہ سے تشبیب کرتا تھا اور اس کی حسن سیہ تاب پر فدا تھا۔ ہریرہ موسیقی میں اپنے زمانہ کی ایک نامور مغنیہ تھی۔ اعشی کے قصیدہ کا مطلع ہے سہ

ما بکاء الکبیر بالاطلال
وسوالی وما ترد سوالی

اس میں ۶۰ شعر ہیں اور اسود بن منذر (برادر شاہ نعمان) کی مدح میں لکھا گیا ہے۔ یہ اپنے اشعار جھانج پر گاتا تھا اس لئے اس کو صناجۃ العرب کہتے تھے۔ عرب کے سوا دیگر ممالک میں بھی چلا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ کسریٰ نوشیرواں نے پوچھا کون ہے؟ خدام نے عرض کیا مغنی عرب ہے۔ "سرود گوید تازی" اس کے قصائد میں فارسی الفاظ بھی بکثرت موجود ہیں اس کا یہ سبب ہے کہ یہ سلاطین عجم کے بھی دربار میں جایا کرتا تھا۔ امراء کے مدح میں بھی قصائد لکھتا تھا اور یہی ذریعۂ معاش تھا اس لیے قوم اس کو ذلیل سمجھتی تھی۔ کیونکہ شعرائے عرب میں ہنوز اعتقاد آن تھی کہ صرف سلاطین اور وزراء کی مدح کرتے تھے اور انھیں سے صلہ لیتے تھے۔ امراء کی طرف مطلق توجہ نہیں کرتے تھے۔ مروان بن ابی حفصہ کہتا ہے سہ

ولقد جئت بالف الف لم تکن الا بکف خلیفۃ او وزیر	میں نے لاکھوں کی رقم پیدا کی لیکن خلیفہ یا وزیر سے۔
ما ذلت انف ان ادل مدحۃ الا لصاحب منبر او سریر	میں نے ہمیشہ اس کو عار سمجھا کہ صاحب تخت اور منبر کے سوا کسی اور کی مدح لکھوں۔

اعشی بھی افضل الشعراء مانا جاتا ہے۔ مدح اور ہجو دونوں خوب کہتا تھا۔ امراء اس کی تیغ زبان سے ہر دم خائف رہتے تھے۔ اور ہجو کے خوف سے معقول صلے دیا کرتے تھے۔ شراب کی تعریف میں اس کے اشعار بہت مقبول ہیں۔ اور جب یہ مرگیا تو اسی مناسبت سے اس کی قبر پر شراب چڑھائی جاتی تھی۔

اعشی نے اپنی شاعری سے غریب خاندانوں کو بھی نفع پہنچایا ہے۔ جب یہ عکاظ کے میلہ میں جاتا تھا تو راستہ

سلہ کتاب الشعراء ابن قتیبہ ۱۳۵، ۱۳۷ و صناجۃ الطرب صفحہ ۲۵۹۔ جمہرہ انصاری۔

میں ایک غریب عرب کے خیمہ میں بسرا کرتا تھا۔ یہ اس کی خوب تواضع کرتا تھا۔ اس کی آٹھ بیٹیاں تھیں اور افلاس کی وجہ سے کوئی پیام نہیں آتا تھا۔ اعشیٰ نے ایک قصیدہ میں ان لڑکیوں کی تعریف کی جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ سب لڑکیاں اچھے گھرانوں میں بیاہ گئیں۔ اعشیٰ کا راوی عُبید تھا جو ہمیشہ اس کے ساتھ مارا پھرتا تھا۔

یہ عہد رسالت میں زندہ تھا مگر اسلام سے محروم رہا۔ اس کا یہ واقعہ مشہور ہے کہ صلح حدیبیہ (سنہ ۶ھ) کے زمانہ میں اس نے مدح نبی کریم میں ایک قصیدہ لکھا جس کا مطلع یہ ہے ؎[1]

الم تغمض عيناك ليلة ارمدا

وبت كما بات السليم مسهدا

مدینہ جارہا تھا کہ دربار رسالت میں حاضر ہوکر قصیدہ پڑھے۔ راستہ میں سردار قریش ابوسفیان بن حرب مل گیا، اور دونوں میں یہ گفتگو ہوئی۔

ابوسفیان۔ اعشیٰ کدہر کا قصد ہے؟۔

اعشیٰ۔ میں نے تمہارے رشتہ دار کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا ہے اُس کی سُنانے کو مدینہ جارہا ہوں۔ اور یہ بھی ارادہ ہے کہ مسلمان ہوجاؤں۔

ابوسفیان۔ مجھے خوف ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صحبت میں پہونچ کر تم کو بہت سے کاموں سے دست بردار ہونا پڑیگا اور میرے خیال میں تم ان کو چھوڑ نہیں سکتے ہو؟۔

اعشیٰ۔ وہ کیا ہیں؟

ابوسفیان۔ سب سے پہلے زنا ہے جس کی اسلام میں سخت ممانعت ہے۔

اعشیٰ۔ مجھے اس کی چھوڑنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس نے خود مجھ کو چھوڑ دیا ہے۔

ابوسفیان۔ زنا کے بعد ممنوعات میں سے قمار بازی ہے۔

اعشیٰ۔ مجھے محمدؐ ضرور انعام دینگے جس کے بعد قمار بازی کی ضرورت ہی نہ ہوگی۔

ابوسفیان۔ اسلام میں سود لینا بھی حرام ہے۔

---

[1] کتاب الشعر صفحہ ۱۳۶، مواسم الادب صفحہ ۱۵ حصہ ۲

اعشی۔ نہ میں نے کسی کو دیا ہے نہ کوئی مجھے دیگا۔

ابوسفیان۔ زنا، قمار، اور سود کی تم کو ضرورت نہیں ہے لیکن شراب کیسے چھوڑ سکتے ہو؟۔

اعشی۔ پانی کافی ہے۔

سردار قریش یہ سنکر چپ ہوگیا۔ اور خیال کیا کہ اعشی کی مدح سے محمد (صلعم) کی شہرت اور بڑھ جائیگی لہذا اس کو اپنی جانب سے سرخ رنگ کے سو اونٹ انعام دیئے اور کہا کہ "تمہارے قصیدہ کا یہ صلہ ہے اس کو قبول کرو اور وطن کو لوٹ جاؤ"۔ اعشی نے یہ صلہ منظور کیا اور یمامہ واپس چلا گیا لیکن منفوحہ (مضافات یمامہ) پہنچ کر اونٹ سے گرا اور مرگیا۔ یہ واقعہ ۶۲۲ء کا ہے۔

سرداران مکہ تبلیغ و اشاعت کو جن طریقوں سے روکتے تھے اس کا اندازہ اس روایت سے بخوبی ہوسکتا ہے۔

۵۔ لبید عامری

سبعہ معلقہ کا یہ پانچواں رکن ہے۔ اس کا نسب نامہ یہ ہے[۱]

ابوعقیل لبید بن ربیعہ بن مالک بن جعفر بن کلاب بن ربیعہ بن عامر بن صعصعہ بن معاویہ بن بکر بن ہوازن

قصیدہ کا مطلع ہے (۸۹ شعر ہیں)

عفت الدیار محلها فمقامها — منیٰ کے وہ گھر جن میں چند روز یا عرصہ تک قیام رہا تھا سب مٹ گئے۔

بمنی تابد غولها فرجامها — اور اس کے متصلہ مقام غول اور رجام بھی ویران ہوگئے۔

لبید کی ولادت ۵۳۲ء میں ہوئی۔ اور امیر معاویہ کی خلافت میں بمقام کوفہ ۶۶۲ء میں انتقال ہوا۔ قبول اسلام کے بعد پچپن سال تک زندہ رہے۔ مرتے وقت بیٹیوں کو وصیت کی کہ ایک سال سے زیادہ میرا سوگ نہ کرنا، نہ بال بکھیرنا، اور نہ مونہہ نوچنا۔

شاعری سے تائب ہوکر قرآن پڑھا کرتے تھے۔ اور یہ اثر قرآن کی فصاحت و بلاغت کا تھا۔ فرماتے تھے کہ

---

[۱] جمہور انصاری کتاب المعمرین سجستانی صفحہ ۶۰ مطبوعہ مصر ۱۳۲۳ھ

" یکفینی القرآن فھو نعم البدل من الاشعار" حضرت عمر نے مغیرہ بن شعبہ والی کوفہ کو ایک مرتبہ یہ حکم بھیجا کہ لوگوں میں جو شعراء ہوں ان کو مدینہ روانہ کرو۔ مغیرہ نے لبید کو انتخاب کیا۔ لیکن انھوں نے جانے سے انکار کر دیا۔ تب مغیرہ نے کہا کہ اچھا اپنا کلام لکھ کر بھیج دو۔ اس حکم کی تعمیل میں لبید نے سورۂ بقر کا ایک جز لکھ کر پیش کیا اور کہا کہ اب مجھے جو کچھ یاد ہے وہ یہی ہے۔ حضرت عمر اس واقعہ سے بہت متاثر ہوئے اور مغیرہ کے سالانہ وظیفہ سے پانسو درہم کم کر کے لبید کے وظیفہ میں بڑھا دئے۔ مغیرہ نے حضرت عمر کو لکھا کہ میرا وظیفہ کس قصور میں کم ہوا ہے۔ عذر معقول تھا، حضرت عمر نے مغیرہ کے وظیفہ میں بیت المال سے اضافہ کر دیا۔ اور لبید کا وظیفہ بھی جاری رکھا۔

حضرت لبید کا یہ قصیدہ عرب کی صحرائی زندگی اور ان کے اخلاق و آداب کا ایک مکمل نمونہ ہے۔ اور اس میں جنگلی گدھے کی خوش فعلیاں قابل دید ہیں۔ نوار کے نام سے تشبیب کرتے تھے۔ عرب جاہلیت کے دستور کے مطابق اس قصیدہ میں شراب خواری، فیاضی، مہمان نوازی اور شہسواری پر فخر کرتے ہیں۔

اس قصیدہ میں ہر رنگ کا کلام موجود ہے۔ نوار سے خطاب کر کے کہتے ہیں:

او لم تکن تدری نوار بانّنی	نوار نے یہ نہ جانا کہ میں ملاشیہ قول و قرار کا بڑا جوڑنے والا
وصالُ عقدِ حبائلٍ جذامھا	اور توڑنے والا ہوں۔ یعنی جو میری طرف جھکتا ہے میں اس کا غلام ہوں اور جو مجھ سے برخی کرتا ہے اس کو فوراً چھوڑ دیتا ہوں

یہ شعر حکیمانہ ہے۔

فاقنع بما قسّم الملیکُ فانما	قسام ازل نے ہماری طبیعت میں جو ودیعت کر دیا ہے (اخلاق و عادات)
قسم الخلائق بیننا علا مھا	اس پر قانع رہنا چاہیئے کیونکہ یہ اُس کی تقسیم ہے جو طبائع کے حالات کو سب سے زیادہ جانتا ہے

لبید کا ایک سوتیلا بھائی (اربد بن قیس) مشرک اور دشمن اسلام تھا۔ نبی کریم کے قتل کے ارادہ سے جا رہا تھا کہ راستہ میں بجلی گری اور مر گیا اس کا مرثیہ لکھا۔ یہ شعر ملاحظہ ہوں۔[1]

فلاجزع ان فرّق الدھر بیننا	اگر زمانہ نے ہمارے مابین جدائی کر دی تو جزع فزع فضول ہے۔ کیونکہ
فکل امرئ یوماً بہ الدھر فلجع	زمانہ ہر شخص کو ایک دن رنج پہونچانے والا ہے۔

---

[1] کتاب الشعر ابن قتیبہ صفحہ ۱۵۱۔

وما المال والاهلون الا ودائع	اہل و عیال اور مال مستعار اشیاء ہیں
ولا بدّ یوما ان ترد الودائع	اور مستعار چیزوں کا واپس کرنا ایک دن ضروری ہے

دیوان لبید کا ایک حصہ یوسف ضیاء الدین پاشا خالدی نے ۱۸۸۰ء میں مع شرح و مقدمہ شائع کیا ہے۔

لبید نہایت عاقل اور تجربہ کار تھے۔ حارث اعرج غسانی نے اُن کو منذر بن ماء السماء شاہ حیرہ کے دربار میں سفیر بنا کر بھیجا تھا۔ لیکن معاملات اس درجہ خراب ہو گئے تھے کہ فریقین میں زبردست جنگ ہوئی جو تاریخ میں یوم حلیمہ کے نام سے مشہور ہے۔

حضرت لبید قبل اسلام بھی قیامت کے قائل تھے۔ لبید پہلے شاعر ہیں جنھوں نے صراحی کو بط کی تشبیہ دی ہے۔

اُم المومنین حضرت عائشہؓ صدیقہ کو بھی لبید کا کلام بہت یاد تھا۔ اور ہر سند کے موقع پر وہ لبید کا شعر پڑھا کرتی تھیں۔

حضرت لبید عہد جاہلیت اور اسلام دونوں میں فیاض رہے۔ اُن کا معمول تھا کہ جب پورب کی ہوا چلتی تھی اُس وقت دعوتِ عام کرتے تھے۔ اور سینکڑوں اونٹ ذبح ہو جاتے تھے۔

۶- عمرو بن کلثوم تغلبی

سبعہ معلقہ کا یہ چھٹا شاعر ہے۔ اس کا نسب نامہ یہ ہے:

ابو الاسود عمرو بن کلثوم بن مالک ...... بن جشم بن تغلب بن وائل

قصیدہ کا مطلع ہے (۱۰۱ شعر ہیں)

الا هبّي بصحنك فاصبحينا	اے اُمِ عمرو! ہوشیار ہو، اور بڑے پیالہ میں صبح کی شراب پلا۔
ولا تبقي خمور الاندرينا	اور کسی دوسرے کے لیے اندرینا رشام کا ایک موضع) کی شراب باقی نہ رکھ

یہ قصیدہ اس وجہ سے لاجواب ہے کہ عمرو نے اپنی جوشِ طبیعت سے برجستہ کہا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس میں

ا؎ کتاب العمدہ رشیق قیروانی صفحہ ۱۱ ۲؎ جمہرہ انصاری کتاب الشعر قتیبہ صفحہ ۱۱۰ بلوغ العرب صفحہ ۱۵۵ جلد ۲

ایامِ بنی تغلب کی تفصیل ہے۔ جس کی مختصر تاریخ یہ ہے کہ ایک دن عمرو بن ہند شاہ حیرہ نے اپنے درباریوں سے پوچھا کہ جزیرۃ العرب میں کوئی ایسا غیور عرب بھی ہے جس کی ماں کو میری ماں کی خدمت کرنے سے عار ہو۔ کسی نے کہا کہ ہاں! ایسی آن بان کی صرف ایک عورت ہے جس کا نام اسماء (لیلےٰ) ہے۔ یہ مُہلہل بنی ربعہ تغلبی کی بیٹی، کُلیب بن ربعہ کی بھتیجی، کلثوم بن مالک، مشہور شہسوار کی بی بی۔ اور عمرو بن کلثوم شاعر کی ماں ہے۔ شاہ کو یہ سُن کر بہت تعجب ہوا۔ اور عمرو کو خط لکھا کہ :-

"میں تمھاری ملاقات کا مشتاق ہوں اور میرے ماں ہند بھی تمھاری والدہ سے ملنا چاہتی ہیں لہذا تم جلد آؤ۔"

شاہ کا خط پڑھتے ہی عمرو اپنے منتخب اور بہادر سواروں کے ہمراہ الجزیرہ سے روانہ ہوا۔ اور اپنی ماں کو بھی چند شریف زادیوں کے ہمراہ لایا۔ شاہ نے بڑے احترام سے خیر مقدم کیا۔ اور فرات و حیرہ کے مابین خیموں میں ٹھہرایا۔

عمرو نے اپنی والدہ کو یہ سمجھا دیا تھا کہ اگر بادشاہ کی ماں تم سے کسی کام کی فرمایش کرے تو انکار کر دینا۔ ادھر شاہ نے اپنی ماں سے یہ کہہ دیا تھا کہ تم لیلےٰ سے کوئی کام لینا۔ چنانچہ ایک دن خیموں میں دعوت ہوئی۔ جب دسترخوان بچھایا گیا تو ہند نے لیلےٰ سے کہا کہ بی بی! ذرا یہ رکابی مجھے اُٹھا دو۔ اُس نے جواب دیا کہ ضرورت ہے تو خود ہی اُٹھا لو۔ یہ جواب سُن کر ہند نے دوبارہ حکم دیا۔ اب لیلےٰ سے ضبط نہ ہو سکا بیچ کر بولی "واذُلّاہ یا آلِ تغلب" (ہائے ذلت، آلِ تغلب کی دہائی ہے) ماں کی آواز سنتے ہی عمر ابن کلثوم بے تاب ہو گیا اور بادشاہ کی تلوار جو خیمہ کے اندر لٹک رہی تھی اُٹھا کر ایسا وار کیا کہ شاہ کا کام تمام ہو گیا۔ اس کے بعد شاہی خیموں کو لوٹ لیا۔ اور قتل و غارت کے بعد الجزیرہ چلا گیا۔

ان دنوں عکاظ کا بازار گرم تھا وہاں پہونچ کر فی البدیہہ یہ قصیدہ پڑھا۔ جس کو اُمرائے مکّہ نے دو مرتبہ سُنا اور بڑی داد دی۔ اور چند ہی روز میں تمام قبائل کے بچہ بچہ کو یہ قصیدہ یاد تھا۔ اُس کے بعض اشعار امثال میں داخل ہیں۔ قصیدہ کے ہر ہر شعر سے شجاعت، جسارت اور غیرت و حمیّت کا اظہار ہوتا ہے اور خاندانی فضیلت اور قومی ہمدردی کا بھی اس میں تذکرہ ہے۔ یہ وہ پُر زور قصیدہ ہے جس کے

اثر سے دو سو برس تک قبیلۂ تغلب کو کسی کے سامنے سر نہیں جھکانا پڑا۔ اور یہی وہ عربی شاعری تھی جس کا دنیا میں جواب نہ تھا۔

عمرو بن کلثوم فخریہ کہتا ہے: ؎

اذا بلغ الفطام لنا صبی	ہمارا بچہ جب اس عمر کو ہو جاتا ہے کہ اس کا دودھ چھڑایا جائے
تخر له الجبابر ساجدینا	تو بڑے بڑے سرکش اس کے سامنے سجدہ میں گر پڑتے ہیں

جنگی کارناموں کے علاوہ اس قصیدہ میں عشق و محبت کی بھی چاشنی ہے۔ اپنی محبوبہ کو مخاطب کر کے کہتا ہے: ؎

قفی قبل التفرق یا ظعینا	اے ہودج نشین! جانے سے پہلے ذرا سواری ٹھیرا لے کہ میں تجھ کو یقینی
نخبرك الیقین و تخبرینا	حدتِ فراق سے ہوشیار کر دوں اور تو مجھے اپنے حال سے مطلع کر دے
قفی نسألك هل احدثت صرما	ذرا ٹھیر (یا سواری ٹھیرا) کہ تجھ سے پوچھ لوں کہ یہ علیحدگی بربنائے
لوشك البین ام خنت الامینا	فراق زمانہ و ضرورتِ سفر ہے یا کہ ازراہ محبت سے خیانت کی ہے۔

عمرو بن کلثوم نے ڈیڑھ سو سال کی عمر میں (۰۰۰ء) انتقال کیا۔ شاعری کے علاوہ فرسان العرب (شہسوار) میں بھی بہت مشہور ہے۔

۷۔ عمرو بن العبد بکری

ملقب بہ طرفہ

ایوانِ معلقہ کا یہ ساتواں رکن ہے۔ اس کا نسب نامہ یہ ہے:۔

" عمرو بن العبد بن سفیان بن سعد بن مالک بن عباد بن صعصعہ . . . . بن علی بن بکر بن وائل"

قصیدہ کا مطلع ہے۔ (۱۰۴ شعر ہیں)

لخولة اطلال ببرقة ثهمد	موضع ثہمد کی پتھریلی زمین میں میری محبوبہ خولہ کے گھر کے آثار ایسے نظر آتے
تلوح کباقی الوشم فی ظاهر الید	ہیں جیسے گودنے کے نشان کھلے ہوئے ہاتھ میں۔

طرفہ قبیلہ بکر بن وائل سے ہے جو بحرین (خلیج فارس) پر آباد تھا۔ یہ کم سنی میں یتیم ہوگیا تھا اور چچا نے ترکۂ پدری سے محروم کردیا تھا۔ طرفہ ۵۵۸ء میں پیدا ہوا اور عین عالم شباب میں (۲۰ ہجری) میں قتل ہوا۔

شعرائے جاہلیت کے کلام میں جو مخصوص مضامین ہوتے ہیں وہ سب طرفہ کے قصیدہ میں موجود ہیں۔ ناقہ کی تعریف میں یہ شعر لاجواب ہے جس میں اس کو کشتی سے تشبیہ دی ہے:

عدولية او من سفين ابن يامن	جس کجاوہ میں نوار سوار ہے وہ گویا عدولیہ کی کشتی ہے یا ابن
يجور بها الملاح طورا ويهتدي	یامن کی بنائی ہوئی ہے جس کو ملاح کبھی سیدھا چلاتا ہے اور کبھی ٹیڑھا

نوار کی حسن کی تعریف کرتا ہے:

ووجه كان الشمس لقت رداءها	اور اس کا چہرہ ایسا ہے کہ گویا آفتاب نے اس پر اپنی چادر
عليه نقي اللون لم يتخدد	ڈال دی ہے۔ اور رنگ صاف رکھتا ہے جس پر جھریوں کا پتہ نہیں ہے

حکیمانہ خیالات کا اندازہ ان اشعار سے ہوتا ہے:

ارى العيش كنزا ناقصا كل ليلة	زندگی کو میں ایک خزانہ سمجھتا ہوں جو ہر رات کو گھٹتا ہے۔ اور
وما تنقص الايام والدهر ينفد	جس کو زمانہ دن رات کم کرتا ہے وہ ایک دن ختم ہو جائیگا۔

طرفہ کا ایک مختصر دیوان بھی ہے۔ ابن قتیبہ نے تصریح کی ہے کہ شعرائے مابعد نے اس کی تشبیہات سے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔

طرفہ کی موت

طرفہ کی بہن (خرنق شاعرہ) عمرو بن ہند شاہ حیرہ کے ایک درباری (عبد عمرو بن بشر) سے منسوب تھی۔ لیکن بی بی کے ساتھ اس کا شریفانہ برتاؤ نہ تھا۔ جب طرفہ سے بہن نے شکایت کی تو اس نے عبد عمرو کی ہجو لکھی جو عام طور پر مشہور ہو گئی۔ ایک دن شاہ نے گورخر شکار کیا اور عبد عمرو کو ذبح کرنے کا حکم دیا۔ جانور زبردست تھا، چھری کی زد سے نکل گیا۔ اُس وقت شاہ

۱؎ عدولیہ بحرین کا ایک موضع تھا۔ جہاں کی کشتیاں مشہور تھیں۔ اور یہ بھی عدولیہ کہلاتی تھیں۔ ابن یامن ایک مشہور نجار تھا۔ جس کی ساختہ کشتیاں نہایت مضبوط اور مستحکم ہوتی تھیں۔ ۲؎ یعقوبی صفحہ ۲۴۰ و کتاب الشعراء ابن قتیبہ صفحہ ۶۱، ۸۵ و ۸۷۔

نے عمرو کو طرفہ کے ہجو کے چند شعر سنائے اور فرمایا کہ طرفہ نے تمہاری نسبت جو کچھ لکھا ہے وہ سچ معلوم ہوتا ہے۔ عبد عمرو نے عرض کیا کہ میری حقیقت کیا ہے، طرفہ نے تو حضور کی بھی ہجو لکھی ہے جو میری بہن سے کہی تھی۔ یاد ہے، بخت بیچارہ دو شعر بھی سنائے۔ شاہ نے فرمایا اچھا میں اس گستاخ ہجو کرنے والے کو ضرور سزا دونگا۔

ایک دن طرفہ کو دربار میں بلایا۔ اور اس کے عزیز دوست جریر بن عبد المسیح (متلمس) کو بھی طلب کیا اور دونوں کو خلعت فاخرہ عطا فرمائے۔ اور ایک ایک سربمہر لفافہ دے کر حکم دیا کہ عامل بحرین (ربیع بن حوثرہ) کے پاس جاؤ وہ تم کو ہمارے فرمان کے مطابق صلہ دیگا۔ یہ دونوں لفافے لے کر دربار سے رخصت ہو گئے۔ (طرفہ کے ساتھ متلمس کو اس لیئے شریک کر دیا تھا کہ اگر یہ زندہ رہا تو خطرہ تھا کہ وہ شاہ کی ضرور ہجو لکھیگا)

یہ دونوں بحرین جاتے ہوئے راستہ میں ایک نہر کے کنارے پر ٹھہر گئے۔ متلمس نے طرفہ سے کہا کہ مجھے شاہ کی یہ کارروائی مشتبہ معلوم ہوتی ہے اگر صلہ دینا مقصود تھا تو عامل بحرین کے پاس بھیجنے کی کیا ضرورت تھی۔ مناسب یہ ہے کہ لفافے کھول کر کسی سے پڑھوائیں (دونوں جاہل تھے) طرفہ نے اس رائے سے اختلاف کیا، لیکن متلمس نے اپنا لفافہ کھول ڈالا اور ایک لڑکے سے پڑھوایا۔ اس میں عامل کے نام حکم تھا کہ متلمس کے ہاتھ پیر قطع کر کے اس کو زندہ دفن کر دو۔ متلمس نے فوراً فرمان کو چاک کر کے نہر میں ڈال دیا۔ اور طرفہ کو پھر سمجھایا، لیکن اس نے متلمس کی نصیحت پر عمل نہیں کیا۔ متلمس تو ملک شام کو روانہ ہو گیا اور طرفہ بحرین پہونچا۔ عامل نے طرفہ سے کہا کہ لفافہ کھولنے سے قبل اگر تم جانا چاہتے ہو تو جا سکتے ہو ورنہ میں تعمیل حکم پر مجبور ہونگا۔ طرفہ نے اب بھی انکار کیا۔ لفافہ کھولا تو اس میں طرفہ کے قتل کا حکم تھا۔

عامل نے طرفہ سے پوچھا کہ تم اپنی موت کس طرح چاہتے ہو۔ اس نے کہا کہ مجھے خوب شراب پلاؤ، جب مخمور ہو جاؤں تو فصد کھول دینا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور یہ نوجوان شاعر دنیا سے ناشاد و نامراد گیا۔

عربی[1] امثال میں صحیفۂ متلمس سے اسی قسم کے خط مراد ہیں۔ طرفہ ہر وقت نشہ میں چور رہتا تھا اور عیش و نشاط سے زندگی بسر کرتا تھا۔ طرفہ کا یہ قصیدہ مع ترجمہ فرنچ موسیو تسلی غصون (Seligsalin) نے بڑے اہتمام سے چھاپا ہے، اور باقی کلام تلف ہو گیا ہے۔

---

[1] کتاب الفاخر صفحہ ۶۰

ضمیمہ

۱۔ عنترہ عبسی نجدی

سبعہ معلقہ کا موجودہ نسخہ جو داخل درس ہے اس میں عنترہ اور حارث یشکری کے قصائد بھی شامل ہیں (زوزنی اور محمد بن زکریا کی یہ رائے ہے) لہذا ان کے حالات بھی لکھے جاتے ہیں:

ابو المغلس عنترہ بن عمرو بن معاویہ بن شداد بن عمرو بن قراد عبسی، یہ جاہلیت کا نہایت مشہور شاعر ہے۔ اس کی ماں زبیبہ، ایک حبش کی لونڈی تھی۔ عنترہ (یعنی نیلگوں مکھی) سیاہ فام اور پورا حبشی تھا، اس لیئے اس کا باپ، اس کو اپنا بیٹا کہتے ہوئے شرماتا تھا۔ اور یہ جنگل میں اونٹ چرایا کرتا تھا۔

اتفاق سے بنی عبس اور فزارہ (ایام عرابہ) میں ایک گھوڑ دوڑ کے موقع پر جنگ چھڑ گئی، اس لڑائی میں عنترہ نے اپنے جوہر شجاعت دکھلائے اور دشمنوں پر کامیاب ہوا۔ اور کثیر تعداد میں مال غنیمت لایا۔ اس صلہ میں عمرو نے عنترہ کو اپنا بیٹا تسلیم کرلیا۔ اور اپنے تمام جائداد کا مالک بنا دیا۔ اور قوم نے بھی اس کو اپنا سردار تسلیم کرلیا۔ چنانچہ عرب کے مشہور آٹھ اخربہ (یعنی سردار) میں سے ایک عنترہ بھی ہے۔

شاعری کے علاوہ عنترہ، عرب کا ایک نامی شہسوار بھی تھا اور عنترۃ الفوارس مشہور تھا۔

عنترہ کی ولادت ۵۲۵ء میں ہوئی، اور ۶۳۲ء میں قبیلہ طے کی جنگ میں قتل ہوا۔ اس کا قاتل اسد الربیص تھا۔ چنانچہ عنترہ کے قتل پر فخر یہ کہتا ہے:۔

انا اسد الربیص قتلت عمرا

وعنترۃ الفوارس قد قتلت

عنترہ خود بھی بڑا شجاع تھا۔ چنانچہ عربی میں مثل ہے کہ "اشجع من عنترۃ"

عنترہ کے قصیدہ (موسومہ مذہبیہ) کا مطلع یہ ہے:

(۷۵، شعر ہیں)

هل غادر الشعراء من متردّم — اگلے شاعروں نے شعر کی اصلاح اور پیوند کاری میں کچھ کسر اٹھا نہیں
ام هل عرفت الدار بعد توهم — رکھی ہے جس کو میں پورا کروں، (پھر بات کاٹ کر کہتا ہے) تو نے
اپنی محبوبہ کے گھر کو بڑے شک شبہ کے بعد پہچانا ہے۔

عنترہ عبلہ (بنت مالک بن قراد) پر عاشق تھا۔ اور اس کے نام سے تشبیب کرتا تھا۔ جس کے ساتھ اس کی شادی بڑی دشواریوں سے ہوئی۔ اور محض اس رشتہ سے وہ بھی صاحب خاندان ہو گیا۔ ورنہ عربوں میں لونڈی کی اولاد نہایت ذلیل سمجھی جاتی تھی۔

عبلہ سے خطاب کر کے کہتا ہے:-

یا دار عبلة بالجواء تکلمی — اے عبلہ کے گھر (جو جواء کے اندر ہے) مجھ سے بات کر!
وعمی صباحاً دار عبلة واسلمی — اور اے گھر تو صبح کے وقت (یہ غارت گری کا وقت ہوتا ہے) خوش اور آفات سے محفوظ رہ۔

عنترہ کے رزمیہ کارناموں[1] کی داستان عربوں میں بہت مشہور ہے۔ اور یہ فسانہ مصر و بیروت میں کئی مرتبہ چھپ چکا ہے۔

حرب[2] داحس میں عنترہ نے بڑا نام پیدا کیا اور ضمضم مُرّی کے دونوں بیٹوں حصین اور ہرم کو قتل کیا۔ جس کا قصیدہ میں ذکر ہے۔

عنترہ کے کلام میں عہد جاہلیت کی زبان اور ملک کی صورت و معاشرت کا صحیح نقشہ نظر آتا ہے۔ یہ بدوی شاعر چمڑے کے خیمہ میں ریت کے فرش پر اپنے دوستوں کو لے کر بیٹھ جاتا تھا اور اشعار سے وہ سماں باندھ دیتا تھا کہ سامعین محو حیرت ہو جاتے تھے۔

---

[1] یہ فسانہ اصمعی نے ہارون الرشید عباسی کے زمانہ میں لکھا تھا جس کو عہد مامون الرشید میں یوسف بن اسمعیل نے مکمل کیا۔ آسٹرین مستشرق ہمر (Hammer) نے اس کا ترجمہ چھاپا ہے اور فرنچ میں ارشل ڈی ویک (Devic) کا ترجمہ مقبول ہے۔ [2] حرب داحس یہ خانہ جنگی ۵۶۸ء سے ۶۳۱ء تک قایم رہی۔ داحس ایک مشہور گھوڑا تھا جو گھوڑ دوڑ میں سب سے آگے تھا۔ اور قریب تھا کہ بازی جیت جائے۔ لیکن ایک شخص نے اس کو بڑھنے سے روک دیا۔ اس بات پر یہ جنگ شروع ہوئی۔ اور ۶۰۹ء میں لڑائی ختم ہوئی۔

اس قصیدہ میں تشبیہ کے لحاظ سے یہ اشعار لاجواب ہیں۔

وخلا الذباب بها فلیس ببارح	سبزہ زار کی تعریف میں کہتا ہے۔ شہد کی مکھی اس سبزہ زار میں
غردا کفعل الشارب المترنم	خلوت گزیں ہوگئی ہے اور کہیں نہیں جاتی (پھولوں کی افراط کی)
	اور ایک شرابی گانے والے کی طرح ہر وقت گن گناتی رہتی ہے
هزجا يحك ذراعه بذراعه	مکھی گاتی ہے اور تالیاں بجاتی ہے۔ جس طرح انگشت بریدہ شخص
فعل المكب على الزناد الاجذم	بار بار آگ کی امید میں چقماق پر ضربیں لگاتا ہے

یہی وہ مضامین ہیں جس کی بنا پر عنترہ کا کلام نامور شاعر ہومر کے مماثل مانا گیا ہے

۲۔ حارث یشکری

باختلاف روایت حارث بھی شعرائے سبعہ معلقہ میں داخل ہے۔ اور بعض مورخین کا خیال ہے کہ حماد روایہ (جامع سبعہ معلقہ) ہم نے قبیلہ (بنوبکر) ہونے کی وجہ سے حارث کے قصیدہ کو معلقہ میں داخل کر دیا ہے شمالی عرب اور روم و فارس میں جو لڑائیاں ہوئی ہیں حارث کے قصیدہ میں اس کی تفصیل ہے لہذا یہ ایک تاریخی ارجوزہ ہے

حارث بن حلزہ قبیلہ بکر (بن وائل) ویشکر سے ہے۔ اس قصیدہ میں ۸۲ شعر ہیں اور مطلع یہ ہے ؎

آذنتنا ببينها اسماء	اسماء نے ہم کو ایک طویل صحبت کے بعد جدائی کی خبر سنائی۔ اور
رب ثاوٍ يمل منه الثواء	اکثر مقیم، طول اقامت سے برداشتہ خاطر ہو جاتے ہیں۔

اس قصیدہ کی مختصر تاریخ یہ ہے کہ عمرو بن ہند شاہ حیرہ نے قبیلہ بکر و تغلب میں صلح کرا دی تھی جو عرصہ تک قائم رہی۔ اس کے بعد شاہ نے بنی تغلب کا ایک قافلہ کسی ضرورت سے جبل طی کی طرف روانہ کیا یہ قافلہ قبیلہ بنی بکر میں جا کر ٹھیرا۔ لیکن قبیلہ والوں نے قافلہ کو اپنے چشمہ سے پانی نہ لینے دیا۔ اور اکثر

---

[1] بلوغ الارب صفحہ ۱۳۹ جلد ۲ کتاب الشعراء صفحہ ۱۳۰

تنبیہ پیاس سے مر گئے

اس واقعہ کی بادشاہ سے شکایت کی گئی۔ جب تحقیقات شروع ہوئی تو بنی تغلب نے جواب دیا کہ یہ غلط الزام ہے۔ ہم نے پانی بھی دیا اور راستہ بھی بتایا۔ اور اپنے حدود سے قافلہ کو آگے پہونچا دیا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قافلہ راستہ بھول گیا اور ریگستان میں فنا ہو گیا۔ چنانچہ انھیں واقعات کو حارث نے قصیدہ میں بیان کیا ہے۔ حارث نے ہاتھ میں کمان لے کر یہ بھی ایک دستور تھا شاہ کے حضور میں قصیدہ پڑھنا شروع کیا اور اس جوش سے پڑھا کہ تیر کی نوک ہتھیلی کے پار ہو گئی اور حارث کو مطلق احساس نہ ہوا

عمرو بن ہند[1] پردہ کے اندر بیٹھا ہوا قصیدہ سن رہا تھا۔ لیکن جب حارث کے اشعار نے اس کو بیتاب کر دیا اور ضبط کی طاقت نہ رہی تو پردہ ہٹا دیا گیا اور حارث کو اپنے برابر تخت پر بٹھالیا

اس قصیدہ میں حارث نے ان احسانات کو گنا ہے جو اس کی قوم نے شاہ سے کیئے تھے۔ اور قبیلہ بکر کو تمام الزام سے بری کیا ہے۔ یہ قصیدہ فی البدیہہ پڑھا گیا۔ اس وقت حارث کی عمر ۱۳۵ سال کی تھی ایک ادیب کا قول ہے کہ یہ قصیدہ حولیات زہیر کے ہم پلہ تھا (یعنی اس قدر پُر زور تھا کہ گویا ایک سال کے غور و فکر کے بعد لکھا گیا ہے)

حارث نے ۵۶۰ء میں انتقال کیا۔ اس کا ایک بیٹا تھا جس کا نام مذعور تھا۔[2]

مضمون سبعہ معلقہ ختم ہوا

---

[1] عہد جاہلیت میں سب سلاطین پردہ کے اندر بیٹھ کر دربار کرتے تھے۔ کتاب العمدہ کی روایت ہے کہ عمرو بن ہند سات پردوں کے اندر تھا۔ اور آہستہ آہستہ یہ پردے ہٹائے گئے۔ اور اخیر میں مجبور ہو کر ساتواں پردہ بھی اٹھا دیا گیا۔ اور حارث شاہ کے قریب ہو گیا۔ صفحہ ۲۱۔

[2] یہ مضمون باوجود اختصار طویل ہو گیا ہے لہذا البقیہ کلیات کے حالات نہایت مختصر لکھے گئے ہیں۔ تاہم کوئی اہم اور تاریخی واقعہ لکھنے سے باقی نہیں رہا۔ (مؤلف)

بادۂ کہن

(میر انیس مرحوم)

"ہم جناب سالک حسین صاحب کاظمی ایم اے (علیگ) کے شکر گزار ہیں کہ اُنھوں نے میگزین کو فراموش نہیں کیا۔ ذیل کی غزل جو میر انیسؔ مرحوم کے کلام کا نایاب نمونہ ہے حضرت سالک کی نوازش سے ہم کو دستیاب ہوئی ہے وہ اس کو غیر مطبوعہ خیال کرتے ہیں۔ ہم کو اُمید ہے کہ موصوف خود بھی میگزین کے لیئے کچھ عنایت کرینگے۔

(مُدیر)

کچھ آج شام سے چہرہ ہے فق سحر کی طرح
ڈھلا ہی جاتا ہوں فرقت میں دوپہر کی طرح

شہیدِ عشق ہوئے قیسِ نامور کی طرح
جہاں میں عیب بھی ہم نے کیئے ہُنر کی طرح

تمھارے حلقہ بگوشوں میں ایک ہم بھی ہیں
پڑا رہے یہ سخن کان میں گہُر کی طرح

نحیف و زار ہیں کیا زور باغباں سے چلے
بٹھا دیا جہاں بس رہ گئے شجر کی طرح

ہماری قبر پہ کیا احتیاجِ عنبر و عود
سُلگ رہا ہے ہر اک استخواں اگر کی طرح

هل غادر الشعراء من متردم — اگلے شاعروں نے شعر کی اصلاح اور پیوندکاری میں کچھ کسر اٹھا نہیں
ام هل عرفت الدار بعد توهم — رکھی ہے (جس کو میں پورا کروں) (پھر بات کاٹ کر کہتا ہے) تو نے
اپنی محبوبہ کے گھر کو بڑے شک و شبہ کے بعد پہچانا ہے۔

عنترہ، عَبلہ (بنت مالک بن قراد) پر عاشق تھا۔ اور اس کے نام سے تشبیب کی تھا۔ جس کے ساتھ اس کی شادی بڑی دشواریوں سے ہوئی۔ اور محض اس رشتہ سے وہ بھی صاحب خاندان ہوگیا۔ ورنہ عربوں میں لونڈی کی اولاد نہایت ذلیل سمجھی جاتی تھی۔

عبلہ سے خطاب کرکے کہتا ہے:۔

یا دار عبلة بالجواء تکلمی — او عبلہ کے گھر (جو جواء کے اندر ہے) مجھ سے بات کر!
وعمی صباحا دار عبلة واسلمی — اور اے گھر تو صبح کے وقت (یہ غارت گری کا وقت ہوتا ہے)
خوش اور آفات سے محفوظ رہ۔

عنترہ کے رزمیہ کارناموں[۱] کی داستان عربوں میں بہت مشہور ہے۔ اور یہ فسانہ مصر و بیروت میں کئی مرتبہ چھپ چکا ہے۔

حربِ[۲] داحس میں عنترہ نے بڑا نام پیدا کیا اور ضمضم مُرّی کے دونوں بیٹوں حصین اور ہرم کو قتل کیا۔ جس کا قصیدہ میں ذکر ہے۔

عنترہ کے کلام میں عہد جاہلیت کی زبان اور ملک کی صورت و معاشرت کا صحیح نقشہ نظر آتا ہے۔ یہ بدوی شاعر چمڑے کے خیمہ میں ریت کے فرش پر اپنے دوستوں کو لے کر بیٹھ جاتا تھا اور اشعار سے وہ سماں باندھ دیتا تھا کہ سامعین محو حیرت ہو جاتے تھے۔

---

[۱] یہ فسانہ اصمعی نے ہارون الرشید عباسی کے زمانہ میں لکھا تھا۔ جس کو عہد مامون الرشید میں یوسف بن دعیل نے مکمل کیا۔ آسٹرین مستشرق ہمر (Hammer) نے اس کا ترجمہ چھاپا ہے اور فرنچ میں مارشل ڈی ویک (Devic) کا ترجمہ مقبول ہے۔ [۲] حرب داحس یہ خانہ جنگی سنہ ۵۶۸ء سے سنہ ۶۳۱ء تک قایم رہی۔ داحس ایک مشہور گھوڑا تھا جو گھوڑ دوڑ میں سب سے آگے تھا۔ اور قریب تھا کہ بازی جیت جائے۔ لیکن ایک شخص نے اس کو بڑھنے سے روک دیا۔ اس بات پر یہ جنگ شروع ہوئی۔ اور سنہ ۶۰۹ء میں لڑائی ختم ہوئی۔

اس قصیدہ میں تشبیہ کے لحاظ سے یہ اشعار لاجواب ہیں ۔

فخلا الذباب بها فلیس ببارحٍ	سبزہ زار کی تعریف میں کہتا ہے۔ شہد کی مکھی اس سبزہ زار میں
غرداً کفعل الشارب المترنم	خلوت گزیں ہو گئی ہے اور کہیں نہیں جاتی (مصرعوں کی افراط کی) اور ایک شرابی گانے والے کی طرح ہر وقت گن گناتی رہتی ہے
هزجاً یحک ذراعه بذراعه	مکھی گاتی ہے اور تالیاں بجاتی ہے۔ جس طرح انگشت بریدہ شخص
فعل المکب علی الزناد الاجذم	بار بار آگ کی امید میں چقماق پر ضربیں لگاتا ہے

یہی وہ مضامین ہیں جن کی بنا پر عنترہ کا کلام نامور شاعر ہومر کے مماثل مانا گیا ہے

۲۔ حارث یشکری

باختلاف روایت حارث بھی شعرائے سبعہ معلقہ میں داخل ہے۔ اور بعض مورخین کا خیال ہے کہ حماد راویہ (جامع سبعہ معلقہ) ہم قبیلہ (بنو بکر) ہونے کی وجہ سے حارث کے قصیدہ کو معلقہ میں داخل کر دیا ہے شمالی عرب اور روم و فارس میں جو لڑائیاں ہوئی ہیں حارث کے قصیدہ میں اس کی تفصیل ہے لہذا یہ ایک تاریخی ارجوزہ ہے

حارث بن حلزہ قبیلۂ بکر (بن وائل) و یشکر سے ہے۔ اس قصیدہ میں ۸۲ شعر ہیں اور مطلع یہ ہے ؎

آذنتنا ببینها اسماءُ	اسماء نے ہم کو ایک طویل صحبت کے بعد جدائی کی خبر سنائی۔ اور
رُبَّ ثاوٍ یُمَلُّ منه الثواءُ	اکثر مقیم، طول اقامت سے بردا شتہ خاطر ہو جاتے ہیں۔

اس قصیدہ کی مختصر تاریخ یہ ہے کہ عمرو بن ہند شاہ حیرہ نے قبیلۂ بکر و تغلب میں صلح کرا دی تھی جو عرصہ تک قائم رہی۔ اس کے بعد شاہ نے بنی تغلب کا ایک قافلہ کسی ضرورت سے جبل طی کی طرف روانہ کیا یہ قافلہ قبیلۂ بنی بکر میں جا کر ٹھیرا۔ لیکن قبیلہ والوں نے قافلہ کو اپنے چشمہ سے پانی نہ لینے دیا۔ اور اکثر

؎ بلوغ الارب صفحہ ۱۳۹ جلد ۲ کتاب الشعراء صفحہ ۱۳۰

تغلبی پیاس سے مر گئے

اس واقعہ کی بادشاہ سے شکایت کی گئی۔ جب تحقیقات شروع ہوئی تو بنی بکر نے جواب دیا کہ یہ غلط الزام ہے۔ ہم نے پانی بھی دیا اور راستہ بھی بتایا۔ اور اپنے حدود سے قافلہ کو آگے پہونچا دیا۔ لیکن اس کا کیا علاج ہے کہ قافلہ راستہ بھول گیا اور ریگستان میں فنا ہو گیا۔ چنانچہ انھیں واقعات کو حارث نے قصیدہ میں بیان کیا ہے۔ حارث نے ہاتھ میں کمان لے کر (یہ بھی ایک دستور تھا) شاہ کے حضور میں قصیدہ پڑھنا شروع کیا اور اس جوش سے پڑھا کہ تیر کی نوک ہتیلی کے پار ہو گئی اور حارث کو مطلق احساس نہ ہوا

عمرو بن ہند[1] پردہ کے اندر بیٹھا ہوا قصیدہ سُن رہا تھا۔ لیکن جب حارث کے اشعار نے اُس کو بیقرار کر دیا اور ضبط کی طاقت نہ رہی تو پردہ ہٹا دیا گیا اور حارث کو اپنے برابر تخت پر بٹھایا

اس قصیدہ میں حارث نے ان احسانات کو گنایا ہے جو اس کی قوم نے شاہ سے کئے تھے۔ اور قبیلۂ بکر کو تمام الزام سے بری کیا ہے۔ یہ قصیدہ فی البدیہہ پڑھا گیا۔ اُس وقت حارث کی عمر ۱۳۵ سال کی تھی ایک ادیب کا قول ہے کہ یہ قصیدہ حولیات زہیر کے ہم پلہ تھا (یعنی اس قدر پُر زور تھا کہ گویا ایک سال کے غور و فکر کے بعد لکھا گیا ہے)

حارث نے ۵۶۰ء میں انتقال کیا۔ اس کا ایک بیٹا تھا جس کا نام مذعور تھا۔[2]

مضمون سبعہ معلقہ ختم ہوا

---

[1] عہد جاہلیت میں سب سلاطین پردہ کے اندر بیٹھ کر دربار کرتے تھے۔ کتاب العمدہ کی روایت ہے کہ عمرو بن ہند سات پردوں کے اندر تھا۔ اور آہستہ آہستہ یہ پردے ہٹائے گئے۔ اور اخیر میں مجبور ہو کر ساتواں پردہ بھی اٹھا دیا گیا۔ اور حارث شاہ کے قریب ہو گیا۔ صفحہ ۲۱۔

[2] یہ مضمون باوجود اختصار طویل ہو گیا ہے لہٰذا البقیہ کلیات کے حالات نہایت مختصر لکھے گئے ہیں۔ تاہم کوئی اہم اور تاریخی واقعہ لکھنے سے باقی نہیں رہا۔ (مؤلف)

باغِ سخن

(میر انیس مرحوم)

"ہم جناب سالک حسین صاحب کاظمی ایم اے (علیگ) کے شکرگزار ہیں کہ اُنھوں نے میگزین کو فراموش نہیں کیا۔ ذیل کی غزل جو میر انیس مرحوم کے کلام کا نایاب نمونہ ہی حضرت سالک کی نوازش سے ہم کو دستیاب ہوئی ہی وہ اس کو غیرمطبوعہ خیال کرتے ہیں۔ ہم کو اُمید ہی کہ موصوف خود بھی میگزین کے لیئے کچھ عنایت کرینگے۔

(مُدیر)

کچھ آج شام سے چہرہ ہی فق سحر کی طرح
ڈھلا ہی جاتا ہوں فرقت میں دوپہر کی طرح

شہیدِ عشق ہوئے قیسِ نامور کی طرح
جہاں میں عیب بھی ہم نے کیئے ہُنر کی طرح

تمھارے حلقہ بگوشوں میں ایک ہم بھی ہیں
پڑا رہے یہ سخن کان میں گہر کی طرح

نحیف و زار ہیں کیا زور باغباں سے چلے
بٹھا دیا جہاں بس رہ گئے شجر کی طرح

ہماری قبر پہ کیا احتیاجِ عنبر و عود
سُلگ رہا ہے ہر اک استخواں اگر کی طرح

حکمائے اسلام اور فلسفۂ یونان

فلسفہ نہ صرف یونانی فن ہے بلکہ اسی کی لغت کا یہ مرکب لفظ ہے۔ اس کے معنی اہلِ لغت نے "محبتِ عقل و دانش" کے بتائے ہیں اور اصطلاحی تعریف میں لکھا ہے کہ "تمام مظاہرات قدرت کے اسباب اور قوانین کا علم" فلسفہ کی حقیقی تعریف ہے

غرضکہ فلسفہ کی بنیاد جیسا کہ مشہور ہے یونانیوں نے ڈالی جو اپنی پوری اوج پر پہونچکر فنا کا درجہ اختیار کر چکا تھا لیکن عہد مامون میں صدیوں کے بعد دوسرے لباس میں پھر زندہ ہوا۔ چنانچہ علامہ قفطی نے "تاریخ الحکماء" میں ارسطو کی سوانح کے ضمن میں احیاء فلسفہ کا ایک عجیب و غریب واقعہ نقل کیا ہے۔ علامہ موصوف لکھتا ہے:

> "محمد بن اسحٰق الندیم نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ مامون نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص سرخ و سفید جس کی پیشانی چوڑی ہے۔ دونوں ابرو ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں۔ سر گنجا ہے آنکھیں ورنگی ہیں۔ اپنے تخت پر بیٹھا ہے اور میں گویا اس کے سامنے کھڑا ہوں اور اس کی ہیبت مجھ پر چھائی ہوئی ہے چنانچہ میں نے اس سے کہا کہ تو کون ہے اس نے جواب دیا کہ میں ارسطاطالیس ہوں میں یہ سنکر خوش ہوا اور میں نے کہا کہ اے حکیم میں تجھ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں اس نے جواب دیا پوچھ میں نے کہا "اچھائی کیا ہے؟" اس نے جواب دیا "عقل" میں نے کہا "اور" اس نے کہا "شرع" میں نے کہا "اور" اس نے کہا "اور کچھ نہیں" میں نے کہا کچھ اور بتا اُس نے کہا . . . . توحید پر قائم رہو۔ چنانچہ مامون نے خواب سے بیدار ہوتے ہی ارسطاطالیس کی کتابیں تلاش کرانی شروع کر دیں لیکن اسلامی ممالک میں اُن کا کہیں پتہ نہ ملا ابن اسحٰق کے علاوہ ایک شخص کا بیان ہے کہ مامون نے شاہ یونان سے خط و کتابت کی اور ارسطو کی کتابیں اس سے منگوائیں اس نے بھی کتابیں تلاش کرائیں لیکن

اس کے ملک میں بھی اُن کا پتہ نہ چلا اس کو بہت افسوس ہوا اور کہنے لگا کہ مسلمانوں کا بادشاہ یونانی اسلاف کے علم کو مجھ سے طلب کر رہا ہے لیکن مجھے کہیں نہیں ملتا ہے اب میرے لئے کیا عذر ہے اور اس یونانی قوم کی مسلمانوں کی نظروں میں کیا وقعت رہے گی چنانچہ اس نے جستجو شروع کر دی کہ قسطنطنیہ کے ایک گرجے کے راہب نے آکر کہا کہ جو کچھ تو چاہتا ہے میں اُسے جانتا ہوں بادشاہ نے کہا بتا چنانچہ اس نے کہا کہ فلاں جگہ پر ایک مکان ہے جس میں ہر بادشاہ زمام حکومت ہاتھ میں لیتے وقت قفل لگا دیا کرتا ہے۔ بادشاہ نے کہا کیا یہ وہی جگہ ہے جس کے متعلق لوگوں کا بیان ہے کہ اس میں اگلے بادشاہوں کا مال ہے۔ . .

. . . . . راہب نے کہا کہ یہ بات نہیں ہے بلکہ وہاں ایک مندر ہے جہاں یونانی لوگ قبل اشاعت مذہب مسیح پوجا پاٹ کیا کرتے تھے۔ چنانچہ جب قسطنطین ابن آنہ کے عہد میں یہاں مذہب مسیحی نے جڑ پکڑلی تو لوگوں کے پاس سے فلسفہ کی کتابیں لیکر جمع کی گئیں اور اس گھر میں مقفل کر دی گئیں اس وقت سے برابر بادشاہ قفل ڈالتے چلے آتے ہیں جیسا کہ تم نے ابھی سُنا۔ بادشاہ نے حکومت کے سربر آوردہ لوگوں کو بلایا اور یہ واقعہ ان کو بتا کر اُن سے مشورہ کیا کہ آیا مکان کھولا جائے چنانچہ انھوں نے رائے دیدی اس کے بعد راہب سے بادشاہ نے دریافت کیا کہ وہ کتابیں اگر مل گئیں تو کیا ممالک اسلامیہ کو بھیجدی جائیں کیا دنیاوی اعتبار سے کوئی خطرہ اور آخرت کے اعتبار سے کوئی گناہ تو نہیں ہے۔ راہب نے کہا کہ اُن کے بھیجدینے میں تجھے ثواب ہوگا کیونکہ جس قوم میں یہ فن گھسا اُس کی بنیاد تک اُس نے ہلادی۔ چنانچہ بادشاہ وہاں گیا اور مکان کھولکر دیکھا تو جو کچھ راہب نے بیان کیا تھا وہ بالکل ٹھیک تھا بے انتہا کتابیں اس میں ملیں غرضکہ ایک طرف سے بے دیکھے بھالے پانچ ڈھیر نکالکر مامون کو بھیجدئے گئے۔ مامون نے مترجمین کے ذریعہ سے یونانی سے عربی میں ترجمہ کرایا۔"

غرضکہ علوم اسلامیہ میں احیاء فلسفہ کی یہ تاریخ بیان کی جاتی ہے جس نے بالیقین ایک زمانہ میں ملت اسلاً

میں گھسکر" اس کی بنیاد ہلا دی تھی" ملت اسلامیہ میں سینکڑوں فرقے اسی فلسفہ کا ایک ادنی کرشمہ ہیں

تنزیقیت کی ایجاد کا سہرا اسی فلسفہ کے سر ہے جس نے اپنے تبعین کو یہاں تک گمراہ کر دیا تھا کہ قرآن کے جواب میں قرآن لکھنے کو تیار ہو گئے تھے لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہے کہ اسی فلسفہ کی تحریک کا طفیل ہے جس نے متکلمین کی جماعت کو کھڑا کر کے اس ہیجان اور طغیان کو روک دیا جس نے مذہب کی قطع و برید میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ ہر فرعونے راموسیٰ اسی کو کہتے ہیں

فلسفہ کی تین قسمیں۔ اخلاقیات۔ مابعد الطبیعیات۔ اور طبیعیات تو پہلے سے تھیں اور اب بھی ہیں لیکن حکماء اسلام نے فلسفہ کی ایک خاص شاخ کی ایک اور طریق سے بھی تقسیم کی جس سے عقائد کے مسائل کو حل کیا یعنی "معرفت حق" ہے اور اس کے چار طریقے بتائے ہیں۔ چنانچہ "معرفت حق" کے متعلق اُن کا خیال ہے کہ یہ معرفت یا دلیل و بُرہان سے ہوگی اور یا ریاض و مجاہدات سے بصورت اول یا بقید احکام اسلام ہوگی اور یا بلا قید اسلام ہوگی۔ اگر بقید اسلام ہے تو اس طریق معرفت پر چلنے والوں کو متکلمین کہتے ہیں اور اس طریق کو "علم الکلام" اور اگر بلا قید اسلام ہے تو ایسے عارفین حق کو "مشائین" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اسی طرح سے دوسری صورت کی بھی تقسیم کی ہے جو اس مخصوص مسئلہ میں فلسفہ کا عملی پہلو قرار دیا جاتا ہے۔ چنانچہ ریاض و مجاہدات کی بھی دو ہی صورتیں رکھی ہیں یعنی بقید مذہب اور بلا قید مذہب صورت اول کا تصوف اور "صوفیاء" نام رکھا صورت ثانی کا نام "اشراقیین" رکھا غرضکہ اس تقسیم سے معلوم ہوا کہ "معرفت حق" کے صرف چار ہی طریقے ہو سکتے ہیں۔ طریق متکلمین۔ طریق مشائین۔ طریق صوفیاء۔ اور طریق اشراقیین

معرفتِ حق

میں اس جگہ ان کے مالہ و ماعلیہ سے بحث نہیں کروں گا اور نہ ان کے حسن و قبح پر روشنی ڈالنا میرے مضمون کا مقصد ہے بلکہ میں ان طریقوں کے مشہور علمبرداروں کی مجمل سوانح ناظرین کے سامنے پیش کروں گا اور ان کی بعض تصانیف کے نام بھی بدون تنقید و تبصرہ ہدیۂ ناظرین کرونگا

اگرچہ متکلمین کا مرتبہ تمام حکماء کے مقابلہ میں بعد کا شمار کیا گیا ہے لیکن اپنے مضمون میں میں سب سے پہلے انہیں کی فہرست دونگا اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ چونکہ تقسیم معرفت حق اسی لحاظ سے کی ہے لہذا وہی ترتیب قائم رکھنی ضروری ہے دوسرے یہ کہ باستثناء بعض تمام فنون اور علوم کی علمی جانب پہلے ہوتی ہے اور عملی

جانب بعد میں یا ، اور چونکہ متکلمین علمی جانب میں ہیں اس لئے پہلے ان کو لیا ۔ اب اگر یہ سوال کوئی اٹھائے کہ علمی جانب میں تو دو قسمیں تھیں پہلے متکلمین ہی کو کیوں لیا مشائین کو کیوں نہیں لیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ مجھے "حکمائے اسلام" پر لکھنا ہے جیسا کہ عنوان مضمون سے صاف ظاہر ہے اس لئے پہلے میں نے متکلمین ہی کی فہرست دینی مناسب سمجھی ۔ دوسرے اصولاً ایجابی پہلو سلبی پہلو سے مقدم ہوتا ہے اور متکلمین میں بوجہ قید مذہب اسلام ایجابی پہلو ہے اس لئے متکلمین کی تقدیم و اولیت نہ صرف اولیٰ ہے بلکہ اصلی ہے ۔

ابرار حسین فاروقی

غزل

ان کے بغیر دل کو کیا بیقراریاں ہیں
کس درجہ بیکلی ہے کیا اشکباریاں ہیں

اے درد اٹھ کہ تجھ بن بے ساز ہے یہ نغمہ
جا اے شعور تجھ سے الفت میں خواریاں ہیں

اس آتش نہاں کے شعلے نہ بجھ سکیں گے
بیکار چشم تر کی یہ ابر باریاں ہیں

سرمایۂ حیات جاوید دردِ دل ہے
چارہ گرو ن سے کہدو کیوں غمگساریاں ہیں

عرق جبین قاتل یا اشک شمع محفل
سب حسن منفعل کی تسکیں باریاں ہیں

پردوں میں ہے نظر کے اللہ ری بیحجابی
کسدرجہ سادگی ہے کیا شوخکاریاں ہیں

قاضی بشیرالدین، بی اے

حضرت رضی بدایونی

کے

ایک غیر مطبوعہ واسوخت کے چند بند

شکر ہے قصۂ غم خوابِ فراموش ہوا کم جوانی کا خمارِ مے سرجوش ہوا
بیخودی دور ہوئی آنکھ کھلی ہوش ہوا حرفِ اربابِ نصیحت گہرِ گوش ہوا
خضرِ بخت نے کی راہنمائی میری
ہوگئی دامِ محبت سے رہائی میری

دل خمِ طرۂ گیسوئے دوتا سے نکلا یوسفِ گم شدہ زندانِ بلا سے نکلا
پاؤں پابندئ زنجیرِ وفا سے نکلا کام کیا بندہ کا الطافِ خدا سے نکلا
گو کہ چاہی تھی مقدر نے تباہی میری
راہبر ہوگئی تائیدِ الٰہی میری

اب وہ وحشت نہ رہی سر میں وہ سودا نہ رہا جاں ستاں سوزِ غم حوصلہ فرسا نہ رہا
روز کا محتسب و شیخ سے جھگڑا نہ رہا دامنِ آلودۂ مے جامۂ تقویٰ نہ رہا
آسرا اور بجز الطافِ خداوند نہ تھا
خیر گذری کہ درِ توبہ ابھی بند نہ تھا

اب تو نظارۂ گلشن بھی گراں ہوتا ہے دلِ غمدیدہ کو جوشِ خفقاں ہوتا ہے
گل پہ رخسارِ حسیناں کا گماں ہوتا ہے سرو پر وہمِ قدِ سرو قداں ہوتا ہے
چشمکِ برق ہے غنچوں کا تبسم مجھکو
زلف کا ہوتا ہے سنبل پہ توہم مجھکو

پند و مواعظ کی خبر تھی کس کو   قولِ اربابِ نصیحت پہ نظر تھی کس کو
بیخودی میں خبرِ شام و سحر تھی کس کو   ہوسِ سود کے فکرِ ضرر تھی کس کو

شغلِ جام و مے و شاہد میں بسر ہوتی تھی
شام سے سو کے شبِ عیش سحر ہوتی تھی

ہوش آدابِ شریعت کا کہاں تھا مجکو   عید ہر روزۂ ماہِ رمضاں تھا مجکو
طاقِ مسجد خمِ ابروئے بتاں تھا مجکو   کوچۂ حورو شاں باغِ جناں تھا مجکو

فتنۂ حشر خیالِ قدِ دلجو تھا مجھے
لیلۃ القدر سوادِ شبِ گیسو تھا مجھے

بامِ خورشید رخاں عرشِ معلّیٰ تھا مجھے   سنگِ دہلیز بتاں طورِ تجلّیٰ تھا مجھے
خدمتِ پیرِ مغاں میں بھی تو لاتھا مجھے   دامنِ بنتِ عنب جائے مصلّا تھا مجھے

جام سے دین تھا ایمان مرا پیمانہ تھا
نازشِ بختِ جبیں سجدۂ میخانہ تھا

تھا ہر اک ساغرِ گل ظرفِ وضو میرے لئے   خم سے آبِ طہارت کا سبو میرے لئے
حورِ جنت صنمِ عربدہ جو میرے لئے   رنجِ دوزخ المِ رشکِ عدو میرے لیے

عیشِ فردوس وصالِ بتِ ہرجائی تھا
صدمۂ قبر عذابِ شبِ تنہائی تھا

طوفِ کعبہ درِ خوباں کی زیارت تھی مجھے   آستاں بوسئ میخانہ عبادت تھی مجھے
میکشی مایۂ تحصیل سعادت تھی مجھے   راتدن رشئے کتابی کی تلاوت تھی مجھے

بادۂ و ساغر و مینا تھا وظیفہ میرا
مصحفِ روئے حسیناں تھا صحیفہ میرا

کیا کہوں رنجِ محبت میں نہ کیا کیا دیکھا   آفتیں جھیلیں جفائیں سہیں صدما دیکھا

الغرض جو مری قسمت نے دکھایا دیکھا   جب نہ جز ترکِ محبت کوئی چارہ دیکھا
ربطِ آخر بتِ بے مہر سے توڑا میں نے
بھاری پتھر تھا اُسے چوم کے چھوڑا میں نے

جذبۂ آزاد

نادان۔ نہ ڈر جو کو دپڑا موجوں میں اُلجھ کر مرتا ہے
شلنے سے عیاں ہے ساحل کے بھوڑ رہا ہے وہ سنورتا ہے
کندن کی دمک، شعلے کی لپک، واحد ہے کودک ناداں کو
مرنے سے ڈرتا نہیں دانا، ڈرنے کی شے سے ڈرتا ہے
پروانے کے عالم پر خود شمع کو آتا ہے رونا،
اس احمق لقمۂ آتش کی تقلید بھی کوئی کرتا ہے
اسباب سے کرنا قطع نظر، ہے شانِ جہالت و غفلت کی
اے جاہل و غافل آزادی کے ناحق دم تو بھرتا ہے
افغانی، ترکی، ایرانی، ہم ہندی سب ایک سے ہیں
جب تک قعرِ جہالت سے بیڑا اپنا نہ اُبھرتا ہے
انگریزوں نے دل سے بھلایا عہد جو ہم سے باندھا تھا
اب اپنا جوا اور اپنی گردن، مرتا کیا نہیں کرتا ہے
آزاد نکلنا پستی سے اس جہل کی آساں کام نہیں
یہ بنتے بنتے بنتا ہے تو سنورتے سنورتے سنورتا ہے

آزاد عظیم آبادی

غزل

وحشر میں ترے ناکامِ آرزو آئے — وہاں بھی دل میں لئے تیری جستجو آئے

ل سے گنج و خرابہ ہیں لازم و ملزوم — شکستہ ہو دلِ عاشق تو اس میں تو آئے

س اب تو چھوڑ یہ گلزارِ رنگ و بلبل — چل اس چمن میں جہاں رنگ ہو نہ بو آئے

یہاں تو بے پیئے مستِ الست رہتے ہیں — یہ کیا ضرور کہ ساغر چلے سبو آئے

وہ بحرِ فیض خود آتا ہی اپنے پیاسوں تک — یہ قاعدہ تھا کہ پیاسا کنارِ جو آئے

ادھر یہ ضد کہ ہو پامال اس کی خاکِ لحد — اِدھر یہ شوق کہ دامانِ ناز چھو آئے

ضیاؔ یہ داغ ریا بھی ضرور دھو لینا
جو پیش جامۂ تقویٰ کی شست و شو آئے

ضیا احمد ۔ ایم اے

پرائیویٹ

"پرائیویٹ" تہذیب جدید کی ایک ایسی عجیب وغریب مخلوق ہے جو دنیا کے تمام دارالعلوموں میں کم اور مسلم جامعہ علی گڑھ میں کثرت سے پائی جاتی ہے جس طرح موسم برسات میں مینڈکوں کی لاتعداد کثرت ظہور میں آجاتی ہے اسی طرح اس مخلوق کی پیدائش کا بھی ایک وقت معین ہوتا ہے اور اختتام برسات پر جو حشر اُن مینڈکوں کا ہوتا ہے وہی انجام موسم گذر جانے پر اس مخلوق کا ہوتا ہے

سب سے پہلے لفظ پرائیویٹ کا لغوی۔ ازدواجی اور ادبی پہلو سے جائزہ لینا زیادہ موزوں ہے تاکہ اس کی جامعیت اور ہمہ گیری کا ناظرین پر انکشاف ہوجائے اور فضول شبہات کی فراوانی سے اپنے دماغوں کو لبریز نہ کرلیا جائے۔ "پرائیویٹ" انگریزی زبان کا ایسا ممتاز لفظ ہے جو اپنی حدود سے نکل کر غیر زبانوں میں بھی شہرت لازوال حاصل کرچکا ہے۔ اور غریب اردو نے تو اس خلوص وتپاک سے اس کا خیر مقدم کیا ہے جیسے کوئی ہندوستانی ماں اپنے بیٹے کی دلہن کو آنکھوں میں بٹھانے کی کوشش کیا کرتی ہے۔ یوں تو انگریزی زبان کی جامعیت مسلم ہے اور ہزاروں لفظ ایسے ہیں جو سینکڑوں مختلف مطالب کے حامل ہیں۔ مثلاً ایک لفظ پریوی Privy ہے۔ جو بادشاہ کی مجلسِ خاص یعنی کونسل کے لئے بولا جاتا ہے اور اسی کے معنی اسی زبان میں بیت الخلا کے بھی ہیں لہذا کوئی شعبۂ حیات ایسا نہیں جہاں "پرائیویٹ" کو کافی "رسوخیت" میسر نہ ہو۔ لغوی حیثیت سے اس کے معنی ہیں تنہا۔ ذاتی۔ خاص۔ پوشیدہ وغیرہ اور ان معانی میں کوئی ایسی خاص بات نہیں جو جاذب نظر ہو۔ مگر جب یہ لفظ کسی اسم کے سر چڑھ جاتا ہے تو اس کا مفہوم بالکل مختلف ہوجاتا ہے جو ہرگز لطف سے خالی نہیں ہوتا۔ تمدن میں اس کا دور دورہ ہے۔ ازدواجی تعلقات میں یہ موجود ہے۔ غریب طلبا ء میں اس کی کار فرمائی ہے۔ اگر بنظرِ تدقیق دیکھا جائے تو اس کی کرشمہ سازیاں نہایت تحیر خیز معلوم ہونگی۔ ازدواجی محل استعمال اس کا یوں ہوتا ہے جیسے شرعی بیوی اور پرائیویٹ بیوی۔ مثال کے طور پر ممتاز بیگم سابق مہاراجہ اندور کی

پرائیویٹ بیوی تھی جس کے "پرائیویٹ پن" نے مہاراجہ صاحب کو تخت سے دست برداری پر مجبور کر دیا اور غریب باؤلا کے قتل کا باعث ہوئی۔ اسی طرح تعلیمی نقطۂ نگاہ سے 'مقید طلبا' اور پرائیویٹ طلبا ہوتے ہیں۔ لیکن پرائیویٹ طلبا اور پرائیویٹ بیویوں میں بہت فرق ہوتا ہے۔ گو لفظی مشابہت ضرور ہے لیکن ان ہر دو کے خواص میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ 'پرائیویٹ' کی تمام اقسام جو ابھی بیان کی گئی ہیں انھیں بالتفصیل حوالۂ قلم کرنے میں خوف طوالت مانع ہے البتہ مؤخر الذکر قسم "پرائیویٹ طلبا" خاص طور پر ناقدانہ نظر اور مزید ایضاح کی محتاج ہے

اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ پرائیویٹ طلبا (جن کے لیے فضائے علی گڑھ میں صرف "پرائیویٹ" کہہ دینا کافی ہے) مسلم یونیورسٹی میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ یہ "دوپائے جانور" ہندوستان کے ہر گوشہ سے یہاں پہنچتے ہیں۔ اِن کی حرکات و سکنات عجیب و غریب اور لطف اندوز ہوتی ہیں۔ اِن کے حلئے جاذب نظر اور قابل توجہ ہوتے ہیں۔ ان کی بھی تین اقسام ہیں:۔

(۱) وہ پرائیویٹ جو شروع سے کسی درس گاہ میں مقید نہ کئے گئے ہوں

(۲) وہ پرائیویٹ جو اسکولوں اور کالجوں میں ناکام رہکر پرائیویٹ طور پر قسمت آزمائی کیا کرتے ہیں

(۳) وہ پرائیویٹ جو اعلیٰ حصولِ تعلیم کے لئے مدرسوں میں 'استاد' بنجاتے ہیں

علی گڑھ کے دورِ حیات میں دو ماہ زیادہ ہنگامہ آرا ہوتے ہیں اور اِن ہر سہ اقسام کی بدرجۂ اتم افراط ہوتی ہے۔ وہ زمانہ جبکہ میٹرک سے لیکر بی۔ اے۔ ایم۔ اے، اور ایل۔ ایل۔ بی تک کے سالانہ امتحانات ہوتے ہیں ہندوستان کی ہر یونیورسٹی کے طلبا، میں حزن و ملال۔ امید و بیم۔ پریشانی و تفکر کا سچا نقشہ پیش کرتا ہے مگر بخلاف مسلم یونیورسٹی میں ہمت و مستقل مزاجی۔ فرحت و بشاشت اور امید و کامرانی کی چلتی پھرتی تصویریں نظر آتی ہیں کیونکہ انھیں ایام میں یہاں کے ستم ظریفوں کی مشق ظرافت کے لیئے خاصہ سامان مہیا ہو جاتا ہے۔ اور ادبی ذوق رکھنے والوں کے لئے وہ چہل پہل رہتی ہے جو عوام کے لئے میرٹھ کی نوچندی میں ہوتی ہے یا ہوتی ہوگی۔

پرائیویٹ قسم نمبر ا نادرۂ روزگار میں سے ہے۔ اِن کی شکل و ہیئت۔ لباس و حلیہ حرکات و سکنات ظرافت پسند طبیعتوں کے لیے صرف باعثِ کشش ہی نہیں بلکہ غذائے روحانی ہیں۔ اور بلا تامل ڈارون کے نظریہ کو تسلیم کر لینے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ بعض تو انگریزی ٹوپی (ٹوپ) زیب سر کئے بلاشبہ ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے حال ہی

سے "ٹائمز آف انڈیا" میں ایک گوریلا سوٹ میں ملبوس دکھلایا گیا ہے۔ یہ ہر ہوسٹل میں پہرے باندھے "کند ہم جنس باہم جنس پرواز" ہر کمرہ میں اس طرح جھانکتے پھرتے ہیں گویا کسی "چڑیا گھر" کو رونق بخشنے کے لیے ابھی جنگلوں سے پکڑ کر لائے گئے ہیں۔ یہ "چڑیا گھر" کی چھت دو طرفہ ہے۔ اگر یونیورسٹی کا کوئی اصلی باشندہ بہت ہی مودبانہ طور سے جھک کر سلام علیک کہہ دیتا ہے تو اس کی طرف ایسی غضبناک نظروں سے گھورنے لگتے ہیں گویا وہ اُن کی خوراک ہی بن کر رہ جائیگا۔ اگر کوئی شخص ان سے یہ پوچھے کہ "کیا آپ پرائیویٹ ہیں؟" تو بہت ہی جھنجھلا کر کہتے ہیں "ہم ہیں پرائیویٹ۔ کر لو کیا کرتے ہو" یعنی پورے طور پر اپنی فطرت ——— (بہیمت) پر اتر آتے ہیں

امتحان کے وقت معینہ سے دو گھنٹہ پیشتر یہ "عرصۂ ترکتاز" یا ایگزامینیشن ہال کے آگے صحن میں جمع ہونا شروع ہوتے ہیں جو انٹرمیڈیٹ امتحانات کے لئے یونیورسٹی سرکل میں واقع ہے اور یہیں کا سماں زیادہ لطف انگیز ہوتا ہے۔ اس ہوسٹل کے اصلی مکین جب اجتماعی طور پر "پرائیویٹ" کا فلک بوس نعرہ لگاتے ہیں تو ان گرفتاروں کی حالت واقعی قابلِ رحم ہوتی ہے ان کے نازک دل دہل جاتے ہیں۔ چہروں کا رنگ اُڑ جاتا ہے۔ مایوسی اور پریشانی چاروں طرف سے گھیر لیتی ہے وہ اپنے آپ کو ایک نئی دنیا میں سمجھتے ہیں جہاں دوست و آشنا۔ عزیز و اقارب ان کی مدد کو نہیں پہنچ سکتے بیشک وہ ایک نئی دنیا میں ہوتے ہیں۔ ایسی دنیا کہ جس سے نہ پہلے واسطہ پڑا ہے اور نہ کسی سے اُس کے رسم و رواج کے متعلق سنا ہے۔ لیکن باوجود اس پریشان کن ہنگامہ کے ان کے دلوں میں بحیثیت مقید طالب علم علی گڈھ میں زندگی گذارنے کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کی دلوں میں اس یونیورسٹی کے متعلق ایک عقیدت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ یہاں کے مستقل یا مقید طالب علم ہو کر رہتے ہیں۔ اور دنیا کی تمام درسگاہیں ان کی نظروں میں ہیچ ہو جاتی ہیں۔ اوّل اوّل میٹرک کے امتحان میں صرف دو سو پرائیویٹ آئے تھے اور ہر سال اس تعداد میں حیرت انگیز اضافہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ صرف چار پانچ سال کے عرصہ میں گیارہ سو تک نوبت پہنچ گئی۔ مگر اس تحیر خیز افراط سے نہ معلوم گورنمنٹ کو کیا خوف ہوا کہ میٹرک میں پرائیویٹ کا داخلہ بالجبر بند کر دیا گیا۔ لہٰذا دو سال سے اس چہل پہل میں حسرت ناک کمی واقع ہوگئی ہے آخر گورنمنٹ کا اس میں کیا نقصان تھا غریب طلبا کثیر مالی نقصان سے بچ جاتے تھے اور یہاں کے قیدیوں کے لئے تفریح کا سامان ہو جاتا تھا لیکن...

.... خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ ان "نوواردوں کا" لباس خصوصاً

دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اگر نصف لباس مغربی فیشن کا بگڑا ہوا خاکہ ہوتا ہے تو باقی نصف ہندوستان کی روح تہذیب پر گریہ وزاری کرتا ہے۔ ٹائی اور ہیٹ کا رواج اس کثرت سے نظر آتا ہے کہ خواہ سوٹ ہو یا نہ ہو اپنی ڈھیلی ڈھالی شلوار یا چست پائجامہ یا دھوتی پر بھی رنگین سکے "سین بورڈ" کی طرح ضرور زیب گلو کرلی جاتی ہے۔ بعض تو اس بری طرح فیشن کے دلدادہ نظر آتے ہیں کہ خواہ ٹائی کی گرہ دینی آئے یا نہ آئے وہ اس پیچ در پیچ گانٹھ ہی پر اکتفا کر لیتے ہیں جس سے مویشیوں کو باندھا جاتا ہے۔ اور بہت سے ایسے بھی ہوتے ہیں جو جاپانی اور انگریزی سلک کے دیدہ زیب سوٹ پہنکر اور ہارڈ کالر لگا کر اس پر خوش رنگ اور بیش قیمت ٹائی کے ساتھ باندھتے ہیں اور بصد انداز و رعنائی مسلم یونیورسٹی میں اس طرح رونق افروز ہوتے ہیں کہ گویا مسٹر ڈول سابق پرنسپل ایم۔ اے او کالج کی اولاد ابھی ابھی جہاز سے اتر کر فرانس۔ امریکہ یا انگلینڈ سے ہوا خوری کے بعد تشریف لائی ہے۔ مگر کہیں غلطی سے بحر اسود میں ایک غوطہ لگا بیٹھی جس کی وجہ سے چہرہ و جسم پر قدرے سیاہی آگئی ہے۔ اور اس رنگ و روپ سے 'ہندوستانیت' ٹپکنے لگی ہے۔ شاید اس اکڑفوں، اور چمکیلے کپڑوں سے ان کا مقصد یہاں کے قیدیوں کو مرعوب کرنا ہوتا ہے؟ بدقسمتی سے ایک بھی تو اپنے اصلی لباس —— شروانی وغیرہ میں نظر نہیں آتا۔ ہندوستانی قہوہ خانوں کی اصلاح کے لیئے تو قبلہ ملا رموزی صاحب نے مولانا شوکت علی کو قدم بڑھانے کا مشورہ دیا ہے۔ ہماری ناچیز رائے یہ ہے کہ جناب قبلہ رموزی خود اپنی افسوں شکن "چائے کی پیالی" سے ہمارے پرائیویٹوں، کا نشہ اتارنے کا بار گراں اپنے ذمہ لیں۔ دیکھئے پھر کتنی جلدی ہندوستان "احرارستان" بنجاتا ہے۔

قسم نمبر ۲۔ میں کوئی خاص خصوصیات نہیں ہوتیں۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تعلیمی جیلخانوں کے بیشتر ہی سے سزا یافتہ ہوتے ہیں۔ فرار ہوجانیکی وجہ سے ان کے دماغوں میں صرف آوارگی آجاتی ہے جسے آپ آزاد خیالی کہہ سکتے ہیں۔ اور جو زیادہ نمایاں حیثیت نہیں رکھتی۔ ان کی عموماً یہ کوشش ہوا کرتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو "تعلیمی قیدیوں" میں اس طرح ملادیں کہ ان کی "فراری" کے متعلق کوئی اندازہ ہی نہ لگا سکے۔ اکثر ہشیار طبیعتیں اس میں کامیاب بھی ہو جاتی ہیں۔ تاہم یہ اپنے نام کیساتھ "پرائیویٹ" لگانے سے ایسا گھبراتے ہیں جیسے سائمن گو بیگ سے جب کسی مقید طالب علم کو ان سے گفتگو کا اتفاق ہوتا ہے تو سب سے پہلے ان کی زیادہ سعی یہی ہوتی ہے کہ مخاطب پر کم از کم اسقدر ضرور واضح ہو جائے کہ یہ بھی یہاں کبھی مقید رہ چکے ہیں۔ چنانچہ اپنے زمانہ کے جیلر۔

"Siman go back" سے

کوتوال۔ اور عیش خورونوش کی وہ جھوم جھوم کر تعریفیں کرنے لگتے ہیں کہ ایک مرتبہ تو موجودہ قیدیوں کو اپنی کس مپرسی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ مگر پھر جب ایکدم خیال آتا ہے کہ "ہم" ایک پرائیویٹ جانور سے باتیں کر رہے ہیں تو اپنی بیوقوفی پر ایسا بیساختہ قہقہہ لگا کر خاموش ہو جاتے ہیں کہ یہ حضرت مع اپنی گولڈن فریم عینک کے بغلیں جھانکتے ہی نظر آتے ہیں۔ غرض ان ایام میں ہر قید یا مستقل طالب علم کو اس "آلۂ تفریح" یا پرائیویٹ کی تلاش رہتی ہے۔ اور یہ بیچارے بلا کاوش جستجو بکثرت مل جاتے ہیں

(۳) پرائیویٹ کی تیسری قسم اپنی نوعیت کی ایک ہی ہے۔ یہ لوگ اکثر اسکولوں میں ٹیچر ہوتے ہیں۔ ان کے دماغ کم عمر بچوں اور لڑکوں پر "نادرشاہی" کرنے کے بعد ادبی دلچسپی کے بجائے غرور اور حکومت کی بو سے متکیف ہو جاتے ہیں۔ ان کے ذہنوں میں یہ بات پورے طور سے نقش ہو جاتی ہے کہ دنیا میں اس نوع مخصوص کی مانند نہ کوئی مدبر ہو سکتا ہے نہ سیاست داں، نہ دوربین ہو سکتا ہے نہ معاملہ فہم۔ نہ مقرر ہو سکتا ہے نہ مضمون نگار، اور نہ ادیب ہو سکتا ہے نہ ادب شناس۔ غرضکہ یہ خود کو ہر صیغۂ حیات میں آئڈیل (Ideal) سمجھتے ہیں۔ اور جناب رشید احمد صاحب صدیقی کے "مغالطہ" کی تمام اقسام کے بیک وقت حامل ہوتے ہیں۔ دنیائے علی گڑھ میں جب یہ نزول اجلال فرماتے ہیں اور آکر جامعہ کی عالیشان عمارات کو دیکھتے ہیں تو فرط حیرت سے آنکھیں تو آنکھیں منہ تک کھلا رہ جاتا ہے یہانتک کہ آپ کل تبتیس[23] دانتوں کو جن میں سے ان کے منہ میں سن رسیدہ ہونے کی وجہ سے صرف بیس[24] اور پچیس[25] کے درمیان ہی رہ جاتے ہیں بخوبی شمار کر سکتے ہیں۔

تمام پرائیویٹوں کی نسبت ان کی تعداد کم ہوتی ہے۔ مگر ان کی پہچان بہت آسان ہے اکثر ادھیڑ عمر ہوتے ہیں۔ پرانے قسم کے درزی کے ہاتھ کا سلا ہوا کوٹ زیب تن ہوتا ہے۔ ایک مضبوط زنجیر سے بندھی ہوئی گھڑی واسکٹ یا کوٹ کی اوپر کی جیب میں پڑی ہوتی ہے۔ اور باہر کی طرف اسی زنجیر میں ایک قطب نما آویزاں ہوتا ہے۔ اگر ان سے گفتگو کا اتفاق ہو جائے تو یہ ہر دوسرے تیسرے فقرہ کے بعد زمانۂ وسطیٰ کے ایرانی شعرائے فرسودہ گھسے پٹے اور ٹوٹے پھوٹے اشعار ضرور پڑھیں گے۔ یہاں کے مستقل طلبا، کو یہ ان طلبا سے زیادہ تصور نہیں کرتے جن پر وہ بچہ سقہ والی حکومت کرتے ہوئے آتے ہیں۔ امتحان کا پرچہ ملنے سے آدھ گھنٹہ پہلے یہ ہر پرائیویٹ پر اپنی "مفروضہ" وسیع معلومات کا ناجائز سکہ بٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور انھیں وجوہات کی بنا پر

بہترین سامان طرب ہوتے ہیں۔

یہ شہرت صرف علی گڑھ ہی کو حاصل ہے کہ یہاں کے طلباء اور پرائیویٹوں میں نمایاں فرق ہوتا ہے ورنہ دیگر یونیورسٹیوں میں مستقل طلباء بھی کسی طرح پرائیویٹوں سے کم نہیں ہوتے یہاں کے طلباء علاوہ تہذیب شائستگی اور آداب محفل سے بہرہ ور ہونے کے ظاہری لباس یعنی بند گلے کے کوٹ۔ ترکی ٹوپی۔ اور سفید پاجامے میں ایسے پر شان و شوکت معلوم ہوتے ہیں کہ پرائیویٹ بیچارے 'پرائیویٹ' بنکر ہی رہ جاتے ہیں۔

آخر میں بیباکانہ مگر دوستانہ نصیحت یہ ہے کہ پرائیویٹوں کو اپنے 'پرائیویٹ پن' پر نادم نہیں ہونا چاہئے کیونکہ خدائے تعالے نے ہر شے کسی خاص مصلحت کی بنا پر بنائی ہے۔ بظاہر تو مضمون نگار صاحب کو اس مصلحت کا علم نہیں ہے! (اڈیٹر) اس لئے انہیں اپنے پرائیویٹ ہوجانے پر قناعت کرکے اپنے خالق کا شکر گذار ہونا چاہیئے۔ اور علی گڑھ آنے سے پیشتر اپنے لباس کو ایک قد آدم آئینہ میں ضرور دیکھ لینا چاہئے۔ یا اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو یہاں کا سیدھا سادا لباس اختیار کرلینا چاہیئے۔ فقط

ظہیر۔ شاہ آبادی

نوٹ:۔ اگر کوئی "پرائیویٹ" صاحب یونیورسٹی کے باقاعدہ طالب علموں کے متعلق اپنے خیالات اور جذبات کو قلم بند کریں تو ہم ان کو بھی بخوشی شائع کریں گے۔ بقول ایک قدیم انگریزی شاعر کے:

"کاش کوئی دیوی ہم کو یہ عطیہ بخشتی۔ کہ ہم خود کو اس نظر سے دیکھتے جس سے دوسرے ہم کو دیکھتے ہیں!"

(مدیر)

ترانۂ دل

۱

جب ہی میں بے نقاب ہوتا ہوں
آپ اپنا جواب ہوتا ہوں
دیدۂ ممکنات بیں کے لیئے
رشکِ صد آفتاب ہوتا ہوں

۲

رندِ میخانۂ حیات ہوں میں
رہروِ دشتِ کائنات ہوں میں
بلبلِ بوستانِ ہستی ہوں
طائرِ بامِ ممکنات ہوں میں

۳

عہد ماضی بھی دیکھ حال بھی دیکھ
پھر مری وسعتِ خیال بھی دیکھ
مشقِ عرضِ جمال تھی ابتک
کوئی دن میں مرا جلال بھی دیکھ

۴

میرے جوہر کو ہے نمود عزیز
میرے جلووں کو ہی شہود عزیز
ذات میری وہ ذات ہی جسکو
روز اول سے ہے صعود عزیز

امین حزیں

معارف

نہ ہاتھ پاؤں ہلانا نہ جستجو کرنا — یہ حال ہو تو حماقت ہے آرزو کرنا
تجھے خیال ہے گر اپنے دست و دامن کا — نہ بھول کر بھی تمنائے رنگ و بو کرنا
جنابِ شیخ پڑھیں کس طرح نمازِ حیات؟ — ہے فرض خونِ جگر سے یہاں وضو کرنا
پسندِ خاطرِ فطرت ہے وسعتِ مشرب — تو اپنے قلزمِ دل کو نہ آبجو کرنا
یہی ہے دیدۂ بینا یہی ہے وزنِ ہنر — اس اپنے چاکِ جگر کو نہ تو رفو کرنا
جنوں کی شانِ جلالی ہے دشت پیمائی — اور اسکی شانِ جمالی ہے ہاؤ ہو کرنا

کمالِ ذوقِ سخن ہے یہی جنابِ امین
کسی کے آئینۂ دل کا گفتگو کرنا

امین حزیں

"شباب کا خون"

اُس پر شباب کا عالم تھا۔ جوانی کی موجیں اُس کی ہر رگ و پے میں لہریں لے رہی تھیں۔ اس کی ہر ادا میں ایک بے خودی اور ہر جنبش میں ایک لغزشِ مستانہ مضمر تھی۔ وہ سراپا بہار تھی۔ محض اُس کا تصوّر آنکھوں کے سامنے ایک دل خوش کن منظر پیش کر دینے کو کافی تھا۔ وہ اپنی غیر محدود طاقت سے بے خبر تھی اور اس لیئے لاپروائی اُس کی فطرت کا ایک خاص جزو ہو گئی تھی۔

اِس میں شک نہیں کہ ڈیوڈ بڈھے اور بیرل کی عمر میں بہت زیادہ فرق تھا لیکن پھر بھی چونکہ ڈیوڈ اپنی دولت و ثروت کے لحاظ سے اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا اس لیئے بیرل کے لیئے اُس کے ساتھ شادی ہو جانا اُس کی عین خوش قسمتی خیال کی جاتی تھی۔ شادی ہوتے ہی دونوں ہندوستان چلے آئے اور یہاں ایک ایسے غیر آباد علاقہ میں مقیم ہوئے جہاں مہینوں کسی انسان کی صورت پہ نظر تک نہیں پڑتی تھی۔ ابتدا میں تو بیرل کو یہ زندگی کچھ ایسی ناخوش گوار نہیں معلوم ہوتی تھی کیوں کہ اُس کے بیشتر اوقات سیر و شکار ہی میں صرف ہوا کرتے تھے لیکن رفتہ رفتہ جب اُس نے دیکھا کہ خود ڈیوڈ کو ان چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے تو وہ بہت افسردہ رہنے لگی۔ چوں کہ ڈیوڈ جنگل کے محکمہ میں نوکر تھا اور اپنے سرکاری کاموں سے لئے زیادہ تر باہر ہی رہنا پڑتا تھا اس لیئے اکثر بیرل نے اُس کے ساتھ سفر میں جانے کی خواہش ظاہر کی لیکن ہمیشہ اُس نے یہی کہہ کر ٹال دیا کہ:۔

"نہیں سفر میں تمھیں تکلیف ہو گی"

غرض اِسی طرح پُورے دو سال ختم ہو گئے اس اثنا میں بقول بیرل کے سب ملا کر صرف پانچ آدمی اُس راستے سے گزرے تھے۔

اِس قیدِ تنہائی نے بیرل پر وہی اثر کیا جو ہونا چاہیئے تھا۔ اُس پر ہر وقت ایک تحیری کیفیت طاری

رہنے لگی اور اُسے دنیا کی کسی بات میں کوئی لطف نہ آتا تھا۔ ایک دن اُس نے پریشان ہو کر کہا:۔

"ڈیوڈ، بہتر ہو کہ تم کچھ دنوں کی فرصت لے کر یہاں سے کسی دوسری جگہ چلے چلو۔ وہاں کسی انسان کی صورت پر نظر تو پڑیگی، یہاں کی تنہائی تو اب کاٹے ڈالتی ہے۔"

ڈیوڈ نے، جو اب تک اپنی کتابوں کے مطالعہ میں منہمک تھا، سر اٹھایا اور جواب دیا،

"یہ تنہائی! تمھارے مکان میں اتنے جانور پلے ہوئے ہیں۔ کتابوں کا ایک ذخیرہ موجود ہے، ان سے دل بہلا سکتی ہو۔ یا جی چاہے تو کشتی پر دریا کی سیر کو چلی جایا کرو۔ اِس سے زیادہ میں اور کیا کر سکتا ہوں"؟

"ہاں، یہ تو صحیح ہے لیکن پھر بھی یہ تنہائی کچھ کم تکلیف دہ نہیں، تم تو چلے جاتے ہو اور میں تنہا بیٹھی گھبرایا کرتی ہوں، پیارے ڈیوڈ، مجھے بھی اپنے ساتھ لے جایا کرو۔"

بیرل نے اتنا کہا اور ڈیوڈ کے قریب آکر کھڑی ہو گئی۔

"پیاری بیرل، تم وہ چاہتی ہو جو ناممکنات میں سے ہے۔ سفر میں چلنے سے تمھیں تکلیف ہوگی۔ خواہ مخواہ پریشان ہونے سے کیا فائدہ؟ اچھا خیر دیکھا جائیگا۔ اس وقت میرے کاموں میں مخل نہ ہو۔ میں بہت مشغول ہوں۔ اِن کاغذات کو کل میرے سندر پور جانے کے قبل چلا جانا چاہیئے۔ تم للہ پریشان نہ ہو۔ میرے خیال میں تمھیں کچھ مقویات کی ضرورت ہے۔ میں ابھی فوراً اس کے لیئے لکھے دیتا ہوں۔"

ڈیوڈ اتنا کہہ کر پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا اور بیرل نے یقین کر لیا کہ دنیا میں کبھی بھی اُس کی کوئی خواہش پوری نہ ہو گی۔ بیرل جس وقت کمرے سے باہر نکل رہی تھی اُس وقت متفرق قسم کے خیالات اس کے دماغ میں ہیجان پیدا کر رہے تھے۔

"یہ سب آخر کیونکر ہو گیا؟ میں جس کے سارے اوقات صرف سیر و تفریح اور دوستوں کے ساتھ ہنسی و مذاق میں صرف ہوا کرتے تھے کیونکر ایک ایسے شخص کے ساتھ بیاہ دی گئی؟ یہ اجتماعِ ضدین نہیں تو اور کیا ہے؟ میرا خیال ہے کہ میرے باپ نے اپنی غربت سے تنگ آکر مجھے اس شخص کے حوالہ کر دیا۔ مجھے وہ وقت بھی یاد ہے جب ڈیوڈ نے میرے پاس شادی کا پیغام بھیجا تھا اور وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنی ساری جائداد کا مالک مجھ ہی کو قرار دیگا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ لوگ میرے جہیز کی بیش بہا چیزوں کو دیکھ کر آپس میں میری خوش قسمتی کا ذکر کرتے تھے۔ اگر اس وقت ایرک یہاں ہوتے تو میں انھیں اپنی داستانِ غم سنا کر اپنا دل ہلکا کرتی۔"

ایرک اور بیرل میں اگرچہ کسی قسم کا کوئی رشتہ نہیں تھا لیکن چونکہ دونوں کے مکانات بالکل متصل تھے لہٰذا یہ لوگ بچپن سے ہمیشہ ساتھ رہتے تھے اس لیئے دونوں کے دل ایک دوسرے کی محبت سے متاثر ہو چکے تھے۔ ایرک ایک نہایت ہی حسین اور نیک سیرت جوان تھا اور بیرل سے اُسے ایک خاص اُلفت تھی۔ بیرل نے شادی کے بعد کچھ دنوں تک ایرک سے سلسلۂ خط و کتابت جاری رکھا لیکن رفتہ رفتہ اُس کی زندگی میں ایک عظیم انقلاب ہونے لگا اور بقول اُس کے تھوڑے دنوں کے بعد ایرک کے خطوط کے لیئے اُسے کوئی مضمون ہی نہیں ملتا تھا۔ آخر ایک مدت مدید کے بعد بیرل کو ڈاک سے ایرک کا ایک خط ملا جس میں صرف اتنا لکھا ہوا تھا۔

"مجھے ان دنوں فرصت ہے اور میں بہت جلد تم لوگوں سے ملنے آرہا ہوں"۔

بیرل نے چاہا کہ کچھ دُور آگے جا کر ایرک کا استقبال کرے لیکن چونکہ ڈیوڈ سرکاری کام سے سفر میں گیا ہوا تھا، اِس لیئے اس نے مکان سے باہر جانا خلافِ مصلحت سمجھا اور تنہا مکان میں بیٹھی نہایت بے چینی کے ساتھ ایرک کا انتظار کرنے لگی۔

شام کے وقت جب آفتاب غروب ہو رہا تھا اور شفق کی سُرخی نے سارے عالم کو منور کر رکھا تھا، یکایک ایرک کی صورت دکھائی دی۔ اُس نے بیرل کو پورے تین سال کے بعد دیکھا تھا اور اب اُس کے حسن و جمال میں ایک غیر معمولی اضافہ دیکھ کر نہایت متحیر تھا۔ ایرک کو دیکھتے ہی بیرل کی زبان سے بے ساختہ یہ الفاظ نکل گئے

"آہا، تم آہی گئے۔ مجھے خوف تھا کہ کہیں تم راستہ نہ بھول جاؤ۔ تم کو میرے خط سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ میں خود تمہارے استقبال کو کیوں نہ آسکی۔ بہر کیف، کپڑے اُتارو اور کچھ دیر دم لو۔ تم بہت تھکے ہوئے ہوگے۔ کہو تو چار لاؤں"؟

اُس کے جواب میں ایرک نے مُسکراتے ہوئے کہا:۔

"نہیں، نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہارے اخلاق کا ممنون ہوں، لیکن یہ تو کہو کہ آج تم ایسی افسردہ کیوں معلوم ہو رہی ہو؟ جناب صاحب بہادر کہاں ہیں؟ کیا اب تک واپس نہیں آئے"؟

بیرل:۔ "نہیں، وہ بہت دُور گئے ہوئے ہیں۔ کل گئے ہیں اور نہیں کہہ سکتی کہ کب تک آنا ہوگا۔ تم انشاء اللہ اُن کی غیبت میں گھبراؤ گے نہیں"۔

ایرک:- "یقین، میں تو نہیں گھبراؤں گا لیکن مجھے تمہاری تنہائی کا خیال ہے۔"

بیرل:- "آہ، میں تو اب اس کی عادی ہو گئی ہوں۔ بقول ڈیوڈ کے جنگل عورتوں کے رہنے کی جگہ نہیں ہے۔"

ایرک:- "بے شک میں بھی یہی سمجھتا ہوں۔"

اب آفتاب غروب ہو چکا اور چاندنی اچھی طرح چھٹکی ہوئی تھی۔ ایرک اور بیرل باتوں میں کچھ ایسے مشغول تھے کہ انھیں دنیا و مافیہا کی مطلق خبر نہ تھی۔ یکایک گھنٹے نے آٹھ بجائے جس سے یہ دونوں چونکے اور کھانے کے کمرہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ کھانے کی میز پر دوپہر تک نہایت مزے مزے کی باتیں ہوتی رہیں۔

بیرل نے کہا:-

"کل میں تمھیں شکار میں لے جاؤں گی۔ یقین ہے کہ تم بہت محظوظ ہو گے۔"

ایرک نے جواب دیا:-

"ضرور، ضرور، میرے یہاں آنے کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے۔"

دوسرے دن بیرل کو اس کے شوہر کا ایک خط ملا جس سے معلوم ہوا کہ وہ ابھی آٹھ دس دن تک اور نہیں آسکتا۔ اس مدت میں یہ دونوں دن رات سیر و شکار میں مشغول رہتے تھے۔ بیرل نے، جو زمانہ دراز سے کسی انسان کی صورت دیکھنے کو ترس گئی تھی، اپنے لیئے ایرک کی صحبت کو ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھ لیا تھا۔ ایرک کا خیال تھا کہ بیرل اپنی افسوس ناک حالت کی خود ذمہ دار ہے۔ نہ وہ ڈیوڈ سے شادی کرتی نہ اُسے آج اس قید تنہائی کی مصیبت برداشت کرنی پڑتی۔ لیکن افسوس، اب کیا ہو سکتا تھا۔ کچھ دنوں بعد ڈیوڈ سفر سے واپس آیا۔ بیرل نے اسے دیکھ کر اپنے دل میں کہا "ڈیوڈ بھی کیسے ضعیف معلوم ہوتے ہیں۔" اور یہی خیال ایرک کا بھی تھا۔ جس وقت ڈیوڈ اور بیرل آمنے سامنے کھڑے تھے تو ان لوگوں کے سنوں میں باپ اور بیٹی کا فرق معلوم ہوتا تھا۔ ایرک بیرل کی حالت زار پر دل ہی دل میں بہت افسوس کر رہا تھا۔ اس نے خود بھی دیکھا کہ جب ڈیوڈ مکان پر بھی رہتا تب بھی اپنا کمرہ بند کیئے ہوئے ہمیشہ کام ہی میں مشغول رہتا تھا۔

ڈیوڈ کی واپسی پر بھی ایرک اور بیرل کے معمولات میں کوئی فرق نہ آیا۔ بیرل اب پہلے سے بہت زیادہ

بشاش معلوم ہوتی تھی جس کو دیکھ کر ایک دن ڈیوڈ بے ساختہ کہنے لگا:۔

"دیکھو! میں کہتا نہ تھا کہ جاڑا آتے ہی تم انشاءاللہ بالکل تندرست ہو جاؤ گی"

افسوس ڈیوڈ کو نہیں معلوم تھا کہ کسی کا افسردہ دل موسم کی تبدیلی سے شاداب نہیں ہو سکتا۔ بیرل کو اس کی شادی کے بعد آج پہلی مرتبہ اس کا موقع ملا تھا کہ وہ اپنے کسی ہم سن دوست کے ساتھ سیر و تفریح میں دل بہلا سکے۔ اور یہی اُس کی صحت کا اصلی راز تھا۔ بیرل جیسی خوش مزاج اور زندہ دل لڑکی کی شادی ڈیوڈ جیسے ضعیف الخیال اور بے مذاق بڈھے کے ساتھ ہونے کے معنیٰ یہی تھے کہ وہ گھٹ گھٹ کر ایک دن پیوند خاک ہو جائے۔ ایک زمانہ تھا جب بیرل کو اولاد کی تمنا تھی لیکن اب وہ اس سے پناہ مانگتی تھی

ایک روز ڈیوڈ اپنے کمرہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے نوکروں نے سمجھا کہ وہ باہر گیا ہوا ہے اس خیال سے وہ لوگ نہایت اطمینان کے ساتھ بیرل اور آئیرک کے باہمی تعلقات پر بحث کرنے میں مشغول تھے۔ ڈیوڈ نے اِن لوگوں کی گفتگو سنی اور پہلے اُس کی طرف کوئی خاص توجہ نہ کی لیکن تھا کسی خیال کے آتے ہی وہ اُٹھ بیٹھا اور سوچنے لگا:۔

"کیا یہ ممکن ہے کہ بیرل اور آئیرک کے درمیان عشق و محبت کے تعلقات قایم ہو گئے ہیں؟ نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا اُسے میرے سوا کسی سے اُلفت نہیں ہو سکتی۔ خیر بہر حال میں خیال رکھونگا"

ایک روز ایک ایسا واقعہ ظہور میں آیا جس نے اِن تینوں کی زندگی میں ایک عظیم انقلاب پیدا کر دیا۔ آئیرک اور بیرل دونوں شکار میں گئے ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے سامنے سے ایک گیدڑ کو بھاگتے ہوئے دیکھا اور اُس کا تعاقب کیا۔ یہ لوگ اپنے گھوڑوں پر نہایت تیزی کے ساتھ اُس کا تعاقب کر رہے تھے کہ یکایک بیرل کے گھوڑے نے ٹھوکر لی اور وہ نیچے آ رہی۔ آئیرک فوراً گھوڑے سے اُتر پڑا اور بیرل کو اپنے سامنے زمین پر پڑا ہوا دیکھ کر بے تابانہ اُس کی طرف دوڑا۔

"یا اللہ! کیا وہ مر گئی؟"

اُس کی زبان سے بے ساختہ یہ الفاظ نکلے اور اُس وقت اُس نے پہلی بار سمجھا کہ دُنیا میں بچپن سے لے کر اِس وقت تک اگر اُسے کسی سے محبت رہی ہے تو وہ بیرل ہی کی ذات تھی۔ اُس نے بیرل کو سہارا دے کر

اُٹھایا اور دیر تک ٹکٹکی باندھے اس کی صورت دیکھتا رہا۔ بیرل نے کچھ دیر بعد آنکھیں کھولیں لیکن پھر فوراً ہی بند کرلیں۔ اصل بات یہ تھی کہ گھوڑے کے یکایک ٹھوکر لینے سے سخت دماغی صدمہ پہونچا۔ اس کی طبیعت اب سنبھل رہی تھی لیکن ایرک کے محبت آمیز الفاظ اور اُس کے لبوں کی گرمی نے بیرل کے دل سے ڈیوڈ کا خیال بالکل نکال دیا تھا اور اس وقت اپنے آپ میں وہ ایک خاص سُرور محسوس کر رہی تھی،

"آہا! میں بھی کیسی خوش قسمت ہوں"

اُس نے کہا اور ایرک کے ہاتھوں میں اپنا ہاتھ دے کر پھر آنکھیں بند کرلیں۔ بیرل کی طبیعت اب پوری طرح سنبھل چکی تھی۔ وہ ڈیوڈ کے بازوؤں پہ سہارا دیئے ہوئے ٹہل رہی تھی کہ یکایک اُس کی زبان سے یہ الفاظ نکلے :۔

"ایں ڈیوڈ، تم یہاں کہاں ؟"

ڈیوڈ :۔ "کیوں، گھر تم ہی کھو میں لے بھی تم لوگوں کا کیا پتہ لگایا ہے۔؟ اللہ رے بے وفائی! مجھے اب معلوم ہوا کہ تم لوگوں کی اس سیر و تفریح کا کیا مطلب تھا۔ اب مجھ پر سارا عُقدہ کُھل گیا"

ڈیوڈ غصہ سے بھوت تھا۔ اس کی آواز اب تیز ہوتی جارہی تھی اور بیچارے ایرک اور بیرل دونوں اس کے سامنے کھڑے اس کے بے معنی غصہ کو دیکھ کر متحیر تھے۔ جب ڈیوڈ نے سلسلۂ کلام ختم کیا تو ایرک آگے بڑھا اور بولا۔

"مسٹر ڈیوڈ، قصوروار صرف میں ہی ہوں۔ تمھاری بی بی کا کوئی گناہ نہیں لیکن اگر اس پر بھی تم اُسے موردِ الزام ٹھیراتے ہو تو یاد رہے کہ اس کی پُشت پناہی کے لیئے ایک زبردست ہستی موجود ہے"

ڈیوڈ نے غصہ میں تھرتھراتے ہوئے جواب دیا :۔

"ہاں، ہاں، تمھیں پورا اختیار ہے۔ اسے جہاں جی چاہے لیجاؤ، لیکن میں اسے طلاق ہرگز نہیں دونگا تاکہ وہ اصلی معنوں میں کبھی تمھاری بی بی نہ ہوسکے۔ میں انشاءاللہ اسے اب اپنے مکان میں داخل بھی نہ ہونے دونگا"

اس وقت کا سماں نہایت ہی حسرت ناک تھا۔ ایرک محض اپنی دیوانہ وار محبت کی وجہ سے بیرل کی رسوائی کا باعث ہوا تھا۔ اس کی محبت بالکل بے لوث تھی، اس لیئے کہ اگر بیرل آزاد ہوتی تب بھی وہ اُس سے شادی کرنے سے معذور تھا، اُس کی جو زندگی تھی اُس میں بیرل کے ساتھ اُس کا شادی کرنا قطعی ناممکن تھا۔

ایرک کے دماغ میں اس وقت مختلف خیالات چکر لگا رہے تھے۔

"اگر اسے میں اپنے ساتھ لیجانا چاہوں بھی تو فوج میں اس کا ساتھ رکھنا کیونکر ممکن ہے؟ مجھے سخت ندامت ہے کہ صرف میری ہی وجہ سے بیرل کو اتنی ذلت اٹھانی پڑی۔ بیچاری کا یہاں کوئی دوست بھی نہیں جس کے ہاں وہ کچھ دنوں جا کر ٹھیر سکے، کیا اس کا باپ اسے اپنے ہاں آنے دیگا؟"۔

وہ دیر تک اسی کش مکش میں کھڑا سوچتا رہا کہ اب کیا کرنا چاہیئے لیکن کوئی صورت سمجھ میں نہیں آتی تھی اس کو فکر تھی کہ کسی صورت سے بیرل کو ایک ایسی جگہ پہونچا دیا جائے جہاں وہ کچھ دیر آرام لے سکے۔ اس نے ڈیوڈ سے کہا:۔

"تمھاری بی بی کو سخت چوٹ لگی ہے بہتر ہوتا کہ تم انھیں کسی آرام دہ جگہ پہونچا دیتے"۔

ڈیوڈ نے جواب دیا:۔

"کیا خوب! وہ میرے مکان میں اب محض اپنا اسباب لیجانے کو آسکتی ہے۔ اور کسی بات کی میں اجازت نہیں دے سکتا۔ اور آپ تو اسی وقت تشریف لے جائیے اور مجھے عمر بھر اپنی صورت نہ دکھائیے ورنہ یاد رہے کہ آپ کی خیر نہیں"۔

ایرک کچھ دیر خاموش کھڑا رہا اور اس کے بعد فوراً گھوڑے پر بیٹھا اور بیرل کو ایک حسرت بھری نگاہ سے دیکھتا ہوا بنگلہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں پہونچتے ہی اس نے نوکروں کو اسباب باندھنے کا حکم دیا اور قبل اس کے کہ ڈیوڈ اپنے مکان پر واپس آئے، وہاں سے چلتا ہوا۔ وہ ایک خط بیرل کے لیئے چھوڑ گیا تھا جس میں صرف اتنا لکھا ہوا تھا، "میں اسٹیشن پر اس وقت تک تمھارا انتظار کرونگا جب تک مجھے تمھارے ارادوں سے اطلاع نہ ہو جائے"۔ دوسرے دن دونوں اسٹیشن پہ ملے، بیرل نے اسی وقت مکان جانے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن ایرک نے کہا، "میں تمھارے لیئے سواری وغیرہ کا انتظام کرنے کے لیئے جاتا ہوں۔ بہتر ہے کہ تم ابھی دو تین دن بمبئی کے کسی ہوٹل میں مقیم رہو"۔ بیرل نے روانگی سے قبل بمبئی سے اپنے شوہر کے نام اس مضمون کا ایک خط لکھا:۔

"آپ کو میری جانب سے جو بدگمانی ہے اس کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔ میں نے کبھی بھی ایرک سے اظہارِ محبت نہیں کیا اور جہاں تک مجھے یقین ہے میں نے کبھی آپ کے حکم سے نافرمانی نہیں کی لیکن پھر بھی اگر آپکے

خیال میں مجھ سے کوئی خطا ہوئی ہو تو اُسے للہ معاف کر دیجئے ۔"

بیرل کو اس خط کا کوئی جواب موصول نہیں ہوا، جس کے بعد اس کے دل سے ڈیوڈ کی رہی سہی محبت بھی جاتی رہی ۔

بیرل کو اپنے باپ کے ہاں رہتے ہوئے کئی سال گزر چکے ہیں ۔ ایک روز اس کے نام ہندوستان سے ایک خط پہونچا جس میں صرف اتنا لکھا ہوا تھا :-

" فوراً چلی آؤ ۔ میں مر رہا ہوں ۔ میں نے تمہیں بہت تکلیف دی للہ معاف کر دو ۔"

ڈیوڈ

یہ وہی شخص تھا جس کے ساتھ بیرل نے زمانۂ شباب میں پورے سات سال کی طویل مدت نہایت مصیبت سے بسر کی تھی، لیکن پھر بھی وہ بے رحم نہ تھی، اُس نے خط کو کئی بار پڑھا اور کہا :-

" ہاں، ہاں، مجھے جانا چاہیئے اور فوراً جانا چاہیئے ۔ اُن کی حالت قابلِ رحم ہے ۔ آج وہ اپنے گزشتہ افعال پہ نادم ہیں ۔ اور میں جانتی ہوں کہ یہ ندامت کس لیئے ہے ۔"

تین ہفتوں کے سفر کے بعد بیرل تھکی ماندی اپنے شوہر کے بنگلہ پر پہونچی ۔ وہاں پہونچتے ہی معلوم ہوا کہ ڈیوڈ دو روز قبل اس دنیا سے سفر کر چکا اور آخری وقت تک اُس کی زبان پر بیرل ہی کا نام تھا ۔ بیرل کے لیئے وہ ایک طویل خط چھوڑ گیا تھا جس سے مرتے وقت اُس کے آخری جذبات کا پتہ چلتا تھا :-

" پیاری بیرل، میں نے تمہیں بہت تکلیف دی جس کا مجھے اعتراف ہے، لیکن للہ میرے قصور کو معاف کر دو ۔ میں مر رہا ہوں لیکن تم سے ملنے کی تمنا دل ہی میں لیئے جاتا ہوں ۔ میری دلی خواہش ہے کہ تم میرے بعد ایرک کے ساتھ شادی کر لو ۔ میں خدا کے فضل سے تمہارے لیئے بہت کچھ چھوڑ کر جاتا ہوں ۔ میری ساری جائداد کی جائز وارث تم ہی ہو ۔ بس اب رخصت ۔ خدا تمہیں خوش اور آباد رکھے ۔ آمین ۔"

ڈیوڈ

بیرل اس خط کو پڑھ رہی تھی اور آنسوؤں کا ایک دریا اس کی آنکھوں سے جاری تھا ۔ وہ اب ایک منٹ بھی اس مکان میں رہنا پسند نہیں کرتی تھی ۔ اُس نے اپنے ارادہ سے ایرک کو مطلع کر دینا چاہا اور ایک طویل خط

[illegible] فروع کیا لیکن پھر نہ معلوم کیا دل میں آیا کہ خط کو چاک کردیا اور ایک پرزہ پر صرف اتنا لکھ بھیجا،
"ڈیوڈ نے انتقال کیا۔ میں یہاں مقیم ہوں۔"

اس خط کے پڑھتے ہی ایرک کی آنکھوں کے سامنے گزشتہ واقعات کا ایک نقشہ پھر گیا۔ وہ اس وقت بہت پریشان تھا اور اس کی صورت سے ایک خاص قسم کی وحشت ظاہر ہوتی تھی۔ اس نے فوراً تار سے اپنے آنے کی اطلاع بیرل کو کردی اور دو روز بعد خود بھی آگیا۔ اُسے کوٹھی کے دروازہ ہی پہ معلوم ہوگیا کہ بیرل کی حالت نہایت خراب ہے۔ اُس کو بدقت تمام اُس کمرہ کے اندر جس میں بیرل بستر علالت پر پڑی تھی، جانے کی اجازت ملی۔ بیرل کو ہیضہ ہوگیا تھا اور اب صرف وقت کا انتظار تھا۔ ایرک اس کے قریب آیا جس کی آہٹ پاکر اُس کے پژمردہ چہرہ پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اُس نے نہایت ہی ضعیف آواز میں کہا۔

"آہا، تم آہی گئے؟"

یہ وہی الفاظ تھے جو اُس نے آج سے سات سال پیشتر ایرک سے ملتے وقت کہے تھے۔ وہ اتنا بولی اور معاً طائرِ روح قفسِ تن سے پرواز کرگیا۔

(ترجمہ از کامریڈ)

شرف الدین

وجدانیات

خطاؤں سے پہلے پشیمانیاں ہیں
محبت کی معصوم نادانیاں ہیں

قیامت تری جلوہ سامانیاں ہیں
جدھر دیکھتا ہوں پریشانیاں ہیں

دل و جان حسرت ہیں قربانیاں ہیں
خوشا وہ کہ جن کی یہ مہمانیاں ہیں

مسلسل غمِ دل کی عریانیاں ہیں
نگاہیں نہیں ہیں پریشانیاں ہیں

نہ اب جوشِ پیہم نہ اب جوشِ منزل
فنا کوشیوں کی فراوانیاں ہیں

غضب میں پھنسی ہیں مرا ساتھ دیکر
پریشانیوں کو پریشانیاں ہیں

محبت کے جلوے نہیں حسن سے کم
اُنھیں بھی مرے ساتھ حیرانیاں ہیں

دلوں پر حکومت نگاہوں سے پردے
جہاں بانیاں ہیں ستم رانیاں ہیں

تجسس میں شامل تحیر میں پنہاں
نظر سوزیاں ہیں نگہبانیاں ہیں

سنا کر غمِ درد پچھتا رہا ہوں
پشیمانیوں کی پشیمانیاں ہیں

ازل سے جو دل کے مقدر پڑی تھیں
وہی آج تک شعلہ سامانیاں ہیں

وہ دشواریاں عشق کی حل ہوں کیونکر
جو دشواریاں ہیں نہ آسانیاں ہیں

ترے جلوۂ جزو و کُل کے تصدق
نہ اب حسرتیں ہیں نہ حیرانیاں ہیں

درِ بت کدہ اور سجدوں پہ سجدے
جگر واہ کیا کفر سامانیاں ہیں

جگر مرادآبادی

مجذوب کی بڑ

بس ہو چکی افکارِ دو عالم کی مدارات — اک ساغرِ جاں سوز دے اے پیرِ خرابات
طاری ہے مرے دل پہ سکونِ جنوں انگیز — ہیجانِ غمِ عشق کے پیدا ہیں علامات
حاصل ہو اگر کیفیتِ دردِ محبت — اُٹھ جائیں طلسمِ غمِ ہستی کے حجابات
اے بیخودیئے ذوقِ فنا اور بڑھے جا — منزل کے نظر آتے ہیں دھندلے سے نشانات
شاید ہے یہی حاصلِ بالیدگیٔ روح — اک محویتِ سوزِ نہاں رہتی ہے دن رات
ہو جائے نہ برہم کہیں جمعیتِ خاطر — مت چھیڑ کے سُن مجھ سے غمِ دل کی حکایات

مطلب نہیں ان کو کوئی سمجھے کہ نہ سمجھے
مجذوب کی بڑ ہیں۔ یہ پراگندہ خیالات

عبدالحی صدیقی

ملک التجار محمود گاوان

المخاطب بہ خواجہ جہاں

وزیر سلطنت بہمنیہ

آج ہم ایک ایسے برگزیدہ شخص کے حالات سپرد قلم کرتے ہیں جو اپنی گوناں گوں صفات کے باعث دنیا میں ایک ممتاز شخصیت رکھتا تھا۔ اور جس کا نام نیکی، منصفی، فراخ دلی، رعایا پروری، ہمدردی، دوست نوازی، علم پروری، بہادری، کشورکشائی اور اولوالعزمی کی وجہ سے ہمیشہ مشہور نام رہیگا۔ اس کی ذات انسانی صفات کا ایک بے نظیر مجموعہ اور کمالات دنیوی کا گنجینہ تھی۔ ان ہی خوبیوں کی وجہ سے وہ نہ صرف سرزمین دکن بلکہ ہندوستان میں اپنا آپ نظیر تھا۔ ایسی شخصیتوں کے لوگ صرف انگلیوں پر شمار ہو سکتے ہیں وہ میدان جنگ میں ایک بہادر سپہ سالار، سیاست میں اعلیٰ پایہ کا مدبر، تجارت میں تجربہ کار تاجر، علم میں ایک جید عالم، ظاہر میں امیر الامرا، اور باطن میں فقیر بے نوا تھا۔ اس قسم کی مرنجاں مرنج خوبیاں قدرت نے جس ذات واحد میں جمع کردی تھیں وہ خواجہ جہاں محمود گاواں تھا۔

دنیا سے گزرے ہوئے اگرچہ اس کو صدہا برس گزر چکے ہیں لیکن اُس کا نام آج تک اسی عظمت اور توقیر کے ساتھ لیا جاتا ہے جس کا کہ وہ مستحق تھا۔ اس کے حالات کا مطالعہ حضرت انسان کے لیے ایک درس عبرت ہے اگر ہم ذرا غور سے ان کے حالات کو پڑھیں تو معلوم ہوگا کہ موجودہ زمانہ میں بھی اُن سے راہ ہدایت پا سکتے ہیں

ابتدائی حالات خواجہ کا اصلی نام ملک شاہ محمد تھا اور دنیا میں محمود گاواں کے نام سے مشہور و معروف ہے وہ ۸۰۸ھ ہجری مبارک میں گیلان کے توابع میں سے قادان نامی گاؤں میں پیدا ہوا۔

خاندان اِس کے متعلق کچھ زیادہ حالات تو معلوم نہیں ہوئے مگر یہ مصدقہ امر ہے کہ خواجہ "چنگیز خانی"

کی اولاد میں سے تھا۔ " ملا عبد الکریم ہمدانی" نے جو کتاب اس کے حالات میں تحریر کی ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے آباؤ اجداد شاہانِ گیلان کے وزیروں میں سے تھے اور ان ہی میں سے ایک رشتے کا بادشاہ بھی تھا۔ اس کے باپ کا نام خواجہ محمد تھا اور چچا کا شمس الدین جو شاہانِ گیلان کے یہاں وزیرِ اعظم بھی تھا۔

تعلیم اُس کو زمانہ کی حالت کے مطابق تعلیم اعلیٰ درجہ کی دلائی گئی تھی، فلسفہ، منطق، ہیئت، ریاضی، طب، جراحی تمام علوم میں دست گاہ کامل رکھتا تھا اور نظم و نثر دونوں پر قدرت تھی۔ غرض ایک امیرزادہ کے لائق پوری پوری تعلیم خواجہ کو دی گئی تھی۔

سیاست سے طبعی لگاؤ چونکہ اُن کے والد اور چچا دونوں دربار گیلان کے رُکن تھے اس لیئے خواجہ کو بھی دربار کی درباداریوں، سیاسی چالوں اور ملکی حالات کا مطالعہ کرنے کا پورا پورا موقع حاصل تھا۔ اور چونکہ وہ فطرۃً بہت ذہین اور سمجھدار تھا اس لیئے اکثر اپنے والد اور چچا کو اہم اُمور میں مدد دیتا رہتا تھا اور اس ماحول کا اثر اُس پر یہ ہوا کہ وہ ایک اعلیٰ مدبر اور قابل سپاہی کی حیثیتوں میں جلوہ نما ہوکر دُنیا کے بڑے آدمیوں میں شمار ہونے لگا۔

ترکِ وطن و شغل تجارت جب دربار میں طوائف الملوکی کی پہلی سی بات نہ رہی لوگ دشمنی پر اُتر آئے اور اُن کے خاندان کو نیست و نابود کرنے کے منصوبے باندھے جانے لگے اُس وقت چالیس برس کی عمر میں پختہ کاری و تجربات کی پونجی لے کر خواجہ معہ خاندان والوں کے اپنے ملک سے ہجرت کرنے پر مجبور ہوا۔ اُس نے آبائی وطن کو ہمیشہ کے لیئے خیرباد کہہ دیا اور تجارت کو زادِ راہ بنا کر

"پائے مرا لنگ نیست ملکِ خدا تنگ نیست"

کہتا ہوا ملک ملک پھرنے لگا۔ وطن سے نکلنے پر عراق و خراسان کے اکثر بادشاہوں نے اُس کے علم و فضل سے فائدہ اُٹھانا چاہا اور اُس کو وزارت کے عہدے پیش کیئے مگر اُس نے قبول نہیں کیئے اور قبول بھی کیونکر کرتا قسمت تو کشاں کشاں سرزمینِ دکن کی طرف لارہی تھی جہاں اُس کو اپنی اعلیٰ قابلیت اور شرافت کے جوہر دُنیا کے سامنے پیش کرنے تھے۔ خواجہ کئی سال تک سیر و سیاحت کرتا رہا جس سے

دوران میں اُس نے دُنیا کی بھول بھلیاں کے ہزاروں تماشے دیکھے۔ ہزاروں مصائب برداشت کیے اور اُن کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔

دکن میں آمد

تین چار سال ایران اور عراق میں گزارنے کے بعد بالآخر خواجہ تاجرانہ حالت میں ملک دکن میں وارد ہوا، جہاں اُس کے صدہا ہم وطن اہم خدمات انجام دے رہے تھے۔ جس زمانہ کا ہم حال لکھ رہے ہیں اُس وقت سلطان علاء الدین ابن احمد شاہ ولی سریر آرائے تخت و تاج تھا۔ مسلمانوں کے قدم مضبوطی کے ساتھ ملک دکن میں جم چکے تھے۔ سلطنتِ بہمنیہ اپنے عروج پر تھی۔ اُس کی عظمت، شوکت اور دبدبہ کا چہار دانگ عالم میں شہرہ ہو رہا تھا۔ جس کو سُن سُن کر دنیائے اسلام کے سپوت اپنی قابلیتوں کے جوہر دکھلانے اور نام آوری کے اُمنگ میں جوق جوق چلے آتے تھے۔ خواجہ کو بھی خیال ہوا کہ دکن چل کر قسمت آزمائی کرنی چاہیئے۔ دکن پہونچا تو شاہ محب اللہ جو خواجہ کے ملاقاتی اور بادشاہ کے مقربین خاص میں سے تھا حُسنِ سلوک کے ساتھ پیش آیا۔

دربار میں رسائی

تینتالیس چوالیس برس کی عمر میں خواجہ نے ملکِ دکن میں داخل ہو کر شاہ محب اللہ کی عنایت سے دربار میں رسائی حاصل کی شفقت اور مہربانی نے اُس کے دل کو رجھا لیا۔ چنانچہ اس نے بھی آقا کی مہربانیوں اور نوازشوں اور خاطرداریوں کو دیکھ کر طرح اقامت ڈالنے کا فیصلہ کر لیا، اور اُمورِ مفوضہ کو تن دہی اور کوشش سے انجام دینے لگا۔

"فتوحاتِ مُلکی اور خواجہ کی ترقیاں"

خواجہ کا پہلے پہل تلوار ہاتھ میں لینا

ابھی خواجہ کو دکن میں آئے ہوئے چار چھ سال ہی گزرے تھے کہ جلال خاں حاکم نلگنڈہ نے جو احمد شاہ بہمنی کا داماد بھی تھا۔ علاء الدین کے انتقال کی خبر مشہور کر کے اور سلطان محمود شاہ خلجی والیِ مالوہ کو ساتھ لے کر سلطنتِ بہمنیہ پر حملہ کر دیا۔ علاء الدین نے فوری انتظامات کے ساتھ محمود گاواں کو منصب یکہزاری پر فائز کر کے جوہر شمشیر دکھلانے کے لیئے مقابلہ پر بھیج دیا۔ اُس نے اپنی سپہ گری کے دلاوری اور بہادری کا وہ ثبوت دیا کہ

جلال خاں کو عاجزی کے ساتھ اپنے آپ کو حوالے کر دینے کے سوائے کوئی چارہ نہ رہا۔ محمود گاواں کی اس کامیابی سے بادشاہ کے دل میں اُس کی عزت و وقعت اور زیادہ ہوگئی۔

ہمایوں شاہ کی تخت نشینی اور خواجہ پر عنایاتِ خسروانہ

۸۶۲ھ ہجری میں باپ کے مرنے کے بعد ہمایوں شاہ تخت نشین ہوا۔ اور باپ کی وصیت کے مطابق محمود گاواں کو ملک التجار کا خطاب دے کر وکیل شاہی اور بیجاپور کا صوبے دار بنا دیا اور اسی کے ساتھ ملک شاہ نامی کو جو سلاطین چنگیزیہ کے خاندان سے تھا خواجہ جہاں کا خطاب دے کر تلنگانہ پر مقرر کیا۔

سکندر خاں ابن جلال خاں کی بغاوت

جلال خاں پہلے بغاوت کر چکا تھا۔ اب اُس کے بیٹے سکندر خاں نے بغاوت کر دی۔ اوّل خان جہاں سر لشکر بار بار بھیجے گئے مگر شکست کھائی۔ اب ہمایوں بذاتِ خود گیا۔ اور جنگ کے دوران میں خواجہ جہاں ترک اور محمود گاواں کی کوششوں سے سکندر خاں کو گرفتار کر لیا اور اس طرح یہ خدشہ دُور ہوا۔

ہمایوں شاہ کا انتقال

۸۶۵ھ ہجری میں ہمایوں کا انتقال ہوگیا۔ اُس کو بھی خواجہ پر بڑا بھروسہ تھا ایک مرتبہ جب یہ بیمار رہا۔ تو یہ خواجہ جہاں ترک اور محمود گاواں کو بُلا کر اُن کے فرائضِ منصبی سے اُن کو آگاہ کیا۔ اور وصیتیں کیں۔ خواجہ جہاں کو وکیل شاہی اور محمود گاواں کو وزیر اعظم کر کے شاہزادہ کو اُن کے سپرد کیا۔ اور شہزادہ کو والدہ کی رائے اور مشورہ سے کاروبار سلطنت کرنے کی ہدایت کی۔ ہم کو اس بیان سے صرف اس قدر مقصود تھا کہ محمود گاواں کی بے لوثی، تدبر اور خدمات لوگوں کے دلوں پر سکہ بٹھاتی جا رہی تھیں

نظام شاہ کی تخت نشینی اور ہمسایہ سلطنتوں کا فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرنا

نظام شاہ آٹھ برس کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ اس کی ماں نرگس بی ایک اعلیٰ پایہ کی سیاست داں، عاقلہ اور مملکت و حکومت کے انتظامی اُمور سے بخوبی باخبر تھی اس نیک بی بی کی سرپرستی میں خواجہ جہاں ترک اور محمود گاواں امور سلطنت کو بخیر و خوبی انجام دینے لگے۔

لیکن نظام شاہ کی خرد سالی و کم سنی سے ہمسایہ سلطنتوں کے مُنہ میں پانی بھر آیا۔ اور یورش شروع

کو بھی سب سے چھایاں آڑیسہ کے دماغوں میں آزادی اور فتوحات کی سمائی مگر شکست کھائی۔ پھر محمود شاہ خلجی والی مالوہ بلائے درماں کی طرح ٹوٹا سخت جنگ ہوئی جس میں محمود گاواں اس زور و شور چستی و چالاکی ہوشیاری اور ہمت سے لڑا کہ مہابت خاں حاکم چندیری اور ظہیر الملک بھاگ کھڑے ہوئے اور مارے گئے۔ جبکہ فتح یقینی تھی نظام شاہ فوج سے علیحدہ ہوگیا۔ بادشاہ کو نہ دیکھ کر فوج میں بھاگڑ مچ گئی فتح شکست سے تبدیل ہوگئی۔ اور سلطنت بہمنیہ سے ایک بڑا علاقہ علیحدہ ہوگیا۔ اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ اب اس سلطنت کا چراغ گل ہونے والا ہے۔

لیکن اس عرصہ میں محمود گاواں نے محمود شاہ گجراتی سے مدد کے لیئے درخواست کی اُس نے ایک بڑی فوج دکن کو روانہ کی جس کی مدد سے محمود گاواں سلطان مالوہ کو شکست دینے میں کامیاب ہو سکا اور اس طرح سلطنت بہمنیہ محمود گاواں کی حکمتِ عملی کے باعث قطع و بُرید سے محفوظ رہ سکی۔ اس واقعہ کے تھوڑے ہی دنوں بعد نظام شاہ کو کسی نے قتل کر دیا۔

محمد شاہ کی تخت نشینی اور اہم تبدیلیاں

۸۶۷ھ ۱۴۶۳ء میں نظام شاہ کا دوسرا بھائی محمد شاہ نو برس کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ اِس کے بعد سلطنت میں خواجہ جہاں ترک کا اقتدار بہت بڑھ گیا۔ وہ بڑے دبدبہ اور وقار کا شخص تھا اُس کے اقتدار کو سلطنت کے لیئے مضر خیال کر کے مخدومہ جہاں نرگس بی نے بیٹے کو سمجھایا اور ۸۶۸ھ میں سرِ دربار نظام الملک نے اُس کو قتل کر دیا فرزانگی و عقلمندی کی وجہ سے کوئی فساد بھی نہ ہونے پایا۔ بعد ازاں محمود گاواں کو خطاب خواجہ جہاں دیا گیا اور امیر الامرائی کے ساتھ منصبِ وکالت بھی اُس کو ملا۔

فتح کونکن اور خواجہ پر عنایات

۸۷۴ھ ۱۴۶۹ء میں خواجہ محمود گاواں کونکن پر حملہ آور ہوا۔ تین برس تک لڑائی جاری رہی اس کی فتوحات ہوتی رہیں گوا کا محاصرہ کر لیا گیا اور خواجہ کے ایک سو بیس جہازوں نے تری کی طرف سے حملہ میں مدد دی۔

چونکہ کچھ عرصہ قبل گوا میں مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا تھا اس لیئے اُن کے انتقام میں یہ حملہ ہوا تھا اس فتح کی بڑی خوشی منائی گئی۔

ایک روسی سیاح مسمی (*Altmasius Nikitin*) جو ہندوستان میں سنہ ۱۴۶۸ء
سنہ ۱۴۷۲ء تک سیر و سیاحت کرتا رہا ہے رقمطراز ہے کہ :-

"ملک التجار نے دو قصبوں کو فتح کر لیا ہے جن کے جہاز سمندر میں چلا کرتے تھے۔ اور سات شہزادوں کو بھی معہ خزانہ گرفتار کر لیا ہے۔ ان شہروں کا محاصرہ (غالباً ان میں سے ایک گوا بھی ہوگا جو سنہ ۱۴۶۹ء میں فتح ہوا ہے) دو لاکھ فوج، سو ہاتھی، تین سو اونٹوں سے دو برس تک کیا گیا۔"

جب ملک التجار تین سال کے بعد واپس بیدر آیا تو محمد شاہ نے اُس کی بڑی تعظیم و تکریم کی۔ ایک دفعہ اُس کے گھر جا کر رہا۔ مخدومہ جہاں نے اُس کو اپنا دینی بھائی بنایا۔ اس کے غلام خوش قدم کو کشور خاں کا خطاب ملا۔ اور قلعہ گوا، گونڈوال اور کولاپور اُس کو جاگیر میں ملے۔ سعید خاں گیلانی اور زین الدین علی کو جو محمود گاواں کے رشتہ دار تھے اور دیگر اُمرائے مغل کو بڑی بڑی جاگیریں عنایت ہوئیں۔

سنہ ۱۴۷۲ء میں رائے بلگاون نے بیجانگر والوں کی شہ پا کر گوا پر حملہ کر دیا۔ محمد شاہ خود سر لشکر ہو کر گیا۔ محمود گاواں نے بڑی حکمتوں کے ساتھ قلعہ کو فتح کیا۔

روسی سیاح اس کے متعلق لکھتا ہے :-

"بادشاہ گلبرگہ معہ ملک التجار لشکر سے کر روانہ ہوا لیکن اس لڑائی میں زیادہ کامیابی نہیں ہوئی ہزاروں آدمیوں اور مال و اسباب کا نقصان ہوا تب کہیں جا کر صرف قلعہ بلگاؤں فتح ہوا۔"

اس فتح سے واپسی پر سنہ ۱۴۷۲ء میں مخدومہ جہاں نرگس بی کا انتقال ہو گیا۔ یہ بہت ہوشیار، عقلمند تھی اور ملکی معاملات کو خوب سمجھتی تھی۔ یہ اسی کا اثر تھا کہ محمود گاواں سلطنت کا حقیقی بہی خواہ بن گیا۔

کھیلی پٹن وغیرہ کی فتح اور محمود گاواں کا انتہائی عروج

سواحلِ مشرقی پر کرناٹک اور تلنگانہ کے درمیان ہندوؤں کی ایک بڑی سلطنت تھی۔ جو اکثر سلطنتِ بہمنیہ پر چھاپے مارا کرتی تھی۔ جب اُس کی گستاخیاں حد سے گزر گئیں تو محمد شاہ بنفس نفیس اُس کی گوشمالی کو چلا اور شکستیں دے کر اُس کو اپنا باجگذار بنا لیا۔ راستہ میں ایک قلعہ کی مرمت کے واسطے محمود گاواں کو حکم دیا جس نے دو برس کی قلیل مدت میں اُس کو بالکل مکمل کر دیا۔ بادشاہ

قلعہ کی مضبوطی و آراستگی کو دیکھ کر مارے خوشی کے پھولا نہ سمایا۔ اُس نے اپنے خاص کپڑے اُتار کر محمود گاواں کو دیئے اور اُس کے خود پہن لیئے۔ محمود گاواں کو وہ عروج حاصل ہوا کہ اس سلطنت میں کسی اور کو نصیب نہیں ہوا۔ اس کامگاری و علو مرتبت سے اُس کے دشمن اور زیادہ ہوگئے اور اُس کی تخریب کی ترکیبیں ہونے لگیں

"خواجہ کی اصلاحات ملکی"

جب ہر طرف سے اُس کو اطمینانِ کلی ہوگیا اور اطراف کے دشمنوں کو زیر کرچکا تو اُس نے اپنی توجہ اصلاحات ملکی کی طرف کی نظم و نسق سلطنت آئے دن کی لڑائیوں کی وجہ سے ابتر حالت میں تھا۔ ملک کو جس کا رقبہ بہت بڑھ گیا تھا بجائے چار صوبوں کے آٹھ صوبوں میں تقسیم کیا گیا۔ عدالتوں کی اصلاح کی گئی مال گزاری کا جس پر ملک کی بہبودی کا دار و مدار رہتا ہے۔ بخوبی انتظام کیا گیا۔ پولیس کی تنظیم کرکے اُن کے چوکی پہرے ٹھیک کیئے گئے۔ ملک میں علم کی عام اشاعت کے لیئے مدارس قائم کیئے گئے۔ علماء کی عزت و توقیر کی گئی۔ تعمیرات عامہ میں دلچسپی لی گئی۔ اِن تمام اصلاحات کی وجہ سے ملک کو آرام و چین ملا اور خوشحالی کا دَور دورہ ہوگیا۔

ملک حسن نظام الملک کی خواجہ سے دشمنی

دکن کا ملک کچھ اس قدر بد قسمت واقع ہوا ہے کہ اُس کو ملکی لڑائیوں، ریشہ دوانیوں، باہمی رقابت، اور درباری چالوں نے ہمیشہ طوائف الملوکی میں رکھا ہے! اور نہیں معلوم وہ کیسا منحوس دن تھا جب اِس طوائف الملوکی کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ کہ آج تک دکن میں ملکی، غیر ملکی، دکھنی، ہندوستانی اور برہمن اور غیر برہمن کے چرچے گھر گھر ہیں جو ایک دوسرے کی عزت کو بٹا لگاتے، حسد و کینہ رکھتے، تباہی و بربادی میں ڈالتے، مصائب میں مبتلا کرتے اور بے حرمتی، بے وقعتی کے درپے رہتے ہیں یہی دکن، یہی اُس کی آب و ہوا، یہی زمین اور اِسی طرح کے لوگ اُس وقت بھی اس سرزمین پر بستے تھے۔ تو کس طرح ممکن تھا کہ وہ ایک دوسرے کی بیخ کنی نہ کرتے۔ اُس زمانہ میں ہندوستانی، دکھنی کا چرچا تو نہیں تھا مگر حبشی، ترک، ایرانی، اجنبی، اور ملکی ضرور دست بہ گریباں تھے ملک التجار محمود گاواں، نسل کے لحاظ سے ترک اور وطن کی مناسبت سے ایرانی تھا۔ اس لیئے وہ

بھی اجنبی لوگوں کی دست گیری کرتا رہتا تھا۔ اور اصل بات بھی یہ ہے کہ ترک اور ایرانی اپنے علم و فضل اور فنون سپہ گری کے لحاظ سے ملکیوں سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھے۔ درحقیقت یہ ترک اور ایرانی ہی تھے جنہوں نے اپنے زورِ قلم اور قوتِ بازو سے سلطنتِ بہمنیہ کو وہ عروج دیا جس کے آثار و علامات دکن کی سرزمین میں ہنوز زندہ اور تاریخ کے اوراق پر بقلمِ جلی کندہ ہیں

اس مخاصمت کی ابتدا یوں ہوئی کہ جب یوسف عادل خاں کھرلہ کی فتح کے بعد دارالسلطنت میں واپس آیا تو محمود گاواں نے اُس کو شاہی دربار میں ملک حسن نظام الملک سے ممتاز تر مقام پر کھڑا کیا۔ ملک حسن نظام الملک کو یہ بات ناگوار گزری اور در پئے آزار ہو گیا۔ جب محمود گاواں نے اصلاحات کا نفاذ کیا تو نظام الملک[1] اور اُس کے بیٹے ملک احمد کو جاگیریں عطا کرکے الگ الگ صوبہ داری پر بھیجا تو نظام الملک نے حیلے بہانے کرکے دربار میں رہنے کی اجازت حاصل کر لی اور بیٹے کو صوبہ داری پر بھیج دیا۔ اس واقعہ سے ملک حسن نظام الملک اور خواجہ محمود گاواں میں زیادہ کشیدگی ہو گئی جس نے ترقی پاکر خواجہ جیسے محبِ وطن کو شہید کرا دیا۔ اور محمد شاہ کے دامنِ شہرت کو ہمیشہ کے لیے خون آلود کر دیا

خواجہ کے خلاف ریشہ دوانیاں اور اُس کی شہادت

اس وقت سلطنت بہمنیہ اپنے پورے عروج پر تھی۔ ہمسایہ سلطنتیں اِس کی تلوار کا لوہا مان چکی تھیں۔ ملکی انتظام بہتر حالت میں تھا۔ چاروں طرف عیش و کامرانی کا دَور دَورہ تھا۔ یہ سب کچھ ملک التجار کی بے لوث کوشش و محنت کا نتیجہ تھا۔ مگر بُرا ہو حسد و کینہ پروری کا کہ جس قدر خواجہ محمود گاواں کا اعتبار بادشاہ کے دل میں بڑھتا جاتا تھا اُسی قدر حاسدوں کے دلوں پر سانپ لوٹتے تھے۔ خواجہ نے تو یہ کیا کہ اصلاحات کرکے اعداء کے زور گھٹا دیئے اور شاہی حکومت کے اثر و اقتدار کو صوبہ داروں پر مستحکم کر دیا

۱؎ ملک حسن نظام الملک احمد نگر کے نظام شاہی سلطنت کا مورثِ اعلیٰ تھا یہ دراصل برہمن تھا۔ سلطان احمد شاہ کے وقت بیجانگر کے حملے میں گرفتار ہوا، اس کا اصلی نام تیما بھٹ اور باپ کا بھیرو تھا۔ سلطان احمد شاہ کے غلاموں میں حسن کے نام سے داخل ہوا۔ شہزادہ محمد کے ساتھ تعلیم و تربیت حاصل کی۔ محمد شاہ بچپن میں اس کو حسن ابن بھیرو کی بجائے بتغیرِ لہجہ حسن بحری کہنے لگا۔ جو بعد کو مشہور نام ہو گیا۔ محمد شاہ نے توش بیگی پر مقرر کیا جس سے ترقی کرتے کرتے منصب ہزاری اور نقارہ و ماہی مراتب بھی حاصل کیا اس کا نکاح شاہی حرم سرا کی ایک اصیل سے ہوا تھا

لیکن انعام یہ ملا کہ نا عاقبت اندیش لوگ اُس کے دشمن ہو گئے۔ خواجہ اور یوسف عادل خاں میں باپ بیٹے کے سے تعلقات تھے۔ یوسف عادل خاں خواجہ کی ہر طرح سے خبر گیری کرتا تھا۔ اُس کی موجودگی میں کسی کو چوں وچرا کی ہمت نہ ہوئی مگر اسی اثنا میں وہ ایک مہم پر چلا گیا۔ دشمنوں کو موقع ملا۔ میدان خالی دیکھ کر ظریف الملک دکھنی اور مفتاح حبشی وغیرہ غلاموں نے باہم صلاح کر کے خواجہ کے ایک غلام کو جس کے پاس مُہر رہا کرتی تھی گانٹھ لیا اور اسے ایک روز شراب کی حالت میں ایک سفید کاغذ پر خواجہ کی مُہر[1] کرالی۔ آستین کے سانپ ملک حسن نظام الملک کی صلاح سے خواجہ کی طرف سے راجۂ اڑیسہ کے نام ایک جعلی خط لکھا گیا۔ اور اُس کو محمد شاہ کے سامنے پیش کر دیا اور بادشاہ کے خوب کان بھرے۔ وہ شراب کے نشے میں مخمور تھا بغیر سوچے سمجھے خواجہ کو بُلا بھیجا۔ اُس کے دل میں کسی طرح کا خدشہ نہ تھا وہ حاضری دربار کی تیاریاں کرنے لگا کچھ لوگوں نے سمجھایا بھی کہ اس وقت جانا خلافِ مصلحت ہے۔ مگر قضا سر پر کھڑی تھی وقت کیسے ٹلتا

اُس کو اپنی امانت، دیانت داری، سچائی اور ملکی خدمات پر کامل بھروسہ تھا۔ خیال میں بھی نہ آیا کہ بادشاہ اُس کو کچھ نقصان پہونچائیگا، اور یہ شعر پڑھا ؎

چوں شہیدِ عشق در دُنیا و عقبےٰ سُرخ رو ست
خوش دمے باشد کہ ما را کشتہ زیں میداں برند

اور کہنے لگا کہ "یہ داڑھی جو ہمایوں بادشاہ کی خدمت میں سفید ہو گئی ہے اگر اُس کے بیٹے کے ہاتھ سے رنگین ہو جائے تو سرخروئی کا باعث ہے۔" ؎

دیکھو صفیر نامِ وفا پر نہ حرف آئے
ایسا نہ ہو کہ کوئی کہے نا صَبُور تھا

لوگوں نے بہت سمجھایا اور گجرات چلنے کے لیئے زور دیا مگر وہ وفا کا پُتلا تھا کس طرح نمک حرامی کرتا۔ اُس کے رگ و پے میں خونِ شرافت دوڑ رہا تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ جگ ہنسائی کا موقع دیتا اُس نے اپنے متوسلین کو جو جواب دیا وہ صفحۂ تاریخ پر آبِ زر سے تحریر کرنے کے قابل ہے :کہ

---

[1] اس مُہر پر "عاقبت محمود باد" کندہ تھا۔

"میں نے مدت ہائے دراز تک یہاں آرام و چین سے زندگی گزاری ہے عرصے اس سلطنت کا نمک خوار ہوں۔ کبھی کوئی خطا مجھ سے سرزد نہیں ہوئی۔ اب اگر دشمنوں نے مجھ پر کوئی تہمت لگائی ہے تو کیا بادشاہ بغیر دریافت کیئے سزا دے دیگا۔ اگر بالفرض ایسا ہو بھی تو بادشاہ کے حکم سے مارا جانا نمک حرامی سے بہتر ہے"

یہ دل ہلا دینے والے الفاظ تھے جنھوں نے سب کو چپ کر دیا اور لوگ خونی منظر کے منتظر رہے خواجہ شاہ کے حضور میں بلا عذر حاضر ہو گیا۔ کچھ پوچھ گچھ نہیں ہوئی۔ بلکہ یکایک بادشاہ نے سوال کیا:۔

"اگر کوئی شخص اپنے آقا کے ساتھ بلاوجہ نمک حرامی و بے وفائی کرے اور یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے تو اُس کی کیا سزا ہے"

خواجہ نے جواب میں کہا:۔ کہ

"اُس کی سزا سوائے شمشیر آب دار کے اور کچھ نہیں"

اُس وقت بادشاہ نے وہ خط اُس کو دکھایا۔ جس کو دیکھ کر خواجہ نے عرض کیا:۔ کہ

"یہ مہر تو میری ہے مگر خط میرا نہیں ہے"

بادشاہ نے کچھ جواب نہ دیا۔ شراب کے نشے میں کچھ خیال نہ کر کے خواجہ کی تمام خدمتوں پر جو اُس سلطنت کی بہتری اور بہبودی کے لیئے عمل میں آئیں پانی پھیر دیا۔ اور آنے والے خطرات سے ہراساں نہ ہو کر قتل کا حکم دیدیا اور خود محلسرائے شاہی میں چلا گیا۔ قتل کی تیاری ہونے لگی چاروں طرف یاس و حسرت کا عالم تھا لوگوں میں چرچے ہونے لگے کہ آج سلطنت کا ایسا شیر مارا جا رہا ہے جس نے اپنی اکہتر برس کی عمر میں سے پینتیس برس سلطنت کی خیر خواہی میں گزارے ہیں اور اپنی انتھک کوششوں سے سلطنتِ بہمنیہ کو ایسے عروج پر پہونچا دیا ہے۔ سب سے زیادہ افسوس کے قابل یہ امر ہے کہ جس محمد شاہ نے اُس کے قتل کا حکم دیا وہ خود اُس کی گودوں کا کھلایا ہوا تھا۔ اور جن لوگوں نے سازش کی وہ تھے جن کو خواجہ نے زمین سے اٹھا کر آسمان وقار پر پہنچا دیا تھا۔

آخر وہ وقت آن پہونچا جب خواجہ کو سفر آخرت کرنا ضرور تھا۔ صفر کی ۵ تاریخ ۸۸۶ھ ہجری تھی

تن بتقدیر ہو کر قبلہ رو بیٹھ گیا کلمۂ طیبہ پڑھتا جاتا تھا۔ شہیدِ وفا کی گردن جبینِ نیاز ہو کر جھکی۔ بیداد گر حبشی کی تلوار بجلی اور برق وش رشتۂ حیات کو کاٹ گئی۔ مگر کیا ہوا خون کے ایک ایک چھینٹے نے گل ریزی کر کے بقائے دوام کا تاج بنا کر اُس کے زیبِ سر کیا اور دُنیا سے خراجِ تحسین و آفریں وصول کیا۔ کسی نے تاریخ لکھی ہو ہے

سالِ فوتش گر کسے پُرسد بگو
بے گنہ محمود گاواں شد شہید

خواجہ کے اخلاق و عادات

اگرچہ محمود ایک اعلیٰ درجہ کا امیر اور بڑے پایہ کا شخص تھا مگر ہمیشہ سادہ زندگی بسر کرتا، اور بوریئے پر سوتا تھا اور ایسا مخیر تھا کہ جو کچھ پاتا سب فقرا و مساکین اور اہل اللہ میں تقسیم کر دیتا تھا۔ تجارت سے جو کچھ ملتا اُس کے نفع میں سے بہت حقیر رقم اپنے روز مرہ کے خرچ کے لیئے رکھ لیتا اور باقی اپنے ہم وطنوں دوستوں، رشتہ داروں اور گوشہ نشینوں کو دیدیتا تھا راتوں کو فقیرانہ لباس میں گلی کوچوں میں پھرتا اور غریبوں کی روپیہ پیسہ سے مدد کرتا۔ اور کہتا کہ بادشاہ نے دیا ہے اُس کے دوامِ دولت کی دعا مانگو۔ اُس کے کثرت سے ساتھ شاگرد تھے۔ علماء فضلا ہر وقت اُس کے یہاں جمع رہا کرتے تھے۔ تکلف مزاج میں بالکل نہیں تھا۔ ظاہر میں گو بڑے پایہ کا امیر اور سلطنت بہمنیہ کا وزیر تھا مگر خلق و مروت اور پرہیز گاری میں ایک خدا رسیدہ فقیر تھا۔ خواجہ کا کتب خانہ تین ہزار کتابوں پر مشتمل تھا جس کو طلبا کے مطالعے کے لیئے وقف کر دیا تھا

خواجہ کی تصنیفات میں ایک دیوان اور انشا میں ایک کتاب "روضۃ الانشا" ہے۔

مولانا جامیؔ سے بھی خواجہ کے تعلقات دوستانہ تھے دونوں میں خط و کتابت بھی رہتی تھی۔ جامی اُس کی انشا کے معترف تھے جو اُس کی قابلیت کی ایک بڑی دلیل کہی جا سکتی ہے۔ انھوں نے اپنے قصائد میں ایک قصیدہ اُس کے نام بھی لکھا ہے

خاتمہ

ہر حال دُنیا میں جو آیا ہے اُس کو جانا ضرور ہے بعض لوگ گم نامی کے ساتھ دُنیا میں آ کر چلے جاتے ہیں اور بعض بقائے دوام کی سند لے کر جاتے ہیں وہ مر جاتے ہیں مگر اُن کے کارنامے، اُن کی کارگزاریاں اُن کی مفید خلق کام لوگوں کے وِردِ زبان رہ جاتے ہیں اور یہی وہ

لوگ ہوتے ہیں جن کے کارنامے آنے والی نسلوں کے لیئے شمعِ ہدایت کا کام دیتے ہیں۔ اُن ہی برگزیدہ ہستیوں میں سے ایک محمود گاواں کی ہستی تھی جس نے قربان گاہِ وفا پر جان جیسی عزیز چیز کو بھینٹ چڑھا دیا۔ اگر وہ چاہتا اور ذرا سا اشارہ کردیتا تو ملک میں وہ آگ لگ جاتی جس کا بجھانا محال ہو جاتا۔ مگر خواجہ نے ایسی ذلیل حرکت نہیں کی۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ خونِ شہیداں رنگ لائے بغیر نہیں رہا اور چند ہی دنوں میں سلطنتِ بہمنیہ کے اوراق پریشان ہو گئے، بندھا ہوا شیرازہ بکھر گیا ایک کی پانچ پانچ سلطنتیں قایم ہوگئیں۔ اور وہ شاہی اقتدار و دبدبہ سب خاک میں مل گیا

امداد احمد خاں بیری

غزل

اُمید کے بھڑکے ہوئے شعلوں کو بجھانے
دل آ گیا کھنچ کر مرا اشکوں کے بہانے

لے ہم بھی دعا کرتے ہیں اب اے دلِ ناکام
اللہ لگائے تری ہستی کو ٹھکانے

سب ہو گئے کیوں فوت کہ ہیں کچھ ابھی باقی
جو جو کہ مجھے زیست کے صدمے تھے اٹھانے

منزل کو سمجھتے ہوئے منزل یہ نہ پہونچا
پلٹا دیا مجکو ترے نقشِ کفِ پا نے

کی میں نے نہ کچھ دل کے تڑپنے کی ذرا قدر
پردہ مری آنکھوں پہ وہ ڈالا تھا خدا نے

افسوس کہ کچھ نقش تھے سو وہ بھی تھے دھندلے
اُلٹا مری تصویر کے جس رُخ کو وفا نے

مجبورِ محض آج ہی ہر فعل کا مختار
قربانِ کرم اے تری بخشش کے بہانے

مختار بدایونی

ہلالِ عید

یہ فی البدیہ نظم اب کی عید الفطر کے موقع پر محسن الملک ہال عید ڈنر میں پڑھی گئی تھی۔ چونکہ بہت پسند کی گئی اس لیے ہدیۂ ناظرین ہے۔ (اڈیٹر)

ہر سو زمرّدیں اک دریائے اخضری ہے
یہ چاند ہے کہ جیسے کشتی ہلال سی ہے
دیدار ماہِ نو ہے یا جامِ جسم نمایاں
مستی میں یا کسی نے مینا اچھال دی ہے
یا مشتری کے لب پر ہے موجۂ تبسّم
یا حور آسماں پر انگڑائی لے رہی ہے
یا خلد سے چلا ہے عیش و طرب کا قاصد
دُنیا تمام جس کو ارماں سے دیکھتی ہے
پیغامِ عید سے کچھ ہم ہی نہیں ہیں بے خود
فرطِ طرب سے فطرت بھی رقص کر رہی ہے

نغمہ سرا ہے دُنیا گونجی ہوئی فضا ہے
دل کو ثمرِ طرب سے سرشار ہو رہا ہے

ہے روزِ عید دل کو غرقِ شراب کر دے
بدمست اس قدر ہو عالم خراب کر دے
کیف و نشاط کا اک دریا ہو اور اس پر
اس جامِ زندگی کو شکلِ حباب کر دے
طوفانِ مے میں مسلم کی بے حسی ڈبو دے
دُنیا میں آج پیدا اک انقلاب کر دے
مسلم کا دل عروجِ مستی سے آشنا کر
پستی کا بھی زمانہ پھر اک خواب کر دے
کعبہ میں جو کھنچی تھی میرِ عرب نے پی تھی
وہ مے پلا کے سب کو مستِ شباب کر دے

تجدیدِ زندگی کر دیدارِ ماہِ نو سے
عالم تمام روشن کر اپنے دل کی ضو سے

سعاد

"گڑیا کا گھر"

مطبوعات مجالس اردو میں انٹرمیڈیٹ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے سلسلہ میں ابھی حال میں ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس کا نام "گڑیا کا گھر" ہے۔ یہ کتاب ہنرک ابسن کے ایک معرکۃ الآرا ڈراما "ڈالس ہاؤس" کا مشرقی چربہ ہے۔ جو عبدالشکور صاحب ایم اے کے رشحات قلم کا رہین منت ہے۔ مترجم موصوف نے ابسن کے اس ڈرامہ کو اردو میں منتقل کرکے ملک اور زبان پر بڑا احسان کیا ہے۔

اس سے پیشتر کہ ہم اصل ترجمے کی طرف رجوع کریں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مصنف، کتاب کے متعلق کچھ بیان کردیں تاکہ قارئین کرام کو مصنف کی دیگر تصانیف کے سمجھنے ۔ ان میں دلچسپی لینے اور اس کے خیالات احساسات و نظریہ کو جاننے کے لئے کافی مواد موجود ہوجائے اور بالخصوص اردو داں طبقہ کے لئے یہ امر ناگزیر ہے۔

مقدمہ کتاب میں جو پروفیسر شبیر احمد صاحب ہاشمی ایم اے ایڈ کی تراوش قلم کا نتیجہ ہے ابسن کی زندگی اور مفہوم کتاب سے مجمل طور پر بحث کی گئی ہے۔ اب ہم وضاحت کے ساتھ اس کی زندگی۔ تصانیف اور اس مختص کتاب کا تذکرہ کریں گے

ابتدائی حالات مغربی دنیا کا یہ مشہور انقلابی شاعر جس نے اپنی تصانیف سے یورپ کے فرسودہ قدیم خیالات و معتقدات میں تہلکہ مچادیا۔ ۲۰ مارچ ۱۸۲۸ء کو ملک ناروے کے ایک چھوٹے سے قصبۂ اسکین میں پیدا ہوا۔ جہاں لوگوں کی خاص دلچسپی کا مرکز لکڑی کی تجارت تھی۔ اس کا باپ ہنرک ابسن جو خود مالدار تھا بڑا سخی و فیاض طبع شخص تھا۔ اس کا گھر مہمانوں سے بھرا رہتا اور اس کو ضیافت و مدارات سے فرصت نہ ملتی تھی گویا اس کا گھر معاشرتی و اخلاقی زندگی کا ایک مستقر تھا۔ جہاں پر لوگ اطراف و جوانب سے آکر جمع ہوتے اور اپنے خیالات کا اظہار کیا کرتے تھے۔ ان واقعات اور حالات نے بچے کے دماغ پر بہت بڑا اثر کیا۔

لیکن چند سال کے بعد ابسن کے باپ کی مالی حالت خراب ہوگئی اور خاندان کو محض معمولی جھونپڑیوں پر قناعت

کرنی پڑی۔ اور اس طرح ابسن کو غربت سے سابقہ پڑا۔ یہ رفیق طفلی مدت تک ساتھ دیتی رہی۔ اور اس کے دماغی نقطہ پر معاشیات بھی زرے جن کا پتہ بعد کی تصانیف میں ملتا ہے۔ رنج۔ افسردگی اور تلخی کی جو جھلک اس کے ڈراما میں نظر آتی ہے وہ اسی کا سبب ہے۔ ان ایام طفولیت میں اس کی کششوں کا مرکز ایک بالاخانہ تھا جس سے وہ محبت کرتا تھا۔ تمام دن وہاں تنہا بیٹھا مطالعۂ کتب میں مشغول رہتا تھا۔ ہیری سن کی کتاب "تاریخ شہر لندن" خاص طور سے قابل ذکر ہے جس کی تصویروں نے ابسن کا رجحان طبع مصوری کی طرف مائل کر دیا۔ اس کے کمرہ میں سامان مصوری۔ چند کتابیں اور ایک پرانے طرز کی ہفت روزہ گھڑی تھی۔ جن کا تذکرہ ہم کو جنگلی بطؔ میں ملتا ہے

بچپن ہی میں اس کا شوق مصوری ظاہر ہو چکا تھا اور جب وہ پندرہ برس کی عمر میں ابتدائی تعلیم سے فارغ ہوا اس نے مصوری کو اپنا مستقل پیشہ بنانے کا ارادہ کر لیا۔ لیکن اس کی قدیم محسنہ غربت سامنے آئی اور اس کو پانچ سال تک ایک عطارہ کی دوکان پر ملازم رہنا پڑا۔ اس امیدواری کے بعد اس کے علمی و ادبی شرارے ظاہر ہونے لگے اور اس کی روح ۱۸۴۸ء کے عالمگیر انقلاب یورپ سے بےچین نظر آنے لگی۔ اس اضطراری کیفیت کا ظہور نظم میں ہوا اب اس کی زندگی وطن میں دوبھر معلوم ہونے لگی جہاں اس کی ولولہ اور اُمنگ کے لئے کوئی موزوں جولاں گاہ نہ تھی ۱۸۵۰ء میں وہ کرسٹیانا گیا اور اخباری دنیا کی خدمت کرکے اپنا پیٹ پالنے لگا۔ وہ اپنے ہمراہ تین ایکٹ کی ٹریجدی کیٹی لینا بھی لایا تھا۔ جو ۱۸۵۰ء میں شایع ہوئی لیکن مقبول نہ ہو سکی۔ اب وہ دوستوں کی مدد سے برگن تھیٹر میں شاعر مقرر ہو گیا اور پانچ سال تک اس خدمت پر مامور رہا۔ اس کے دو ایک ڈراما بھی دکھلائے گئے اس کے بعد وہ ناروی تھیٹر کا جو نیا جاری کیا گیا تھا منتظم خصوصی بن گیا۔ لیکن وہاں اُسے سوائے ادبی و اصلاحی فائدوں کے کچھ حاصل نہ ہوا۔ بدقسمتی و نحوست اس کے ساتھ ساتھ جاتی تھی۔ تھیٹر کا دیوالہ نکل گیا اور اُسے پھر مصوری شروع کرنا پڑی مجبوراً پرانے تھیٹر میں ملازمت کی۔ اس کی تمام کوششیں گورنمنٹ کی طرف سے پنشن مقرر ہو جانے کے بارے میں ناکام رہیں۔ کیوں کہ اس نے حکومت کے موجودہ دستور العمل پر آزادانہ تبصرہ کیا تھا

وہ آزاد منش تھا۔ دنیا کی ظاہری رسومات و قیود سے اس کو سخت نفرت تھی۔ ناروے کا سرد ملک اس کو رہنے سہنے کے لئے پسند نہ آیا۔ ۱۸۶۴ء میں اس نے ہجرت کی اور پچیس برس تک جرمنی و اٹلی کے خوشنما و پُرفضا مناظر کی بدولت اپنی روح کو مالا مال کرتا رہا۔ اپنے چہار سالہ قیام اٹلی میں اس نے برانڈ اور پیر جنٹ دو معرکۃ الآرا

منظوم ڈرامے شائع کئے جن کی طباعت نے ادبی حلقوں میں ایک ہل چل مچا دی اور ابسن کے نام کی شہرت دور دور ہونے لگی چنانچہ ناروے کی گورنمنٹ نے اس کی ادبی خدمات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کی پنشن کی آرزو بھی پوری کر دی۔ اب فارغ البالی کا زمانہ آیا۔ ۱۸۷۷ء سے اس نے نثر میں ڈرامے لکھنے شروع کئے اور یہی وہ تصانیف ہیں جو اس کی عالمگیر شہرت کا موجب بنیں۔ سب سے آخری ڈراما ۱۸۹۹ء میں طبع ہوا جب کہ اس کی عمر بہتر برس کی ہو چکی تھی۔

۱۸۹۱ء میں ابسن اپنے وطن میں اور کرسٹیانا میں مقیم ہوا۔ اب وہ یورپ کی شہرۂ آفاق ہستیوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ اور وہ قوم جو اس کو برادری سے خارج کر چکی تھی اب سرنگوں تھی۔ ۱۸۹۸ء میں اس کی سترھویں سالگرہ کے موقع پر بہت زور کے ساتھ جشن منایا گیا۔ اور اگلے سال تھیٹر والے میدان میں اس کی یادگار ایک مجسمہ کی شکل میں قائم کی گئی۔ اور جب ۱۹۰۶ء میں ایک طویل بیماری کے بعد اس نے اس جہان سے کوچ کیا اس کے جنازے کے ہمراہ ایک جم غفیر تھا اور چھوٹے بڑے۔ ادنیٰ و اعلیٰ اس کے ساتھ تھے

ابسن کا زمانہ یورپی ادب کی تاریخ میں بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ انیسویں صدی جس میں وہ پیدا ہوا کھیلا۔ کودا۔ بڑا ہوا اور پھر بڈھا ہوا یعنی جسمانی مدارج کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کی روحانی و دماغی ارتقاء کی نشو و نما ہوئی۔ اسی صدی کے اثرات کا نتیجہ ہے۔ یہ وہ مشہور زمانہ ہے جب انگلستان میں ورڈز ورتھ اور کولرج پرانے فرسودہ خیالات کو جھٹلا چکے تھے اور اپنی تصانیف سے ایک انقلاب عظیم برپا کر رہے تھے۔ ہر طرف رومانیت ہی رومانیت کا چرچا تھا۔ جس کو شیلی اور کیٹس نے معراج ترقی تک پہنچا دیا۔ یورپ کے دیگر ممالک میں یہ تبدیلی ذیدروٹ۔ گوئٹے۔ ہائنے وصٹیں۔ ٹالسٹائی اور ابسن کے رشحات قلم کی ممنونِ احسان ہے۔ چنانچہ ابسن کو پورے طور پر سمجھنے کے لئے یہ لازمی ہو جاتا ہے کہ پہلے ان بزرگ ادبا کے کلام کو بھی پڑھا جائے

اس نئی روح نے جو اس صدی میں کام کر رہی تھی۔ نہ صرف ادب پر اثر ڈالا بلکہ تمام علم و سائنس میں حیرت انگیز گلکاریاں شروع کر دیں۔ مختلف الاقسام خیالات و متنوع تصورات صفحہ کی کار فرمائی ہوئی۔ اور جب ڈارون کی دماغی کاوشیں لوگوں کے سامنے آئیں تو دنیا میں تہلکہ پڑ گیا۔ اور حیاتی و جذباتی برقی جنبش کے باعث مذہب کا میلان انسان اور اس کے کارناموں کی طرف ہو گیا۔ انسانی دماغی کمزوریاں، خوفناک افسانے اور بے سروپا داستانیں جو مدتہائے دراز سے انسانوں کو گمراہ کئے ہوئے تھیں۔ کالعدم ہوئے۔ اس نئی روح کے تحت میں ہماری روزمرہ زندگی کے

بہترین افکار، خوشنما تحسین جذبات زندگی کے واقعات و حقائق۔ تجربات کے نتائج اور اطمینان و راحت کی خوشنما نفیس قالبوں میں ظاہر کئے گئے اور یہ خیالات و افکار ہم کو دنیا کی اس بھولی بھالی شکل کو یاد دلاتے ہیں جو زمانۂ قدیم میں شاعروں فلاسفروں اور سنجیدہ دماغ لوگوں کے دل و دماغ پر مرتسم تھیں۔ اس نئی روح نے زندگی کی رگوں میں ایک خاص قسم کا ارتعاش پیدا کر دیا۔ شاعروں اور فیلسوفوں کا یہ تمام گروہ فطرت کی چھان بین اور اس کے ہر مظہر کی ماہیت دریافت کرنے میں ہمہ تن مستغرق ہو گیا۔ اور جب ہم ان کے کارناموں کو پڑھتے ہیں۔ تو ہماری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں۔ اور ہم مبہوت ہو جاتے ہیں۔

یہ اسی پُرکیف و نغمہ زار روحانی طاقت کا اثر تھا کہ ابسن کی نظمیں ایک خاص طرز کی حامل ہیں۔ اُس کا قول ہے کہ "نظم لکھنا حشر بپا کرنا۔ سر پر قیامت ڈھاتا ہے"۔ اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی نظمیں کس قدر کاوش و سخت محنت اور جانفشانی سے لکھا کرتا تھا۔ اور ؎

برائے پاکیٔ لفظے شبے بروز آرد ٭ کہ مرغ و ماہی باشند خفتہ او بیدار

کا مصداق ہے۔ ایک دوسرے موقعہ پر اُس نے کہا ہے کہ "جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ اُس حالت کا پرتو ہے جس سے میں خود گزر چکا ہوں"۔ اور "ہر ایک عمدہ نظم آزادی و پاکیزگی نفس کے لئے ایک مقدس لائحۂ عمل پیش کرتی ہے"۔ اس لحاظ سے وہ شیکسپیر بالزک اور کانگریو کی مانند ایک خاص جذبۂ انسانیت کی تشریح کرتا ہے اور اُس کا موضوع سخن آزادی و تکمیل نفس ہے۔ اُس نے بالفاظ دیگر تعصب و جہالت کے خلاف جہاد کیا۔ "شاعر کا اصلی مقصد مشاہدہ کرنا اور مطالعہ کرنا ہے نہ کہ غور و فکر" اور "ہر ایک چیز جو میں نے بحیثیت شاعر کے پیدا کی ہے اُس کی بنیاد کسی نہ کسی تخیل یا شعبۂ حیات پر ہے"۔

وہ ایک بڑا شاعر تھا اور اُس کی شاعری کو سمجھنے کے لئے اُس کی اصل کتابوں کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ تراجم سے کام نہیں چل سکتا۔ کیونکہ کوئی ترجمہ ایسا نہیں ہے جو اُس کے کلام کی اصلی خوبی کو مجروح نہ کر دیتا ہو ابسن کے تخئیل کی مثال بمقابلہ دیگر شعراء کے بعینہ ایسی ہے کہ وہ نظم لکھتے وقت گلاب کے پودے لگاتا ہے اور دوسرے گلاب کے صفات ہی بیان کرتے رہ جاتے ہیں۔ اُس کی تمام نظموں میں یہ فرق ہمیشہ نظر آتا ہے مثال کے طور پر چند مضمون پیش نظر ہیں

عمق میں ہی امن و سکون - ابدی سکون ہے

ملے میرے گمن ! اسپہ نے راستہ پیدا کرا اور پوشیدہ راز کے جگر میں داخل ہو جا

میں ایک روز ستاروں بھرے آسمان کے نیچے ایک خوش بچہ کی مانند بیٹھا تھا - بہار کی ستیاں جوش پر تھیں، اور فضا نے دلفریب میرے پاؤں کو مس کرتی تھی

شباب کا پیارا سکون میری روح میں مقیم تھا

لیکن وہ روح پر درد دن رات کی خوفناک تاریکی میں گم ہو گیا۔

اور میں نے پہاڑی کی قدرتی راگنیوں کو کان کے اذاروں کی گھڑ گھڑ میں گم کر دیا

جب میں یہاں پہلے پہل آیا - میں نے کہا (پاگل بچے) پہیلی بوجھ گئی ؛

عمق کی روح میرے لئے زندگی کے راز ہائے عظیم کا خزانہ تھی "

افسوس کہ روح نے بھی تو مجھے اُن چیزوں کی بابتہ نہیں بتلایا - جو پریشانی میں ڈالدیتیں اور سخت مضرت رساں تھیں

افسوس ! اس زندان خاک سے روشنی کی ایک کرن بھی تو اوپر کو نہیں جاتی

تو کیا پھر میں ناکام رہا ؟ کیا میرا مسلک مجھے کبھی بھی صاف و روشن دن کی فضا میں نہ لیجائے گا ؟

تاہم بالائے آسمان کی روشنی ہنوز میری آنکھوں کو خیرہ اور چکا چوند کر رہی ہے "

نہیں ابھی اور نیچے جا - مجھے رکنا نہیں چاہیئے - وہاں ہی ابدی سکون ہے میں اپنی زندگی کے آخری لمحے تک ترقی کے لئے برابر ہاتھ پیر چلاتا رہوں گا

صبح کی ایک کرن بھی مجھے متعجب نہیں کرتی اور نہ اُمید کی کرن پیدا ہوتی ہے "

اُس پُرانے گھر میں وہ دونوں رہتے تھے ۔

خزاں کے طویل ایام اور دسمبر کی خوفناک تاریکیوں میں وہ گھر جل گیا - اور راکھ ہو گیا ۔

دونوں اُس راکھ میں ادھر اُدھر بے قرار تھے ۔

کیونکہ انگاروں میں ایک بیش قیمت ہیرا پڑا ہوا جس کو آگ کبھی ضائع نہیں کر سکتی

اگر اُن میں سے ہر ایک ایمانداری سے تلاش کرے تو شبہ نہیں ہو سکتا کہ میاں بی بی میں سے کوئی اُس کو

[illegible]۔

[illegible] وہ اُس کو پا لیتے ہیں۔ اگر وہ میلا ہو جاتا۔ وہ قیمتی جوہر جس کو آگ کبھی برباد نہیں کر سکتی۔
تاہم وہ اُس نسوانی وفاداری کو جو خاک ہو چکی ہے ہرگز نہیں پا سکتے۔ اور نہ مرد اپنی چلی ہوئی مسرت کو پا سکتا
ہے وغیرہ وغیرہ۔ ہجو۔ افسانے۔ غزل اور اُن میں تصوف کا رنگ کیا پیارا معلوم ہوتا ہے۔ غرض جو خیالات نظم
میں ظاہر کئے گئے ہیں وہی سب کے سب نثر میں بھی موجود ہیں اس لئے نظموں کے دیکھنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں رہتی۔
برانڈ میں مذہب۔ فقہ دینیات۔ خدا اور اُس کی عبادت سے بحث کی گئی ہے۔ پیر جنٹ بالکل ہیملٹ کے
رتبہ کی ہے۔ یہ فن کمال کا ایک نمونہ ہے اور اعلیٰ تخیل انسانی کا مخزن

(۱) "میرے عقیدہ۔ میری اُمید اور میری محبت کی جان تو ہی ہے"

(۲) "محبت کی خواہش روحانی زندگی کی ایک چمک ہے"

ڈراما نویسی ۔ اِن نظموں کی تکمیل کے بعد اِبسن نے ڈراما نویسی کو اپنا مستقل پیشہ بنا لیا۔ فنون لطیفہ میں وہ افسانہ نویسی کو سب سے بڑا فن سمجھتا تھا اور اِس فن کے ظاہر کرنے میں اُس نے اپنے تمام قوائے عقلیہ کو صرف کر دیا ہے۔ اُس کے ڈرامے پرانے قالب میں رونما نہ ہوئے۔ بلکہ ایک عجیب و حیرت انگیز صورت میں لوگوں کے سامنے آئے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اُس کے وطن اور تمام یورپ میں اُن کی وجہ سے تنقید و تبصرہ کا بازار گرم ہو گیا۔ وہ موجودہ اخلاقی تاریخ یورپ کو ناولوں اور افسانوں کا حل بتلاتا ہے۔ پرانے ڈراما میں دلی مسرت کا اظہار یا طفلانہ خوشیوں کا تذکرہ ہوتا تھا اور اُن کا اعادہ بار بار متنوع اقسام سے دنیا کی شاندار نظاروں میں کیا گیا ہے۔ لیکن تنظیم معاشرہ اور انفرادی تکمیل نفس کو کلیتہً فراموش کر دیا گیا تھا۔ یہی وہ جذبہ ہے جو ابسن کے ہر ڈراما میں پورے زور کے ساتھ حشر بپا کر رہا ہے۔ اُس کا خاص موضوع سخن اِس صنعت میں عورت۔ مسئلۂ ازدواج۔ تجربات زندگی۔ تعلیم۔ آزادی و تکمیل ذات نظام عمرانی کی بہبودی و برتری ہے تعلیم کا انحصار نظام معاشرۃ پر ہے اور نظام معاشرۃ کی بقا تعلیم کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ وغیرہ وغیرہ بہت ضروری مسائل ہیں۔

ان تمام مسائل کا حل طلب کرنا اُس کا مقصود ہے۔ وہ مختلف اقسام کی شکلیں ہمارے سامنے پیش کرتا ہے اور اُن کے جواب کا ہم ہی سے طالب ہے۔ وہ سوال دریافت کرنے کا بہت شائق ہے۔ لیکن جواب دینا اُس کے فرائض

ظاہر ہے۔ اِن مسائل کی وضاحت و تشریح کرتے وقت وہ مذہب کو فراموش نہیں کرتا بلکہ اُس کا عقیدہ ہے کہ مذہب سے انسان کو اطمینان و آرام نصیب ہوتا ہے۔ البتہ وہ ظاہری رسومات و باطل عقائد کی سخت ہجو کرتا ہے۔ اُس کا مذہب "ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم" ہے۔ اُس نے اپنے ذخیرۂ معلومات۔ اپنی پختہ کاری فن و علم کو انسانی زندگی و تصورات کی بہتری کے لئے وقف کر دیا ہے۔ "موجودہ معاشرت کو تباہ کر دینا ایک اُلٹے مینارہ کو سیدھا کر دینا ہے" اُس کا مقولہ ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کس قدر اپنی سوسائٹی سے تلملا و کبیدہ رہتا تھا۔ اُس کی تمام معتبر تصانیف ایک بڑی مجبور و مجروح روح کی داستان عبرت زا ہیں جو معاشرتی اثرات کے باعث جو آپس میں تباہی پر آمادہ ہیں دب گئی ہیں اور اِس زہرہ گداز نقصان کی تفسیر لفظوں میں ادا کی گئی ہے۔ یہی سبب ہے کہ موجودہ مصنفین کی صف میں وہ سب سے زیادہ انقلاب پسند متصور کیا گیا ہے۔

بہ حیثیت ایک ماہر فن و صاف متفکر آدمی کے ابسن کی ذات میں اُس کے قوی کی نشو و نما کامل طور پر ہوئی ہے۔ اُس کی تصانیف بقول اُس کے "شب زندہ" ہیں لیکن غلطی سے اُس کو خشک مزاج تارک الدنیا اور قنوطیت پسند سمجھ لیا گیا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اُس کو تمام عمر بچّے۔ پھول اور گانے سے نفرت رہی۔ اور اُسے گھریلو زندگی کے عیش و آرام و برکات کا قطعی تجربہ و خیال نہ تھا۔ لیکن تاہم وہ دنیا کے بہترین ڈرامانویسوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اُس کو عمیق خیالات کے اظہار و ادائیگی میں کمال ہے۔ روح انسانی سے زیادہ مقبول شے دنیا میں بظاہر قدرت پر دلالت کرنے والی کوئی دوسری نہیں ہے۔ لہٰذا اس کے راز کو سمجھنے میں اس کو کمال انہماک و دلچسپی ہے۔ اُس کی تصانیف اِن روحانی تجربات کی مستقل تفاسیر ہیں۔ اور رسمیات و تکلفات لایعنی اور ناجائز خواہش ظاہری کے خلاف بغاوت کا اعلان ہیں۔ جن کو روزمرہ کی زندگی کے واقعات میں سادہ و قدرتی طور پر ظاہر کیا گیا ہے۔ بعض بعض مواقع پر ناروے کی تاریک و سرد راتوں کے ذکر سے ایک خاص قسم کا تشنج انسانی دماغ پر ہو جاتا ہے۔ لیکن زیادہ تر اس کے کلام میں طوفان خیزیوں کا فوٹو کھینچا گیا ہے۔ جس میں زور ہے۔ جوش ہے۔ خیالات۔ تصورات و محاکات جن کی تکمیل خاموشی و تنہائی کی ممنون احسان ہے۔ ذہنیت انسانی پر آہستہ آہستہ قبضہ جما لیتے ہیں لیکن یہ قبضہ لازمی و یقینی ہے اور یہی بظاہر نفرت انگیز۔ سنگ ریزے قابلِ قدر جواہر پارے بن جاتے ہیں۔

[illegible] اور تھیٹر میں سب سے بڑی شخصیت گنا جاتا ہے۔ وہ اسٹیج کی تمام حالتوں اور صورتوں کو [illegible] [illegible] سے کام لیتا ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ اس کے ڈراما نوجوانوں کے لئے واضح ویسا [illegible] نہیں ہیں اس کے تماشوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ جذبات کو اُبھارنے یا حسیات کو تیز کرنے کے لئے کوئی بیہودہ نکتہ پیش نہیں کرتا بلکہ اصل بحث ہی سے نہایت مدلل و موثر پیرایے میں ناظرین تماشہ کے ہر فرد پر تجربات زندگی کو ظاہر کر دیتا ہے۔ اختتام تماشہ ہم خود ہی سمجھتے ہیں۔ اور تھیٹر محض ایک بہانہ اور ذریعہ ہے۔ اور یہ اس کے اعلیٰ کمال کا ایک کرشمہ ہے کہ وہ ڈراما کی زندگی میں انسانی زندگی کا صحیح نظارہ پیش کرتا ہے۔ اور ہو بہو فوٹو کھینچ دیتا ہے۔ وہ اپنے ناظرین کو ڈراما کا ایک ضروری جزو بنا دیتا ہے۔ ہم اُن میں موجود ہوتے ہیں اور اُن کو دیکھتے ہیں۔ وہ قدیم اصول اتحادِ زمان و مکان وغیرہ کو قائم رکھتا ہے۔ اور نہایت شد و مد کے ساتھ استعمال کرتا ہے۔ وہ اپنے افراد ڈراما کے ذریعہ اپنی گزشتہ زندگی کو حیرت انگیز پیرائے میں ظاہر کرتا ہے۔ اور یہی وہ صفت ہے جو اُس کو تھیٹر کا بادشاہ بنا دیتی ہے

"گڑیا کا گھر" میں یہ بات موجود ہے اور اُس کے مابعد کے دیگر تماشوں میں بھی یہ عنصر شامل ہے۔ اُس کی تصانیف میں کلاسک، رومانی اور جدید تینوں رنگ بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ "گڑیا کا گھر" ہمہ تن قدامت سے پُر ہے۔ اُس کی کتابوں میں وہ جادو۔ وہ محویت وجدانیت جو ایک اعلیٰ ترین پایہ کے مصنف و ماہر فن کے اکتساب علم و فن کی دلیل ہوتی ہے کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ وہ آزاد جذبۂ روحانیت کو بیدار کرتا ہے جس سے ہم زندگی کی ماہیت کو سمجھنے لگتے ہیں۔ وہ انسانیت کے مفہوم و مقاصد کو بوضاحت سمجھاتا ہے

سب سے بڑا اعتراض اُس پر یہ ہے کہ اس نے کائناتِ عالم میں عورت کو مرد پر ترجیح دی یہ بدقسمتی ہے کہ اس کے یہاں تقریباً ہمیشہ صفائی و صداقت۔ محبت و اخوت۔ قربانی و ایثار۔ صلح و آشتی استدلال اور جوش و قوت تمام صفاتِ حسنہ عورتوں کے حصے میں آئی ہیں۔ اور مرد بزدلی۔ بیوقوفی۔ بدمعاشی۔ حرص و خودغرضی کے پتلے بنا دیئے گئے ہیں اس تمیز کے بھی خاص وجوہ تھے۔ کہ ایک صنف کو جسارت عزتِ نفس اور فراخ دلی کی تمام صفات عطا کر دی گئیں اور تعجب تو یہ ہے کہ کسی لحاظ سے بھی اُس میں نسوانیت نہیں پائی جاتی۔

اُس نے کبھی انہماک سے کسی نسوانی تحریک کی تائید نہیں کی۔ بلکہ اُسے غصہ آتا ہے اور تعجب ہوتا ہے کہ "گڑیا کا گھر" کی تصنیف کے بعد لوگ اُس کو نسوانی شاعر کہنے لگے۔ لیکن یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اُس کا یہ مقصد ہرگز نہ تھا

کہ وہ ایک صنف کی توصیف کرے اور دوسری کی تذلیل - بلکہ یہ سب محض اتفاقیہ ہوا - یہ ابسن کی ہنگی انفرادیت ہے - کیونکہ وہ ہمیشہ حکومت کے خلاف انفرادی حقوق کی حمایت کرتا رہا ہے - معمولی آدمیوں کے لئے یہ مسئلہ نہیں ہے - وہ ہمیشہ نظامی اداروں کو انسانی آزادی و ترقی کے منافی سمجھتا تھا " پولس کے سپاہی اور میونسپل کونسل - غریب تجارت پیشہ وسیاست داں طبقہ کے راستہ میں حائل ہوتے ہیں " لہٰذا اس کی مانند بغاوت کی حامل شخصیتیں غریب مزدور یا کوئی مجرم ہی ہوسکتی تھیں - غریب طبقہ کی بابت اُس کو زیادہ علم نہ تھا اور عوام اُس کے افراد تماشبینی کے اہل نہ تھے - پس کائناتِ انسانی میں اُس کی نگاہ یکایک عورت پر پڑی کیونکہ وہ عمومیت کو ناپسند کرتی ہے وہ منطقی - ذکی الحس اور قادر الذہن ہوتی ہے اور کسی مباحثہ میں گم نہیں ہوجاتی وفاشعار رشتۂ ازدواج کے تقدس کے لئے کھڑی ہوتی ہے ماں کے فرائض - غیبت اور بُری باتوں کی پردہ پوشی کو وہ محض رسمی معیار اخلاق سمجھتی ہے - وہ صرف اتنا جانتی ہے کہ وہ کسی ایسی زندگی کو گوارا نہیں کرسکتی جو عصمت فروشانہ زندگی کے مشابہ ہو - اُس کے تمام تماشوں میں یہ جزو مشترک موجود ہے - کہ عورت ذاتی و انفرادی قدر و قیمت اشیاء کو پسند کرتی ہے - اور اُس معاشرتی و تمدنی خاک سے جو مرد ہر وقت اُس کی آنکھوں میں ڈالتے رہتے ہیں وہ اندھا ہونا نہیں چاہتی

اِس کا یہ منشا ہرگز نہیں کہ اِبسن نراج کا حامی تھا - اور وہ کسی موقع و محل کے لئے قوانین کی ضرورت نہیں سمجھتا تھا - وہ آئین کا دشمن نہ تھا - وہ زندگی کے مستثنیات میں دلچسپی لیتا ہے اور در اصل اُس زمانہ کی حالت کا مرقع پیش کرتا ہے - جب زمانہ بہت ہی زیادہ عمومیت و معاشرۃ کی کڑیوں میں پھنس گیا تھا - وہ محبت برادری - اور خوش آہنگی و خوش نفسی کے آئین کو پسند کرتا ہے - اُس کی حالت ڈاکٹر جانسن کی طرح ہے جس نے باسول سے کہا تھا کہ " اپنے دماغ کو فضولیات و لغویات سے پاک کردو " یہ وہ پیغام تھا جس کو ابسن یورپی دنیا کے سامنے لایا وہ چاہتا تھا کہ بالکل عریاں تصویر موجودہ اخلاق و تہذیب کی پیش کردے - اُس نے ۱۸۸۲ء میں ایک موقع پر کہا کہ " در اصل زندگی میں ایسے لمحے گزرتے ہیں جب تمام دنیا کی تاریخ مجھے ایک بڑے تباہ شدہ جہاز کی طرح معلوم ہوتی ہے اور یکہ و تنہا بچا ہوا چیز جو مجھے دکھائی دیتی ہے وہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو تباہی سے بچا لیا جائے "

اسکنڈی نیویا کی زبان غیر فصیح - نامہذب و خشانہ خیال کی گئی ہے - پُرانی طرز اور سیدھی سادی وضع کے

لوگ وہاں کے [illegible] ہیں۔ لیکن تاہم ملک ادبی تحریکوں کا مرکز رہا ہے۔ اور کھلم کھلا حقائق زندگی کی تصویریں [illegible] اور افسانوں میں دکھلائی گئی ہیں۔ وہاں کا تھیٹر بھی مشہور ہے۔ لہذا ناروی علم و فن کو سمجھنے کے لئے [illegible] ہوم کو جاننا ضروری ہے۔ جہاں پر ایک سال کا دن رات ہوتا ہے۔ گرمی میں مستقل گرمی۔ دھوپ کی تیزی۔ درختوں اور پودھوں کی بھینی بھینی خوشبو دماغ پر عجیب کیف کی حالت مترتب کر دیتی ہیں۔ باقی سال تاریک و پُرخوف رات ہوتا ہے۔ ناروے کا ملک یورپی تمدن کی انتہائی شمالی سرحد ہے۔ جس کے نواح و اطراف میں قدیم ما قبل تاریخ دیوتا ابھی تک حکمراں ہیں۔ بھوت۔ پریت چڑیل اور پریوں کا اثر ابھی تک محسوس کیا جاتا ہے۔ ان کو انسانی زندگی کا ایک رفیق سمجھ لیا گیا ہے۔ اِن عقائد رواجیات کا دل و دماغ قوم پر بہت گہرا اثر ہوا۔ خود فطرت کی سحرکاریاں غیر معمولی طور پر جلوہ نما ہیں۔ آسمان۔ سمندر۔ اور آبشار میں رنگوں کی رنگینی۔ بحری جانوروں کی رعنائیاں۔ مچھلیوں کی شوخیاں۔ عمودی چٹانیں ارواح انسانی کے لئے سامان بہجت و انبساط مہیا کرتی ہیں۔ اور تخیلات غیر محدود روحانیت کا جامہ پہن لیتے ہیں۔ اور یہی تخیلات تمام قصوں اور افسانوں میں بھرے ہوئے ہیں شاعرانہ احساسات۔ بھیانک اور پُرخوف افکار۔ حقائق و الفت فطرۃ۔ تصوف کی لہر۔ محویت کی بہار۔ اِبسن کا خاص حصہ ہیں۔ فلسفہ میں انہماک۔ ایمانداری و راستبازی۔ انفرادیت و تنہائی۔ گوشہ نشینی و وسیع النظری اُس کو ماں سے ورثہ میں ملیں جو فطرۃً نہایت شرمیلی۔ باحیا۔ خاموش طبع اور عافیت پسند عورت تھی۔ وہ دماغی اخلاقی و ارادی جمہوریت کا دلدادہ تھا۔ کیونکہ بغیر اس آزادی کے صحیح ارتقاء دماغی نہیں ہو سکتا۔ اور یہ آزادی صرف عورتوں اور مزدور پیشہ غریبوں کی آزادی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ وہ خود اشتراکی۔ مضبوط ارادے اور غور و فکر کا آدمی تھا۔ اُس کا چہرہ بھی رعب دار تھا۔ شریف طبقہ کی تمام صفات اِبسن کی ذات میں موجود تھیں۔ وہ نہایت سنجیدہ و زیرک شخص تھا۔ اُس کا وجود ڈانٹی کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ وہی دروغ و باطل سے نفرت و حقارت۔ وہی خیالات وہی اثر اور وہی رنگ ہے اور اس وقت ہم محسوس کرتے ہیں کہ دروغ بافیوں کا پہاڑ پاش پاش ہو گیا۔

وہ اپنے خیالات کے ظاہر کرنے میں بمقابلہ اپنے ہمعصروں کے زیادہ بیباک اور آزاد تھا۔ تنقید و تبصرہ کی طرف سے بے نیاز اور اہانت کی جانب سے بے پروا تھا۔ ہم کو اُس کی تصانیف میں بحث و مباحثہ کے لئے کافی مواد ملتا ہے۔ لیکن اُس کی بقائے شہرت کا دارومدار زیادہ تر ڈراما پر ہے جو اُس وقت لکھے گئے جب وہ دنیا کے

تک ہے اُٹھا اُٹھا کر راسخ العقیدہ بن چکا تھا۔ سنہ۱۸۷۷ء سے پیشتر کے تمام ڈراما معاشرتی ادواروں پر ایک خاص قسم کی تنقید ہیں۔ اس سال کے بعد کی تمام تصنیفوں میں فلسفہ و تصوّف کا رنگ غالب ہو تا گیا۔ اُس کے تمام تماشوں میں زیادہ زور معاشرتی ماحول کی ساخت اور فرد انسانی کی معقول و جائز آزادی پر ہے۔ وہ رسمی رواجی دروغ بافیوں اور خرافات لایعنی کے خلاف سخت نفرت کا اظہار کرتا ہے جن کو سوسائیٹی نے زندگی کا لازمہ قرار دے رکھا ہے۔ گفتگو مختصر و معقول اور پُر معارف و با محاورہ ہے۔ بناوٹ و لفاظی کو دخل نہیں۔ صداقت و حقانیت کا شیدا ہے اس کے ڈراما واقعات زندگی کی من و عن لفظی تصویریں ہیں۔ یہ اُس کا کمال فن ہے۔ اگر کوئی ادنیٰ درجہ کا شاعر یا ماہر فن ہوتا تو ایسے نازک مسائل کے سلجھانے میں تباہ ہو جاتا۔ اُس کا مواد یا خاکہ ڈراما (پلاٹ) نہایت عمدہ ہے۔ اُس نے مختلف طبقہ کی عادتوں کا تذکرہ کر کے اُن کا مضحکہ نہیں اُڑایا بلکہ دراصل معاشرتی نظام کی خرابیوں کو ظاہر کیا ہے۔ اور سیاسی دستور پر نکتہ چینی کی ہے حکومت جمہوری اُس کے خیال میں عوام کے غلبہ کے باعث مفید و نافع الانام نہیں ہو سکتی۔ سیاسی انقلاب بیکار ہیں۔ کیونکہ اِن سے موجودہ حالت میں درستی و بہتری نہیں ہو سکتی بلکہ اصل چیز دماغی و روحانی ماحول میں انقلاب پیدا کرنا ہے۔ روحانی تعلق ہی اتفاق کو قائم کر سکتا ہے۔ اِسی سے اصلی آزادی مل سکتی ہے اور ہر مرد عورت کی معقول و جائز آزادی کے دائرے کو حتی المقدور وسیع کرنے ہی سے صحیح جمہوریت کا اکتساب ہو سکتا ہے۔

معاشرتی و نفسیاتی ڈراما میں "گڑیا کا گھر"۔ بھوت۔ نوجوانوں کا جتھا۔ حامئ معاشرۃ۔ دشمن معاشرہ۔ جنگلی بطخ۔ سمندر کی عورت۔ اور "جب ہم موے زندہ ہونگے" وغیرہ وغیرہ مشہور ڈراما ہیں۔ جو ان تمام خصائص کے حامل ہیں جن کا تذکرہ ہم اوپر کر چکے ہیں۔ "گڑیا کا گھر" اِبسن کا ابتدائی معاشرتی ڈراما ہے جو ۱۸۷۹ء میں لکھا گیا۔ یہ پہلا ڈراما ہے جس کے باعث اس کی شہرت اپنے وطن کے علاوہ یورپ کے دیگر ممالک میں ہوئی۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ وطن میں اس کی شہرت کم درجہ کے رومانی تاریخی ڈراما سے ہو چلی تھی۔ اور اُس کی برانڈ سے کامیابی کی مہر لگ گئی تھی۔ جو ۱۸۶۶ء میں طبع ہوئی۔ اُس وقت سے اِبسن کا مطمح نظر سیاسی و عمرانی بدمذاقیوں کا انکشاف کرنا تھا۔ اور جس کے لئے بہت کافی مواد ناروے کی زندگی میں موجود تھا۔ "گڑیا کا گھر" اُس وقت لکھا گیا جب اِبسن "چہل سال عمر عزیزش گذشت" کے دائرہ سے باہر قدم رکھ چکا تھا۔ اور دسمبر میں شائع ہوا۔ اِس کے تھوڑے دن بعد کوپن ہیگن میں

[illegible] لندن میں پہلے پہل ۱۸۹۹ء میں اس کی شہرت ہوئی۔ لیکن پیرس میں ۱۸۹۴ء میں ہی [illegible] کی [illegible]۔ اب اس کے بکثرت تراجم ہو چکے ہیں۔ نوشابہ کا پارٹ جو ڈراما کی ہیروئین ہے دنیا کی بہترین [illegible] کرنے والی عورتوں نے پسند کیا ہے

دُنیا میں دو قسم کے دل پائے گئے ہیں۔ ایک مرد کا اور دوسرا بالکل مختلف الفطرت عورت کا اور ان دونوں کی جانچ اور آزمائش کے لئے دو مختلف جداگانہ قاعدے منضبط کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن قیامت یہ ہے کہ باوجودیکہ دونوں ایک دوسرے کو سمجھتے نہیں پھر بھی عورت اپنی زندگی میں ہمیشہ مرد کے نقطۂ نظر سے جانچی جاتی ہے۔ یہ طے شدہ امر ہے کہ وہ خود بالکل مرد کی معاشرۃ کو قبول نہیں کر سکتی۔ اور اس ڈراما میں اسی نکتہ کی وضاحت کی گئی ہے

زمانۂ موجودہ کی عورت عہدِ قدیم کی عورت سے عادات و اطوار میں مختلف ہے۔ وہ زیادہ شریف النفس زیادہ اور متحمل اور زیادہ صادق القول ہے۔ یہ افضلیت اُس کی انفرادیت پر سخت پابندی عائد کرتی ہے۔ وہ محبت یا انسانیت سے نفرت نہیں کرتی۔ بلکہ محبت کو حقانیت و صداقت کا سب سے زبردست ہتھیار تصور کرتی ہے۔ زندگی میں سب سے بہتر تخیل محبت ہے۔ کسی انسان کو جرات نہیں کہ محبت کے احکام سے سرتابی کرے اگر وہ صحیح طور پر اُس کی ماہیت کو سمجھ لیتا ہے۔ اور اُس کو ذاتی طور پر آزادانہ سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ محبت کا دارومدار نفسانی و شہوانی اغراض پر نہیں ہے۔ یہ تنگ خیالی تمام زندگی کی بنا نہیں ہو سکتی عام آدمی محبت کو زندگی کی دوسری مسرتوں اور دلکشیوں سے بالکل جدا اور مختلف سمجھتے ہیں۔ محبت اُن کی نگاہ میں خودغرض تنہا اور سب سے جدا شے ہے۔ اور جہالت۔ شرم۔ کاذب شرم اور جھوٹے وعدوں میں عیاں ہوتی ہے۔ اِس نوع کے خیالات اُس دستور کا پرتو ہیں جو عورت کو انسانیت کے درجہ سے گرا ہوا قرار دیتا ہے اور مرد سے مختلف سمجھتا ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ عورت مرد کے متعلق کیا خیال رکھتی ہے؟ -

اِبسن آہستہ آہستہ اُس کے انفرادی جائز حقوق کی پاسداری و حمایت کرتا ہے۔ محبت اُس کے خیال میں انسان خود پیدا کر سکتا ہے اور یہ کسی طرح بھی کسی مخصوص شکل یا رشتہ و علاقہ پر موقوف نہیں ہے۔ یہ صرف سسکیاں یا آنسو بہانے سے حاصل نہیں ہوتی۔ محبت پاک کنندہ۔ نجات دہندہ اور طاقت بخش قوت ہے۔ یہ حیات و ممات

Original. [illegible]

کی مانند واقع ہونے والی شے ہی۔ اور وہ شے ہی جو ہماری خواہشات و داعیات میں موجود ہے۔ لیکن ہمارے اختیارات و امکانات سے قطعی باہر ہے۔ صحیح جذبہ محبت گو کسی خاص شخص کا حق نہیں لیکن تاہم سب میں موجود ہوتا ہے۔ محبت کے بغیر زندگی بیکار ہے۔ انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنا نصب العین عالی رکھے اور اس کی جائے صداقت ہی سے ہو سکتی ہے

"گڑیا کا گھر" ابسن کی مرتبہ نسوانی تصویر پیش کرتا ہے۔ اور یہ وہ معرکۃ الارا ڈراما ہے جو عمرانی امور اور عورت کی موجودہ حالت کو دکھلاتا ہے۔ یہ شادی کا سانحۂ غمناک ہے۔ اس پر سب سے زیادہ تنقید کی گئی ہے اور یورپ کے عالموں نے اس کو ہر پہلو سے جانچا ہے۔ فنِ ڈراما کے لحاظ سے یہ تماشا نہایت مکمل ہے۔ یہاں پہ ابسن رسمی قیود سے آزاد ہو جاتا ہے۔ یہ ڈراما اُس کے طرزِ تحریر کا بہترین مکمل نمونہ ہے۔ اُس کا ہر جزو ایک دوسرے سے خوب وابستہ ہے۔ اور تکمیل فن کا ہر جملہ اور ہر محاورہ سے اظہار ہوتا ہے۔ مصطلحات کے معاملہ میں "گڑیا کا گھر" ایک غیر معمولی تبدیلی یورپی ڈراما میں شروع کر دیتا ہے۔ ایک عرصہ تک بغور اس تبدیلی کو دیکھنے سے ہم اس قدر عادی ہو گئے ہیں کہ اب ہم بآسانی محسوس نہیں کر سکتے کہ یہ انقلاب کسقدر عظیم و حیرت انگیز تھا۔ یہ تمام باتیں ایسی معروف ہو چکی ہیں اور موجودہ تماشوں میں زندگی کا جزو لاینفک بن گئی ہیں۔ کہ ہم بھول جاتے ہیں کہ یہ تبدیلی اُس وقت سے ہوئی جب ایک سرگرم گروہ احرار نے "گڑیا کا گھر" کو اسٹیج پر اسکنڈی نیویا کے باہر دکھلایا۔ عورت کا نمونہ نوشابہ ہے۔ وہ گڑیا ہے بچی ہے۔ بلبل ہے۔ قمری ہے اور بیوی ہے۔ مرد کی سیرت مرزا سے ظاہر ہوتی ہے۔ نوشابہ ایک جعلی چک بنا کر بنک سے روپیہ حاصل کرتی ہے اور مرزا کو بغرض علاج اٹلی لیجاتی ہے۔ اور اپنے اِس فعل پر نازاں ہے وہ اِس کو ایک شریف و جائز فعل تصور کرتی ہے اور جب مرزا کو اس کا علم ہوتا ہے تو نوشابہ کو یقین ہے کہ شوہر اپنے اوپر اِس الزام کو اوڑھ لے گا۔ لیکن اِس خیال میں اُس کو کس قدر ناامیدی کا مُنہ دیکھنا پڑتا ہے

نوشابہ گھر کی مالک ہے وہ ایسی عورت ہے جس کی جوان طبیعت اُن عارضی اثرات سے متاثر ہو جاتی ہے جنھوں نے اس کو ایک پیارا بچہ بنا دیا ہے۔ وہ ایک غیر محتاط افسر کی بیٹی ہے۔ جس کی ایمانداری و دیانتداری قابلِ شک ہے۔ وہ رسمیات کی قیود میں پیدا ہوئی اور جوان ہوئی۔ اُس کو خاص دلچسپی ملازموں کے پاس بیٹھنے اور اُن کی

[illegible] میں [illegible] - وہ اب تین[1] بچوں کی ماں ہے اور ایسے شخص کی بیوی ہے جو اُس کو تمام بیرونی اثرات [illegible] سے [illegible] رکھتا ہے - لیکن خود اُس کے کام میں مدد دینے یا شریک مصیبت ہونے سے بچتا ہے - وہ اُس کی [illegible] عادتوں کو [illegible] کرتا ہے - اور اُس کو بلبل گڑیا اور پیاری کے نام سے خطاب کرتا ہے - وہ اُس کی مسرت کا [illegible] ہے - مرزا کا مذاق اُس سے بالکل جدا ہے - اور اُس کی محبت خاص قسم کی ہے - نوشابہ کی خصلت اُس کی تعلیم اور مرزا یوم کا قدرتی نتیجہ ہے - وہ بے تکلفی و چرب زبانی سے جھوٹ بولتی ہے اور لاپروائی سے اپنی خواہشات کے پورا کرنے میں منہمک نظر آتی ہے - روپیہ کے معاملہ میں اُس کا تخیل استحقاق ابتدائی ہے - وہ اپنے باپ کا نام بھول جاتی ہے - لیکن ایک دردمند محبت بھرے دل کے جذبہ سے کام لیتی ہے - اُس کی نیت ہمیشہ نیک ہے - وہ قصور وجرم کے ناموں سے بھی واقف نہیں - اُس کی تعلیم و تربیت کا اثر سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ مثل ایک پیالے - محبت کرنے والے بچہ کی ہے - جس کو ذمہ داری کا کوئی احساس نہیں ہوتا - لیکن دانائی اُس میں پوشیدہ ہے - وہ روشن ہوتی ہے اور جب آخر کار دن کی روشنی اُس کے گڑیا کے گھروندے میں داخل ہوتی ہے وہ سمجھتی ہے کہ دنیا کا کیا حکم اور فیصلہ ہے ! - اور جب کو اُس کا شوہر تحکم سے جتلاتا ہے - اس مصیبت کے وقت وہ محسوس کرتی ہے کہ اُس کی شادی دراصل شادی نہ تھی وہ تمام سال ایک اجنبی کے ہمراہ زندگی بسر کرتی رہی - وہ اپنے بچوں کی پرورش کے لئے قطعی ناموزوں ماں ہے - وہ اپنا گھر چھوڑ دیتی ہے اور اُس وقت تک لوٹنے کا ارادہ نہیں رکھتی جب تک کہ وہ اصلی معنیٰ میں شادی کے قابل نہ ہوجائے

کیا وہ واپس آئے گی ؟ اِس سوال کا جواب دیے بغیر اِبسن فسانہ کو ختم کردیتا ہے - یہ عورتیں دراصل آزادی و حفظ حقوق کے لئے مر رہی ہیں - وہ ایک نئے دستور و نظام معاشرۃ کی اُمید دلاتی ہیں - مرد زیادہ تر ان زمانوں میں دنیا کی جنگ میں زخمی و تباہ ہوگئے ہیں - حالانکہ وہ اپنے معاشرتی ماحول و حالت کو بخوبی جانتے ہیں - لیکن وہ محض تماشائیوں کی مانند کھڑے رہتے ہیں - اور اِس جنگ میں کامیابی کے لئے ذرا کوشش نہیں کرتے لیکن تمام عورتوں میں غیر مفتوح قوۃ ہوتی ہے وہ خاص قوۃ اُن کے سینوں میں تازگی و لطف زندگی کو قائم رکھتی ہے - اور اِس کا اظہار عمل میں ہوتا ہے "گڑیا کا گھر" شادی کی ٹریجڈی ہے

کُل ڈراما کا لطف اتنا ہے کہ آیا مرزا و نوشابہ کی شادی صحیح معنی میں ہوئی یا نہیں ؟ نوشابہ یقین رکھتی ہے کہ

[1] ترجمہ میں دو بچوں کا ذکر ہے لیکن دراصل تین بچوں کی ماں ہے -

اُن کی شادی نہیں ہوئی۔ یہ ڈراما رسومات شادی جواز قانون سے کہیں زیادہ عمیق مسئلہ پر روشنی ڈالتا ہے
اِلہامی جیسی اور غور و فکر کی پیچیدہ ہرگز نہ تھیں۔ اُس کا مقصد اِس امر کو معلوم کرنا ہے کہ بنی نوع انسان میں
جنسی کے تعلق و رابطہ کو کون سی شے ممکن الوقوع بنا سکتی ہے؟ اور وہ کیا شے ہے جو ایک فرد انسان کے تعلقات
و رابطہ کو پاک یا ناپاک کر سکتی ہے؟ آخری منظر میں اِسی نوعیت کے تین سوال دریافت کئے گئے ہیں اور ابسن ہر ذی فہم و عقل
فرد سے اُن کے جواب کا طالب ہے۔ ان تین سوالوں میں سے پہلے سوال کی طرف توجہ نہیں کی گئی ہے

جب مسز ایلونگ کا خط پڑھ چکتا ہے تو وہ نوشابہ سے کہتا ہے "اس آٹھ سال کی مدت میں تم کہ جو میرے لئے
باعث عزت و افتخار تھیں۔ اس قدر مکار، جھوٹی۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ نفرت انگیز ایک مجرم ثابت ہوئیں۔" نوشابہ
کا جواب قابلِ غور ہے۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک عورت کو اپنے مرتے ہوئے باپ کو ایذا سے محفوظ رکھنے کا کوئی
حق نہیں اور نہ اُسے اِس امر کا اختیار ہے کہ وہ اپنے شوہر کو بچا سکے۔ مجھے اس بات کا اب فیصلہ کر لینا چاہئے کہ میں راستی
پر ہوں یا سوسائٹی۔" پھر نوشابہ کہتی ہے "مجھے یقین ہے کہ بہت سی باتوں سے زیادہ اہم یہ بات ہے کہ میں ایک انسان
ہوں یا کم از کم مجھے انسان بننے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اور ہلمر اس بات کا جواب دیتے ہوئے کہ "کوئی آدمی اپنی
عزت اور ناموس کو اپنی محبوبہ پر قربان نہیں کرتا۔" وہ ایک دنداں شکن جواب دیتی ہے کہ "لاکھوں عورتوں نے اکثر ایسا
کر دکھایا ہے۔"

عورت کو صلح، امن اور خوشحالی درکار ہے نہ کہ عزت۔ موجودہ سوسائٹی میں اُس شخص کو قابلِ تعریف سمجھا جاتا ہے
جو محبت کی بنا پر شادی نہیں کرتا۔ بلکہ عزت و ناموس کا خیال رکھتا ہے۔ لیکن جب محبت صادق و کامل ہوتی ہے تو عزت
و ناموس کا قصہ ختم ہو جاتا ہے۔ اور وہ بے حقیقت اور اضافی چیز معلوم ہونے لگتی ہے۔ ابسن دشمنِ سلطنت تھا۔ اس کا
خیال تھا۔ کہ سلطنت انفرادی زندگی کی بد دعاؤں کا اثر ہے۔ اور لہٰذا اِس دشمن کو تباہ کر دینا چاہئے۔ تعجب خیز امر
یہ ہے کہ وہ اِس خیال کو بہت اہمیت دیتا ہے۔ حالانکہ عام انسانی دماغ میں اُن کی یہ اصل و حقیقت نہیں ہے۔
سلطنت و ملوکیت کے پردے میں غائب ہو کر وہ "دنیا کی حقیقت" کو ہرگز نہ سمجھ سکا اور اِس نقصان پر سخت ملول
و نالاں رہا۔

تکمیل ذات یا تزکیہ نفس کے بارے میں ابسن کی بابت غلط فہمی سے کام لیا گیا ہے ڈراما کے مبحث، عورت کے

حق تلفی نسواں پر یورپ کے ادبی حلقوں میں بہت قیل وقال ہوئی اور اکثر جگہ اس کو سخت وسست بھی کہا گیا۔ تاہم سب اس کا تذکرہ امراض النسل ہے جس کو اس نے جنگلی بطخ اور بھوت میں اور زیادہ واضح کر دیا ہے۔ گویا گڑیا گھر کا مضمون دراصل عورت کا اپنی انفرادی ذمہ داریوں کو محسوس کرنا ہے۔ جس کو مثل ایک بچے کے سمجھا گیا۔ اور یہ بذاتِ خود ایک ایسی بات تھی جس پر چہ میگوئیاں ہوتیں۔ خدا جانے نوشابہ حق پر تھی یا ناحق پر۔ فطرتی طور پر یا غیر فطرتی طور پر وہ اپنے شوہر کو چھوڑنے۔ گھر اور بچوں کو خیرباد کہنے میں کہاں تک حق بجانب تھی۔ تاکہ وہ ذات کی تکمیل کر سکے۔ نہیں معلوم کہ آیا یہ علیحدگی و تنہائی اس کے تزکیۂ نفس کے لئے ضروری تھی؟ غرض ان سب نکات پر خوب گرم گرم مباحث ہوئے۔ اگرچہ بعض کا خیال ہے کہ واقعہ کے بیان کرنے میں عورت کے فرائض کی بہ نسبت ابسن نے اس کے حقوق کی زیادہ پاسداری کی ہے۔ یہ مخفی نہ رہے کہ اپنے تمام عمرانی تماشوں میں وہ ہمیشہ اپنے نقطۂ نظر کو پیش کرتا رہا۔ اس کے حل کی کوئی کوشش نہیں کی

اس کا جواب ان لوگوں کو جو اس پر نکتہ چینی کرتے تھے۔ کہ وہ محض فلسفۂ اعدامیت کی تعلیم دیتا ہے۔ یہ تھا کہ میرا فرض یہ ہے کہ میں نظام معاشرۃ کی کمزوریوں کو ظاہر کروں اور فلسفۂ تنظیم واساس کو ان لوگوں کے لئے چھوڑے دیتا ہوں جو ڈراما نویس نہیں ہیں۔ اس نے تشخیص مرض تو ضرور کی لیکن علاج دوسروں کے لئے چھوڑ دیا علاوہ بریں چاہے اس کا نظریہ نوشابہ کے افعال واعمال کے لحاظ سے ہماری نگاہوں میں ناقص و نامکمل معلوم ہو لیکن اس کے لئے یہ امر باعث افتخار ہے کہ باوجودیکہ بڑے زور وشور و سرگرمی سے عورت کے حق تکمیل ذات و تزکیۂ نفس کی پیروی کی لیکن کبھی اس نے "ایک خود مختار و خود سر عورت" کی تعریف نہیں کی وہ کبھی ایسی سرکش و ناہنجار ہستی کے قیام کا روادار نہیں ہو سکتا تھا۔ جس کا مفہوم تکمیل ذات محض اتنا تھا کہ وہ اس ماحول کو ترک کر دے جس میں وہ نمایاں حصہ لیتی ہے۔ اور ان تاثرات پر حملہ آور تھی جس کے لئے وہ فطرۃً ناموزوں ہے۔ اس کا قول ہے کہ عورتوں کو بے کم وکاست مستقبل میں عملی دنیا میں بہت زیادہ اثر رکھنا چاہئے۔ لیکن ماں اور محض ماں کی حیثیت سے۔

بعد کی تصانیف میں یہ رنگ اور زیادہ گہرا ہوتا گیا۔ اور مختلف پیرائے اور مختلف اسلوب سے اس نے نظام معاشرۃ کی کمزوریوں کو خوب بینائی سے ظاہر کیا۔ وہ دولت و وجاہت علم و ترقی اور پیدائش و آبادی وغ

کا چنداں قائل نہ تھا۔ اس کا تمام زور محض اخلاق۔ ارادہ۔ اور روح کی صفائی و مضبوطی پر ہے۔ اور یہی وہ صفات ہیں جن کی پرستش وہ آخری دم تک کرتا رہا

اسی نوع کی دیگر نظریات یورپ میں ایک خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ مثلاً نظریۂ ارتقا اور تنازع البقا، یہ وہ مسائل ہیں کہ جب یورپ نے ان کی ماہیت کو دریافت کیا اور تمام تجربات کتابوں اور اخباروں میں شائع ہوئے تو ایک تہلکہ پڑ گیا۔ اور لوگوں نے سمجھا کہ قدرت کے مخزن خزانے سے نایاب موتی رول لئے گئے۔ ہمارے ملک کے وہ نوجوان بھی جن کو اپنے سلف کے کارناموں سے واقفیت و دلچسپی نہیں ہے۔ اور بدقسمتی سے تعلیم کا ذریعہ بھی یورپی زبان بن گئی ہے۔ جب اِن مسئلوں کی بابت یورپی زبان میں پڑھتے ہیں تو لامحالہ ان کے دل و دماغ۔ محنت و جانفشانی کی داد دینے لگتے ہیں۔ اور یک طرفہ فیصلہ پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ کاش اُن کو معلوم ہوتا کہ اسلام کے روح پرور تخیل نے اِن سب باتوں کو بہت پہلے لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ اور اس سے بہتر ایک تخیل بھی تو آج دنیا پیش نہیں کر سکتی۔ عورت ہی کی ذات کو لیجئے۔ ابسن پہلا شخص ہے جس نے اِس حقیقت کو محسوس کیا کہ عورت کو انفرادی طور پر تزکیۂ نفس کی سخت ضرورت ہے۔ اس پر نکتہ چینی ہوئی سخت مباحث ہوئے۔ اور ابسن کو نشانۂ ملامت بنایا گیا۔ اگر ذرا نظر غور سے دیکھا جائے۔ تو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کمی جس کو سوسائیٹی کی ساخت میں محسوس کیا گیا۔ اور جس کا تدارک ضروری متصور ہوا۔ کیونکر اتنی مدت تک اِس کا خیال کسی اور کو نہ ہوا؟ اور کیوں خود عورتوں نے اپنے اِس جائز حق کی طلبی کے لئے شورش برپا نہیں کی۔ اِس کا جواب بہت سہل ہے۔ یورپ یا عیسائیت کا جو خیال آج تک عورت کے متعلق رہا ہے اُس کو جاننے کے بعد ہر عقل سلیم اِس نتیجہ پر پہنچتی ہے اور اِس جمود و خمود کی وجہ سمجھ میں آ جاتی ہے۔

نہ صرف عیسائیوں میں بلکہ یہودیوں میں بھی عورت کو ذلت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے شادی نہ کی۔ اُن کو زندگی کی تمام پیچیدگیوں سے واسطہ نہ پڑا۔ وہ کوئی قانون مرد و عورت کے لئے مترتب نہ کر سکے۔ اُن کے پیرووں نے تو غضب ہی کر دیا۔ عورت کو گناہ کا باعث سمجھا گیا۔ اور دنیا کی صفات حسنہ سے ... یہودی اور عیسائی پیشوا از روئے تعلیم توریت و انجیل عورتوں کو ذلیل۔ حقیر۔ کم رتبہ اور مردوں کے تابعدار سمجھتے رہے۔ انسانی گناہ کا تمام وبال اُنھیں کی گردن پر تھوپا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رہبانیت کی وبا پھیلی۔ اور عورتوں

حیثیت مقدار سے زیادہ حقیر خیال کیجانے لگی - یہودی مصنف تو مردوں کی برائی کو عورتوں کی شکل پر ترجیح دیتے تھے۔ عورت کو مرد کے ہوا و ہوس کا اصلی سرچشمہ قرار دیا - اُس کو دوزخ کا دروازہ سمجھا گیا بعض تو یہاں تک بڑھے اور بول اُٹھے کہ عورت کو اس خیال ہی سے شرم آنی چاہیئے کہ وہ عورت ذات ہے اُس کو اپنے لباس سے شرم کرنی چاہیئے - کیونکہ یہ اُس کے جنت سے نکالے جانے کی یادگار ہے - اور نیز اُسے اپنے حُسن سے شرمندہ ہونا چاہیئے - کیونکہ یہ شیطان کا آلہ ہے - عورتوں کو اجازت نہ تھی کہ وہ مقدس انجیل کو ہاتھوں میں لے لیں کیونکہ وہ جنس ناپاک ہیں - عورتوں کو املاک بھی ورثہ میں نہ مل سکتی - اور نہ وہ کسی جائداد پر قابض ہو سکتی - اور لہذا یا تو وہ راہبہ (نن) بنجانے پر مجبور ہوتی یا شادی کو قبول کرتی تھیں - لڑکیوں اور بیبیوں کا کوئی حق وراثت نہ تھا

جب ایک قوم کے تمام چھوٹے بڑے - دیندار و دنیا دار افراد کا عورت کے متعلق یہ خیال ہو اُس سے کیا اُمید کی جاسکتی ہے کہ وہ عورت کو تزکیۂ نفس کی اجازت دے سکتا ہے - اب چونکہ سائنس کی ترقی نے عیسائیت کے من گھڑت اور مفروضہ اُصولوں کو ٹکرا کر پاش پاش کر دیا اور اُن کی حقیقت معلوم ہو گئی ہے تو لوگ آزاد خیال بن گئے ہیں - جن ذرا ذرا سے نکات اور معمولی باتوں کو یورپ کے فلاسفر نہایت کاوش سے دریافت کر رہے ہیں وہ اسلام میں پہلے سے موجود ہیں -

اسلام کو یہ فخر حاصل ہے کہ اُس نے دنیا میں سب سے پہلے اور ایسے وقت جب ہر چہار طرف عورت کی تذلیل و توہین کی جا رہی تھی - نہ صرف اُس کی حالت میں انقلاب پیدا کر دیا بلکہ اُس کی زندگی کے لئے طے شدہ دستور العمل قائم کر دئے - عورتوں کی عزت اور زن و شو کے باہمی آرام و آسائش اور مسرت کی تعلیم دی - عورت کی جانب محبت و مؤدت کے پاکیزہ خیالات پیدا کئے - اور فرمایا کہ " ھُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ " لیکن اِن جماعتی تعلقات کو مضبوط کرنے کے ساتھ ہی ساتھ عورتوں کو بھی انفرادی طور پر تزکیۂ نفس کی تلقین کی اور بآواز بلند دنیا کو مژدہ سُنا دیا کہ ہر شخص فطرۃ اسلامی پر پیدا ہوتا ہے - محض اُس کے اعمال و افعال سے اُس کی ہستی کو جانچا جائے گا - امیر - غریب - اور مرد و عورت کسی کی رعایت نہ کی - سب کو برابر درجہ پر رکھا - پیغمبر اسلام نے اپنی زندہ مثال سے اُن فرسودہ توہمات کو یک سر باطل کر دیا اور وہ باتیں جن پر متمدن

یورپ آج انگشت بدنداں ہے - تیرہ سو برس پیشتر عرب کے بدووں کی زندگی کا جزو بن چکی تھیں - اور نہ صرف اُن کی بلکہ اسلام کے ہر ایک پیرو اور جان نثار کی عادت ثانی ہو چکی تھیں - قومی و ملکی کوئی امتیاز نہ تھا - لہٰذا مغرب کے فدائیوں کو چاہئے کہ پہلے اسلام کا مطالعہ کریں اور اُس کی روشنی میں یورپی داناؤں کی تعلیم و تربیت کو پرکھیں تب اُن کو معلوم ہوگا کہ وہ کہاں ہیں ؟ -

پروفیسر عبدالشکور صاحب کا ترجمہ قابل قدر ہے اور ہم کو اُمید ہے کہ دیگر اصحاب ذوق سلیم بھی اُردو زبان کو یورپ کی مفید و بکار آمد کتابوں کے تراجم و ملخص سے مالا مال کر دیں گے - کتابت کی خامیوں اور غلطیوں سے اگر قطع نظر کی جائے تو ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ "گڑیا کا گھر" اُردو ڈراما میں بیش بہا جواہر کا اضافہ کرتا ہے - ہم پروفیسر مذکور الصدر کو اُن کی اِس جدت پر مبارکباد پیش کرتے ہیں اور اُمید ہے کہ وہ ابھی کچھ اور لکھیں گے - آمین

(مُدیر)

نوٹ - مضمون بالا میں کتب ذیل سے مدد لی گئی:

1. Chapters in Norwegian Literature by Illit Groudal & Ola Raknes.
2. Henrik Ibsen by Ellis Roberts.
3. New Spirit by Scott.
4. Early Plays. by Anders Osbeck.
5. Plays Edited by William Archer
6. Lyrics and Poems Edited by F. F. Garrtt
7. Class Lectures. by Prof. E.E. Dickenson.
8. لیکی کی تاریخ اخلاق یورپ ، سیرۃ النبی وغیرہ

"گلِ خنداں"

رونقِ باغِ جہاں اے گلِ خنداں تو ہے　　زینتِ صحنِ چمن زیبِ گلستاں تو ہے
گرمیِ بزمِ سخن کا سر و ساماں تو ہے　　بلبلِ خستہ کے ہر درد کا درماں تو ہے
دل حسینوں کے چُراتی ہے تری رنگینی
پردے پردے میں کیا کرتا ہے تو گل چینی

تیری طینت میں ازل سے ہی وفاکوشی ہے　　تجھ کو محبوب کب احسان فراموشی ہے
چاک سینہ ہے ترا عالمِ بے ہوشی ہے　　صد زباں ہو کے بھی لب پر ترے خاموشی ہے
بھید کھُلتا نہیں کچھ اے گُلِ خنداں تیرا
بو پریشاں ہے کہ ہے حال پریشاں تیرا

جلوۂ حُسنِ ازل کی کوئی تصویر ہے تو　　زخمِ پنہاں کے لئے مرہم تدبیر ہے تو
مصحفِ دل ہی کہ اس کی کوئی تفسیر ہے تو　　خوابِ غفلت کی سمجھتا ہوں کہ تعبیر ہے تو
دُور گلچیں سے رہے شاخ سے ٹوٹے نہ کبھی
ساغرِ عیش ترے ہاتھ سے چھوٹے نہ کبھی

اندرجیت شرما

خطبات عالیہ

جناب آنریبل جسٹس ڈاکٹر شاہ محمد سلیمان صاحب ایم اے ایل ایل ڈی نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اکتالیسویں اجلاس کے موقعہ پر ایک بصیرت افروز پر معارف خطبہ بمقام اجمیر دیا تھا - اس کا کچھ حصہ نذر میگزین ہے - (مدیر)

علوم مغربی

انگریزی ایک عالمگیر زبان کی حیثیت سے

اس سے میری یہ غرض ہرگز نہیں کہ انگریزی زبان کی تعلیم یونیورسٹی سے خارج کر دی جائے یا کسی حیثیت سے اس کا مرتبہ کم کر دیا جائے - میرے خیال میں انگریزی زبان کی تعلیم بدستور جوش و خروش سے قائم رہنی چاہئے اور اس کے ذریعہ سے تحصیل علوم میں جس قدر ترقی ممکن ہو جاری رکھنی چاہیے اس امر کا ہر شخص کو معترف ہونا پڑے گا کہ انگریزی نے ایک عالمگیر زبان کی وسعت اختیار کر لی ہے اور اس کے ذریعہ سے تمام مغربی علوم و فنون حاصل کئے جا سکتے ہیں - انگریزی زبان کی وسعت اور گہرائی سے کل مغربی ممالک کے تمدن و ترقی کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ انگریزی زبان میں بلا کافی دست گاہ کے علوم مغربی کی تحصیل ممکن ہی نہیں - دنیا کے بیشتر حصوں میں انگریزی زبان بولی جاتی ہے اور اس کے علم ادب میں ترقی یافتہ دنیا کے تمام علوم داخل ہیں - ظاہر ہے کہ جیسے جیسے علوم میں ترقی ہوتی جاتی ہے - ہمیں علماء کی ایک ایسی کثیر اور جفاکش جماعت کی ضرورت محسوس ہوتی جا رہی ہے - جو ان کی کامل تحصیل کے بعد ہماری مادری زبان میں تمام علوم کو منتقل کرنے کے لئے اپنی ساری عمریں وقف کرے لیکن اہمیت کار کے لحاظ سے ممکن ہے کہ ابھی ایک مدت ہمارا یہ مقصد پورا نہ ہو سکے -

مغربی تعلیم سے غلامانہ ذہنیت نہیں پیدا ہوتی

یہ الزام کہ مغربی تعلیم پانے سے لوگوں میں غلامانہ ذہنیت پیدا ہوتی ہے قطعاً بے بنیاد ہے - اگر ہم آج کل کے یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ شخص کا مقابلہ کسی ایسے شخص سے کریں جو پرانے طرز تعلیم

(خواہ وہ عربی فارسی یا سنسکرت) سے مستفید ہو تو جہاں تک بنیادی تعلیم کا تعلق ہے ان دونوں میں نہایت درجہ فرق پایا جائے گا۔ اوّل الذکر شخص زمانۂ سلف کی اس نمایاں ترقی سے جو فلسفہ اور دیگر علوم میں قدما نے حاصل کی تھی بالکل بے بہرہ ہوگا اور اسی طرح آخر الذکر شخص بھی اس تمام ترقی سے جو زمانۂ حال میں ظہور میں آئی ہے نہایت درجہ ناواقف ہوگا۔ قدیم درسیات کے علماء کے دماغ علم کی اس وسعت و ترقی سے اثر پذیر نہیں جو بیرونی دنیا میں ہو چکی ہے۔ چونکہ قدیم علوم میں ان کی ساری دماغی طاقت صرف ہوئی ہے اس لئے وہ اسی کی ثنا و صفت کرتے رہتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح کے علم سے بڑھ کر اور کوئی علم نہیں ہو سکتا۔ ظہورِ اسلام کے پہلے ارسطو اور افلاطون جو سکھا گئے یا جو بو علی سینا قریب ہزار برس ہوئے لکھ گئے وہ پتھر کی لکیر ہو گئی اور اب اس سے زیادہ ترقی کرنا کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے۔ یہی وہ خیال ہے جس کی وجہ سے مغربی علوم کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور بلا تکلف اس کی توہین کی جاتی ہے۔ اسی لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ پرانی درسی کتابوں کا پڑھنے والا مغربی ممالک کی علمی ترقی و تحقیقات پر اعتماد نہیں کرتا۔ یہی نہیں بلکہ دورِ جدید کے آزادی و جمہوریت پسندی کے خیالات و تحریکات سے بھی ناواقف ہوتا ہے اور اس طرح دنیا کی موجودہ حالت سے یکلخت ناواقف و بے مَس رہتا ہے۔ ہمارے یہاں کے عالم سے عالم شخص کو بھی وہ کشادہ نظری نصیب نہیں جو ان مسائل سے ذاتی واقفیت رکھنے والوں یا یورپ و امریکہ کی تاریخِ حاضرہ کا مطالعہ کرنے والوں کو حاصل ہے۔ برخلاف اس کے وہ شخص جس کی تعلیم صرف مغربی طریقہ پر ہوئی ہے وہ یہ فرض کر لیتا ہے کہ علم کے معنی صرف مغربی علوم و فنون کی تحصیل ہے اور یہ کہ پرانی زبانوں کی کتابوں میں کوئی کارآمد بات نہیں پائی جاتی۔ اس کی یہ ناواقفیت اس درجہ ہوتی ہے کہ اس کے دل میں پرانے علوم کی کوئی عزت ہی نہیں ہوتی۔ مغربی علوم و شائستگی کی اس مبالغہ آمیز عظمت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا ذہن قدم قدم پر یورپین علماء کے معلومات و انکشافات کا دست نگر رہتا ہے۔ اور جب وہ اپنی حالت پر غور کرتا ہے تو متقابلتاً اپنے کو نہایت درجہ پستی میں گرا ہوا پاتا ہے۔ اس اعتبار سے موجودہ زمانے کے تعلیم یافتہ لوگوں کا ذہن یورپ کا تابع و محتاج رہتا ہے۔ مگر یہ الزام کلیتاً صحیح نہیں۔ باوجود اس یک طرفہ مطابقت کے خیالات میں تہور و آزادی کے علاوہ اپنی انفرادی خصوصیت کا حِس بھی پیدا ہو جاتا ہے اور جذبۂ خودداری و سلف ریسپکٹ میں اضافہ ہوتا ہے۔ اپنی خامیوں کا احساس اور اپنے ملک کی پست حالت کا خیال دل میں ایک زبردست

جذبہ ترقی پیدا کرتا ہے اور یہ جذبہ ترقی علم وشائستگی کا سبب بن جاتا ہے جس سے ملک وقوم کی حالت روبصلاح ہوتی جاتی ہے اور روز بروز قوم کی استعداد اور طاقت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے

دنیا بے ہمال کرو غرض کہ علم نہ تو کلیتاً مشرق کی پیداوار ہے اور نہ مغرب کی۔ تمام جدید و قدیم اقوام نے حسب مقدور اپنی اپنی چیزیں انسانی معلومات کے ذخیرے میں جمع کی ہیں۔ موجودہ مختلف ممالک کے صاحبان علم کا وہ متحدہ ذخیرہ ہے جو ہزار ہا سال کی انسانی تہذیب وشائستگی کے دوران ترقی میں تیار ہوتا رہا۔ اس لئے چونکہ اس کی جگہ اب بجائے مشرق کے مغرب ہوگئی ہے اُسے ترک کرنا کوئی عقل ودانش کی بات ہرگز نہیں۔ جس قدر مشرق زندگی کے مادی پہلو کے اعتبار سے آج کل مغرب کا مقلد ہے اُسی قدر مغرب کو بھی مشرق کی روحانی مملکت سے ابھی کچھ حاصل کرنا باقی ہے۔ مغربی ممالک کے جو شاندار کارنامے علم وفن کے متعلق ہیں اور امن عامہ وبہبود مادی کے لحاظ سے جو ترقیاں عمل میں آئی ہیں ان سے آنکھ بند کرلینا سخت غلطی ہوگی۔ مغرب کی اس حیرت انگیز ترقی کا راز یہ ہے کہ اس نے تعلیم عامہ کا معیار بہت بلند کردیا ہے۔

یونیورسٹی کا نصب العین

جامعہ کا فرض ہے کہ نو اور ماضیہ کی تحقیق کرکے اُن کی حفاظت وترقی کا سامان کریں۔ اُن کو مادی پیکر میں لاکر سنگ بنیاد قرار دیں اور اسی سنگین بنیاد پر ان تمام اکتشافات، تحقیقات، ادبیات اور مسائل سائنس کے محل تعمیر کرے جو تمام دنیا میں ہوں اور ساتھ ہی ساتھ وہ بھی ہوں جو خود اسی جامعہ کی کوششوں کا نتیجہ ہوں۔ جامعہ کی مساعیٔ حسنہ سے معلومات انسانی میں وسعتیں پیدا ہونی چاہئیں وہ ایسے کہ طلبار کے آئینۂ فہم وفراست پر نئی جلائیں کرکے ان میں تخیل وتصور کے نئے جوہر پیدا کئے جائیں۔ صرف جامعہ ہی ایسا باقاعدہ نظام ہے جس سے ترقی مستقل کا صحیح اندازہ لگایا جاسکتا ہے اس واسطے کہ یہاں جو طلبار آج تحصیل علم سے فارغ ہوکر نکلیں گے وہی کل جمہور کے لیڈر ہوں گے اور جس پیشہ میں داخل ہوں گے لوگ اُن کے نقش قدم چلیں گے تعلیم جامعہ کا مقصد سکنڈری تعلیم سے بالکل مختلف ہے۔ جامعہ کو بنفس خود ایسا جامع محکمہ ہونا چاہئے۔ جہاں تعلیم کی ہر شاخ میں اعلیٰ مراتب حاصل کئے جاسکیں۔ وہاں مقدار کی کوئی قدر نہ ہونی چاہئے بلکہ نوعیت

جگہ اعمال کو اصل معیار سمجھنا چاہیئے کسی جامعہ کے فوائد ان طلبار کی تعداد سے میزان عقل پر تولے نہیں جا سکتے جو سال بسال وہاں سے گریجوایٹ ہو کر نکلتے ہوں بلکہ تحقیق و تدقیق کے کاموں سے منافع کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ علوم کی تمام معلومہ شاخوں میں انتہائی درجہ کے حصول تعلیم کے لئے آسانیاں ہونی چاہئیں کسی جامعہ کی اہمیت ایک تو اس کے محققانہ کاموں سے اور دوسرے اس امر سے دریافت ہو سکتی ہے کہ اس نے خزینۂ علوم انسانی میں کس قدر اور کیسا اضافہ کیا ہے۔ جس جامعہ میں طبع زاد (اوریجنل) کاموں کا فقدان ہے وہ جامعہ امتحان کی ایک مشین ہے جس سے محض درس و تدریس اور تقسیم اسناد کا کام لیا جاتا ہے۔ وہاں ایسے اسناد جو سفر حیات اور مملکت معاش میں پروانۂ راہ داری بن سکیں بانٹے جاتے ہیں ایسے نام نہاد جامعہ کو ہم زیادہ سے زیادہ شاندار مدرسہ کہہ سکتے ہیں۔ اس کے اسناد حقیقتاً تہذیب پرست اور صحیح اخلاق کے ضامن ہونے چاہئیں۔ جامعہ کے معیار کو مسلسل بلند و بلند تر ہونا چاہیئے اس طور سے کہ سائنس اور ادب کے قابل اشخاص اپنی محنت شاقہ اور خالص توجہ سے کسی وقت دریغ نہ کریں۔ جامعہ کو محض تعلیم کا ایک تپلی گھر نہ ہونا چاہیئے بلکہ علوم و فنون کا مرکز بھی ہونا چاہیئے علوم ماضیہ کی حفاظت بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی جدید انکشافات کی جستجو۔ ابھی تک بہت سے خزائن علوم پوشیدہ جنھیں بے نقاب کرنے کی ضرورت باقی ہے۔ ہمارا فرض منصبی ہے کہ ظلمات گمنامی سے اپنے علوم و فنون ماضیہ کے گم شدہ چشموں کو ڈھونڈھ نکالیں ایسے محققین (اسکالرس) کی ضرورت ہے جو فلسفیات ماضیہ کا سراغ لگائیں اور انھیں موجودہ انکشافات کا ہم دوش و ہم رتبہ کر کے دنیا کے سامنے ایک جدید پیرایہ میں پیش کریں۔

پوسٹ گریجویٹ (بی اے کے بعد کی) تعلیم

بدنصیبی کی بات ہے کہ لوگوں کو پوسٹ گریجوایٹ تعلیم کی اہمیت کا صحیح اندازہ نہیں ہے۔ تحقیقات عالیہ کے لئے جو طلبار داخل ہوتے ہیں ان کی تعداد بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ محکمہ کے اخراجات نسبتاً بہت زیادہ ہوتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر عارضی دیکھنے والے کی نگاہ میں ہر شعبہ غیر ضروری طور پر بیجا اسراف کا سبب معلوم ہوتا ہے اور وہ تنقید کے لئے نہیں تفغص کے واسطے تیار ہو جاتا ہے۔ اہل جمہور صرف ایسی ہی تعلیم کے لئے چشم براہ رہتے ہیں

جو کسی اچھے پیشہ کی کفیل ہو سکے اور اس نفس تعلیم کی ترقی کی پرواہ ذرا بھی نہیں ہوتی مگر جب تک تعلیم کے اعلیٰ مدارج مہیا نہ کئے جائیں اور محقق کے لئے حوصلہ افزائی نہ کی جائے۔ خواہ کسی نگاہوں میں کوئی جامعہ سرچشمۂ الہام و آب حیات نہیں ہو سکتا اور نہ اس وقت تک تحقیق کے فدائی ترقی تعلیم میں کوئی حصہ لے سکیں گے اور نہ ملک کی تجارت یا صنعت و حرفت کو ان کی تحقیقات سے کوئی فائدہ پہونچ سکے گا۔ کہیں یہ نہ سمجھے گا کہ پوسٹ گریجویٹ تعلیم کا مقصد صرف انہیں چند طلباء کو فائدہ پہونچانا ہے جو برسرکار ہوں۔ نہیں یہ شعبہ جامعہ کے فرائض اعلیٰ کا مخزن و مرقع ہے اس کا سچا مقصد یہ ہے کہ علوم انسانی کے ذخیرہ میں اضافہ کیا جائے۔ اگر ایسے انکشافات کئے جائیں جن سے کاروبار کو فائدے پہونچ سکیں تو ملک کی اقتصادی حالت میں بہت کچھ ترقی ہو سکتی ہے جب تک اس قسم کے کام کسی ملک میں نہ ہوتے ہوں اس وقت تک اس کا شمار دنیا کی زبردست قوموں میں ہو ہی نہیں سکتا۔ اس واسطے کہ ان قوموں کا معیار صرف وہی اضافہ ہے جو ارتقار خیال انسانی میں کیا گیا ہو

یونیورسٹیوں کا اتحاد عمل | مختلف یونیورسٹیوں کا اتحاد اس نگاہ سے ضروری ہے کہ نظام و معیار میں ہم وضعی پیدا ہو سکے سرکار ہند نے ایک یونیورسٹی کو آرڈنیشن بورڈ (مرکز اتحاد جامعہ) قائم کیا ہے جہاں آپس کے صلاح و مشورہ سے عام تجویزیں عالم شہود میں آئیں گی۔ جب اتفاق و اتحاد ہو جائے گا تو مختلف یونیورسٹیاں مختلف تعلیم کے شعبوں میں خاص مہارتیں پیدا کر لیں گی اور ایسی صورت میں مختلف علمی شعبوں کی زائد از ضرورت کثرت یا تکرار نہ ہو سکے گی۔

یونیورسٹی کے آئینی اصول | بدقسمتی سے بہت یونیورسٹیوں کے لائحۂ عمل کے ماتحت متعدد کونسل کمیٹی فیکلٹی اور بورڈ قائم ہیں جہاں معلّمین کی شان عملی کاموں میں خصوصی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ چیزیں نہ صرف معلّمین کو اُن کی ذاتی علمی مصروفیتوں سے جدا کر کے وقت ضائع کراتی ہیں بلکہ باہر والی مجلسوں میں بھی بہت کم شرکت کا موقع دیتی ہیں لہٰذا وہی حضرات ہمیشہ اکثریت میں رہتے ہیں اور تمام معاملات پر قابو رکھتے ہیں۔ تعلیمی مسائل میں عملۂ معلمین کو واقعی اقتدار و اختیارات ملنے چاہئیں مگر دستور العمل اور کارفرمائی کے معاملات میں سے جن سے خود ارکین عملہ کے دامن بھی وابستہ ہوتے ہیں۔ ایک مکمل بیرونی عنصر کی موجودگی لازم ہے جو مختلف فیہ مسائل کا نہایت بے لوثی سے فیصلہ کر سکے جامعہ کی دوسری قابل غور کمزوری یہ ہے کہ علوم کی تمام شاخوں میں دسترس حاصل کئے جانے کی کوششیں نہیں ہوتی

یہ نہیں کہ مضامین میں کم کر کے خصوصی امتیازات حاصل کئے جائیں۔ جامعہ کے اعلیٰ مقاصد کے واسطے تو یہ کا انتظام یقیناً مضر ثابت ہوگا۔ چونکہ موجودہ صورت میں جامعہ سے مادی فوائد کے توقعات بہت زیادہ ہوتے ہیں اس واسطے اسناد کے حصول کی طرف بہت زیادہ توجہ رہتی ہو اور تحقیقی مساعی یا پوسٹ گریجویٹ تعلیم پس پشت ڈال دی جاتی ہو۔ باہر کی آدمی پر ایک چیز کا اثر اور بھی پڑتا ہے وہ یہ کہ مختلف شعبوں کے لئے ضوابط و قواعد کا پشتارہ بہت ضخیم ہے۔ یہ دستور صرف اپنی ضخامت کی بدولت رجسٹرار کے دفتر اور معلمین کی توجہ کا معتد بہ حصہ اپنی طرف مبذول رکھتا ہو اور اس دام کے پیچیدہ پھندوں سے رہائی پانے کے لئے رستم کی سی طاقت درکار ہے۔ جامعہ کا مقصد اولین یہ ہونا چاہئے کہ وہاں جس قسم کی تعلیم دی جائے وہ تعلیم ہر حیثیت سے مکمل ہو اور تحقیق اور تدقیق کے لئے خالص توجہ اور قوائے ذہنیہ کی تہذیب و ترتیب کے انمول جوہر معلمین میں پیدا ہوسکیں یونیورسٹیوں کو قومی زندگی کا جزو لاینفک ہونا چاہئے اور ملکی ترقیوں میں ان کو قابل قدر حصہ لینا چاہئے۔

دارالاقامہ مدرسہ یا کالج کے زمانہ میں ترقیات اخلاقی کے لئے بورڈنگ کی سکونت ناگزیر ہو۔ خوش قسمتی سے مسلمانوں میں قوم و قبیلہ کے امتیازات نہیں ہیں اس لئے وہ دارالاقامہ میں ایک فرد معاشی کی حیثیت سے مقیم رہتے ہیں اور ہم پیالہ۔ ہم نوالہ و ہم صحبت ہوسکتے ہیں۔ اگر ہر طالب علم ایک علیحدہ کمرے میں رہے اور اپنا خالص باورچی رکھے تو صحیح معنوں میں دارالاقامہ کی کوئی شان ہی باقی نہیں رہتی۔ علی گڑھ اور الہ آباد ایسے مقامات میں مسلمان طلبہ کے لئے جداگانہ عمارتیں اور مشترک دارالطعام موجود ہیں۔ اگر ہر ایسی جگہہ نہ سہی جہاں کہیں کالج موجود ہو تو بھی ضرورت ہو کہ کم از کم ہر جامعہ کے تمام مرکزوں میں اس قسم کے دارالاقامہ کھول دئے جائیں تاکہ اتحادی زندگی میں روزافزوں ترقیاں ہوتی رہیں

زنانہ تعلیم

زنانہ تعلیم بھی نہایت ضروری ہے مذہب اسلام نے علم کو اللہ کا نور اور تعلیم کو ایک روحانی تنویر قرار دیا ہے اور اس کی ضرورت اور اہمیت کو احکام ائمہ سے ثابت اور قائم کیا ہے۔ نعوذ باللہ یہ کیسے

ممکن ہے کہ اللہ قوم کے نصف افراد کی طرفداری کرے اور دوسرے نصف کو اس نور سے محروم رکھے۔ کوئی شخص کہیں سے ہمارے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی کوئی حدیث یا تلقینی ارشاد ایسا نہیں دکھا سکتا جس سے یہ ثابت کیا جا سکے کہ حضور والا نے کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے ذہن میں اس خیال کو جگہ دی ہو کہ مسلم آبادی کے زنانہ نصف حصّہ کو بالکل جہالت اور تاریکی میں چھوڑ دیا جا سکے۔ بغرض زمانہ موجودہ کے نقطۂ نگاہ سے بھی دیکھا جائے تو صاف عیاں ہے کہ قومی بیداری کی ترقی اور اعتماد نفس کی سچ پھلنے کے لئے اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ کل آبادی تعلیم یافتہ ہو۔ اگر ہندوستان کو تہذیب و تمدن کے میدان میں آگے بڑھنا ہے تو عوام کی ایک ہمہ گیر تعلیم نہایت ضروری اور قطعاً ناگزیر ہے اور لابدی امر ہے کہ یہ تعلیم ہر قسم و ہر نوع کی ہو اور اس میں جنس کی کوئی قید نہ ہو۔ وہ تمام دلائل جو تعلیم کے مفید ہونے کے حق میں پیش کئے جاتے ہیں اسی شدومد سے زنانہ تعلیم پر بھی منطبق ہوتے ہیں چنانچہ آج کل بہت کم لوگ ایسے باقی رہ گئے ہیں جو مرد اور عورت کے لئے مساوی طور پر مفید ہونے کے قائل نہ ہوں ہر شخص اس امر کو تسلیم کرتا ہے کہ کسی ملک و قوم کو ایسی ہمت کی مجال نہیں ہو سکتی کہ وہ اپنی آبادی کے ایک پورے نصف حصّہ کی طرف سے بالکل چشم پوشی کرے اور اسے قعر جہالت میں پڑا رہنے دے۔ ہمارے ملک میں زنانہ تعلیم نے بھی ترقی ضرور کی ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ ہمارے اس عجیب و غریب ہندوستانی رواج کی بنا پر کہ عورتوں کو ایک گوشہ میں بٹھا دیا جاتا ہے خود عورتوں کی طرف سے زنانہ تعلیم پر زیادہ زور نہیں دیا گیا اور اصرار نہیں کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ سرکار کی طرف سے زنانہ تعلیم پر اتنا روپیہ صرف نہیں کیا گیا جتنا کہ لڑکوں کی تعلیم پر ہوا ہے لیکن لڑکیوں کے اسکولوں میں ان کی کافی تعداد موجود نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اُن میں وہ تعلیم نہیں دی جاتی جو عورتوں کے لئے بہت زیادہ مناسب حال ہے۔

تعلیم کی نوعیت میں تبدیلی کی ضرورت ہے

اس امر کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ہماری مسلم قوم کو اس وجہ سے اپنی لڑکیوں کو معمولی زنانہ اسکولوں میں بھیجنے سے تامل ہوتا ہے کہ وہ ابھی تک اس مفاد سے ناآشنا ہے۔ جو لڑکوں کی طرح لڑکیوں کو بھی ادبی تعلیم کے حصول سے حاصل ہو سکتا ہے۔ یہ تامل اور پس و پیش کچھ تو اس سبب سے ہے کہ زنانہ اسکولوں اور کالجوں کے خصوصیات و کیفیات بالکل وہی ہیں جو لڑکوں کے مدارس کے

ہیں اور نصاب تعلیم بھی لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے قریب قریب یکساں ہو۔ لڑکوں کی طرح لڑکیوں کو بھی یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ بھی اسی طرح تعلیم حاصل کرنے کے بعد ان ہی کی طرح امتحانات میں شریک ہوں گی اور وہی ادبی امتحانات پاس کریں گی جو لڑکے پاس کرتے ہیں حالانکہ ہر شخص کو اس امر کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ لڑکیوں پر خانہ داری کے جو فرائض ماں بننے پر عائد ہوتے ہیں وہ ان فرائض سے بالکل مختلف ہیں جو لڑکوں پر سن بلوغ کو پہنچنے کے بعد عائد ہوتے ہیں عورتوں کے لئے اعلیٰ ادبی تعلیم مفید ضرور ہے لیکن نہ اس قدر کہ جتنی مردوں کے لئے مفید ہے۔ البتہ یہ دوسری بات ہے کہ عورتوں کو بھی مد معاش کے لئے وہی کاروبار اور پیشے اختیار کرنا پڑیں جن کی مردوں کو ضرورت ہوتی ہے۔ اگر لڑکیوں کے مدارس کی صورت وکیفیت کو بدل دیا جائے اور انھیں عورتوں کی ضروریات کے لئے زیادہ مناسب حال بنا دیا جائے تو ان مدارس میں لڑکیوں کی تعداد ضرور زیادہ ہو جائے گی۔

یہ بات آسانی سے ہر ذہن میں سما سکتی ہے کہ لڑکیوں کے مدارس میں تاریخ جغرافیہ صرف ونحو اور الجبرا کے مقابلہ میں سینے پرونے سوئی کا کام کرنے۔ لباس بنانے۔ کھانا پکانے۔ کپڑے دھونے اور حساب کتاب رکھنے پر زیادہ توجہ صرف کرنی چاہئے۔ لڑکیوں کے مدارس میں تدبیر منزل یعنی کفایت شعاری اور خوش اسلوبی کے ساتھ گھر کے رکھ رکھاؤ کی تعلیم خاص طور پر مفید ثابت ہوگی۔ لڑکیوں کو طرح طرح کے مربہ جات اور شربت تیار کرنے۔ مکھن اور پنیر بنانے۔ چھوٹے چھوٹے بکس شمع دان اور ٹوکریاں تیار کرنے طرح طرح کے کھانے پکانے۔ عمدہ عمدہ ترکاریوں کو انتخاب کرکے خوش ذائقہ طور پر پکانے صنعت کا کام کرنے اور گھر کے انتظام کے لئے ہر نوع کی ضروریات مہیا کرنے کی تعلیم دینی چاہئے۔ البتہ یونیورسٹی کی تعلیم ایسی چیز ہے کہ چونکہ اس کا مقصد بلند ترین اوصاف کے افراد پیدا کرنا ہے اس لئے وہ سب کے لئے یکساں ہونی چاہئے اور جو لڑکیاں اس قسم کے علوم حاصل کرنا چاہیں ان کو بھی وہی درسی کتب مطالعہ کرنی چاہئیں جو لڑکوں کے لئے ہوتی ہیں لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ ابتدائی اور ثانوی درجوں میں بھی جو تعلیم لڑکیوں کو دی جاتی ہے وہ بھی بعینہٖ لڑکوں کی سی تعلیم ہو۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اکثر لڑکیوں کو اپنے گھر میں مصروف ہو جانا پڑتا ہے اس لئے یہ ضروری ہے کہ اسکول کی تعلیم ختم کرنے سے پہلے وہ ان تمام

امور میں خاص تربیت پا چکی ہوں جن کی انھیں آئندہ زمانہ میں ضرورت پیش آئے گی۔ اصل یہ ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم کا کل نصاب تبدیل وضع کا محتاج ہے اور وہ لڑکوں کی تعلیم کے نصاب سے بالکل مختلف ہونا چاہئے لڑکیوں کے باب میں زیادہ ضرورت اس امر کی ہے کہ صحت جسمانی کے قواعد، امراض کی ابتدائی حالتوں کی روک تھام، نقشہ کشی، نقاشی، زردوزی وغیرہ فنون کی طرف زیادہ توجہ کی جائے۔ اگر ہمارے اس موجودہ نظام کو از سرتا پا تبدیل کر دیا تو یقیناً بہت مفید اور خوش آیند صورت پیدا ہو جائے گی۔ اس میں شک نہیں کہ آج کل امتحانوں کا جو نظام اور قاعدہ جاری ہے اس سے لڑکیوں کے ذہن پر بہت زیادہ بار پڑتا ہے۔ اور لڑکوں کی صحت پر اس کا اتنا برا اثر نہیں ہوتا جتنا کہ لڑکیوں کے مزاج پر ہوتا ہے۔ اگر عملی تعلیم پر زیادہ زور دیا جائے تو ان کو اس دماغی بار سے نجات ہو جائے گی اور ان کے قوی بھی اس بار عظیم سے سبکدوش ہو جائیں گے جس کا انھیں آج کل عادی بنایا جا رہا ہے۔

ہماری پستی اس میں مطلق کلام نہیں ہے کہ زمانہ تعلیم کے لحاظ سے ہماری قوم دوسری اقوام کے مقابلہ میں بہت پیچھے ہے اور اگر ہم بہت جلد اس پر اپنی ہمتوں کو صرف نہ کریں گے تو ہمارا درجہ و مقام روز بروز اور بھی زیادہ پست ہوتا جائے گا۔ تمام میونسپلٹیوں میں آہستہ آہستہ مفت اور جبری تعلیم قائم ہوتی جاتی ہے اور بہت ممکن ہے کہ لڑکیوں کے لئے خاص خاص مدارس قائم کئے جائیں۔ چھوٹی عمر کے بچوں کے لئے مطلق اس امر کی ضرورت نہیں ہے کہ ان کو علیحدہ مدارس میں تعلیم دی جائے تعلیم کے ابتدائی مراحل میں لڑکوں اور لڑکیوں کی یکجائی تعلیم کسی طرح مضر نہیں ہو سکتی۔ بلکہ مفید ثابت ہوگی۔ لیکن اندیشہ یہ ہے کہ اگر ہماری قوم اپنی لڑکیوں کو مناسب اور صحیح قسم کی تعلیم دینے کی کوشش نہ کرے گی۔ اور جب تک کہ لڑکیوں کی تعلیم کو ان کی ضروریات کے مطابق نہ بنایا جائے گا۔ ثانوی تعلیم کی طرف اگر صحیح اصول اور طرز پر دی جائے تو اس سے عورتوں کی ایک کثیر تعداد کی زمانہ حال کی ضروریات کافی و وافی طور پر پوری ہو جائیں گی اور ان کو اس قابل بنائے گی کہ وہ پوری قابلیت اور حسن لیاقت کے ساتھ اپنے گھروں کا انتظام کر سکیں اور ان کو بجا طور پر زینت دے سکیں۔

اعلیٰ تعلیم چوں کہ لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم بھی اسی اسلوب پر ہونی چاہئے جس پر لڑکوں کی تعلیم ہوتی ہے۔ لہذا ایسی تعلیم صرف ان خواتین کے لئے مناسب ہے جو مردوں کی طرح آزادانہ طور پر کسب معاش کرنے کی خواہشمند ہیں۔ پردہ

جس تشدد کے ساتھ مسلمانوں میں رائج ہے ان کے لئے سنگ راہ ہے۔ لیکن یہ ایسی سنگین رکاوٹ نہیں ہے کہ اسے کسی طرح عبور ہی نہ کیا جا سکے۔ کیوں کہ اس قسم کی آسانیوں کا انتظام موجود ہے کہ پردہ کا لحاظ قائم رکھتے ہوئے بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کی جا سکے۔ لڑکیوں اور عورتوں کے لئے متعدد ایسے اسکول اور کالج موجود ہیں جو بہترین اور عمدہ ترین سامان تعلیم سے آراستہ ہیں اور صرف عورتوں کے لئے وقف اور مخصوص ہیں۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے خواہشمندوں کے لئے ان مدارس کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔

طبابت ایک موزوں پیشہ ہے یہ خیال غلطی پر مبنی ہے کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین کے لئے کسب معاش کے ذرائع ناپید ہیں عالمانہ پیشوں میں سے کم از کم دو ایسے ہیں جو عورتوں کے لئے بالکل مناسب اور موزوں ہیں یعنی طبابت اور استادی کے شریفانہ پیشے۔ خصوصاً طبابت کا پیشہ ہندوستان میں عورتوں کے لئے نہایت ہی موزوں چیز ہے ہمدردی اور پُرشفقت نگاہ داشت اور پرداخت خواتین کی خاص صفات ہیں اور ان صفات کی ان پیشوں میں بہت ضرورت ہے۔ خود پردہ کی رسم کی موجودگی ہی اس بات کی کافی ضمانت ہے کہ زنانہ طبیبوں کے لئے کام کرنے کا وسیع میدان موجود ہے۔ ہندوستانی مریضہ کی فطری حیا مانع ہوتی ہے کہ وہ اپنے مرض کی کیفیت کو زنانہ ڈاکٹر کے سوا اور کسی سے بیان کرے۔ اور یہی امر اس بات کا یقین دلانے کو کافی ہے کہ اگر خواتین طبابت کا پیشہ اختیار کر لیں اور اپنے فن میں پوری ماہر اور قابل ہوں تو وہ اس کل طبقہ پر حاوی ہو سکتی ہیں

استادی بھی موزوں پیشہ ہے استانی کا شریف پیشہ بھی عورتوں کے مناسب حال ہے۔ جیسے جیسے دیہاتی علاقوں میں زنانہ ابتدائی تعلیم لازمی اور عام ہوتی جاتی ہے اسی کے ساتھ استانیوں کی ضرورت بھی ہوتی جائے گی اور ظاہر ہے کہ لڑکیوں کے مدارس کے لئے استانی خواتین کی مانگ ہوگی۔ ایسی صورت میں استانیوں کے لئے تعلیم گاہوں کے ایک باقاعدہ اور منتظم نظام کی ضرورت ہے۔ بلاشبہ یہ ہماری قوم کی بداقبالی کی علامت ہوگی کہ طبابت اور استادی جیسے دو شریف پیشوں میں ہماری خواتین شریک و شامل نہ ہوں۔

شذرات

نغمۂ طرب

(یہ نظم جناب قاضی بشیرالدین صاحب بی اے (علیگ) نے یونین کی رسم مسند نشینی کے موقعہ پر پڑھی تھی۔ اب ہدیۂ ناظرین میگزین کی جاتی ہے)

مدیر

خزینۂ تجلیات ابر نوبہار ہے — ضیائے طور منظر سواد لالہ زار ہے
فضائے اخضریں حسیں طرب گہ نواز میں — کرشمہ کوش دل نشیں ترنم ہزار ہے
ہوائے سمت مرغزار نغمہ زا و نور بار — سرود کوش آبشار حسن جوئبار ہے

شعاع مہر زخمہ ہے فضا خود ایک ساز ہے
مغنیٔ حیات کی یہ صوت جاں نواز ہے

چمن پہ کیا نکھار ہے کلی کے اس ابھار سے — یہ لطف جوئبار ہے ہوائے کوہسار سے
ترنم ہزار ہے بن اور شاخسار سے — بہار کی بہار ہے نوائے آبشار سے
یہ کون گلعذار ہے کہ جس کا انتظار ہے — جہاں طرب گسار ہے ہوائے مشکبار سے

پیامئے سروش ہے بہارے فروش ہے
ہوا سکوں بدوش ہے نوید نائے و نوش ہے

نسیم جانواز نے کھلائے گل چمن چمن — بکھر کے زلفِ ناز نے جہاں کیا ختن ختن
یہ فضل بے نیاز ہے عطائے کارساز ہے — کہ آج یونین بنا ہے خود ہی رشک یونین
غیاث صدر انجمن ہوئے بفضل ذوالمنن — تجھے ہے نصیب یونین تجھے فروغ علم و فن
حفیظ ناظم اور ذکی ہیں ان کے لائبریرین — خدائے کارساز نے جنھیں دیا ہے ذوق فن

بپا ہے جشن ہر طرف خوشی و اہتزاز ہے
کہ رامپور حامد ہال جلوہ گاہِ ناز ہے

شعاعِ مہ نے گوندھ کر شفق کے پھول تار میں — قزح کا رنگ بھر دیا ہے کہکشاں کے ہار میں

عروسِ شب سے لے کے یلدا ز منظر سے — رنگا ہے مشتری نے جا بجا صحنِ بہار میں
خوشی کے آنسوؤں کو پا کے آئی بلبلِ حزیں — سجا کے نرگسِ چمن کی چشمِ انتظار میں

گلے میں یہ جو ہار ہیں نگہ کے الجھے تار ہیں
شگفتہ دل ہمارے ہیں جو بن کے گل نثار ہیں

فدا ہمارے دل ہیں اور نثار تجھ پہ ہے فلک — ہم ترانہ ساز ہیں خوشی سے ہر طرف فلک
ہے فخر تجھ پہ اس قدر جہانِ اعتبار کو — کہ غلغلہ ہے یو مین کی شان کا قمر تلک
نہ کیوں ہو اس قدر خوشی کہ یہ خوشی ہے میکشی — گریں نہ جام ارتعاشِ شوق میں چھلک چھلک

تو میر کارواں ہے اب کہ تیرا اعتبار ہے
تو منتخب ہے پیشرو تجھی پہ اب مدار ہے

قدم اٹھا کہ منتظر تمام کا اب ہے کارواں — خدا ہے اپنا مہرباں نہ ہو ذرا بھی بدگماں
یہ مرکزِ امید ہے تو اب امید گاہ ہے — یہ آرزو کا باغ ہے تو اس کا اب ہے باغباں
دیارِ آرزو ہے یہ تو اس کا حکمراں ہے اب — یہ اپنا حسن آبرو تو آبرو کا پاسباں

او آبرو کے پاسباں کٹھن ہے راہ سروری
رکھ حوصلہ بلند تر کہ سیڑھی ہے چاکری

تو خود دمِ بہار بن فضائے لالہ زار بن — ہوائے جوئبار بن ترنمِ ہزار بن
شگفتہ ہو کلی کلی دلِ امیدوار کی — نوائے آبشار کی ندائے خوش گوار بن
اٹھ اب کہ صبح کے نشاں افق پہ ہو چلے عیاں — سن اے حجازی جواں تو ابرِ مشک بار بن

ہو نافہ تتار تو ہوائے عطر سار تو
فضا کو کر نگار تو کہ خود ہے رازدار تو

ربابِ کائنات کا حیات ایک تار ہے — کہ جس کے ارتعاش سے وجود نغمہ زار ہے

خزینۂ .... خزینۂ ...... خزینۂ تجلیات
ابر .... نوبہار .... ہے

علم ترکیہ نسل

اصطلاحات مستعملہ مضمون ہذا

1. Eugenics علم ترکیہ نسل	9. Nurture اکتسابی
2. Genetics علم التخلیق	10. Ovum بیضہ
3. Biometry اقتیاس الحیات	11. Embryo جنین
4. Human Evolution انسانی ارتقا	12. Separate twines علیحدہ توام
5. Natural Selection انتخاب فطری	13. Similar twines یکساں توام
6. Heredity توریث	14. Birth rate شرح پیدائش
7. Variation تغیر یا تغیر	15. Stud Breeding تولید خانہ
8. Environment جوار یا ماحول	

علم ترکیہ نسل سے ہماری مراد اُن کارآمد اصول سے ہے جو سوسائٹی کے ماتحت آنیوالی نسلوں کی نوعی خصوصیات میں کمی یا زیادتی کر سکیں۔ سرفرانسس گالٹن جو اس علمی تحقیقات کا رہنما سمجھا جاتا ہے علوم جدیدہ کے ماہرین میں نمایاں ہستی رکھتا ہے۔ دوسرے شعبوں میں گالٹن کی اکثر خیال آرائیاں محو کیجا سکتی ہیں کیونکہ علم ترکیہ نسل کی تابانی اولیں معلومات کے سامنے ماند پڑ جاتی ہیں یہ آیندہ نسلوں کا کام ہو کہ قصر شہرت میں ایسے شخص کو مناسب جگہ دیں جس نے ایک نیا موزوں طریقہ جس کے ذریعہ سے نبی نوع انسان بجائے ترقی بالذات کی بے سود توقعات پر قانع رہنے کے اپنی اصلاح اور بہبود کا کوشاں ہو سکے۔ حسابات کی غیر موجودگی اور عدم گنجائش کے باعث ہم اُن تعدادی جانچ میں مداخلت کرنے سے اس موقع پر قاصر ہیں جن پر گالٹن کے نتائج خصوصاً مبنی ہیں باوجود علم التخلیق

اور علم اِحیائیات کی مختلف النوع طریق تحقیقات کے ایک طرف اہل علم التخلیق اور دوسری جانب اہل الاحیائیات کے ترقی نسل کے نتائج میں تطابق اس لئے بڑی اہمیت رکھتے ہیں کہ شاید وہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ دونوں طریقے اپنے اپنے طور پر درست ہیں

اسی بنا پر ہم ان تحقیقات اور مباحث کے اقتباس کا تتبع کرتے ہیں جنہوں نے گالٹن کو موجودہ نتیجہ پر پہنچایا کہ بنی نوع انسان جسم، صورت، عادت اور ذہانت میں نمایاں ترقی کی خاصیت رکھتی ہے۔ اس مسئلہ کی اہمیت اس وجہ سے اور زیادہ ہے کہ نسلی ترقیات کی تحصیل اُن کی قدر کو اور بڑھائے گی اور بایں وجہ انسان کی خوشحالی میں اضافہ کریگی۔ لیکن اہل تزکیۂ نسل صرف نتائج سے مطمئن نہیں ہوتے وہ رجحانات جدیدہ اور خیالات عامہ کی زبردست طاقت کو موجودہ نمایاں بُرے روئے سے پھیر کر اور صحیح راستے پر لگا کر تبدیلی اور ترقی کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں

اس مشاہدہ کے سلسلے کی پہلی کڑی عرصہ دراز ہوا ڈاروِن نے معلوم کی تھی جبکہ اُس نے بتایا تھا کہ انسان نے سادے اور نیچے درجے کے حیوانات سے کتنا زیادہ فروغ پایا ہے۔ انسانی ارتقا اکثر تعلیم یافتہ حضرات کے عام عقلی مذاہب کا جزو اعظم ہے۔ تاہم اہل سیاست اور سخاوت اس کلیہ کو زمانہ موجودہ یا مستقبل میں استعمال میں لاتے نظر نہیں آتے۔ کوئی ان اہم نتائج کو حقیقی نہیں سمجھتا کہ اگر انسان نے زمانہ گذشتہ میں فروغ حاصل کیا ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ زمانہ گذشتہ میں بھی ترقی نہ کرے اور اگر نوع انسان زمانۂ ماضیہ میں تبدیلی پذیر ہوئی ہے تو اب بھی اس کی صلاحیت نہ رکھتی ہو اُن لوگوں کو جو خیالات عامہ اور خیراتی کاموں کے محرک ہیں یہ سمجھنا چاہیئے کہ ان کا طریقۂ عمل اُس ممکن الوقوع تبدیلی کی رو اور مقدار پر کس قدر اثر ڈالتا ہے۔

یہ یقین کیا جاتا ہے کہ انسانی ارتقا مثل دوسرے حیوانات کے بڑی حد تک انتخابی اثرات کا نتیجہ ہے۔ انتخاب کردہ فرق خواہ کم تھے یا زیادہ اِس بحث پر اثر نہیں ڈالتے قدیم زمانہ میں یہ انتخابی عمل ہولناک مقابلہ کا نتیجہ تھا جس کی وجہ سے وہ افراد جن میں کوئی خاص خوبی آ جائے زندگی کے مستحق قرار پاتے اور جو اس کے برخلاف ہوتے معدومی کا مزہ چکھتے تھے

تہذیب جدیدہ اور خیالات بہبود انسان نمایاں طور پر عمل انتخاب فطری کا سدباب ہو گئے ہیں۔ جس کے باعث

محدود میں نوع انسان کی ترقی غالباً بالکل مسدود ہو گئی ہو اور یہ خطرہ معلوم ہوتا ہے کہ شاید دور قہقری کا آغاز ہو گیا۔ سائنس حضرات کو یہ ناگریز نتیجہ تسلیم کرنا پڑتا ہے جو ان بیّن واقعات کو ملتے ہیں کہ انسان یکساں نہیں پیدا ہوا۔ بلکہ اپنے حق پیدائش کے لحاظ سے ہر جسمانی اور دماغی ساخت اور عادات میں نمایاں فرق رکھتا ہے اور گو ہر شخص بڑے بننے والا ہو سکتا ہو لیکن سوسائٹی کو وہ لوگ جنھیں ہمارے نزدیک جسمانی اور دماغی دونوں بہترین طور پر ودیعت ہوتے ہیں بڑے بننے کی پیدائش کی صلاحیت نسبتاً کم رکھتے ہیں

کیا ایسے عملی ذرائع موجود ہیں جن سے عدم اصلاح کی خاصیت کا مقابلہ کرکے نوع انسان کو فروغ کی جانب بڑھایا جا سکے ایسے ذرائع معلوم کرنے کے لیے اس بات کی ضرورت ہو کہ انسان کی حیاتی ارتقا کے ابتدائی اصول ہر ممکن طور سے بہم پہنچانے جائیں اس سے ہماری مُراد اصول توریث اور تغیر ہیں گالٹن ہی پہلا شخص ہے جس نے یہ بتایا کہ انسان کے نسلی توریث اور تغیر کے قوانین بالکل دوسرے ذی حیات کے قوانین کے مطابق ہیں اُس نے یہ بھی بتلایا کہ دماغی اور اخلاقی خصوصیات اُسی طور پر توریث ہوئے ہیں جس طرح جسمانی خصوصیات ہوتے اس مسئلہ کو وہ عام پسندیدگی حاصل نہیں ہوئی جو اس کا اصلی حصہ تھا باوجودیکہ پروفیسر کارل پیرسن نے اس کی تصدیق میں اور متعدد شہادتیں بھی بہم پہونچائیں

اکثر اشخاص کا یقین ہے کہ نوع انسان کی ترقی تعلیم اور سوسائٹی کی حالت کو فروغ دینے سے براہ راست اور مستقلاً اثر پذیر ہو سکتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ کسی شخص کی خوبیاں مثلاً تندرستی اور نیک خوئی وغیرہ اس کے جوار اور پرداخت پر اتنا ہی منحصر ہیں جتنا کہ اُس کی توریثی یافت پر۔ اس لئے قبل اس کے کہ ہم آگے بڑھیں یہ ضروری ہے کہ ہم اندرونی اور تعلیمی یعنی تخلیقی اور اکتسابی خوبیوں کی نسبتی اہمیت کو خوب سمجھ لیں۔ اس موضوع پر بہتر مشاہدے کی صرف ایک مثال ہے جو کہ گالٹن کی تحقیقات کا نتیجہ ہے

گالٹن کا مشاہدہ توام افراد کے حالات پر منحصر ہے توام افراد دو طرح کے ہوتے ہیں ایک قسم کے توام اُن حیوانات کے بچوں کی نوعیت کے ہوتے ہیں جو ایک ساتھ دو یا اس سے زیادہ بچے دیتے ہیں یعنی ہر بچہ ایک علٰحدہ بیضہ سے پیدا ہوتا ہے اور دوسری قسم کے توام وہ ہیں جو ایک ہی بیضے میں دو جنین کی ساخت کا نتیجہ ہوتے ہیں اول الذکر توام آپس میں عام بھائی بہنوں کی طرح مناسبت رکھتے اور اکثر متضاد صنف کے ہوتے

[illegible] توام یکساں ہوتے ہیں اور ہمیشہ ایک ہی صنف کے ہوتے ہیں لیکن ہماری موجودہ علم تحقیق کی [illegible] جب اُس نے پہلی مرتبہ اس مضمون پر خامہ فرسائی کی نامعلوم تھیں۔ ہمیں بتاتی ہیں کہ موقعاً [illegible] توام حقیقتاً یکساں اور ایک ہی توریثی یافت کے حامل ہوتے ہیں یہ کہنا اس موقع پر نامناسب نہ ہوگا کہ یہ ایک ہی فرد کے دو حصے ہیں جو بڑھ کر دو مکمل انسان ہو جاتے ہیں۔ ذخیرہ معلومات میں ایک طرف یہ معلوم کرنے کے لئے کہ یکساں توام مختلف حالات کے تحت میں کس قدر تغیر پذیر ہوتے ہیں اور دوسری جانب علیحدہ توام ایک ہی حالات کے ماتحت کس قدر مشابہ ہو جاتے ہیں۔ کافی مواد موجود ہے۔ گالٹن نے غالباً اسی یکساں توام کے حالات بہم پہنچائے۔ ان میں سے اکثر یکساں توام خصائل عادات اور صورت میں بڑی عمر تک مشابہ رہے۔ اور آخر عمر میں جب کبھی تبدیلیاں واقع ہوئیں تو کسی بیماری یا حادثے کے باعث جس سے توام کے صرف ایک ہی فرد پر اثر پڑا اس سلسلہ میں یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ خفیف وجوہات کے تدریجی اثرات بہت کم تبدیلی کر سکے

گالٹن لکھتا ہے کہ مجھے ایک مثال بھی نہیں ملتی جس میں ایک یا ہر دو افراد توام میں اُن کی مستقل آزاد خواہشات کے باعث کسی فرق نے اس لئے فروغ پایا ہو کہ وہ اپنی فطری خصوصیات پر شاداں رہے ان مشاہدات سے جو نتیجہ مرتب ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ پرورش و پرداخت خلقت کے مقابلہ میں نسبتاً بہت کم اثر رکھتی ہے اور یہ کلیہ علیحدہ توام کے حالات سے مصدق ہو جاتا ہے علیحدہ توام کے حالات اس بات پر ہم آہنگ ہیں کہ باوجود تربیت اور جوار کی یکسانیت کے اُن کی مختلف النوع خصوصیات میں کوئی مابہ الامتیاز تفاوت نہیں پیدا ہوا۔ اس مشاہدہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خیال کرنا درست ہے کہ انسان کی توریثی فطرت اُس کی تربیت اور ماحول کے مقابلہ میں اس کی آغاز شباب کی دماغی اور جسمانی بناوٹ پر زیادہ اثر رکھتی ہے اور عام تجربات کا ماحصل اس نتیجے کی مطابقت میں ہے۔

آپ ہر نسل کو یکے بعد دیگرے تعلیم دیتے رہیں۔ تاہم نقطۂ آغاز جہاں سے ہر فرد اپنی ترقی کی جدوجہد شروع کرتا ہے ایک ہی رہے گا گو کوئی متاخر اپنے متقدم پر تھوڑی سبقت بھی لے اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ بعض اوقات ہم ایسے ہشاش بشاش اشخاص سے بھی روشناس ہوتے ہیں جن کے لیے صحیح کام کرنا اور مشکلات حیات میں بے ہراس

جو فطرت ثانیہ ہے یہ خوبیاں خلقی ہی کیسی نہیں۔ اسی وجہ سے ان کی اولاد کو توریث ہوتی ہیں۔ کچھ لوگ بڑے ہوتے ہیں اور بعض بڑائی حاصل کرتے ہیں اور چند پر بڑائی ڈال دی جاتی ہے۔ لیکن وہ لوگ جو بڑے پیدا ہوتے ہیں یعنی نہیں جو بڑے مرتبہ پر ہوں بلکہ وہ جو بذات خود بڑے ہوں یہی وہ فرد ہوتے ہیں جن کے اخلاف کی طرف ہم کو آئندہ اصلاح خلقت کے لیے نظر جانا چاہیے۔

اگر یہ نظریہ منصفانہ ہے تو ہم اس پر مجبور ہیں کہ اپنے سوشل قوانین کی موزونیت کے خیالات پر بغور نظر ثانی کریں تعلیم اور صفائی وغیرہ خواہ کتنی ہی اہمیت رکھتی ہوں لیکن صرف محدود اثر رکھتی ہیں اچھے اور بڑے افراد کی نسبتی شرح پیدائش ہی ہماری ترقی کا جزو اعظم ہے اس کا اثر گو ایک پشت میں اتنا خفیف ہو کہ احاطہ احساس میں نہ آسکے لیکن اس کا اثر ہر نسل میں بڑھتا رہیگا اور علاوہ ازیں جب ایک مرتبہ پیدا ہو گیا پھر ختم نہیں ہو سکتا اس لیے ہم کو اندازہ کرنا چاہیے کہ زمانہ حاضرہ میں شرح پیدائش کی کیا نسبت ہے اور کون سے وجوہ اس پر اثر ڈالتے ہیں ہمیں خاص طور پر اس کا اندازہ کرنا ہے کہ آیا موجودہ قوانین جن کا مقصد تعلیم اور بچوں کی پرداخت کو ترقی دینا ہے کسی نوع سے براہ راست یا بالواسطہ سوسائٹی کے مختلف گروہ کی نسبتی شرح پیدائش پر اثر ڈالتے ہیں پس اگر ایسے قوانین کمتر درجہ کے لوگوں کی شرح پیدائش کے حامی ہیں تو یہ مسئلہ بڑے غور و فکر کا محتاج ہے کہ آیا ایسے ایک فرد کی دماغی اور جسمانی ترقی کی سہولتیں مہیا کرنا تمام نسل انسانی کو عظیم نقصان پہنچانا ہے

ہر شخص و نیز حکومت کے لئے بہتر ہوگا کہ اس قسم کی پُر مغز کارروائی کے ممکن نتائج کو بغور دیکھے۔ اس لئے اس موقع پر ہم گالٹن کا خیال پیش کرتے ہیں جو قابل لحاظ ہے یہ روشن ہے کہ عموماً ہر قوم کی عادہ و دہش کا بہت بڑا حصہ بلا شبہ براہ راست یا بالواسطہ نااہل افراد کی افزونی کا باعث ہوتا ہے۔ بجائے اس کے وہ زر کثیر اور غور و فکر جو ممالک خیرات پر صرف ہوتے ہیں افراد موزوں کی بہتری اور افزونی پر لگائے جائیں اس کو اور واضح کرنے کے لیئے ہم حال کے شادی شدہ افراد کو اُن کے بچوں کی اغلب تمدنی قدر کے لحاظ سے تین حصوں میں تقسیم کریں تو ان میں ایک مختصر گروہ سالم اور پسندیدہ افراد کا ہوگا اور دوسرا مختصر حصہ ناقص اور ناپسندیدہ افراد کا اور تیسرا حصہ ایک بڑی جماعت کا ہوگا جو کہ ہر دو متذکرۂ بالا حصص کے درمیانی خصوصیات کا حامل ہوگا اگر تمدنی اور اخلاقی امداد و نیز مادی سہولتیں پسندیدہ افراد کے لئے بہم پہنچائی جائیں اور ناپسندیدہ اور نااہل افراد کے لیے مخصوص نہ کی جائیں تو ملک کے لئے

کہ [illegible]

اب ہم کسی قوم کے مختلف گروہ کی نسبی شرح پیدائش پر غور کریں یہ بذات خود بڑا اہم مسئلہ ہے اس کا حجم بلحاظ گنجائش کے باعث ہم صرف مسٹر ہیرن کی تحریر سے چند اعداد نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں،

شرح پیدائش	شق اول	جرائم پیشہ	۶،۶
		گونگے اور بہرے	۶،۲
		ناقص دماغ والے	۷،۰
	شق دوئم	اہل حرفہ و پیشہ	۵،۱
		اہل فراست	۴،۷

اس کا یہ مطلب ہے کہ اگر کوئی اس امر پر غور کرے کہ شق اول کے افراد بہ نسبت شق دوئم کے افراد کے غالباً چند سال قبل شادی کرتے ہیں اور اس طور پر عیبی یا ناقص دماغ والے بہتر دماغ والوں کی بہ نسبت دوچند رفتار سے فرض تولید سرانجام دیتے ہیں تو اُس کو اس میں شبہ کی گنجائش نہ باقی رہی گی کہ اس تناسب کا کیا نتیجہ ہوگا؟ خود مسٹر ہیرن کہتے ہیں کہ نوع انسان کی ترقی بہتر اور پسندیدہ جماعت کے افراد کی محتاج ہے اس لئے اگر ان اصول کو بطور کلیہ خود مہذب اشخاص نہ تسلیم کریں گے یا اہل سیاست مدنی قوانین کا جزاعظم نہ بنائیں گے تو نوع انسان میں دور قہقری شروع ہو جائیگا۔ یہاں تک کہ نسل انسانی بربریت کا شکار ہو جائیگی۔ ممکن ہے کہ پھر غیر منظم فطری انتخاب کے پرآشوب مدارج سے گزر کر فروغ پائے

جماعت کے مختلف طبقات کی شرح پیدائش کے فرق کی ذمہ داری بڑی حد تک بے شبہ اہل فراست کی عمداً پیدائش کی رکاوٹ ہے جب کوئی شخص اپنی محنت کی بدولت کسی خاص درجہ کا آرام اور آسائش حاصل کرلیتا ہے تو طبعاً اپنی اولاد کے لیے اچھے آغاز اور اسی درجہ کی سہولیتوں کے مہیا کرنے کا متمنی ہوتا ہے اور جب اُسے معلوم ہے کہ یہ امر آسان ہو جاتا ہے اگر افراد خاندان کی تعداد محدود ہو تو ایسی صورت میں اس اصلیت سے اس کا مستفید ہونا بالکل قابل الزام نہیں ہے اگر ایسے افراد کے اولاد کی تعداد بہ نسبت ناقص درجے کے افراد کی اولاد کے کثیر ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ

بچوں کو عموماً اپنے والدین سے پیچھے رہنے پر قانع ہونا پڑیگا۔ معاملات کا یہی رخ از روئے نسلی ترقی اور قومی فلاح زیادہ پسندیدہ ہے کیونکہ اسی صورت میں کوئی خاص منصب اپنے پیش رو منصب دار کے بہ نسبت بہتر اور پسندیدہ افراد سے پر ہو سکتا ہے

حکومت کے اخراجات پر ناقص درجے کے افراد کی قومی تعلیم اور تجویز کردہ طریق پر درشت پرداخت ایسے دستور العمل ہیں جو کہ مختلف جماعتوں کی نسبتی شرح پیدائش پر چند خاص قسم کے اثرات پیدا کریں گے یہ سب کچھ سالم اور پسندیدہ گروہ کے اخراجات پر ہوتا ہے جس کی وجہ سے اُن کی تولیدی صلاحیت میں اور تنایاں کمی واقع ہوجائیگی ایسے دستور العمل اُسی وقت منصفانہ ہوں گے جبکہ اس شرح پیدائش کی خطرناک تفریق کو درست کیا جاسکے اور قوانین کے دونوں پہلو یکساں کیجائیں بچوں کی تعلیم اور تربیت کے قبل اُن کی توریثی یافت میں ترقی نہایت ضروری ہے اس لیے اگر حکومت تربیت اور تعلیم کی ذمہ دار ہوگی تو اُسے اس بات پر بھی مصر ہونے کا حق حاصل ہوگا کہ بچوں کی توریثی یافت پسندیدہ ہو لیکن موجودہ صورت میں یہ امر لا حاصل ہے

مسئلہ مذکور کا علاج افلاطون سے لیکر اب تک رفاہ عام کے کارکن تجویز کرتے رہے ہیں لیکن ان تمام تر تجاویز کے خلاف کہ نوع انسان تولید خانوں کے اصول پر چلنے کیلئے کا یہ اعتراض قائم ہے کہ کون ضروری انتخاب کرنے کی اہلیت رکھتا ہے سالم اور ناقص افراد متمدن کے نکات معلوم کرنا کسی دیگر جانور کی خصوصیات کی دریافت سے بدرجہا مشکل ہے۔ جبتک زندگی کی عملی مشکلات اُبھار کر خصوصیات کو پورے طور پر واضح نہیں کرتیں اُس وقت تک اکثر لوگ اپنی شخصیت کو ظاہر نہیں کرتے اور اس صورت میں قبل اس موقع کی آمد کے خرابی اپنا کام کر چکتی ہے اس لئے اگر وہ ناقص قسم کے ہیں تو اُن کو اپنی تعداد بڑھانے کا موقع حاصل ہو چکتا ہے اور اس طور پر انتخاب بے کار ثابت ہو جاتا ہے۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ بے رحمی جو بیا کا نہ انتخاب کے لیے ضروری ہے خود اتنی بڑی غیر متمدن خصوصیت ہے کہ اگر اسے کبھی کام میں لایا گیا تو تمدن بد سے بدتر ہو جائیگا اس لئے یہ طریقہ اعلیٰ تمدنی خوبیوں کی ترقی کے براہ راست خلاف ہے

اس لیے تزکیہ نسل کہ طالب علم کو ایسے طریقے واضع کرنے چاہئے جو کہ ایک طرف اصلح اور پسندیدہ افراد کی شرح پیدائش میں معتد بہ اضافہ اور دوسری جانب ناقص اور ناپسندیدہ افراد کی شرح پیدائش کمتر کرے۔ ایسی تجاویز کافی

طور پر اکثر مواقع پر پیش کیا جا چکی ہیں۔ بہت سے موجودہ ڈاکٹر اس بحث میں مشغول ہیں کہ ناقص افراد یعنی نسلی بیماریوں کے حامل خفیف و تزار پاگل اور دیگر افراد جو امراض مزمنہ و متعدیہ میں مبتلا ہوں شادی سے بالکل روک دیے جائیں کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کارروائی زیادہ ظالمانہ ہوگی؟ یقیناً اگر یہ لوگ غیر مبدل قانون توریث کو سمجھ لیں تو وہ خود آیندہ ناقص نسلوں کے وجود کا باعث بننے کی خواہش نہ کریں اس لئے اگر ایسے اسفل خیالات کے لوگ موجود ہوں جن کو یہ مسئلہ اپنی جانب رجوع نہ کر سکے تو یقیناً ایسی شادی اسی قسم کے تشدد کی مستحق ہے جیسے کہ دوسرے جرائم۔ ہم خفیف جرم کرنے والے کو نہایت شد و مد کے ساتھ روکتے اور سزا دیتے ہیں تاہم ایسے افراد کی شادی جرم نہیں قرار دیتے ہیں۔

تندرست اور پسندیدہ افراد کی شرح پیدائش کی زیادتی کے متعلق بھی تجاویز پیش کی گئی ہیں گالٹن لکھتا ہے کہ تزکیۂ نسل کا پہلا مقصد ناقص افراد کی شرح پیدائش کو کم کرنا اور دوسرا مقصد موزوں افراد کی جلد شادی اور ان کے بچوں کی مناسب پرورش کو فروغ دے کر نسل انسانی کو ترقی دینا ہے۔ انتخاب فطری کثرت پیدائش اور مکمل فقدان پر منحصر ہے لیکن علم تزکیۂ نسل صرف بہتر نسل کے افراد کی پیدائش کا جن کی بہتر پرورش ہو سکے حامی ہے۔

ایک مکمل متمدن قوم جس میں ہر فرد قوم اپنی آمدنی حکومت سے حاصل کرتا ہو مسٹر مکڈوگل کی نئی تجویز پر عمل کار لائی جا سکتی ہے اس تجویز کا مقصد یہ ہے کہ آمدنی کا تقرر شادی اور تعداد اولاد پر ہو اس طور پر صاحب اہل و عیال کی حالت اچھی ہو جائے گی اور شرح پیدائش میں افزونی کا امکان زیادہ ہو جائیگا

گو کہ ایک قوم کی فلاح و بہبود بڑی حد تک ہر فرد کی دماغی و جسمانی صحت پر منحصر ہے تاہم ایک باموقع دانشمند کی پیدائش دنیا کی رفتار ترقی میں بڑا فرق پیدا کر دیتی ہے۔ گالٹن نے اس کو پورے طور پر واضح کر دیا ہے کہ اوسط خاندان کے والدین کی بہ نسبت ذہین اور نمایاں والدین کی اولاد میں دانشمند کی پیدائش کا زیادہ امکان ہے اس لئے اگر صلح اور اکمل افراد کی شرح پیدائش کو زیادہ ترقی دی جاے تو دانشمند کی پیدائش کا موقع بہت بڑھ جاتا ہے۔

اس طویل بحث کو مسٹر پیرسن نے مختصر طور پر یوں واضح کیا ہے "چونکہ قوت ادراک توریث ہوتی ہے اس لیے مجھے اس میں بالکل شبہ نہیں ہے کہ جرائم کی صلاحیت بھی منتقل ہوتی ہے آج ہم اپنے مجرموں اور پاگلوں کی پرورش کرتے ہیں بعد ازاں ہم ان کو جیل یا پاگل خانوں سے نکال دیتے ہیں خواہ ان کی اصلاح ہوتی ہو یا نہیں تاکہ زبون

ناقص افراد کی نئی نسل کی بنیاد ڈال کر چند ماہ بعد وہ پھر حکومت کی نگہداشت میں آ جائیں۔ توریث کے نقطۂ نظر سے ہم پاگل اور جرائم پیشہ کی اصلاح نہیں کر سکتے۔ خلق کے اچھے ہونے سے کچھ نہیں بدلتی کیونکہ خلق جسمانی تاثرات کا نتیجہ ہے اور نہ مادے نسل کا۔ جرائم پیشہ کی تعلیم مدقوق کو پاک صاف ہوا اور نحیف و نزار کو آرام اور غذا اچھے کام ہیں اس کی وجہ سے فرد مخصوص کی اصلاح ممکن ہے۔ لیکن اس عمل سے اُن کی اولاد ان نقائص سے نہیں بچ سکتی۔ اس سے افراد قوم کے دماغ اور جسم کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ اس قسم کے کام خرابیوں پر پردہ ڈالتے ہیں۔ ہمارا بڑھا ہوا انسانی احساس ہم کو انتخاب فطری کی بیرحمانہ مدد سے قوم کی اصلاح ہوتے ہوئے دیکھنے کی اجازت نہ دیگا۔ ہم دردِ مصیبت محسوس کرتے ہیں تو صرف اس لئے کہ اس سے مصیبت زدہ کو بغیر اس کے خلق یا اس کی قومی یا نسل قدر کی جانچ کے چھٹکارہ دلا سکیں۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ کوئی شخص خود اپنے وجود کا ذمہ دار نہیں ہے وہ ایسا ہی بُرا یا بھلا ہے جیسا کہ خلقت اور پرداخت نے جس پر اس کا کوئی اختیار یا قابو نہیں ہے بنا یا ہے لیکن اس موقع پر سائنس واضح کر دیتی ہے کہ کوئی قوم اپنی برتری کو اُس وقت تک قائم نہیں رکھ سکتی جب تک کہ غالب شرح پیدائش بہتر دماغ یا جسم والے افراد کی نہ ہو۔ اس لئے اگر آپ سالم اور بے نقص افراد کی پرورش کریں تو نقائص اور بربادی سے محفوظ رہکر ترقی کرتے رہیں گے،،

لیکن قبل اس کے کہ کوئی حقیقی اور نمایاں ترقی ممکن ہو قانون توریث کے خاص اصول کی معلومات عوام کو ہونی چاہیئے اس لیئے ایسی سوسائٹی کی ضرورت ہے جو اس قسم کے اہم کام سرانجام دے سکے کیونکہ صرف نسل انسانی کی اصلاح پر ہماری آئندہ ترقی کا دارومدار ہے

سید محمد رضوان اللہ بی۔ ایس۔ سی۔ گورکھپوری

"تجلیات"

پوچھتے ہو کہ سرِ وحدت کیا — ماسوا کی بھلا حقیقت کیا
ہم نہیں جانتے قیامت کیا — آج اگر تم ملو قباحت کیا
نقدِ ہستی نثارِ یار کرے — یہ نہیں ہے تو پھر محبت کیا
واعظو! اس کو دیکھ لو پہلے — پھر کہو حور کیا ہے جنت کیا
اِس کے حقدار ہم شرابی تھے — اہلِ تقویٰ و ابرِ رحمت کیا
اُس سے مِل جو ہمیشہ ساتھ رہے — بیوفاؤں سے لطفِ صحبت کیا
عاشقی میں ہے محویت درکار — راحت وصل و رنج فرقت کیا
جن میں چرچا نہ کچھ تمہارا ہو — ایسے احباب ایسی صحبت کیا
ملنے والوں سے راہ پیدا کر — اُس سے ملنے کی اور صورت کیا
باغِ رضواں بھی باغ ہے آخر — سیرِ گُل کے لیئے ریاضت کیا
اور ہمت بلند کر اے شیخ — طمع و خوف کی عبادت کیا
بس تمہاری طرف سے جو کچھ ہو — میری سعی اور میری ہمت کیا
یوں ملو اُس سے میں کہ میں بھی نہ ہوں — دوسرا جب ہوا تو خلوت کیا
گوشہ گیری حدیثِ نفس کی ساتھ — دل بھی مجمع میں ہے تو عزلت کیا
کہیں تیرے سوا کوئی ہے بھی — بدگمانی کی مجھ سے علت کیا

آسیِ مست کا کلام سنو
وعظ کیا پند کیا نصیحت کیا

(آسی غازی پوری)

خواتینِ مصر کے خطوط

مندرجہ ذیل خطوط کو ترجمہ کی شکل میں متعارف کرانے کی بظاہر ضرورت نہیں ہے اس لئے کہ جو شخص اس مراسلت کا محرک تھا اس نے خود خطوط کے شروع میں ایک تمہیدی خط تمام خواتین تعلیم یافتہ کے نام اپنی طرف سے شائع کیا ہے جس میں اُس نے ایک حد تک اس مراسلت کی وجہ کو ظاہر کر دیا ہے۔ اس جگہ یہ بتا دینا ضروری ہے کہ مراسلت کا یہ مجموعہ ستمبر ۱۹۱۰ء میں مصر کے ایک قدیم رسالہ "انیس الجلیس" میں شائع ہوا تھا۔ جو ایک ماہوار رسالہ تھا اور اسکندریہ سے ایک خاتون کی زیرادارت شائع ہوتا تھا۔ (مترجم)

خواتین تعلیم یافتہ!

میرے اور آپ لوگوں کے درمیان ایک واقعہ پیش آیا تھا جو مخفی تھا لیکن میں ضروری سمجھتا ہوں کہ میں اپنے "انیس" کے صفحات پر اس راز کو ظاہر کر دوں تاکہ آپ اپنا مبلغ علم معلوم کر لیں۔ اور اپنی تعلیمی حالت پر افسوس کریں۔ اگرچہ میں جانتا ہوں کہ اس افشاء راز سے آپ مجھکو ملامت کریں گی لیکن فرزندان وطن کی محبت نے اس افشاء راز پر مجھے آمادہ کیا۔ لہٰذا اگر میں نے اتنی خدمت انجام دی تاکہ آپ کو اپنی خرابیاں معلوم ہو جائیں تو مجھ پر کوئی ملامت نہیں پڑ سکتی ہے میں نے اخبار "مصور" میں حسب ذیل اعلان شائع کیا تھا۔

"ایک مسلم نوجوان ایسی خاتون سے خط و کتابت کرنی چاہتا ہے جو پڑھی لکھی ہو اُس کا نام یا ذات معلوم کرنے کی ضرورت نہیں ہے"

"بشرطیکہ اُس کی عمر بیس برس سے زیادہ نہ ہو۔ پتہ نمبر ۱۱ سیدہ زینب[1] مصر" اس اعلان کے شائع ہوتے ہی خطوط کی بوچھاڑ ہونے لگی جن کی تعداد چھپن تھی۔ اُن میں آٹھ کے متعلق میں سمجھ گیا کہ مردوں کی طرف سے ہیں اور

---

[1] "سیدہ زینب" قاہرہ (مصر) میں ایک محلہ کا نام ہے چونکہ حضرت سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کا مزار شریف وہاں ہے اس لئے یہ محلہ اسی نام سے موسوم ہے (مترجم)

،اسکے متعلق مجھے یقین ہو گیا کہ پڑھی لکھی خواتین کی طرف سے ہیں۔ چنانچہ جو مردوں کی طرف سے آئے تھے ان کو تو میں نے دیا سلائی دکھائی اور ان کی حماقت پر خوب ہنسا کہ انھوں نے اپنے تئیں عورتوں کے زمرہ میں لا کھڑا کیا۔ لیکن جو خواتین کے خطوط تھے اُن سب کو مع ان کے جواب کے میں شائع کرتا ہوں تاکہ اُن کے لکھنے والیوں کے اخلاق سے آپ باخبر ہو جائیں یا دوسرے الفاظ میں آپ کے لئے وہ نشاط انگیز ہوں۔ میرے پاس ایک خط اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون کا پہونچا جو ہمارے ملک میں واحد پڑھی لکھی اور تربیت یافتہ بی بی ہے اس کی مجھ سے طویل خط و کتابت ہوئی ہے۔ جس کو میں آئندہ کے پرچہ میں شائع کرونگا۔ لیکن باقیماندہ یہ ہیں،

(۱) جناب فاضل۔ ،، سیدہ زینب رضی اللہ عنہا وغیرہ وغیرہ۔

میں نے "مصور" مجریہ ۲۴ جنوری ۱۹۰۳ء نمبری ۴۴ پڑھا۔ اس میں میں نے آپ کی طرف سے یہ اعلان دیکھا کہ آپ کو ایک ایسی خاتون کی ضرورت ہے جو آپ سے خط و کتابت کرے آپ کو اُس کے نام اور ذات کے معلوم کرنیکی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن جناب یہ تو فرمائے کہ وہ کونسی خاتون ہوگی جو پردہ میں ماں کے پاس رہکر آپ سے سنگی کریگی آپ کے لیے بہتر یہ ہے کہ کسی فرنگی عورت کو ٹٹولئے جو آپ کے اعلان کو لبیک کہے۔ اور ان لڑکیوں کی طرف توجہ نہ فرمائیے۔ سب سے زیادہ میرے لئے مضحکہ خیز بات یہ تھی کہ آپ بیس برس سے زیادہ کے متلاشی نہیں ہیں۔ اور پھر آپ یہ کہتے ہیں کہ آپ (محلہ) سیدہ زینب میں رہتے ہیں مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں سیدہ زینبؓ آپکے اس قسم کی حرکت پر کوئی نقصان نہ پہونچائیں

میں نے اس کو جواب دیا:-

"آپ کا جواب پہونچا۔ آپ کے لئے مناسب ہے کہ اس بدتمیزی سے لوگوں کو مخاطب نہ کیا کریں اس کے ساتھ ہی آپ سے یہ کہونگا کہ اس کے بعد مجھ سے خط و کتابت نہ کریں"

(۲) جناب صاحب دستخط ،،

اس ہفتہ کا "مصور" مجھے پہونچا۔ اس میں میں نے ایک عجیب اشتہار دیکھا کہ اس سے پہلے میں نے نہ کسی عربی اخبار میں پڑھا اور نہ فرنگی میں بالخصوص اُس کے وہ شرائط پڑھکر جو آپ نے اشتہار میں لکھے ہیں مجھے سخت تعجب ہوا۔ آخر اس کے کیا معنی ہیں۔ مجھے مطلع کیجئے تاکہ میں آپ سے خط و کتابت کروں۔ آپ کے اطمینان کے لیے یہ لکھے دیتی

بعد کتاب کچھ خوف نہ کریں میری عمر اس وقت ۲۰ سال کی ہے

میں نے جو کچھ مضمون اس کے جواب میں بھیجا وہ یہ تھا:۔ "تم نے جو یہ لکھا کہ اس قسم کا اعلان نہ تو کسی عربی دیار میں کیا اور نہ فرنگ میں، یہ بالکل غلط ہے اور چونکہ تم وہ خاتون ہو جن کی مجھے خط و کتابت کے لیے تلاش نہیں ہے اس لئے امید ہے کہ آیندہ سے خط و کتابت نہ کرو گی" اس طرح سے میرے اور اس کے درمیان خط و کتابت ختم ہوئی

(۳) جناب فاضل

تم نے جو کچھ "مصور" نمبر ۴۴ میں لکھا وہ صرف اس لئے لکھا تاکہ خواتین کے اخلاق کا مطالعہ کر کے ان کے متعلق کچھ آپ لکھیں۔ میں اپنی بہنوں کی طرف سے آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ آپ کی یہ شرط کہ آپ ایسی عورت سے خط و کتابت کرنی نہیں چاہتے ہیں جس کی عمر بیس سال سے کم ہے۔ آپ کو اس کا حق ہے لیکن وہ لڑکی جس کی عمر بیس سال سے زیادہ ہوگی یا تو شادی شدہ ہوگی اور یا نہیں۔ اگر شادی شدہ ہوگی تو اس کا شوہر خط و کتابت سے مانع آئیگا اور اگر نہیں ہوگی تو اس کے بے بیاہے ہونے کا رنج ہی اس کی مصروفیتوں کے لئے کافی ہے۔ لیکن میں ایک متوفی فوجی افسر کی لڑکی ہوں میری ماں ہے جو مجھ سے بے انتہا محبت کرتی ہے میرے کوئی اور بھائی بہن نہیں ہیں اسی وجہ سے میری ماں نے گھر بار میرے سپرد کر دیا ہے ہماری آمدنی ۱۲ پونڈ (قریباً ۱۸۰ روپیہ) ماہوار ہے ابتک میری شادی نہیں ہوئی کیونکہ میری عمر ۱۸ برس کی ہے بس اگر آپ کی عمر اس سے کم یا زیادہ ہے تو مجھے مطلع کیجئے اور ساتھ ہی آپ اپنی حالت سے مطلع کیجئے تاکہ میں پھر آپ کو لکھوں۔ ...

میں نے جواب دیا:۔

"مجھے افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ میرے اس خط کو آپ آخری سمجھئے کیونکہ آپ وہ خاتون نہیں ہیں جن کی مجھے تلاش ہے۔ اور ساتھ ہی یہ میں مشورہ دونگا کہ محض غیر سے جس کو آپ نہ جانتی ہوں خط و کتابت میں اتنی جرأت نہ کیا کریں"

اس کے جواب میں اُس نے ایک معذرت نامہ بھیجا جس کا میں نے جواب نہیں دیا

(۴) جناب من

بیشک آپ اس طریقہ کے موجد ہیں لیکن اب تک میں آپ کے اشتہار کا مطلب نہیں سمجھی کہ آیا آپ اس حیلہ سے اپنی شادی کرنی چاہتے ہیں اگر ایسا ہے تو دختران مصر ایسی لغویات کی طرف توجہ نہیں کر سکتی ہیں آپ ہی فرمائیے کہ اگر آپ کی کوئی بہن ہو اور اس اعلان کو دیکھ کر آپ سے اجازت خط و کتابت طلب کرے توکیا آپ اجازت دیدیں گے پس آپ کے لئے بہتر ہے کہ آپ دختران مصر کو بدنام نہ کیجیے جو بات آپ اپنی بہنوں کے لئے پسند کریں وہی دوسروں کی بہنوں کے لیے پسند کریں۔ امید ہے کہ جواب سے مستفید کرینگے۔

میں نے جواب دیا:۔

میں نے یہ جواب پڑھا۔ اگر میری بہن ہوتی اور مجھ سے اجازت طلب کرتی تو میں اس کو یہ بتاتا کہ کس طرح لوگوں کو تہذیب و ادب سے مخاطب کرتے ہیں نہ کہ ایسے تحکم کے ساتھ جو آپ کے جواب میں ہے چونکہ مجھے وہ خاتون مل گئی ہے جس سے میں خط و کتابت کرنی چاہتا تھا لہذا نہایت افسوس سے آپ کو اطلاع دیتا ہوں کہ آپ خط و کتابت نہ کریں

(۵) جواب من ۔

میں "مصور" کی متوالی ہوں اسی لئے اس کو ضرور پڑھتی ہوں اس مرتبہ اس کو پڑھکر میرا دل باغ باغ ہوگیا اور جب میں نے آپ کا اشتہار دیکھا تو خوشی کے مارے پھولے نہ سمائی اور اپنے جی میں کہا کہ مصر کی ترقی کا وقت آگیا۔ لیکن اس اشتہار سے آپ کی غرض کیا ہے ۔کیا آپ ایسی رفیق چاہتی ہیں جو اس اشتہار سے آپ کی طبیعت کے موافق ملے۔ یا اس سے شادی کرنی چاہتے ہیں مجھے مطلع کیجیئے تاکہ میں پھر آپ کو لکھوں. . . . .

میں نے جواب دیا:۔

"آپ کے احساس کا شکریہ اور دعا کرتا ہوں کہ خدا آپ کو میرے علاوہ دوسرے سے خط و کتابت کرنیکی توفیق دے ۔ چونکہ جس کی تلاش میں میں تھا وہ مجھے مل گئی لہذا امید ہے کہ آپ آیندہ خط و کتابت نہیں کرینگی"

اس کے جواب میں اس نے مجھے نہایت سخت سست لکھا اگر صفحات تنگ نہ ہوتے تو میں ضرور اس جواب کو شائع کر کے بعض خواتین کی اخلاقی حالت کو پیش کرتا۔

(۶) جناب من

جو کچھ میں آپ کو لکھ رہی ہوں اس کی معافی چاہتی ہوں۔ آپ کا اعلان کچھ ایسا گول گول ہے کہ مجھے جواب دیتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ اگر آپ کی نیت پاک ہے تو مجھے اپنے نام و پتہ سے مطلع فرمائیے تاکہ معلوم تو ہو کہ کون مجھ سے خط و کتابت کر رہا ہے۔

میں نے اس کو جواب دیا۔

محترمہ۔ آپ کے مؤدبانہ تخاطب کا بیحد شکر گزار ہوں اور اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ آپکو اپنی حفاظت میں رکھے اور آپ کے مانند اور بہت سی خواتین کو با ادب بنائے۔ چونکہ میں اپنا نام و پتہ نہیں ظاہر کر سکتا ہوں اس لئے امید ہے کہ آپ معاف کریں گی۔ بہر حال میرے دل میں آپ کی بے انتہا عزت ہے

اس کے بعد اس نے پھر کچھ جواب نہ دیا

(۷) نمبر ۱۱ سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کے رہنے والے؟

گزشتہ ہفتہ کا میں نے "مصور" پڑھا اور اس ہفتہ کے "مصور" کا انتظار کیا لیکن اس میں آپ کی طرف سے کچھ نہیں پایا۔ چنانچہ میں نے اب ارادہ کیا کہ آپ سے مراسلت کروں میرا خیال ہے کہ شاید میں سب سے پہلی ہونگی جو آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ اس لئے کہ مصری خواتین، اس معاملہ میں قدم رکھتے ہوئے ذرا گھبراتی ہیں۔ جب میں نے آپ کے اعلان کو خوب اچھی طرح سے پڑھ لیا تو میں سمجھی کہ آپ کنوارے ہیں اور شادی کرنی چاہتے ہیں لہذا میں آپ کو لکھتی ہوں کہ میری آمدنی ۷ پونڈ ماہوار ہے اس کے علاوہ میرا باپ مالدار ہے اس کے مرنیکے بعد میری آمدنی ۲۰ پونڈ اور بڑھ جائیگی۔ یہ سات پونڈ مری مرحومہ ماں سے مجھے پہونچے ہیں میں آپ کو اپنا نام اور اپنی ذات بھی لکھے دیتی ہوں تاکہ آپ کو میرے بیان کی تصدیق ہو جائے۔ میں آپ کے جواب باصواب کی منتظر ہوں

میں نے اس کو جواب دیا:-

"جناب من۔ اللہ کی عنایت سے مجھے وہ خاتون مل گئی ہے جو مجھ سے خط و کتابت کر رہی ہے اور جس سے میں خط و کتابت کر رہا ہوں۔ لہذا آپکا شکریہ کہ آپ نے مجھ پر بھروسہ کر کے مجھے اپنے نام اور ذات سے مطلع کر دیا آپ مطمئن رہیں کہ میں اس کو مخفی رکھونگا" اس کے جواب میں اُس نے مجھے ایک شکریہ نامہ بھیجا اور اس میں لکھا:-

"اگر میری طرف سے ترسیل جواب میں دیر نہ ہو جاتی تو میں بلاشک وہ خاتون ہوتی جس سے آپ بجائے اس خاتون کے مراسلت کرتے۔"

(۸) جناب عالی

میرے بھائی مجھے اُمید ہے کہ یہ میرا خط آپ کے اعلان کا جواب ہوگا لہٰذا مجھے اجازت دیجئے۔ مجھے یہ بھی اُمید ہے کہ جس خاتون کی جستجو میں آپ ہیں وہ شاید میں ہی ہوں۔ لہٰذا کیا آپ اپنے ارادہ سے مطلع فرمائیں گے تاکہ ہمارے درمیان مراسلت صحیح بنیاد پر ہو۔

چنانچہ میں نے جو جواب اس کو دیا تھا اس کا مفہوم یہ تھا کہ میں ایسی خاتون سے مراسلت چاہتا ہوں کہ جس کی رائے اور فکر سے کوئی نتیجہ اخذ کروں اس کے سوائے اور کوئی میری غرض نہیں ہے۔

(۹) جنابمن

میں نہیں کہہ سکتی ہوں کہ آپ کا اعلان پڑھکر مجھے کسقدر مسرت ہوئی اور آہ کے وہ شعلے جو اس وقت تک سینہ میں مقید تھے فوراً بھڑک اُٹھے اس لئے کہ میں اپنے اس بھائی کے ساتھ رہتی ہوں جو اپنی نشہ بازی شیطنت اور فضول خرچی کی وجہ سے مجھے بے حد تنگ کرتا ہے اسی وجہ سے آپ کا اعلان پڑھتے ہی فوراً آپ کو خط لکھا لہٰذا اُمید ہے کہ آپ خط وکتابت جاری رکھیں گے .... اس کے بعد اپنی پریشانیوں کی داستان لکھی۔ لیکن چونکہ میں نے اس کو کچھ جواب نہیں دیا اس لیے اُس نے بھی اس کے بعد کچھ نہ لکھا۔

"مولینا کاشفی"

اظہارِ خیال

دل چاہیئے ہلاک تمنا کہیں جسے — اہل نظر ہی عشق کی دنیا کہیں جسے
تند غم فراق ہوئی دل کی کائنات — اک درد رہ گیا ہے تماشا کہیں جسے
پھر چشم شوق کو ہے مئے دید کی ہوس — پھر اک نگاہ برق تجلی کہیں جسے
صدقہ تری نگاہ و تمنا فریب کے — پھر دل میں اک خلش ہے تقاضا کہیں جسے
وہ جان آرزو جو تڑپتا ہے رات بھر — مجسا کہیں جسے کہ نہ تسا کہیں جسے
صہبا وہ کیا کرے دل برباد کا گلہ — حسرت کشِ وداع تمنا کہیں جسے

تنقید و تبصرہ

(از مدیر)

مخزن لاہور سالگرہ نمبر زیر ادارت جناب ابوالاثر حفیظ صاحب جالندھری۔ حفیظ صاحب دنیائے ادب میں ہونہار نوجوان ہیں اور اپنے کام کے سرانجام دینے میں نہایت خلوص و ایثار سے کام لیتے ہیں۔ مخزن کا سالگرہ نمبر دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ مضامین نثر و نظم کا لاجواب انتخاب اگر دیکھنا ہو تو مخزن کو ملاحظہ کیجئے۔ مندرجۂ بالا پتہ سے دستیاب ہو سکتا ہے

مساوات۔ لاہور مساوات کا اجرا نمبر بغرض ریویو آیا ہے جو زیر نگرانی جناب ڈاکٹر شیخ محمد عالم صاحب بیرسٹرایٹ لا۔ لاہور۔ قابل اڈیٹروں کی ادارت میں شائع ہوگا۔ شیخ صاحب موصوف سیاست ملکی میں حصہ لینے کے باعث بہت مشہور ہو چکے ہیں انھوں نے اب ملک کے سامنے صحیح نظریۂ سیاست کو پیش کرنے کی نیت سے یہ روزنامہ جاری کیا ہے۔ شروع میں ڈاکٹر صاحب کا ایک مقالہ ہے جس میں اغراض و مقاصد اخبار سے بحث کی گئی ہے۔ وہ فرماتے ہیں،

نمبر۱۔ اخبار مساوات کا مقصد دولت کمانا نہیں ہے۔ بلکہ ملک میں صحیح سیاسی خیالات کی اشاعت ہے۔

نمبر۲۔ اخبار مساوات کا فرض ہے کہ وہ جماعتی اور فرقہ وارانہ اختلافات سے بالاتر رہ کر اپنے اصلی معنوں میں مساوات کی تلقین کرے۔

نمبر۳۔ اخبار کی زبان سلیس اور ایسی عام ہو جسے ہر طبقہ کے لوگ بآسانی سمجھ سکیں۔

نمبر۴۔ اخبار عام اردو اخبارات کے روزمرہ کے لعن وطعن میں شریک نہ ہو۔ بلکہ اپنے لائحۂ عمل پر کاربند رہتے ہوئے اختلاف رائے کی عزت کرے۔ وغیرہ ملک کے تمام بڑے بڑے حضرات نے ڈاکٹر صاحب کو خطوط بھیجکر ان کی اس ہمت کی داد دی ہے اور اعتراف کیا ہے کہ ایسے بے لوث پاک طینت اور نیک نہاد اخبار کے اجرا سے فضائے

سیاست جو صحت سے مکدر ہے۔ صاف ہو جائیگی۔ اور جس کمی کو اردو صحافت میں محسوس کیا جا رہا ہے۔ اب پوری ہو جائیگی اخبار کے مدیر مسئول جناب عبدالوحید صدیقی صاحب اخباری دنیا میں شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ آپ تو زمزمہ ماہجر دیوبند کے اڈیٹر تھے۔ اور ڈاکٹر صاحب کی دعوت پر لاہور چلے آئے ہیں۔ ہم کو پوری اُمید ہے کہ صدیقی صاحب وہاں بھی اپنے مخصوص قومی رنگ کو ترک نہ کریں گے۔ اور فرقہ دارانہ اختلافات سے اپنے دامن کو پاک رکھیں گے۔ اخبار ۲۳ مئی ۱۹۲۹ء سے روزانہ باقاعدہ جاری ہوگا اور لاہور سے مل سکے گا

اردو کہانیاں مصنفہ قاضی ظہور الحسن صاحب ناظم۔ ساکن ضلع بجنور

سید انشاء مرحوم نے ایک کہانی لکھی تھی۔ جس میں عربی فارسی کے الفاظ کے استعمال سے احتراز کیا تھا۔ اب قاضی ظہور الحسن صاحب نے بھی اسی طرز پر یہ چھوٹی سی ۲۰ صفحہ کی کتاب بچوں کے لیے لکھی ہے۔ جس میں نظم و نثر کی ۷ کہانیاں شامل ہیں۔ زبان نہایت سادہ۔ آسان اور عیب سے پاک ہے۔ اور دلچسپ ہے بچوں کے لیے اس کا مطالعہ ضرور مفید ثابت ہوگا۔ ملک کے مشہور انشا پردازوں نے اس پر ریویو بھی کیا ہے۔ چھ آنہ ڈاک ٹکٹ ۲۰ کلدار میں مل سکتی ہے۔

پتہ:۔ مولوی فیض الدین صاحب وکیل محلہ عابد شاہ حیدر آباد۔ دکن

اسلام (عید نمبر) امرتسر اڈیٹر محمد مہر الدین صاحب قیمت فی کاپی ۶ر

یہ رسالہ ۴۶ صفحہ میگزین سائز پر شائع ہوا ہے۔ اور عید الضحٰی پر مختلف النوع اقسام کے نظم و نثر مضامین کا گلدستہ ہے۔ مسلمانوں میں اسلام کی تعلیم و ترقی کی ترویج اس کا عین مقصد ہے۔ عید پر مختلف قسم کے مضامین شائع کئے گئے ہیں اُن کے مطالعہ سے ہم کو معلوم ہو جاتا ہے کہ عید کی خوشی مختلف جگہوں مختلف دلوں میں کیا معنی رکھتی ہے امیر و غریب کی عید کا کیا مفہوم ہے وغیرہ وغیرہ کتابت و طباعت معمولی ہے

ملنے کا پتہ:۔ منیجر رسالہ اسلام۔ امرتسر پنجاب